سلسلۂ نصابات علمیہ جامعہ عثمانیہ

جدید

قانون بین الممالک کا آغاز

واحد طباعت اصل فرانسیسی سنہ ۱۸۹۴ء بروسل و پاریس

تالیف

ارنشٹ نیس

استاذ قانون جامعہ بروسل

ترجمہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

استاذ قانون جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۶۴ھ م سنہ ۱۳۵۴ف م سنہ ۱۹۴۵ء

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن

فہرست مضامین

صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ اس ترجمے کے متعلق

پیش لفظ اور دیباچے عام طور سے پڑھے نہیں جاتے۔ لیکن یہاں کم سے کم پہلا پارۂ تحریر پڑھ لیا جائے تو ناظر کتاب کو بہت سی الجھنیں پیدا ہی نہ ہوں۔

رسم الخط اور اعراب

ہماری زبان میں تقریباً ہزار سال سے زبر، زیر، پیش کے صرف سہ گانہ عربی اعراب پر اکتفا کی جاتی رہی ہے گو حروف تہجی میں عربی پر کوئی درجن بھر اضافہ ہو گیا: کچھ زمانۂ قدیم ہی میں اور کچھ ہمارے ہی زمانے میں مثلاً دوچشمی (ھ) وغیرہ۔ اعراب پر کم توجہ کی وجہ اس کا نسبتۃً کم استعمال سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر حال مزید اعرابی علامتیں درکار ہیں اور خود ہماری زبان کے الفاظ کے لیے واؤ مجہول اور یائے مجہول کی طرح مجہول پیش اور مجہول زیر کی شدید ضرورت ہے۔ انگریزی کے کثیر رواج کے باعث بہت سے انگریزی نام جو زبانوں پر چڑھ گئے ہیں وہ تو مجہول زبر کے بھی متقاضی ہیں۔ اس وقت تمام عربی ممالک میں ایک اور حرف تہجی (ڤ) رائج ہو گیا ہے جو یورپی زبانوں کے حرف (V) کے لیے ہے۔ سنسکرت ناموں کے لیے نہیں اس کی مقامی ضرورت بھی ہے، اور یورپی ناموں کے لیے بین الاقوامی اور علمی ضرورت بھی۔ یکسانیت اور ہم آہنگی کی خاطر (ڤ) کو بھی بلا ترمیم اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔

ایک علمی کتاب میں خاص کر قانون بین الممالک میں آنے والے ناموں کی وسیع ضرورتوں کے مدنظر کم سے کم ان تین زائد اعرابی علامتوں اور ایک نئے حرف تہجی کی ضرورت ہے۔ چونکہ یہ اس کتاب میں کثرت سے برتے گئے ہیں، اس لیے ان کی تھوڑی سی مزید توضیح بے محل نہ ہوگی:-

موجودہ	اضافہ کردہ
ـِـ معروف زیر مثلاً اِس، اِیمان وغیرہ میں	ـٖـ مجہول زیر مثلاً یہ ایک وغیرہ میں
ـُـ معروف پیش اُس، دُور، نُور	ـٗـ مجہول پیش وہ چور (= ڈاکو)
ـَـ معروف زبر وَس قَلَم	ـٰـ مجہول زبر ہاملٹن ناشنل آٹ یہ انگریزی آواز، الف اور یائے مجہول کے بین بین ہے۔
ـآـ معروف مد آسمان	ـٓـ مجہول مد آلن آڈم مجہول زبر ہی کی طرح لیکن زیادہ لمبی آواز
....	ڤ مثلاً لفٹ ڈیل ٹوڤر لفوڤ یہ آواز (ف) اور (و) کے بین بین ہے اور نیچے کے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں سے دبانے پر تلفظ ہے۔

اس کے بعد اس کی مطلق ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ناموں کو دو دو رسم الخطوں میں لکھا جائے۔ البتہ کتاب کے آخر اشاریے میں اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ مختلف یورپی زبانوں میں مختلف حروف کی آوازوں میں بے انتہا فرق ہے مثلاً (J) کا تلفظ انگریزی میں (ج) ہے تو فرانسیسی میں (ژ) اور جرمن میں (ی) وغیرہ وغیرہ۔ مزید برآں

جن جن کتابوں کا حوالہ ہے ان کے ناموں کا بھی ہم نے ترجمہ دیا ہے، اور اشاریے میں اصل زبان کا نام اسی کے رسم الخط میں دیا گیا ہے۔

زبان

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ اس زبان سے ہمارے ہاں بہت کم ترجمے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے حیدرآبادی انگریزی "مدامی معاہدۂ حلیفی" نے فرانس کے ساتھ مملکت آصفیہ کے پرانے اور گہرے رابطے بالکل توڑ دیے اور باوجود پھلچری (پونڈی شیری) اور کارے کال کی "مشروط الخدمت انعام جاگیر" فرانسیسیوں کے قبضے میں بحال رہنے دینے کے، فرانسیسی تمدن اور ادبیات سے استفادہ ایک پوری صدی تک رک گیا، تا آنکہ سید علی بلگرامی نے "تمدن ہند" اور "تمدن عرب" کو فرانسیسی سے ترجمہ کر کے علمی تعاون کا یہ رشتہ پھر سے جوڑنے کی ہلکی سی کوشش نہ کی۔ دوسری طرف گارسیں دِتاسی وغیرہ کے روایات جامعۂ پاریس میں اس قدر مستحکم ہیں کہ سنہ ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۳[illegible]ء میں وہاں کے مدرسۂ السنۂ شرقیہ میں یورپی طلبہ نذیر احمد وغیرہ کی کتابیں فرفر پڑھتے دیکھے گئے۔

بلدۂ حیدرآباد سے خاص کر فرانسیسی اثرات مٹ نہ سکے۔ یہ سطریں محلۂ ترپ بازار میں لکھی جارہی ہیں اور ہماری "نئی فوج" کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو رئے منوں کے متعلقین میں سے کسی کا مکان کوئی تین چار نسلوں سے "ترپ باغ" کے نام سے ہمارے خاندان کی ملکیت میں چلا آرہا ہے اور ڈیڑھ صدی کے ہمہ گیر انگریزی اثرات بھی اس "ترپ" کو "ٹروپ" نہ کرسکے۔ ہمارے ہاں کی "نظم جمعیت" نامی فوج میں تو ان پرانے روابط کے اثرات اب بھی کثیر اصطلاحی الفاظ میں برقرار ہیں۔

لیکن یہ سب بھی اس بات کے لیے قطعاً ناکافی ہیں کہ فرانسیسی محاورے ترجمے میں ہم لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ انشا پردازی میں ترجمہ بڑی مشق اور خاص صلاحیتیں چاہتا ہے اور میرے لیے کسی کتاب کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں آئے ہوئے نو یا دس یورپی

زبانوں کے اقتباسات کوئی خاص دشواری نہ رکھتے لیکن پانچ پانچ سو
ہزار ہزار برس پہلے کی زبانوں کے جملے بلکہ صفحوں کے صفحے مؤلف
نے اپنے ناظرین پر ضرورت سے زیادہ حسن ظن رکھ کر نقل کر ڈالے
ہیں۔ اس بارے میں مترجم کی کچھ سرگزشت سنئے۔ قرون متوسطہ
کی "بگڑی ہوئی" لاطینی کے بہت سے الفاظ میرے زیر استعمال لغت
میں نہ ملے۔ ایسی چند عبارتیں ایک مقامی عیسائی مدرسے کے صدر
کو بتائی گئیں۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ انتظار کروا کر انھوں نے معذرت
کہلا بھیجی کہ وہ ان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح پرانی فرانسیسی
کے کچھ اقتباسات، ایک ایسے فرد کو بتائے گئے جس کی مادری
زبان فرانسیسی ہے اور جو خود ادبیات کا طیلسانی۔ سوائے ایک یا دو
لفظوں کے قیاسی معنوں کے وہاں بھی معذرت ہی مل سکی۔ ناقسی
لمحۂ کسیری نے متعلقہ دور کی زبانوں کے لغت منگوا سکنے کے راستے
بند کر رکھے ہیں۔ آخر میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی تدریسی ضرورتوں
سے اس ترجمے کی بڑی عجلت تھی۔ ترجمے کو کوئی ڈیڑھ دو مہینوں
میں ختم کرنا پڑا اور، پھر تفصیلی نظر ثانی اور اصل سے لفظ بلفظ مقابلے
کا موقع پائے بغیر اسے چھپنے کے لیے بھیج دینا پڑا۔ یہ غیر ذمہ دارانہ
معذرتیں نہیں، درد دل ہے۔ نہ معلوم کب تلافی کا موقع ملے۔

کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے جدید ادبی رجحان کے موافق
آسان سے آسان زبان برتی جائے۔ ایک چیز میں تو رائج الفاظ کو
بھی عمداً چھوڑ دیا گیا اور مثال کے طور پر "سولھواں لوئی" اور "اٹھارواں لوئی"
لکھے گئے ہیں اور بیجا فارسیت کے "لوئی شانزدہم" اور "لوئی ہشدہم"
سے پرہیز کیا گیا ہے۔

کتاب کا نام بھی دو ایک توضیحی لفظ چاہتا ہے۔ ہماری اخباری دنیا
میں "بین الاقوام" کا لفظ انگریزی کے لفظی ترجمے کے
باعث جاری ہے۔ لیکن ہمارا موضوع چونکہ "قوموں" کے نہیں بلکہ "مملکتوں"

کے باہمی برتاؤ کے قواعد ہیں اس لیے "بین الممالک" کی اصطلاح برتی گئی ہے، جو اب بالکل نامانوس بھی نہیں رہی ہے۔ خود انگریزی زبان کے علمی حلقوں میں اب "انٹرنیشنل" کی جگہ "انٹراسٹیٹل" کا لفظ پھیل رہا ہے۔ اصل میں ایک زمانے میں سیاسی قوم ہی سب کچھ تھی، نسل اور زبان اور اسی طرح کی چیزوں کا لحاظ نہ تھا۔ اب قوم کے لفظ سے جو معنے سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں، وہ نسلی قومیت کے ہیں۔

اصطلاحیں

ہماری زبان میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی الفاظ آسانی سے کھپ جاتے ہیں کیونکہ ان زبانوں کے بہت سے الفاظ پہلے ہی سے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ اب نئی اصطلاحوں میں علاوہ اور امور کے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ حتی الامکان مانوس الفاظ ہی سے مشتق ہوں اور ہماری زبان میں آسانی کے ساتھ گھل مل سکتی ہوں۔

ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان بھی اس وقت دشواری محسوس کرنے لگتی ہے جب کسی ایسی زبان، ایسے تمدن یا ایسے موضوع سے سابقہ پڑے جس سے سابق میں تعلق نہ رہا ہو۔ انگریزی یا عربی سے اردو میں ترجمہ اب کافی آسان ہے اور بہت سے لوگوں کو تیزی کی خاطر محض املانویس کافی نہیں ہوتا، مختصرنویس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اردو کے بہت اچھے ماہر عرب یا انگریز کو اردو سے ترجمہ مقابلۃً بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان کی زبانوں میں اردو سے کم ترجمے ہوئے ہیں۔

جس شخص نے فن ترجمہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو کہ مثلاً عربی میں کس طرح یونانی، سریانی، پہلوی، سنسکرت وغیرہ سے؛ لاطینی میں عربی وغیرہ سے؛ انگریزی میں لاطینی وغیرہ سے ترجمے ہوئے تو وہ فوراً محسوس کرلیتا ہے کہ ترجمی ادب کے ابتدائی، درمیانی اور آخری دوروں میں اس سے کہیں زیادہ فرق ہوتا ہے جتنا خود زبان میں اس عرصے میں۔ عربی

میں ہزار ایک سال پہلے جو اوّلین ترجمے ہوئے تھے، ان میں سے کچھ اب بھی محفوظ ہیں۔ ان کا سمجھنا کسی عرب کے لیے بھی اس سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوا ہے، جتنا ہمارے دار الترجمے کے اولین ترجموں کا ہمارے لیے۔ قابل سے قابل اور فن دان سے فن دان مترجم ملنے کے باوجود، عربی کو جو دشواریاں رہیں وہ ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔

مثلاً: ہم آج کتنا پن، کیسا پن، اگر پن، وہ پن، ہیں پن وغیرہ کے حاصل مصدر سنیں تو فوراً رد کردیں گے لیکن کمیت، کیفیت، لمیت، انیت، ہویت، انانیت بھی عربی کے لیے ایک زمانے میں ویسے ہی نامانوس اور ناگوار تھے۔

دوسرے: بعض نئے مفہوم یا علموں کے نام شروع میں بعینہ اپنا لیے گئے مثلاً اثولوجیا، ماثماطیقا۔ پھر یہی الفاظ دوسرے دور میں "ربوبیت" اور "تعلیم" بنے۔ اور آخر میں یہی "الٰہیات" اور "ریاضی" بنکر اب تک چلے آرہے ہیں۔

یا: جغرافیا کی جگہ صورۃ الارض اور صور الاقالیم، اور موسیقی کی جگہ غناء کہنے کی کوشش کی گئی مگر یہ سخت جان اور بے حیا نکلے۔

اور: جنس، قانون، ہندسہ، فلسفہ وغیرہ کو بدلنے کی شاید کبھی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ تریاق، اساطیر وغیرہ تو غالباً قبل اسلام کا حق قدامت جتانے اور "ملکی" بنے رہے؛ اور بعد کے عرب ماہرین اشتقاقیات ان کو خالص عربی مادوں سے بتانے لگے۔

بہرحال ابتدائی دور کے بغیر درمیانی دور آ نہیں سکتا اور نہ ان دونوں بنیادی دوروں کے گزرنے کے بغیر آخری دور زریں کے آنے کے عجلت پسند خواہشمند حقائق اور ممکنات کی دنیا میں نظر آتے ہیں۔

ہمارے دار الترجمے کی گراں خرچی پر بعض بھولے مخلص فوراً انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔ لیکن وہ بھولتے ہیں کہ اردو سے کہیں زیادہ فطری صلاحیتیں رکھنے والی عربی زبان کو عصری علمی زبان اور ترجموں کی

اہل بنانے کے لیے عباسی بغداد کے دار الحکمت، اور فاطمی مصر کے دار العلم، اور اُموی قرطبہ کے دار الکتب نے جو رقمیں صرف کیں، ان کے اعداد پر اب ہم یقین بھی نہیں کریں گے کہ اچھی کتابوں پر ان کے ہموزن سونا بھی معاوضہ ملتا رہا۔ اگر ہم نے اپنے دور اول میں کبھی کبھی ہموزن چاندی دیدی تو کونسی بڑی علم نوازی اور مقصد پروری کرلی!۔ نہ تو یہ صرفہ ضایع شدہ اور اسراف سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کے بغیر ہماری رفتار ترقی اتنی تیز ہوسکتی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ جلالتمآب حضرت سلطان العلوم کے عثمانی امن و فراوانی، اور حاتمی داد و دہش کے دور میں ہمارے ہاں اس کام کا آغاز ہوا ورنہ ہم اپنے ہموطن پیشروؤں سے آگے کیا نکل جاتے سب ہی سے پیچھے رہتے۔

ترجموں کی دائمی ضرورت

یوں تو کسی زبان کے علمی بچپن یا کسی بالکل نئے فن کی تحصیل کے وقت تمام اہم اور بنیادی کتابوں کے ترجمے کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن چند ترجموں کی ضرورت بہرحال ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ایجاد اور کمال کسی ایک قوم کی میراث نہیں اور جب تک دنیا میں اختلاف السنہ باقی ہے، اپنی زبان اور اپنے تمدن کو عصری رکھنے کے لیے دنیا کی ہر زبان کی اچھی کتابوں کا ترجمہ ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر ہمارا دار الترجمہ ابھی دور اول ہی کے اختتام پر بچنت بن جائے اور مختلف علوم کا تا حال کیا ہوا ترجمہ ہی منتہائے علم قرار دے لے۔ ابھی تو قدیم امہات الکتب ہی ختم نہیں ہوئیں، روزمرہ نکلنے والی مشرقی و مغربی السنہ کی قابل ترجمہ کتابیں ہر سال سیکڑوں ہی ہوتی ہیں۔

مولف کے حالات

زیر ترجمہ کتاب کا مولف آرنسٹ نیس ہے جو بلجیم کی جامعۂ بروسیل کا پروفیسر تھا۔ جنگ مانع ہے کہ اس کے مزید حالات معلوم کیے جائیں۔ بہرحال اتنا ضرور معلوم ہے کہ علاوہ قانونی تدریس کے، اسے عدل گستری کا عملی تجربہ بھی رہا ہے اور

وہ ایک بڑے رتبے کا حاکم عدالت رہ چکا ہے۔ قانون بین الممالک کی بین الاقوامی انجمن کا سرگرم رکن ہونے کے علاوہ اس نے کئی درجن کتابیں بھی فرانسیسی میں لکھی ہیں۔ علمی رسالوں کے مضمون اس کے ماسوا ہیں۔

زیر ترجمہ کتاب ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے تک اس کی جو کتابیں چھپی تھیں ان میں سے خود مولف نے حسب ذیل کو اہم قرار دیا ہے:-

۱۔ پاپائی بلحاظ قانون بین الممالک — (اس کا انگریزی ترجمہ پادری پانسن بی لیوں نے ۱۸۷۹ء میں لندن میں شایع کیا۔ فرانسیسی اصل کی تاریخ معلوم نہیں)۔

۲۔ بحری جنگ — مطبوعہ بروسیل ۱۸۸۱ء

۳۔ قانون جنگ اور گروتیوس کے پیشرو — م بروسیل ۱۸۸۲ء

۴۔ اُونورے بُونے کی تالیف شجرۂ حروب — م بروسیل ۱۸۸۳ء

۵۔ سفارت کاری کا آغاز — م بروسیل ۱۸۸۴ء

۶۔ اصول قانون بین الممالک (لوریمر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) — م بروسیل ۱۸۸۵ء

۷۔ فرانسوا لوراں، اس کے حالات اور کارنامے — م بروسیل ۱۸۸۶ء۔

۸۔ بنتھام کی بعض غیر مطبوعہ یادداشتیں — م بروسیل ۱۸۸۷ء

۹۔ انگلستان کے قانون بین الممالک کی خیالاتی اور تالیفاتی تاریخ — م بروسیل ۱۸۸۸ء۔

۱۰۔ توماس کامپانیلا — م بروسیل ۱۸۸۹ء

۱۱۔ امرندیوں (امریکا کے اصلی باشندوں) کے حقوق اور اسپینی مولف — م بروسیل ۱۸۹۰ء

۱۲ سیاہ غلامی اہل قانون اور اہل عدالت کی نظروں میں — م بروسیل ۱۸۹۰ء۔

۱۳- جدید قانون عامہ کے بانی ـــــ م بروسیل سنہ ۱۸۹۰ء

۱۴- قانون قدرت کے اصول دو جلدوں میں (لوریمر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) ـــــ م پاریس سنہ ۱۸۹۰ء

۱۵- فرانس میں اٹھارھویں صدی تک کے سیاسی نظریے اور قانون بین الممالک ـــــ م پاریس سنہ ۱۸۹۱ء

۱۶- برٹش میوزیم کے کاغذات تنصام ـــــ م بروسیل سنہ ۱۸۹۱ء

۱۷- انگلستان کے سیاسی نظریے ـــــ م بروسیل سنہ ۱۸۹۲ء

۱۸- موجودہ زیر ترجمہ کتاب ـــــ م بروسیل و پاریس سنہ ۱۸۹۲ء

اس کتاب کی کئی خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو اپنے موضوع کی مستند اور معتد اول کتاب ہے جس کا ہر کوئی حوالہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر مولف کی وسعت قلبی ہے کہ اپنوں کی کوتاہیاں اور غیروں کی خوبیاں اور احسان ماننے میں اسے ذرا بھی تامل نہیں معلوم ہوتا۔ کم مغربی مولف ہیں جنھوں نے جدید قانون بین الممالک پر کثیر مشرقی اثرات کو اس صراحت سے تسلیم کیا، سراہا اور ثابت کیا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی ادبیات سے براہ راست استفادہ نہ کرسکنے اور ترجموں میں سے بھی چند مشہور ہی پر اکتفا کرنے کے باعث بعض جگہ واقعاتی غلطیاں ہیں تو بعض جگہ تخمین کی اور خانگی سنی سنائی باتوں کو حقائق سمجھ کر پیش کر دیا گیا ہے ـــــ ان کی طرف حسب ضرورت مترجم نے حاشیے میں توجہ دلا دی ہے ـــــ لیکن ان غلط واقعات سے اس نے مشرق کی بعض چیزوں پر اعتراض کیا ہے تو یہ تعصب اور عناد سے کہیں زیادہ ناظر دار تلاش میں کے موقتی جذبات کا فوری ردعمل کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اصل کتاب میں کوئی اشاریہ نہیں ہے اور یہ غیر دلچسپ مگر ضروری اور ساتھ ہی

کٹھن کام بھی مترجم ہی کو کرنا ہے۔

میں ان ناظروں کا پیشگی شکریہ عرض کرتا ہوں جو میری کسی سہو اور خامی سے واقف ہوں تو اس سے اپنے احباب ہی کو نہیں مجھے بھی متنبہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ یہ مجھ پر ہی نہیں علم پر بھی احسان ہوگا۔ فقط

محمد حمید اللہ

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

۱۵؍محرم الحرام ۱۳۶۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

"مملکتوں کے قانون" یا اگر جیرمی بنتھم کی رائج کردہ اصطلاح کو استعمال کریں تو "قانونِ بین الممالک" کے متعلق یہ سوال ہوتا رہا ہے کہ آیا وہ واقعی کوئی قانون ہے یا نہیں، مگر آج کل اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مشہور انگریز کے ہم مسلک لوگوں نے قانون کا جو محدود تصور قائم کر لیا تھا، اس کے باعث اس سوال کا جواب نفی میں دینے کے لیے قابل لحاظ وجہ پیدا ہو گئی تھی (انگریزی اصطلاح "لا" (قانون) کے مفہوم میں ان لوگوں نے تین بنیادی تصورات ضروری خیال کیے تھے: اولاً اس کا ایک حکم کی حیثیت رکھنا، دوسرے اس کی عدم تعمیل پر تہدید و تدارک کا مہیا کرنا، اور تیسرے ایک ایسے اقتدار کا پایا جانا جو اس قانون کے نفاذ کا حکم دے سکے) ان لوگوں نے ایک ایسے اقتدار کی ضرورت خیال کی جو سزا دے سکے۔ ان کے خیال میں اس سزا کا اطلاق ایک ناگزیر تدارک ہے چونکہ قانون بین الممالک میں ان کو نہ تو کوئی واقعی حکم دینے والی قوت نظر آئی (کیونکہ مملکتیں خود مختار تصور کی جاتی ہیں) اور نہ ہی کوئی واقعی تدارک (کیونکہ ان کی رائے میں صرف عالم انسانی کی رائے عامہ ہی بالآخر تعریف یا ملامت کے ذریعے سے مملکتوں کے کسی فعل کو پسند یا ناپسند کر سکتی ہے اور بس)۔
یہ شبہ ابھی تک قانونِ بین الممالک کے لیے کوئی ایسا اقتدار

نہیں پایا جاتا جو اس کے قواعد بنانے پر مامور سمجھا جائے لیکن ہم اس چیز کو نہ بھلائیں کہ عام قانون ملک بھی بہت دنوں تک اس انتظار میں رہا کہ کوئی قانون ساز آئے اور اس کو ایک معین طور سے بیان کرے۔ تدوین کا زمانہ رواج کے بعد آتا ہے اور رواج شیوخ قبیلہ کے عدالتی فیصلوں کا جانشین ہے اور کچھ نہیں۔

(بے شبہہ قانون بین الممالک کے لیے ابھی تک کوئی عدالتی اقتدار مستحکم طور سے قائم نہیں ہوا ہے لیکن خود عام قانون ملک کے سلسلے میں اگر کوئی ایسا اقتدار پایا جاتا ہے جو قانون کے نفاذ پر مامور ہے تو یہ بھی ایک استثنائی صورت ہی ہے نہ کہ کوئی ضروری کلیہ۔)

II

اصل میں قانون کا وجود سزا کے اطلاق سے بالکل بے نیاز ہے۔ قانون بین الممالک کے اس نازک نکتے کو غالباً جیرمی بنتھم سے زیادہ کسی اور نے احتیاط کے ساتھ نہیں واضح کیا ہے۔ اپنی قیمتی زندگی کے آخری سالوں میں اس نے اس موضوع پر بہت سے صفحے سیاہ کیے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قانون بین الممالک کے لیے اس بات کی ضرورت نہیں کہ کوئی قوت حاکمہ پائی جائے، چاہے وہ مملکتوں کے نمایندوں کی کانفرنس ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح کی کانفرنس کے انعقاد کی اس نے تجویز پیش کی تھی، مگر اس کو اس نے محض یہ فریضہ سپرد کیا تھا کہ مقدمات کا فیصلہ کرے، (نفاذ سے اس کو کوئی تعلق نہ ہو)۔ ہم مکرر یہ چیز بیان کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہے۔ وہ محض مملکتوں کے ایک اخلاق کا نام ہرگز نہیں ہے۔

یہ قانون روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ بہت دنوں تک اس نے اپنے آپ کو قواعد جنگ تک محدود رکھا جنھوں نے حقیقت میں اس کے تخم کا کام دیا۔ اس کے بعد سفارتی نظام کا زمانہ آتا ہے۔ جنگ کو قواعد وضوابط کا پابند بنانے کے لیے ابتداءً منفی طریقہ استعمال کیا گیا اور مختلف چیزوں کی ممانعتیں صادر کی جانے لگیں۔ چنانچہ ظالمانہ برتاؤ کو نادرست

ٹھیرایا گیا۔ پھر ایسے طریقوں کے استعمال کو باضابطہ طور سے بُرا قرار دیا گیا۔ مستقل سفیروں کے تقرر نے قانون بین الممالک کے لیے ایک تعمیری دور کا آغاز کیا۔ ہمارے زمانے میں بہت سے ادارے وجود میں آچکے اور ترقی کر رہے ہیں، جن سے اس کا پتا چلتا ہے کہ بین الممالک انتظام نے کتنی عظیم الشان ترقی کر لی ہے۔

ہر انسانی کام کے دو حصے ہوتے ہیں: ایک تو ہمعصروں کا حصہ اور دوسرے ان لوگوں کا حصہ جو اس ابدی کشمکش میں اس جہان سے گزر چکے ہیں۔ اور کشمکش انسانیت کے لیے ناگزیر ہے۔ قانون بین الممالک کی حد تک بھی یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ صرف طبیعت انسانی کی پیداوار ہے۔ انسان ہی اس کو وضع کرتا ہے جس طرح کہ وہ عام قانون ملک کو یا جس طرح وہ قانون سیاسی کو معین کرتا ہے۔ رفتار زمانہ سے ایک کے بعد دوسری نسلیں آتی رہیں اور ہر ایک نے اس عظیم الشان کام میں اپنا حصہ لیا اور ہر ایک نے اس مشترکہ خزانے کو معمور کرنے میں ہاتھ بٹایا۔

کیا مثالوں کی ضرورت ہے؟ یہ فینیقیہ تھا جس نے حقیقت میں ہم کو بحری قانون عطا کیا۔ اب تک بھی یونان کا فلسفہ اپنے قوی اثرات ہم پر استعمال کر رہا ہے۔ روما کی سیاسی اور قانونی صلاحیت نے دنیائے جدید کو بھی حیات بخشی، جس طرح کہ قرون متوسطہ کو اس نے زندہ کیا تھا۔ قرون متوسطہ نے بھی اس بارے میں اپنا حصہ لیا ہے۔

قدیم تمدن چھٹی صدی عیسوی میں غائب ہو گیا۔ یورپی قابلیتوں کی پیدائش بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی سے سمجھی جاتی ہے۔ ان دونوں کا درمیانی زمانہ روح انسانی کی روایات کے مطابق اس چیز کے زیر اثر رہا جس کو ہم "عربی علم" کا نام دینے لگے ہیں۔ عیسائیت نے بھی تین صدیوں تک زور وشور سے حکومت کی۔ اس کے بعد وہ نشاۃ ثانیہ وجود میں آیا جس نے مغربی دنیا کا براہ راست قدامت متمدنہ سے اتصال پیدا کر دیا۔

قانون بین الممالک کی تاریخ انسانیت کی پوری تاریخ پر حاوی ہو جائے گی۔

چنانچہ ایک فرانسیسی مولف نے حال میں اس کو لاانتہا ہی معقولیت کے ساتھ یوں واضح کیا ہے:۔

> "اگر دو جماعتیں ساتھ ساتھ پائی جائیں تو یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان میں ایسے مفادات پیدا ہوں جن کے حل کے لیے قواعد بنانے کی ضرورت پڑے، وہ جنگ کریں گی اور اس کے بعد صلح۔ اور خود بین الممالک ادارے اپنی بیّن اور نمایاں کمزوری و نزاکت کے باوجود ایسی چیز کی نمایندگی کرتے ہیں جو کم سے کم تبدّل پذیر اور زیادہ سے زیادہ منتقل ہو۔"[1]

موجودہ جماعت انسانی جن بڑے عناصر پر مشتمل ہے ان کا اس میں راست یا بالواسطہ حصہ لینا صفحات آیندہ میں بار بار نظر آتا رہے گا۔ بہرحال یہ ایک ایسا دور ہے جس کا مطالعہ دیگر ادوار سے زیادہ ضروری ہے اور یہی وہ دور ہے جس میں ہمارا جدید تمدن پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔

قرون متوسطہ کی آخری صدیوں میں قانون بین الممالک کے جو ادارے وجود میں آئے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس زمانے کے نظریے بڑی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ لوگوں کو معلوم نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرون متوسطہ اصل میں مباحثوں کا دور ہے۔ چنانچہ پہلی نظر میں ہمیں وہ ایک ایسا زمانہ نظر آئے گا جب طبیعتیں غیر متزلزل ضبط کی پابند تھیں یہ بھی نظر آئے گا کہ چند بہت بلند تصورات (مثلاً مقصور عیسائیت' یا پاپائیت' اور مقدس رومی شہنشاہیت کا نظریہ' اور جاگیرداری نظام) واقعۃً انسانیت کو گھیرے ہوئے تھے[2]۔ ان چیزوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ خاصکر جن چیزوں کا قانون بین الممالک سے تعلق ہے ان کی حد تک قرون متوسطہ کے مولفوں نے اکثر ایک قابل ستایش بہادرانہ طبیعت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم صرف پاپائیت اور

---

[1] سود لاکلا ڈییئر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد اول دیباچہ صفحہ (۱)۔

[2] گے بار کی فرانسیسی کتاب "اطالوی نشاۃ ثانیہ اور فلسفۂ تاریخ" صفحہ (۶)۔

شہنشاہیت کے مسائل کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، جن کے اندر خود مختاری اور مشوری سماج کے اہم امور داخل ہو جاتے ہیں، بلکہ ہمارا اشارہ ان تمام اقسام کے امور کی طرف ہے جو مملکتوں کے مخاصمانہ یا مسالمانہ تعلقات کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال سے بحث کی جانے لگی کہ آیا جنگ ایک جائز چیز بھی ہے یا نہیں؟ اور ان اسباب کا، جن کے تحت ہتیار اُٹھانا درست قرار دیا جا سکتا ہے، اس شدت اور وضاحت سے اس زمانے میں مطالعہ کیا جاتا تھا کہ اس کے بعد سے اب تک پھر کبھی نہ ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ خانگی جنگ اور انتقام ذمو اخذہ عرصے تک قانونی ادارے بنے رہے۔ ان کی تک اس زمانے میں تنقید شروع IV ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کی اولاً مخالفت ہونے لگی اور بالآخر ان کو ایسے اداروں میں شامل کر دیا گیا جو حق اور صداقت سے عاری سمجھے جاتے ہیں۔ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کے متعلق بھی پرجوش مباحثے ہوتے رہے اور ان کے متعلق بھی ہمیں ایسے شرافت آب منکرین کے خیالات سنائی دیتے ہیں جو "قبل از وقت پیدا ہوئے تھے اور جو آیندہ صدیوں کے لوگ تھے"۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس بات کی ضرورت کا اعلان کیا تھا کہ رواداری برتی جائے۔ ثالثی اور تحکیم کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان پر عمل کیا جانے لگا۔ رائے عامہ سے کچھ اتنی اپیل کی جاتی رہی کہ ہماری انیسویں صدی کے اختتام پر بھی نہیں ہوتی ہے۔ توازن قوت کے نظریے کو ایک قابل احترام حیثیت عطا ہوئی۔ پندرھویں صدی عیسوی کی عظیم الشان دریافتوں کے باعث حصول اراضی کے مسائل پیدا ہوئے۔ اور اس کے کچھ ہی بعد سمندری آزادی کا معاملہ۔ اسی پر سب کچھ نہیں ختم ہو جاتا۔ اگر کچھ لوگ ایسے تھے جو حقایق پسند تھے اور حوادث و واقعات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر کے فیصلہ کرتے تھے تو اسی زمانے میں کچھ ایسی پرجوش طبیعتیں بھی وجود میں آئیں جو جذبات سے لبریز تھیں اور ابدی امن کا میٹھا خواب دیکھتی تھیں۔

اگر ہم مختلف قوموں کے کارناموں کا مطالعہ کریں، جن کے متعلق مٹیلے نے "انسانیت کے عظیم الشان راز" کی دلچسپ اصطلاح استعمال کی ہے، تو دنیا کی تاریخ ہمیں خوشنما ہی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسی صورت میں وہ اس مقصد کو سب سے زیادہ پورا کرتی ہے جو آرٹشوں نے اس سے متعلق کیا ہے۔ اور ایسی صورت میں وہ سیاست اور اخلاق کی سب سے زیادہ جیتی جاگتی تصویر نظر آسکتی ہے۔ قانون بین الممالک کے آغاز کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو وہ بہت سبق آموز ہے؛ ہر قوم کے پیش نظر ایک کام رہا۔ ہر صدی کا ایک مقصد رہا۔ اٹلی نے منقش اور سیاست کار پیدا کیے۔ اسپین نے اپنے مشہور علماء اور شارل کیں (پانچویں چارلس) کی طاقتور سلطنت کے عہدہ دار پیدا کیے۔ فرانس نے اونور سے بوٹنے اور کرسٹین ڈیپیزان جیسے عہد آفریں تحریکوں کے بانی پیدا کیے۔ انگلستان نے اپنے حامیان بادشاہت پیدا کیے اور انھیں لوگوں نے حقیقت میں جدید قانون بین الممالک کی بنیاد ڈالی۔ اسی لیے ہمیں اس علم کے آغاز کو گروشیوس کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ بے شبہہ اس کی لاطینی کتاب "قواعد جنگ و صلح" تاریخ میں عہد آفریں حیثیت رکھتی ہے۔ جس زمانے میں دنیا میں صرف "قوت" کا بول بالا تھا، نوہالینڈ کے اس مشہور مولف نے مملکتوں کو وہ قواعد یاد دلائے جن پر ان کے تعلقات مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن گروشیوس سے پہلے بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی رہی تھی جو بے شبہہ اکثر صورتوں میں جستہ جستہ امور کے متعلق تھی لیکن وہ بہرحال ایک ناقابل انکار صلاحیت، ایک ناقابل تردید زور، اور قریب قریب ہمیشہ انسانیت کے ساتھ ایک عشق رکھتے ہوئے تھی، جو ان کے بعد والوں میں بھی ہمیں کبھی کبھی نمائب نظر آتی ہے۔

بہرطور قانون بین الممالک کی تاریخ ایک نسلی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے "بیچارے یاس انگیز نظریے" کی مخالفت میں،

V

اپنے قطعی ایقان کے ذریعے سے اس کو مکمل بنانے میں حصہ لیا ہے۔ ارتقا و ترقی پر ایقان، ایک استحکام اور قوت حاصل کر جاتا ہے جب ہم قانون بین الممالک کا مطالعہ کرتے ہیں اور سب سے زیادہ یہیں ہم کو یہ چیز نظر آتی ہے کہ انسانیت کی بہتری کے لیے بے پناہ انگیس جلوہ گر ہیں جھگڑے سخت ہیں، دراز ہیں، مگر ان کا نتیجہ کامیابی ہی ہوتا ہے۔ اور ہر دفعہ یہ کامیابی عقل اور مشیت انسانی کے باعث ہی حاصل ہوئی ہے۔
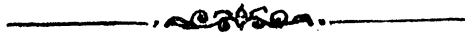
باب اول

قرون متوسطہ کا تصور اور علم قانون بین الممالک

قانون بین الممالک کا کوئی ٹھیک تصور قرون متوسط کے مؤلفوں کی تحریروں میں سچ پوچھیے تو نہیں ملتا۔ ان لوگوں نے ایک گرم جوشی کے ساتھ قانون روما کا نئے سرے سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے کلیسائی قانون کا علم ایجاد کیا۔ انھوں نے قانون رواجی کی عمارت تعمیر کی، انھوں نے خاص کر ارسطو کے اثرات کے تحت قانون سیاسی کے مسائل کی چھان بین شروع کی۔ لیکن قانون بین الممالک، بحیثیت ایک کل کے، ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ بے شبہہ وہ قانون قدرت کے اندر گھلا ملا ضرور ایک حد تک پایا جاتا تھا، لیکن اس طور سے کہ وہ بھی اور قانون قدرت بھی، ہر دو قانون کلیسائی اور قانون روما کے اندر مخلوط ہو گئے تھے۔

رفتہ رفتہ قانون قدرت نے اپنے کو الگ کیا۔ چنانچہ لوگ اس کا مطالعہ ڈرتے ڈرتے یوستی نیان (جسٹی نین) کی تالیفوں کے کسی نہ کسی باب کے موقع پر کرنے لگے تھے یا اس وقت جب کہ پوپوں کے کسی نہ کسی احکام و تحریرات

میں مندرجہ قواعد کی بحث ہو۔ رفتہ رفتہ قانون جنگ بھی انھیں ابواب اور انھیں قواعد کے سلسلے میں موضوع بحث بننے لگا۔ آہستہ آہستہ قانون سفارت کی بھی تشریح اور ترقی ہونے لگی۔ قانون جنگ یا قانون سفارت کے مطالعے کے سلسلے میں جو بعض مسائل پیدا ہوئے تھے انھوں نے وسعت بھی اختیار کی۔ اس بارے میں عیسائیت کے خیالات کی تائید کی جاتی ہے، مثال کے طور پر غیر مذہب والوں کے حقوق کا سوال۔ بے شبہہ ان تمام مباحث کے سلسلے میں ابھی تک بحیثیت مجموعی ایک فن کی حیثیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ایک واقعہ متحقق ہے کہ علم قانون کی دونوں نئی شاخوں یعنی قانون قدرت اور قانون بین الممالک ہر دو کے آغاز اور پیدائش کے لیے ہمیں انھیں کے ہاں تلاش کی ضرورت ہوگی۔

8

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قانون قدرت کا اثر بہت دنوں تک قانون بین الممالک پر چھایا رہا۔ ایک سے زیادہ خود مختار مملکتوں کا وقت واحد میں پایا جانا حقیقت میں صرف اسی متبادل امر کو پیش کرتا ہے کہ لوگ یہ تصور کریں کہ یہ مملکتیں کسی بھی قانون کی پابند نہیں ہیں، اور یہ کہ ان کے متعلق یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون قدرت کا موضوع ہیں۔ بہر حال اس چیز کو ہم اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ قدرتی مساوات اور ایک قدرتی حالت کے پائے جانے کے نظریے تاریخ انسانی میں صحت بخش کام انجام دے چکے ہیں کیونکہ تمام قدیم برائیوں کو انھیں کے نام سے برا ٹھیرایا جا سکا، ان پر حملہ کیا جا سکا، اور ان کو تباہ کیا جا سکا۔

بہت دنوں تک قانون بین الممالک کی صحیح صحیح تعریف نہیں کی جا سکی۔ اُلپینَن نے قانون کی جو مشہور تعریف کی تھی اسے عام طور سے قبول کیا جاتا ہے کہ: قانون یا تو قانون قدرت ہوگا یا قانون اقوام یا قانون مُلک۔ قانون قدرت، جاندار مخلوقات کا قانون ہے۔ قانون اقوام کی اصطلاح مبہم اور غیر معین ہے۔ قرون متوسطہ کے مولف اس قانون اقوام کے تبدیل ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ اس کو نہایت

احتیاط کے ساتھ قانون قدرت سے ممتاز کرتے ہیں، بلکہ وہ ان کی باہمی مماثل چیزوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ قانون بین الممالک کو قانون کی کس قسم میں داخل کیا جائے جب کہ اس سے اس کا جدید تصور مراد لیا جائے یعنی "قوموں یا مملکتوں کے مابین چلنے والا قانون" ــــ یہ اصطلاح اصل میں فرانسواد سے فی توریا نے استعمال کی تھی اور ریشارزوشہ نے اس کو چرا لیا تھا۔ پادری سیس بیئیر نے "قانون مابین اقوام" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ روما کے چند مولفوں کے ہاں قانون اقوام کی اصطلاح سے وہ چیزیں مراد ہوتی تھیں جو قانون کا موضوع ہوں۔ اور قانون جنگ، قواعد جنگ، قانون جنگ وصلح، قواعد جنگ و قانون حکومت، قواعد جنگ و قوانین فتح کی اصطلاحوں سے وہ چیزیں مراد ہوتی تھیں جو قانون کی غرض وغایت ہوں۔ افلاطون اور ارسطو یونانی سرزمین تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے برخلاف سسیرو نے تسلیم کیا تھا کہ کسی جائز جنگ میں قانون فیتیالی اور دیگر بہت سے قوانین رومیوں اور ان کے دشمنوں دونوں کے لیے مشترک تھے۔ لیکن یہ تصور قرون متوسطہ کے مولفین کی اکثریت کے ہاں مدغم ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ ایک عجیب چیز ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ قانون بین الممالک بنا ہی نہ تھا اس کی ایک ایسی تعریف ــ شاید تعریف کی جگہ تشریح کہنا زیادہ صحیح ہوگا ــ وجود میں آگئی تھی جو جدید تصور سے بہت قریب ہے۔ چنانچہ اشبیلیہ کے پادری اِسی دُور نے (جو ساتویں صدی عیسوی کے آغاز کا مولف تھا) ایک کتاب لاطینی میں ایتی مولوگیا (فقہ اللغہ) لکھی تھی جو اس زمانے کے جملہ علوم کا خلاصہ اور ایک واقعی دائرۃ المعارف ہے۔ اسی میں اس نے قانون کو قانون قدرت، قانون ملک اور قانون اقوام میں تقسیم کیا ہے، اور اس کی رائے میں قانون قدرت جملہ اقوام کا مشترکہ قانون ہے اور اس کی ہر جگہ تعمیل ہوتی ہے مگر اس لیے نہیں کہ وہ کوئی

"قانون ہو بلکہ قدرتی افتاد ہی کی وجہ سے[1]۔ وہ اس کے تحت نکاح، نسل، اور بچوں کی تعلیم و تربیت کو داخل کرتا ہے۔ "قانون اقوام" اس کی رائے میں کم و بیش اس چیز سے مشابہ ہے جسے ہم "قانون بین الممالک" کہتے ہیں[2]۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس تقسیم کے علاوہ ایک "قانون فوج" بھی تسلیم کرتا ہے جس کی تعریف کسی قانون جنگ کی کتاب کے ابواب کے عنوانات سے مشابہ ہے[3]۔ جو چیز وہاں قابل ملاحظہ ہے وہ یہ ہے کہ اشبیلیہ کے اسی دور نے جو آخری چیزیں بیان کی ہیں وہ حقیقت میں اُلپین ہی سے ماخوذ ہیں جس نے اپنی کتاب "احکام" کے حصہ اول میں "قانون فوج" کا "قانون اقوام" ہی کے ساتھ ذکر کیا تھا اور جس نے "قانون اقوام" کی اصطلاح کبھی تو ایک وسیع معنوں میں اور کبھی محدود معنوں میں استعمال کی تھی[4]۔

[1]۔ (لاطینی میں): وہ جملہ اقوام کا مشترکہ قانون ہے۔ اس کی تعمیل قدرتی افتاد کے باعث ہوتی ہے، کسی کے قانون بنانے کے باعث نہیں"، "فقہ اللغہ" کتاب ۵، باب ۴ تا ۷۔

[2]۔ (لاطینی میں): "قانون اقوام کا تعلق کسی جگہ پر قبضہ کرنے، عمارت بنانے، سازو سامان جنگ، جنگ، قیدیوں، غلاموں، دشمن کی گرفت سے بازیابی، حلیفی صلح، متارکہ یا عارضی صلح، سفیروں پر دست درازی نہ کرنے کی پابندی اور ناجنسوں سے نکاح کی ممانعت سے ہے"۔

[3]۔ (لاطینی میں): "قانون فوجی کا تعلق جنگ کرنے کے رواجات و مراسم، حلیفی قائم کرنے کے معاہدے، مقابلے کے لیے جانے یا جنگ پر مامور ہونے والوں کو نشان امتیاز عطا کرنے سے ہے۔ نیز اس نشان دہی کو قبول کرنے، جگہ چھوڑ دینے پر سپاہیوں کو تعزیر کرنے، تنخواہ مقرر کرنے، رتبوں کے مدارج، اعلیٰ ترین اعزاز مثلاً تاج یا بالا عطا کرنے، مال غنیمت کا فیصلہ کرنے اور اشخاص کی نوعیت اور جانفشانی کے لحاظ سے تقسیم کرنے، اور حکمران کے حصے سے ہے"۔

[4]۔ ڈرکسن کی جرمن کتاب "رومی تاریخ قانون اور علوم قدیمہ کے ماخذوں کی تنقید و تشریح کے لیے دستیاب شدہ تحریریں" جلد (۱) صفحہ ۱۹۵۔ ری تھیے کی فرانسیسی کتاب "گروتیوس سے پہلے کے

اِنِیئین کی تعریف کا اشبیلیہ کے اسی دور کی تالیف میں آجانا خود ایک
قابل ذکر امر ہے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک چیز قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ
یہ تعریفیں قرون متوسطہ میں، وہ انتہائی تقدس حاصل کر چکی تھیں جو ان
کے لیے اس زمانے میں ممکن تھا۔ یعنی یہ تعریفیں فقہ اللغہ سے لے کر گراتیان
کی لاطینی کتاب "پوپوں کے احکام کا مجموعہ" میں نقل ہو گئی تھیں۔

گراتیان کی یہ کتاب جیسی کچھ تھی لوگ اس سے واقف ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی
کے نصف اول میں قانون کلیسائی کے تحریری عناصر میں جو لاتعداد متضاد
امور نظر آتے تھے، ان کے متعلق گراتیان نے (جو خیال کیا جاتا ہے کہ بولونیا
میں سینٹ فیلکس کے راہب گھر میں پروفیسر تھا)، اس بات کی کوشش کی کہ
ایک ایسا مجموعہ تیار کرے جس سے تمام تضاد اور اختلاف دور ہو جائیں۔
یہ محض خانگی کوشش تھی۔ مولف کو کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہ تھی۔ مگر
جلدی ہی کتاب کو ایک عظیم الشان اہمیت حاصل ہو گئی۔ گراتیان نے
اپنی کتاب کو لاطینی میں "مجموعہ قوانین متضادہ" سے موسوم کیا تھا مگر
بعد میں لوگ اس کو "احکام" کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس کا نہایت گہرا
مطالعہ کیا جانے لگا۔ یہ کتاب نصاب میں شامل کی گئی۔ اس کے حاشیہ نگار
اور شرح نویس پیدا ہو گئے۔ لوگ عرصے تک یقین کرتے رہے کہ پوپ
تیسرے اِیوجین نے اس کتاب کی توثیق کر دی تھی۔ یہ واقعہ کہ مختلف
پوپ اس قصے کا ذکر کرتے رہے اور اس کو سچا سمجھتے رہے، اس بات کا
کافی ثبوت ہے کہ اس کتاب کو کتنا تقدس نہ حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس
زمانے میں اس کتاب کا نام "سردار اور آقا گراتیان کے احکام زرین"
رائج تھا۔

10

جب یہ تعریفیں گراتیان کی کتاب "احکام" میں داخل ہو گئیں، تو
پھر وہ قرون متوسطہ کے نصف دوم میں جاری و ساری رہیں اور ان کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ادبیات قانون بین الممالک پر یادداشت"۔

متعدد تشریحیں ہوتی رہیں۔ اور خود عہد جدید کے آغاز کے وقت مختلف مولفوں نے جو معقولیت پسند اصطلاح استعمال کی وہ انداز سے میں ان سے کچھ بھی بڑھی ہوئی نہ تھی۔

خیالات کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے چند واقعات خاصے دلچسپ ہیں۔ "سات ارکان" نامی اسپینی کتاب ۱۲۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک اہم قانون سازانہ یادگار ہے۔ قابل قانون والوں شنایاں ژاک روینتر قرمان مارتی نیز اور ژولدان نے قسطیلیہ کے بادشاہ دسویں الفونسو کو اس بات میں مدد دی تھی کہ وہ اپنے کام کو مکمل کرے۔ ان کے پیش نظر وہ تعریفیں بھی تھیں جو قانون روما کی ڈائجسٹ میں بیان ہوئی ہیں اور وہ تعریفیں بھی جو اشبیلیہ کے اسی ڈور نے اپنی لاطینی فقہ اللغہ میں دی ہیں۔ مگر انھوں نے اول الذکر ہی کو نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک قانون قدرت جملہ جاندار مخلوقات کے قانون کا نام ہے اور قانون اقوام جملہ انسانوں کے قانون عمومی کا نام۔ اس کے برخلاف اسی زمانے میں ایک ڈرمی نیکن پادری نے قانون بین الممالک کی تشریح اشبیلیہ کے اسی ڈور سے اخذ کی۔ اس کا نام تیں ساں ڈبوتے ہے۔ اس نے "بڑا آئینہ" نامی ایک وسیع دائرۃ المعارف لاطینی میں تالیف کی۔ اس نے تین اقسام بیان کیے: قدرتی ملاحظات، عقائدی ملاحظات، اور تاریخی ملاحظات۔ براکٹن کے ہنری نے "انگلستان کے قوانین اور رواجات" نامی لاطینی کتاب ۱۲۵۶ء تا ۱۲۵۹ء کے مابین تالیف کی۔ یہ آزون کی کتاب "خلاصہ" اور ریومتی بنیان کے "احکام" پر اپنی رائے مبنی کر کے قانون بین الممالک کی یوں تعریف کرتا ہے کہ: وہ قانون جسے قومیں (مملکتیں) برتتی ہیں اور جو قانون قدرت سے ماخوذ ہے۔

اس موضوع کے پورے مواد کے متعلق جو دھندلے سے تصورات تھے وہ بظاہر بعد کی دو اور صدیوں تک کافی ہی خیال کیے جاتے رہے۔ اور نئے مولفوں کو ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ البتہ

اس زمانے میں چند خاص ابواب کے متعلق خصوصی دلچسپی لی گئی، مثلاً قانون جنگ اور اس کے مختلف ادارے، اور قانون سفارت۔
سولھویں صدی عیسوی میں پراٹسٹنٹ مولف، جن میں اولڈن ڈورپ سب کا سرکردہ تھا، قانون قدرت کی جانچ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکے کہ قانون بین الممالک کیا ہے[1]۔ یہ ایک اسپینی تھا جس کی قسمت میں اس قانون کی تعریف لکھی تھی۔

فرانسوا دے ویتوریا کہتا ہے کہ "قانون بین الممالک وہ قانون ہے جسے فطرتی عقل نے تمام قوموں کے مابین قائم کیا ہے" — (یہی الفاظ مکرر اصل لاطینی میں) — اس کے نظام میں یہ قانون ایک واقعی قانون ہے جو معاشرہ پسندی کی قابلیت پر مبنی ہے۔ کیونکہ ایک قدرتی معاشرہ پایا جاتا ہے جس میں باہمی تعلقات ہوتے ہیں، باہمی میل جول ہوتا ہے اور قوموں کے مابین ایک ربط پایا جاتا ہے۔ ہر قوم کو کسی دوسری قوم سے تعلقات قائم کرنے کا اتنا حق ہوتا ہے کہ اگر اس حق کے استعمال سے روک دیا جائے تو جنگ درست ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرانسوا دے ویتوریا نے صاف اور واضح طور سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ مملکتیں ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہیں، ان کے حقوق اور ان کے فرائض باہم مساوی طور سے پائے جاتے ہیں۔ یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اصل میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا قانون بین الممالک میں کوئی قانونی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا وہ محض کوئی بین الممالک اخلاق یا مدارات کا نام ہے۔ اس سوال کا جواب دینا، جیسا کہ جامعۂ سالامانکا کے اس پروفیسر نے دیا، اصل میں اس بحث کا پیشگی ہی فیصلہ کر دینا تھا، جس نے بعد میں صدیوں تک ماہرین کو مشغول رکھا[2]۔

۱ـ فون کالٹن بورن کی جرمن کتاب "ہوگو گروتیوس کے پیشرو قانون قدرت و قانون اقوام کے نیز دونوں اصلاح کی سیاسیات کے متعلق" صفحہ ۲۳۳۔

۲ـ زوش نے قانون مابین اقوام کی اصطلاح استعمال کی ہے اور سب لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ

جنتی لیس میں اگرچہ دیگر قابل لحاظ خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن خاص اس بارے میں اس کے ہاں وضاحت اور تعیین نہیں پایا جاتا۔ اس کی رائے میں قانون بین الممالک قوموں کے ایک سمجھوتے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھوتہ خاص کر طویل رواج کے ذریعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

فرانسو اسوارینیس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے قوموں پر قانونی پابندی عائد کرنے والے قواعد کے وجود سے متعلق نہایت معین خیالات ظاہر کئے تھے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "نوع انسانی اگرچہ مختلف قوموں اور بادشاہتوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس میں بہت کچھ ایک اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور یہ اتحاد نہ صرف معینہ اور مخصوص امور میں ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ سیاسی اور اخلاقی اتحاد ہے۔ اس اتحاد کا پتا باہمی محبت اور ہمدردی کے قدرتی احساس کے ذریعے سے چلتا ہے۔ اور یہ احساس اپنے آپ کو سب تک وسیع کر لیتا ہے حتیٰ کہ اجنبیوں تک بھی، خواہ وہ کسی قوم کے کیوں نہ ہوں۔ ہر مملکت خواہ وہ جمہوریت ہو یا بادشاہت، اپنی حد تک مکمل ہوتی ہے۔ اور وہ اس بڑے جسد کا بہر حال ایک عضو ہوتی ہے جس پر نوع انسانی مشتمل ہے کبھی کوئی مملکت اپنے آپ اتنی پختہ نہیں ہو سکتی کہ اسے کسی باہمی امداد، کسی میل جول، کسی مفاد یا ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپس کے ربط ضبط کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اس لیے مملکتوں کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک ایسا قانون پایا جائے جو اس طرح کے

12

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اصطلاح اسی کی ایجاد ہے مگر حقیقت میں اس نے یہ اصطلاح فرانسوا دے تی توریا سے مستعار لی ہے اور اگرچہ وہ ٹیتوریا کی لاطینی کتاب "دینیاتی مباحث" کو نقل کرتا ہے مگر اس غرض سے نہیں کہ اس اصطلاح کی ایجاد کے لیے اس کا شکریہ ادا کرے، بلکہ شہنشاہ کے اس ادعا کی تردید کے لیے کہ وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کا سردار ہے۔

باہمی مواصلات اور معاشرت میں ان کی رہنمائی اور ان کی ہدایت کرے۔ بے شبہ اس نقطۂ نظر سے فطرتی عقل بہت کچھ کام آسکتی ہے، لیکن یہ فطرتی عقل کافی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اسی لیے خصوصی قوانین، رسم ورواج کے ذریعے سے وجود میں آئے ہیں[1]" (دیکھئے سواریتیس کی لاطینی کتاب "کتاب قوانین و خدائے مقنن"، حصہ دوم باب ۱۹ فصل ۹)۔

---

[1] یہی عبارت اصل لاطینی میں۔

13

باب دوم

پاپائی اور شہنشاہت

مغربی رومی شہنشاہت پر مہلک وار ہو چکا تھا، حتی کہ وحشی آگے بڑھنے لگے اور اپنی سلطنتیں قائم کرنے لگے تھے اور جو کچھ حصہ رومی سلطنت کا بچ رہا وہ اٹلی کی حد تک محدود تھا۔ اور اس ملک نے بھی جلدی ہی اپنے کو دشمن کے رحم و کرم پر پایا۔

سنہ ۴۷۶ء میں اوڈواکر کے حکم سے مغربی رومی شہنشاہت کے آخری حکمران رومولوس اوگسٹولس نے سینیٹ میں اپنے استعفے کا اعلان کیا اور مجلس کا ایک وفد مشرقی رومی شہنشاہ زینون کے دربار میں حاضر ہوا، تا کہ اس سے یہ معروضہ کرے کہ اس کے خیال میں اٹلی میں اب مزید علیحدہ شہنشاہوں کا ہونا غیر ضروری ہے کیوں کہ ایک ہی حکمران کی عظمت و جلالت اس بات کے لیے کافی ہے کہ مشرق و مغرب دونوں کی مدافعت کر سکے۔

تین صدیاں گزر گئیں۔ پھر شارلمان نے کوشش کی کہ مغربی

یورپ میں اتحاد قائم کرے۔ جب اس بڑے فرنگی بادشاہ کے جانشینوں کے ہاتھوں یہ کوشش ناکام ہوگئی تو اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

یہ ٹکڑے ٹکڑے ہونا قرون متوسطہ کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ یونانی تصور مملکت، جیسے رومیوں نے اپنی قوت سے ترقی دی تھی، جرمنوں کو نہ بھایا۔ یہ بے انتہا انفرادیت پسند تھے۔ اس لیے انھیں قدیم نظام حکومت ناگزیر طور سے ناپسند تھا۔ قدیم نظام چونکہ انھیں ذرا بھی نہ بھاتا تھا، اس لیے مرکزی اقتدار کی دھجیاں بکھر جانے سے پھر دوبارہ اتحاد کا قائم ہونا بظاہر ناممکن نظر آنے لگا۔ ہزار ہا الگ الگ سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ہر طرف جاگیرداری نظام پھیل گیا۔ میشلے کے الفاظ میں "تقسیم کی ذیلی تقسیم ہونے لگی۔ ذرے کو جزء لایتجزیٰ ہونے کی خواہش ہونے لگی ہر کوئی علاحدہ ہونا چاہنے لگا۔ کوئی عقاب کے ساتھ جا بیٹھا، تو کوئی نالے کے پیچھے جا گھسا۔ اور جلدی ہی لوگوں نے بھلا دیا کہ ان کے اپنے تعلقے، ان کی اپنی وادی کے پرے بھی کوئی دنیا بستی ہے۔ اس نئے تصور نے جڑیں پکڑیں اور وہ زمین پر جم گیا"[1]

پھر بھی اتحاد کی طرف جو رجحان تھا، اس نے اپنے کو ایک دہری شکل میں ظاہر کیا۔ مختلف قوموں میں مرکزی اقتدار قائم ہونے لگا۔ اور ایک وسیع تر سرزمین میں، جسے ہم "بین الممالک تعلقات کی دنیا" کا نام دینا پسند کرتے ہیں، اس بات کے نظریے ترقی کرنے لگے کہ نہایت مقتدر پاپائیت اور نہایت مقتدر شہنشاہت کو وجود میں لایا جائے۔

عالمگیر حکمرانی کا خیال اگر پورا ہو جائے، چاہے شہنشاہ کے ذریعے سے ہو، چاہے پوپ کے ذریعے سے تو قانون بین الممالک کا وجود میں آنا محال ہو جائے۔ یہ خیال چونکہ خالص نظریاتی دنیا تک محدود رہا اس لیے اس نے اکثر ایک صحت بخش اثر ڈالا۔ اور ایک سے زیادہ نیا اصول نیز

14

[1] میشلے کی فرانسیسی "تاریخ فرانس" حصہ دوم، باب سوم۔

بہیمانہ قوت پر انصاف کو ایک سے زیادہ ترجیح۱؎ اس بنا پر ممکن ہو سکے کہ روحانی اور دنیاوی عالم میں اتحاد کا ایک مفروضہ قائم کیا گیا تھا۔

ایک "بیرونی کلیسا" کا تصور حقیقت میں کوئی عیسائی تصور نہ تھا بلکہ وہ انجیلی اسپرٹ سے ایک روگردانی اور یہودیت کی طرف عود کرنے پر مشتمل تھا۔ حضرت موسیٰ نے مذہبی خدمات انجام دینے والوں کا ایک نظام قائم کر دیا تھا جو بھینٹوں، چڑھاوؤں اور قربانیوں کا اہتمام کرتا اور خدا اور بندے کے مابین واسطے کا کام دیتا۔ حضرت موسیٰ نے مخلوق کا خالق سے براہ راست ربط دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ بے شبہ اس نظام کے مطابق جملہ عیسائی یکساں صفات سے متصف نہیں سمجھے گئے تھے لیکن جو شخص دینی تعلیم دینے پر مامور ہوتا وہ تعلیم پانے والوں سے بہتر نہیں ہوا کرتا تھا۔ [او خود گم است کرا رہبری کند]۔

"بیرونی اتحاد" کے مقابلے میں "روحانی اتحاد" زیادہ حقیقی اور زیادہ بلند ہوتا ہے۔ مگر اس نے فروغ حاصل نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عمومیت پسندانہ نظام قائم ہوا اور جماعتوں کی حکمرانی وہی افسر کرتے جو انھیں میں سے ہوتے اور اعلیٰ صلاحیت کے باعث آزادانہ طور پر چنے جاتے۔ بعد میں عمومیت پسندانہ نظام کی جگہ اسقفوں اور پادریوں کے اعیانی نظام نے لے لی۔ اسقف یہ دعویٰ کرنے لگے کہ انھیں اقتدار براہ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر اس بڑے دائرے میں مساوات قائم بھی رہی تو یہ ایک واقعہ ہے کہ روحانی اقتدار کے تصور نے جگہ پکڑ لی تھی۔ اپنی نوبت پر اسقفانہ اعیانیت بھی غائب ہوگئی۔ اور اس زمانے میں دنیا جس سماجی اضمحلال کا شکار تھی، اس میں یہ کمزور نظام پنپنے کے قابل نہ تھا۔ اسی لیے پاپائیت کے لیے اس نے جگہ خالی کر دی۔ اور یورپ ہی میں کلیسا کا اقتدار مرتکز ہو گیا، اور بادشاہت کے

15

۱؎ نیانڈر کی جرمن "تاریخ مذہب عیسائیت" (صفحہ ۳۹۶) و مابعد۔

روایتی تصورات اور رسم ورواج کے باضابطہ نظام پر چھا گیا۔

روما کے اسقفوں نے جلدی ہی دیگر عیسائی جماعتوں کے اسقفوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ ابتدائی کلیسا ہی میں لوگوں نے دیکھا کہ پوپ وکٹور نے ایشیائے کوچک کے عیسائیوں کو اپنی جماعت سے خارج قرار دیدیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں پوپ اسٹیفن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے افریقیہ اور ایشیا کے کلیساؤں پر بپتسمے کے جائز ہونے کے متعلق روما کی روایتیں جبراً عائد کر دی ہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے اختتام کے قریب جو تحریک پیدا ہوئی تھی، وہ بھی ان دعووں کی تائید وتقویت کا باعث بنی۔

پادریوں کی صوبہ وار مجالس شوریٰ کے نظام نے اس بارے میں ایک عہد آفریں انقلاب پیدا کیا۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس صوبے کے صدر شہر میں ہوتا اور اس شہر کا اسقف یعنی میٹراپولیٹن یا مطران (یا پایہ تخت کا پادری) اس کی صدارت کرتا۔ اسی وجہ سے اس کو ایک خصوصی امتیاز حاصل ہو گیا۔ یہ تحریک ترقی ہی حاصل کرتی گئی۔ اس کی تنظیمیں پھیلتی گئیں اور بڑے بڑے علاقوں پر حاوی ہوتی گئیں۔ اس کے باعث ان چند شہروں کو جہاں اسقف ہوتے تھے، ایک امتیاز حاصل ہونے لگا۔ شہر روما کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ اٹلی کا کلیسائی صدر مقام ہے۔ جلدی ہی اس کے ساتھ اسکندریہ اور انطاکیہ نے بھی اس اعزاز میں شرکت حاصل کر لی کہ وہ عیسائیت کے سب سے اہم مرکزوں میں سے ایک ہیں۔ مختلف حالات نے روما کے اقتدار کو بڑھانے میں حصہ لیا۔ اس روایت نے عام طور پر وثوق کا درجہ حاصل کر لیا کہ سینٹ پیٹر وہاں آیا تھا۔ اور اس طرح پورے مغرب میں روما ہی وہ واحد مقام تھا جہاں کی اسقفی ایک حواری نے قائم کی تھی۔ اور اولیت کا جو اعزاز سینٹ پیٹر کو حاصل ہوا تھا، وہ اس کے مزعومہ جانشینوں کو بھی حاصل ہونے لگا۔ سارڈیکا میں جو مجلس شوریٰ ہوئی تھی اس نے اس اولیت کو

تقدس دے دیا اور معتوب اسقفوں کو اجازت دی کہ وہ روما میں مرافعہ پیش کریں۔ اور شہنشاہ تیسرے ثالن تینین نے ایک فرمان کے ذریعے سے پوپ لیو اعظم کی سرداری کو تسلیم کرلیا تھا۔

یہ چیز نظر انداز نہیں کیجانی چاہیے کہ سیاسی ضروریات کا لحاظ کرکے جب قسطنطین نے عیسائیت کو رومی شہنشاہت کا سرکاری مذہب قرار دیا تو وہ مذہبی معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اس کو مقتدر اعلٰی کے فرائض انجام دینے کے سلسلے میں اس کا بھی حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کیجانی چاہیے کہ عیسائی شہنشاہوں نے پادری اعظم کا لقب اختیار کرلیا اور یہ کہ گراتیان وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کو قبول کرنے سے ۳۸۳ء میں انکار کیا تھا۔

16 رومی شہنشاہت کے زوال کے بعد اوستروگوتھ حکمرانوں نے عام طور پر مغربی نظام کلیسا کو ایک ایسی آزادی دے رکھی تھی جس سے مشرق کے کلیسا محروم تھے۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہ کلیسائی قوانین بھی اسی طرح وضع کرتے تھے جس طرح قوانین ملک۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کلیسائی قوانین بطریرکوں کے پاس بھیجتے تو قوانین ملک صوبوں کے حاکموں کے پاس بھیجتے۔ تھیوڈورک نے پادریوں کے ایک اجلاس شوریٰ کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ روحانی معاملات میں غیر مذہبی لوگوں کے گھس آنے کو ناجائز اور نادرست قرار دے۔ بے شبہہ ہمیشہ یکساں رواداری نہیں برتی جاتی رہی۔ پوپ جان اول قید خانے میں مرا۔ اور اس کے جانشین تیسرے فیلکس کو بادشاہ نے یہ اختیار دیا تھا کہ سینیٹ یا پادریوں یا رومی رعایا میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کرے۔ لیکن نہ تو ان واقعات نے اور نہ ہی یونانی شہنشاہوں کے اٹلی کو فتح کرلینے نے اس بات میں روڑے اٹکائے کہ پاپائیت کا نظام روز افزوں ترقی ہی کرتا جائے۔

پوپ کے دعووں سے بےشمار احتجاج شروع ہوئے۔ مشرق نے ان دعووں کو کبھی تسلیم نہیں کیا اسکندریہ اور انطاکیہ کے بطریرکوں نے ان کے

سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ قسطنطنیہ کے بطریرک نے کال سی ڈون کی مجلس شوریٰ کے فیصلے پر تکیہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اس کو روما یعنی پوپ کے برابر ہی حقوق حاصل ہیں۔ پھر بھی روما کامیابی ہی حاصل کرتا چلا گیا، کیونکہ اس کو اتحاد پیدا کرنے میں جتنی کامیابی ہوئی، مشرق اس سے محروم رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مشرقی کلیسا یونانیوں کے زیر اثر تھا۔ اور یونانی نسل، طبعاً افتراق پسند تھی۔

ملک کے کشوری اقتدار کی موجودگی کے باعث بازنطینی نے اپنے لیے ایک ماتحتانہ حیثیت کو جاری رکھا۔ یوسٹی نیان نے اپنے ہاتھوں میں روحانی اور دنیاوی ہر دو اقتدار جمع کر لیے تھے۔ اس نے روما کو اعزاز و اکرام سے لاد دیا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ذاتی برتری کو برقرار رکھنے میں ذرا بھی کمی نہیں کی۔ اس نے اپنے پروردوں میں سے دو کو پوپ نامزد کروایا اور پوپ گریگری اعظم نے شہنشاہ موریس کے نام جو مؤدبانہ خط لکھا ہے، اس سے بہتر کوئی اور چیز اس بات کو واضح نہیں کر سکے گی کہ پوپ اور شہنشاہ کی باہم حیثیت کیا تھی۔

اٹلی میں شہنشاہی اقتدار کے کمزور پڑ جانے اور لومبارڈ علاقے والے جرمنوں کے حملوں کے باوجود روما کا تعلق قسطنطنیہ کے شہنشاہوں سے باقی رہا۔ چنانچہ پوپ یا تو ان شہنشاہان قسطنطنیہ سے یا ان کے نائب یعنی صوبہ راؤینے کے نائب السلطنت سے اپنے انتخاب کی توثیق حاصل کرتے رہے اور ٹیکسوں کی ادائی کے پابند رہے۔

کارلو فنجیوں کا دور آیا تو انھوں نے بھی بیزنطینی روایات کی پیروی پر اکتفا کی۔ انھوں نے جب پوپوں کو لومبارڈیوں اور یونانیوں سے نجات دلائی، تو انھوں نے پوپوں کو تقریباً وہی حیثیت دی جو اپنی وسیع شہنشاہت کے اسقفوں کو دی تھی۔

جب شارلمان کی پوپ تیسرے لیو کے ہاتھوں تاج پوشی ہوئی تو

نظریے کی حد تک اقتدار شہنشاہی منتقل ہو گیا۔ مشرقی رومی شہنشاہیت کی قیصرہ ایرینے نے جب اپنے بیٹے قسطنطین کو معزول کیا تو روما کا انتخاب بھی وہی اثر رکھتا تھا جو قسطنطنیہ کا۔ پوپ نے اعلیٰ ترین افسر مذہبی کی حیثیت میں کارروائی نہ کی بلکہ روما کے باشندوں کے ترجمان کی حیثیت سے۔ اور اس نے فرنگی بادشاہ کے سر پر جب سونے کا تاج رکھا تو وہ روما کے باشندوں کی پرجوش تائید کی وجہ سے تھا۔ شارلمان کی شہنشاہیت نے بعد میں مقدس رومی جرمانی شہنشاہیت کا نام اختیار کیا کیونکہ اٹلی اور جرمنی کا اقتدار اعلیٰ ایک ہی جرمن حکمران کو حاصل ہو گیا تھا۔ یہ مقدس رومی شہنشاہیت حقیقت میں جرمنی کے بادشاہ اوتون اعظم کی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔

اٹلی میں نراج اپنے اوج عروج پر تھا۔ وہاں بھی جاگیرداری نظام پھیل گیا تھا اور مختلف ڈیوک، مارکوئیس، بیرایٹ رے، شوسے فرئیول، اسپولیت اور ٹسکنی کے بڑے بڑے علاقوں کے کاونٹ (جاگیردار سرداری کے لیے آپس میں جھگڑتے تھے۔ کلیسائے سینیٹ پیٹر یعنی مسکن پاپائیت میں یکے بعد دیگرے نااہل پوپ آتے گئے۔ پوپ کی اپیل کے جواب میں شہنشاہ اوتون بڑی بڑی فوجیں لے کر سلسلۂ کوہ آلپ میں گھس آیا اور اٹلی اور صوبۂ پاؤیا کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا جب اس نے اس بات کا حلف اٹھا لیا کہ وہ مقام مقدس یعنی پوپ کے مسکن کی حفاظت کرے گا اور شہر کے حقوق کا احترام کرے گا تو پھر وہ روما کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کی ۲ فروری ۹۶۲ء کو پوپ بارھویں جان کے ہاتھوں تاجپوشی عمل میں آئی۔ شہر روما کے باشندوں کی رضامندی، اس رسم کے لیے ایک اہم عنصر تصور کی گئی۔ اور پوپ نے اپنے آپ کو اوتون کی رعیت تسلیم کر لیا۔ اور عامۂ رعایا نے یہ حلف اٹھایا کہ وہ آئندہ اس کی رضامندی کے بغیر کسی کو پوپ منتخب نہیں کریں گے[1]۔

---

[1] جمیس برائیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہیت اور موجودہ جرمن شہنشاہیت"

اس کے بعد کی صدی میں مقدس رومی شہنشاہت تیسرے ہنری کے دور میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ جرمنی میں اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ خود اٹلی میں اس کے اقتدار کا یہ حال تھا کہ اس نے مقام مقدس یعنے پاپائیت کے تین امیدواروں کو معزول کردیا اور مجلس شورائے مذہبی سے اس نے یہ اقتدار حاصل کرلیا کہ پوپ کا انتخاب وہ خود کرسکے[۱]۔

پاپائیت اور شہنشاہت کے باہم مل کر ایک برتر اقتدار ہونے کا جو تصور تھا، وہ اپنے مطمع نظر کو تو کبھی پورے طور سے حاصل نہ کرسکا۔ لیکن پھر بھی شارلمان اور اوتون اعظم اور تیسرے ہنری کے زمانوں میں اس مطمع نظر سے، زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کی جاسکی۔

قرون متوسطہ میں حکومت الٰہیہ کا تصور جاری وساری رہا۔ سینٹ آگسٹائن کے الفاظ میں شہر "خود خدا کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر" قائم تھا۔ اکویناس کے سینٹ ٹامس، ایجیدیو کولونا، دانتے اور نکولاس دکوسا اسی اصول اتحاد کی تائید میں جان لڑاتے رہے جس کی سینٹ آگسٹائن نے تلقین کی تھی۔ چنانچہ ان کی رائے میں عالم انسانی ایک واحد کل ہے جو خدا نے قائم کیا ہے۔ اس پر ایک ہی حکمران کی حکمرانی ہونی چاہیئے اور صوفیانہ نقطۂ نظر سے پورا عالم انسانی ایک ہی جسم پر مشتمل ہے، ایک ہی قوم ہے، ایک ہی بادشاہت ہے۔

اتحاد بہرحال مطمع نظر رہا۔ اور خود پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں آندلاو کا پیٹر یہ کہہ کر اس کی تائید کرتا رہا کہ ارسطو جیسے سربرآوردہ فلسفی نے بھی (جس کے متعلق ابن رشد نے یہ کہا تھا کہ وہ قانون نگار فطرت تھا) یہ کہا تھا کہ ایک سے زیادہ سرداروں کا ہونا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کا فرانسیسی ترجمہ از دومرگ باب ہشتم۔

[۱] دیکھئے حوالہ بالا برائس کی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" باب ہشتم

ایک بُرائی ہے۔ اور حکمران ایک ہی ہونا چاہیے۔

بہر حال اعتدال پسندوں کے نزدیک خدا نے، اپنے آسمان کا بادشاہ ہونے کی حیثیت میں، پوپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اور خدا نے، خود کے زمین کا بادشاہ ہونے کی حیثیت میں شہنشاہ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ غرض ہر دو حضرت مسیح کے جانشین تھے: ایک روحانی سردار تھا، تو دوسرا دنیاوی سردار۔ دوسرے الفاظ میں کلیسا اور مقدس رومی شہنشاہت دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز تھے۔ اور یہ دونوں اسی ایک چیز کے دو رخ کہے جا سکتے ہیں۔[1]

بہت دنوں تک خود شہنشاہت کے اقتدار کے متعلق غالیانہ نظریے رکھنے والے بھی، روحانی اقتدار کا احترام ملحوظ رکھتے رہے۔ جب پوپ چوتھے آدریان نے اپنی بڑائی کے دعوے شروع کیے تو شہنشاہ فریڈرک بار بروسہ نے اپنے خط میں انجیل لوقا کی اس عبارت کا حوالہ دیا جس میں حضرت مسیح کا قول نقل ہوا ہے کہ: "اور شاگردوں نے کہا: استاد! یہاں دو تلواریں ہیں۔ اور یسوع مسیح نے ان سے کہا: یہ کافی ہے۔" دو تلواروں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کا ذکر فرانسیسی کتاب "سکسنی کا آئینہ" میں یوں ہوا ہے: "خدا نے دو تلواریں عیسائیت کی حفاظت کے لیے رکھی ہیں: روحانی تلوار پوپ کے سپرد کی گئی ہے، اور مادّی تلوار شہنشاہ کے۔"

پاپائیت کے نظریے کو پوپ ساتویں گریگری نے ترقی دی۔ جب وہ ہلڈے برانڈ نامی ایک معمولی راہب تھا تو اس نے یہ چیز اس زمانے کے مقامِ مقدس یعنی پوپ کو سمجھائی تھی اور یکے بعد دیگرے اس نے چار پوپوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ کلیسا کے احیاء کی کوشش کریں اور روحانی اقتدار پوپ کے ہاتھوں آجانے کا اطمینان حاصل کریں۔

---

[1] دیکھیے ایضاً صفحہ ۱۴۴۔

اور جب وہ خود پوپ بنا تو اس نے اس کوشش کو جاری رکھا اور اس کو ایک عظیم الشان تحریک کی صورت دے دی کہ پوپ کو کشوری اقتدار پر برتری حاصل ہو۔ اس کے باعث مغربی کلیسا میں راہبیت کی روح غالب آگئی۔ مشرقی کلیسا میں یہی روح گناسٹک اور مانوی (مبنی ثنویت) عقیدے کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور وہاں والوں نے جسم انسانی کو ایک قیدخانہ تصور کیا اور شہری معاشرے کو ایک رکاوٹ خیال کیا اور بالآخر اس سے تقشف پیدا ہوا۔ اس کے برخلاف مغرب میں رومی ذہنیت کے اثرات کے تحت اس نے ایک عملی مقصد تک رسائی حاصل کی جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ پوری دنیا کو روحانی اقتدار فتح کرے[1] 19

عیسائیت کو دو برائیاں گھن کی طرح کھا رہی تھیں: ایک تو متبرک چیزوں کی فروخت اور دوسرے پادریوں کے اخلاق کا بگڑ جانا۔ ساتواں گریگری اپنی زندگی بھر ان برائیوں کا مقابلہ کرتا رہا[2] اس کے پیشرو اسقفیت کے خلاف لڑتے رہے، تو یہ پوری پادریت کے خلاف لڑتا رہا۔ اس کے کام کا یہ حصہ کامیابی سے سرفراز رہا۔ کلیسا کے اتحاد کے متعلق اطمینان حاصل ہوگیا اور خود پوپ کے روحانی اقتدار کو تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن یہ کامیابی کافی نہ تھی۔ سینٹ آگسٹائن نے جس خدائی شہر کا تصور پیش کیا تھا ساتویں گریگری نے اس کو وجود میں لانا چاہا مگر اس طور سے نہیں کہ عیسائیت قائم ہو جس کا خواب ہپّون کے اسقف یعنی سینٹ آگسٹائن نے دیکھا تھا، بلکہ ایک "فردی حکومت" کی صورت میں۔ اور اس طرح نہیں کہ حضرت مسیح غیر مرئی

---

[1] ملمن کی انگریزی "تاریخ عیسائیت لاطینی" جلد ۴ صفحہ ۱۳۱۔

[2] لوران کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ششم باب پاپائیت و شہنشاہیت صفحہ ۱۹۲ و مابعد۔

سردار رہیں بلکہ اس طور سے کہ پوپ روحانی بادشاہت کا قیصر ہو۔ یہیں سے نئے جھگڑے پیدا ہوئے اور یہیں سے قرون متوسط کی پاپائیت کے خود سرانہ نظریے وجود میں آئے جن کا منشار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک نہایت مطلق العنان "حکومت الہٰیہ" قائم کی جائے۔

ساتویں گریگری نے مقدس رومی شہنشاہت کے خلاف جو ہولناک جنگیں برپا کرائیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ اس نے صرف جرمنی ہی میں کلیسا اور کلیسا کے سردار کا اقتدار اعلیٰ نہیں منوایا بلکہ اس نے فرانس میں اپنے نمائندوں کو حکم لکھ بھیجا کہ یہ ضروری ہے کہ "ہر فرانسیسی پر واجب کیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ سچی اطاعت کے طور پر ہر گھر سالانہ کم سے کم ایک دینار ادا کیا کرے"۔ اس نے اسپین کے حکمرانوں سے کہا تھا کہ "طویل زمانے سے تمہاری سلطنت سینٹ پیٹر کی جائداد ہے"۔ اس نے ولیم فاتح کو لکھ بھیجا تھا کہ "ماتحت ہونے کا حلف لو"۔ کورسیکا سارڈینیا اور ہنگری کے باشندوں کو بھی اس نے مماثل الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بہادری کا کارنامہ اس نے جرمنی کے شہنشاہ چوتھے ہنری سے جھگڑے میں دکھایا۔ اس جھگڑے میں قلعۂ کانوسا کا منظر سب سے زیادہ یادگار واقعہ ہے۔ اور یہ لڑائی حقیقت میں ایک عالمگیر شہنشاہت کے لیے لڑی گئی تھی۔ اصل میں وہ مقدس اشیار کی فروخت کے سلسلے میں چھڑی تھی۔ چوتھا ہنری تخت نشین ہو رہا تھا اور اس نے روما کے مطالبات کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ پوپ کو یقین تھا کہ اسے مقدس رومی شہنشاہت کے اندر جو بہت سے ماتحت حکمران شریک تھے، وہ پوری مدد دیں گے۔ اس لیے اس نے بے جھجک اس مسئلے کو اعلیٰ ترین مجلس مذہب یعنی کونسل میں پیش کر دیا۔ جرمنی نے احتجاج کیا اور اس کے اسقفوں نے گریگری کے علی الرغم جواب دیا اور ورمس کی کونسل میں خود اسی کو پاپائی سے معزول کر دیا۔ اس پر پوپ نے شہنشاہ کو جات باہر کر دیا اور اس کی رعیت

کو اس کی اطاعت کے حلف سے بری قرار دیا۔ پوپ کے فرمان میں لکھا تھا: "میں ہنری کے لیے ممنوع قرار دیتا ہوں کہ وہ ٹیوٹانی اور اطالوی سلطنت پر حکومت کرے۔ اور میں ان تمام عیسائیوں کو حلف سے بری قرار دیتا ہوں جنھوں نے اس کے لیے حلف اٹھایا ہو یا آئندہ اٹھانے والے ہوں۔ اور میں سب کے لیے اس کی ممانعت کرتا ہوں کہ اس کی خدمت بطور بادشاہ کے کریں"

یہ کشمکش بڑی سخت تھی۔ اور اس میں فتح و شکست بار بار پلڑے بدلتی رہی۔ پہلی دفعہ شہنشاہ کو شکست ہوئی تو اس نے قلعہ کانوسا آکر ساتویں گریگری سے رحم کی التجا کی۔ مگر جلدی ہی اس نے پھر ہتھیار اٹھائے اور برابر مقابلہ کرتا رہا۔ نہ تو (۶۵) لڑائیوں نے اور نہ بدنامی و فضیحت نے اور نہ ہی رفیقوں کی غداری نے اس کی ہمت کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔ صرف ایک بیٹے کی بیوفائی اس کی ہمت شکنی کا باعث ہوئی۔ لیکن ساتویں گریگری کے فتوحات ہوئیں انتشار فن کی ہیروی نسل سے ٹکرا کے رہ گئے۔ اور جب جلاد کے تبر نے اس پر عظمت خاندان کے آخری نمائندے کے سر کو مقتل میں لڑھکانے میں کامیابی حاصل کی، تو یہ لڑائی اتنا طول کھینچ چکی تھی کہ پوپوں کی عالمگیر حکمرانی کا قائم ہونا ہمیشہ کے لیے ناممکن ہوچکا تھا۔[1]

ایک مورخ نے ساتویں گریگری کو "معلم ناممکنات" کا خطاب دیا ہے۔ اس مشہور پوپ نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ اس کی تجویزوں کو جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکتا۔ بے شبہہ اس نے ایک شہنشاہ کو اس بات پر مجبور کیا تھا کہ تین دن تک اپنی خطاؤں کی معافی کے لیے گڑگڑاتا رہے، مگر اس کے بعد خود گریگری کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور ابدی شہر یعنے روما سے دور اس نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد

[1] لوراں کی کتاب مذکور، حوالۂ مذکور۔

اس طور سے کیا کہ اس کی رعیت اس سے بگڑ چکی تھی اور اس کے ساتھی اس کو چھوڑ چکے تھے۔ شہنشاہ جو تھے ہنری کو موقع ملا کہ کانوسا کا انتقام لے، چنانچہ اس نے مکرر ساتویں گریگری کو پاپائی سے معزول کرایا۔ اور بے قاعدہ پوپ تیسرے کلیماں کو روما پہنچایا اور اپنے کو اٹلی کے بادشاہ کی حیثیت سے مذہبی حلقوں سے بھی تسلیم کرا لیا۔ ساتویں گریگری کو پاپائیت مجسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے پادریوں کو ان ہولناک لاطینی الفاظ میں لڑائی پر آمادہ کیا تھا کہ "ملعون ہے وہ شخص جو اپنی تلوار کو خون آلود نہ کرے"۔ یہ چیز اس کے جانشینوں کے لیے ماٹو بن گئی۔ یہ غیر مفید نہ ہوگا کہ اس کے نظریوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا جائے۔

اس کے خیالات کی بنیاد سے سب واقف ہیں کہ کیتھولک راہبوں کے تصور کے مطابق آدمی میں دو ممتاز اور متضاد عناصر پائے جاتے ہیں یعنی روح اور جسم۔ اب معاشرے کے نظام روح کی نمائندگی کون کرے؟ کلیسا۔ اور جسم کی نمائندگی کون کرے؟ غیر مذہبی عوام کا سماج۔ اس غیر مذہبی سماج یعنی مملکت کی زندگی کوئی حقیقی زندگی نہیں ہے۔ اور انسانیت اس وقت تک نجات حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ کلیسا کی رہنمائی کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دے۔

جس طور سے ساتویں گریگری نے اپنے نظریے کی توضیح کی وہ ایک سے زیادہ دلچسپیوں کی حامل ہے۔ اس کے فرمانوں، اس کے خطوط اور اس کے احکام سے ہمیں نظر آ سکتا ہے کہ ان دونوں اقتدار وں میں وہ کس طور سے امتیاز کرتا تھا[1]۔ اس کے "احکام" میں ہمیں یہ لکھا نظر آتا ہے کہ "پوپ کا نام دنیا میں اچھوتا ہے۔ وہ شہنشاہوں کو معزول کر سکتا ہے، اور ان کی رعیت کو حلف اطاعت سے بری قرار دے سکتا ہے"۔ ساتویں گریگری کے "خطوط" بھی ایسے ہی نتیجے ہیں۔

[1] گیزلر کی جرمن "تاریخ کلیسا" جلد (۲) حصۂ اول فصل (۲۳) اور حصۂ دوم فصل (۴۷)۔

چنانچہ "سینٹ پیٹر کا سکن چونکہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مذہبی چیزوں کو جس طرح چاہے باندھے یا کھول دے۔ اس لیے بدرجۂ اولیٰ اس کو مادّی چیزوں کے متعلق بھی ایسا ہی اقتدار حاصل ہے۔" یہ وہ راست اقتدار تھا جس کے متعلق پوپ کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کا استعمال کر سکتا ہے۔ اور یہ وہ مطلق العنان اقتدار تھا جو اس کے اپنے اعلانوں کے مطابق اس کو حاصل تھا۔

ساتویں گریگری کے "خیالات" ان دونوں اقتدارات کی انفرادی حیثیتوں کے متعلق بھی اتنے ہی واضح اور قطعی ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک خط سے ہم کو مکمل طور سے اس کا علم ہوجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "بادشاہوں کی اصل انسانوں سے ہے اور انسانوں کو شیطان نے ورغلا کر اس کوشش پر آمادہ کیا ہے کہ اپنے ہمجنسوں پر غلبہ حاصل کریں۔ اس کوشش پر انھیں ایک اندھی ہوس اور ایک ناقابل برداشت حرص آمادہ کرتی ہے۔ جن ذرائع سے وہ اپنے مقصد کو حاصل کرتے ہیں وہ چوری، بیوفائی، قتل انسان، اور تمام دیگر ممکنہ جرائم ہیں۔ اور یہی وہ ناپاک انسان ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مسیح ربانی کو اپنے قدموں میں جھکا دیا! اس دعوے سے فرشتوں کے مطرود سردار یعنی شیطان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس نے "خدا کے بیٹے" کو ان الفاظ میں زمین کی بادشاہتوں کا لالچ دیا تھا کہ: اگر تو میری پوجا کرے تو میں تجھے یہ تمام چیزیں دیدوں گا۔ یہ وہ امتیاز ہے جسے خدا سے ناواقف انسانوں نے گھڑ لیا ہے۔ کیا اس امتیاز کو اُس امتیاز کے آگے سر تسلیم نہیں خم کردینا چاہیے جسے قدرت نے اپنے اعزاز کے لیے قائم کیا ہے اور جو اسی قدرت نے اپنی مرحمت سے دنیا کو عطا کیا ہے؟" گویا دنیاوی و مادی اقتدار کی اصل شیطان سے ہے، اور روحانی اقتدار خدا سے حاصل ہوتا ہے۔ دنیاوی طاقت جہنم سے حاصل ہوتی ہے، اور کلیسائی طاقت کی اصل آسمانی ہے۔ صرف یہی نہیں، خود کلیسا کے اندر ساتویں گریگری نے

ایک مہلک تقسیم قائم کی یعنی جملہ راسخ العقیدہ لوگ پادریوں سے بالکل الگ قرار دیئے گئے اور جملہ رعایا کو راعیوں کے خلاف ہر قسم کی کاروائی اختیار کرسکنے سے محروم کردیا گیا۔[۱]

22 واقعات نے ساتویں گریگری کے اِن اِدّعاوں کی کملی تردید کردی جو اسے دنیاوی اقتدار کو اپنے ماتحت بنانے کے متعلق تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ چوتھے ہنری کے جھگڑوں میں اسے ناکامی ہوئی۔ ولیم فاتح نے اس کے مطالبات کو حقارت کے ساتھ رد کردیا تھا۔ دیگر مواقع پر بھی اس کی کوششوں کو ناکامی نصیب ہوئی۔ لیکن یہ بہر حال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے دعوے خواہ کتنے ہی غیر معتدل اور مغرورانہ کیوں نہ سمجھے جائیں عوام کی ذہنیت میں ضرور سرایت کرگئے۔ جیسا کہ بلونتچلی نے واضح کیا ہے کہ ساتویں گریگری کے زمانے سے پوپ کو اعلیٰ تر مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے اور عیسائی تصورات کے مطابق اس کا رتبہ شہنشاہ سے بھی بلند ہے۔ جرمنی کی مخالفت سے ایک عالمگیر کلیسائی فردی حکومت قائم نہ ہوسکی۔ لیکن شہنشاہوں کو بھی پوپوں پر اختیار باقی نہ رہ سکا۔ خیال یہ قائم ہوگیا کہ عالم عیسائی میں پوپ کا اقتدار اعلیٰ مقدم سمجھا جائے۔ اور یہ کہ دیگر مقتدرانِ اعلیٰ اس کی اطاعت کریں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں چند بڑے قانون ساز پوپوں مثلاً تیسرے اِنوسنٹ، نویں گریگری اور چوتھے اِنوسنٹ نے جو مغرورانہ سیاست جاری کی تھی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سینٹ پیٹر کو جو عالمگیر اقتدار حاصل تھا اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ کلیسا اس عالمگیر اقتدار کا وارث سمجھا جائے؛ یہ کہ شہنشاہ باقی امور کے متعلق پوپ ہی کا نائب سمجھا جائے؛ یہ کہ مقدس رومی شہنشاہت، جو دنیاوی اقتدار کا سب سے بلند مظاہرہ تھی، وہ بھی مقام مقدس یعنے پوپ کی ماتحت ہے؛ اور یہ کہ پوپ

---

[۱] گریگورو ویئوس کی جرمن "تاریخ شہر روما قرون متوسط میں" جلد ۴ صفحہ ۲۵۔

(جو شہنشاہت کے تاجدار سے بھی برتر ہے) وہ حکمرانوں کا حکمران" ہے۔[1]

قانون مذہبی کے مولف اگر مقام مقدس یا پاپائی کے دعووں کی تائید کرتے رہے تو قانون ملک کے مؤلف شہنشاہت پسندانہ نظریوں کی۔ اول الذکر نے یہ ثابت کیا کہ پوپ کے اقتدار میں ہونا، بہ نسبت شہنشاہ کے اقتدار میں ہونے کے، "زیادہ قرین عقل ہے۔ اور مذہبی قانون کی شرح نے یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ شہنشاہ کو پوپ کسی بھی گناہ کے باعث معزول کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لاطینی جملہ یہ ہے "شہنشاہ کو کس گناہ کے باعث معزول کیا جا سکتا ہے؟ کسی بھی۔ اگر وہ ناقابل اصلاح یا غیر مفید بن جائے تو اسے معزول کر سکتے ہیں"۔

پوپوں کا انداز بیان قابل ذکر ہے۔ انھوں نے جو پر غرور دعوے کیے تھے، ان کے چند مظاہرات کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے:۔

28

سواب کے فلپ، برونزوک کے اوتون اور دوسرے فریڈرک نے جب تاج شہنشاہی کے لیے رقیب بن کر جھگڑنا شروع کیا تو پوپ تیسرے انوسنٹ نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ کلیہ قاعدہ قرار دیا کہ اصولاً اور قطعاً شہنشاہت تو مقام مقدس ہی کو حاصل ہوتی ہے اور یہ صرف پوپ ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی کو تاج و تخت شہنشاہی اپنی برکت کے ذریعے سے عطا کرے۔ کسی کو شہنشاہ نامزد کرنے کے حق کا ناگزیر نتیجہ اس نے یہ اخذ کیا کہ وہ اس کو معزول اور تبدیل بھی کر سکتا ہے۔

اپنے احکام میں سے ایک میں وہ بیان کرتا ہے کہ انجیل لوقا میں جن دو تلواروں کا ذکر ہے وہ روحانی اور دنیاوی اقتدار کی تمثیل کے طور پر بیان ہوئی ہیں، اور یہ دونوں تلواریں پوپ ہی کو حاصل ہیں۔ ایک کا استعمال پوپ شخصی طور سے کرتا ہے، دوسرے کا استعمال اگرچہ

---

[1] ہوشیار برے آول کی لاطینی کتاب "فریڈرک دوم کے سیاسی کائم جلد (۱) دیباچہ صفحہ ۲۲۸۔

مختلف حکمران کرتے ہیں لیکن کلیسا کے لیے اور پوپ کی ہدایت کے تحت

نواں گریگری اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ سچ پوچھو تو پوری دنیا کا مقتدر آقا پوپ ہی ہے: دنیا کی چیزوں کا بھی، دنیا کے اشخاص کا بھی۔

قسطنطین کے عطیے سے سب واقف ہیں۔ یہ دستاویز آٹھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں جعلی طور سے تیار کی گئی تھی۔ وہ اس بات پر مبنی قرار دی جاتی ہے کہ قسطنطین کا جذام دور ہو گیا تھا اور پوپ سِلوِسٹر نے اسے بپتسمہ دیا تھا۔ شکریے کے جذبات سے مملو ہو کر شہنشاہ نے پوپ کو شہر روما، ملک اٹلی، مغربی صوبے یعنی لمبارڈی، علاقۂ وینس اور علاقۂ استریا عطیے میں دیدے۔ نویں گریگری نے اس مشہور دستاویز پر جن الفاظ میں شرح لکھی وہ یہ ہیں: اس نے فریڈرک دوم کو لکھا کہ "یہ ایک مشہور اور معروف واقعہ ہے کہ یہ قسطنطین عالمگیر بادشاہت کا مالک تھا۔ اس نے نہ صرف شہر روما کے باشندوں، بلکہ پوری رومی شہنشاہت کے باشندوں کی رضامندی سے یہ ارادہ کیا ہے کہ حواریوں کے شہزادے کا نائب (یعنی پوپ) جو عالم یادریت کی اور پوری دنیا والوں کی روحوں کا سردار تھا، وہ اب پوری دنیا کی چیزوں اور لوگوں کا بھی حکمران ہو جائے۔ قسطنطین کا خیال ہے کہ خدا نے جس کو آسمانی چیزوں کا زمین پر نگران مقرر کیا ہے، وہی دنیاوی چیزوں کا بھی انتظام کرے۔ اسی لیے اس نے پاپائے روما کو ہمیشہ کے لیے عصا و علامات شہنشاہی دیدیے ہیں، نیز شہر روما اور اس کی اپنی ڈچی (ریاست) اور خود پوری شہنشاہت بھی۔ اس کا تصور یہ ہے کہ یہ نہایت بری بات ہوگی کہ جس جگہ کے لیے آسمانی شہنشاہ نے عیسائی مذہب کے سردار کو مامور کیا ہو، اس جگہ کوئی اور دنیاوی شہنشاہ کسی طریقے کا بھی اقتدار استعمال کر سکے۔ اسی لیے اس نے اٹلی کو پوپ کے سپرد کر کے اپنے لیے یونان میں ایک نیا مسکن منتخب کر لیا ہے۔ اور کلیسا نے اس کا جوا شارلیمان کے

کندھوں پر رکھ کر مرکز شہنشاہت کو اب جرمنی میں منتقل کر دیا ہے۔
اگر کلیسا نے تیرے پیشروؤں اور تجھ کو تخت شہنشاہی پر بیٹھنے کے لیے
بلایا اور تجھ کو (یعنی فریڈرک دوم کو) تیری تاجپوشی کے دن تلوار
کی طاقت بھی عطا کرنی منظور کی، تو اس کے معنے یہ نہ تھے کہ کلیسا
نے اپنے اقتدار میں کسی طرح کی بھی کمی کرنی منظور کی تھی"۔[1]
چوتھے انوسنٹ نے شہنشاہ دوسرے فریڈرک کو معزول
کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کی رعایا اپنے حلف وفاداری
سے بری ہے اور وہ تمام لوگ جو پھر بھی شہنشاہ سے وفاداری ظاہر
کریں وہ جات باہر سمجھے جائیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے اس نے خود
حضرت مسیح کے ان الفاظ کی بنا پر اپنا حق جتایا تھا کہ" جس کسی کو
زمین میں سرداری دی جائے اسی کو آسمان میں بھی سرداری
دی جائے گی"۔

24

شہنشاہت پسندانہ نظریے کو زیادہ تر قانون ملک کے مولفوں
نے ترقی دی۔ یہ لوگ قانون روما کے بے انتہا دلدادہ تھے۔ اور اس
قانون کی شرح لکھنے والوں نے بارھویں صدی عیسوی ہی سے اس کے
نظریات مطلق العنانی کو انھوں نے پوری طرح نظام جاگیرداری میں
منتقل کر دیا۔
۱۱۵۸ء میں رونکالیہ کے میدان میں مجلس شہنشاہی کا اجلاس
ہوا اور اس میں فریڈرک بار بروسہ نے بلگار، مارٹن گوسیا، اور
پورتار اتیناسے کے ژاک اور ہوگو نامی بولونیا کے چار ماہرین قانون
سے (جن کے ساتھ لومبارڈی شہروں کے نمایندے بھی شریک
تھے) وہ مشہور فیصلہ کروا لیا جس کے ذریعے سے اس کو اس اہم
معاملے میں مکمل اقتدار حاصل ہو گیا کہ ماتحت حکمرانوں اور جمہوریتوں کے

---

[1] ایضاً صفحہ ۲۳۰

تعلقات کا شہنشاہیت کے ساتھ تعین خود ہی کر سکے۔ اس اجلاس کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شہنشاہ نے مارتن اور بلگار کے ساتھ سیر کرتے وقت یہ دریافت کیا کہ آیا ان کی رائے میں وہ دنیا کا آقا ہے ؟ مارتن نے اثبات میں جواب دیا۔ بلگار نے ایک شرط لگائی اور کہا کہ وہ اس سے استفادہ تو کر سکتا ہے لیکن اس کا مالک نہیں ہے۔ فریڈرک نے اول الذکر کو ایک گھوڑا انعام میں دیا۔ اس پر بلگار نے لاطینی میں کہا "میں نے گھوڑا اس لیے کھو دیا کہ گھوڑے کے عوض حق بات کہی اور یہ ٹھیک نہ تھا"

چاہے یہ قصہ سچا ہو یا نہیں، اس سے بڑی عمدگی کے ساتھ ان خیالات کی ترجمانی ہو جاتی ہے جو اس مکتب کے لوگ شہنشاہوں کے متعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہوں کے مغرور ترین دعووں کی تائید کرنے والے بھی قانون ملک کے ماہروں میں مل جاتے تھے۔ بے شبہہ واقعے کی حد تک جرمن شہنشاہوں کے مطالبوں اور دعووں سے انسانیت کے لیے کبھی کوئی حقیقی خطرہ نہیں پیدا ہوا۔ یہ "حکمران عالم" کے خطاب سے ملقب ہوتے تھے، لیکن اکثر وہ جرمنی پر تک اطمینان کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ حکمران جن کو یہ اختیار حاصل سمجھا جاتا تھا کہ جس بادشاہ کو چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جس کو چاہیں معزول کریں، وہ بھی اکثر اپنے طاقتور ماتحتوں کے سامنے لرزا کرتے تھے۔ قانون روما کے شارحین نے شہنشاہیت کے متعلق جو بلند تصور قائم کیا، اس کو جس احترام سے ملبوس کیا اور اس کے لیے جو اختیارات انھوں نے تسلیم کیے، وہ دلچسپ چیز ہیں۔ اتحاد کی ضرورت بہت بڑی رہی ہوگی کیونکہ اس کو حاصل کرنے کی خواہش نے بڑے بڑے دماغوں کو بھی اس طرح کے مبالغوں پر آمادہ کر دیا۔ ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں شہنشاہیت کمزور ہوتی گئی، ویسے ویسے دنیا کے سیاسی نظام میں اس کو جو

رتبہ حاصل تھا وہ شاندار تر الفاظ میں پیش کیا جانے لگا۔

فریڈرک دوم کی سیاست میں اصلاح کی جو کوششیں نظر آتی ہیں وہ بڑی عجیب و غریب تھیں۔ اس نے چاہا کہ جرمنی اور اٹلی کو ایک ہی اقتدار کے تحت لا لیا جائے اور پوپ کو دوبارہ خالص روحانی مسائل تک محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو خطرناک کشمکش ہوئی اس کے دوران میں یہ نظر آیا کہ اس نے اپنی ابتدائی تجویزوں میں ترمیم کر دی ہے اور اس بات کا خواب دیکھنے لگا ہے کہ پاپائی اقتدار کا خاتمہ ہی کر دے اور اس کے اختیارات کو بھی شہنشاہ کے اختیارات میں شامل کر دے۔ شہنشاہ نے خود کے تقدس میں پوپ سے برتر ہونے کا اعلان کیا اور یہ ظاہر کیا کہ یسوع مسیح کے نائب ہونے کے فرائض وہ پوپ کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور سے انجام دے سکتا ہے[له]۔ پوپ کے حوالی موالی میں ان خیالات نے مبالغہ آمیز طور سے اپنا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ پوپ کا احترام اس طور سے کیا جانے لگا کہ گویا وہ زندہ خدا کا اوتار ہے اور اس کے وزیر اعظم پیٹر ڈ لافینیہ کے متعلق ــــ جو ایک ہمعصر خیال کر لیا جاتا ہے ــــ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ جدید کلیسا کا سنگ زاویہ ہے۔

فریڈرک دوم ناکام ہوا۔ اس کشمکش میں اس کے جانشین غائب ہو گئے مگر اس کشمکش نے ذہنوں پر ایک محو نہ ہونے والا نشان چھوڑ دیا۔ بہت دن تک اقتدار شہنشاہی کے حامی، خانوادۂ ہوہن اشٹاوفن کے حکمرانوں کو، جنھیں کلیسا نے جماعت باہر کر دیا تھا، مقدس اولیاء خیال کرتے رہے اور یہ تصور کیا جاتا رہا کہ دوسرا فریڈرک مر نہیں سکتا کیونکہ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ پادریوں کو نکال باہر کرے۔ ایک ہمعصر مولف نے بیان کیا ہے کہ

له۔ ایضاً صفحہ ۷۹ ما بعد

یہاں تک پیشین گوئی کی گئی کہ وہ اپنی راکھ سے ایک انتقام لینے والا، ایک تیسرا فریڈرک پیدا کرے گا جو پوپ اور اس کے نظام پادریت کا خاتمہ کردے گا۔ سوئیٹان (سوئٹزرلینڈ) کے ایک مورخ وِنٹر تھور کے جان نے بیان کیا ہے کہ باویریا کے لوئیس کی وفات پر مختلف قوموں کے لوگوں نے بلکہ تمام قوموں کے لوگوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ فریڈرک دوم پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ دوبارہ آنےوالا ہے تاکہ اس کلیسا کی اصلاح کردے جو ایک انتہائی پستی اور فساد میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جو لوگ اس خیال کے حامی تھے انھوں نے کہا کہ "وہ یہ ضروری ہے کہ وہ آئے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اس کے ایک ہزار ٹکڑے کیوں نہ کردیے گئے ہوں اور اس وقت بھی جب وہ کسی چتا کے شعلوں سے راکھ ہی کیوں نہ ہوگیا ہو۔ یہ فطرت کا فیصلہ ہے کہ یہ ایسا ہی ہو۔ اور یہ فیصلہ ناگزیر ہے"

26

اتحاد کے اصول نے دانتے کو بھی پھسلا لیا تھا چنانچہ اس کی رائے میں اتحاد ہی جملہ خوبی کا ماخذ ہو سکتا ہے۔ "وہ سب سے بڑی چیز سب سے بڑا اتحاد ہے۔ اور سب سے بڑا اتحاد سب سے بڑی بھلائی ہے"۔ یہ الفاظ اس کے نظریے کا نچوڑ ہیں۔ اس کی رائے میں فردی بادشاہت ہی وہ واحد طریقہ حکومت ہے جس سے اعلیٰ ترین بھلائی یعنے عالمگیر امن کے متعلق اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دانتے کے مقابلے میں کم قابل لوگ مثلاً اس کا ہمعصر چینو اور اس کے بعد کے زمانے کا بارتولے بھی اس کے اس یقین میں شریک رہے۔

اس بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے کہ دانتے نے اپنی کتاب "مونارکیا" یعنے "بادشاہت" کب تالیف کی؟ کیا وہ سنہ ۱۳۱۱ء کے لگ بھگ تالیف ہوئی یا دانتے نے اس کو خود ساتویں ہنری کے پڑاؤ میں لکھا جب کہ وہ اس اٹلی میں اپنا شہنشاہی اقتدار جمانے کے لیے آیا تھا جہاں اس کے آباد اجداد طویل عرصے تک کشمکش کرتے رہے تھے؟

یا یہ کہ اس نے اس کو ساتویں ہنری کی موت کے بعد مرتب کیا؟ معلوم نہیں۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ اس میں پاپائیت پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا ہے۔ ساتویں ہنری نے ذرا بھی پوپ پانچویں کلیمان سے جنگ نہ کی تھی۔ دانتے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شہنشاہ کو، جو قیصروں کا وارث ہے، عالمگیر بادشاہت کا بھی حق حاصل ہے۔ دانتے یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا فردی بادشاہت دنیا کی بھلائی کے لیے ضروری ہے، آیا رومی قوم درست طور سے بادشاہت کی مستحق ہے، آیا بادشاہ کا اقتدار براہ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے یا کسی منسٹر (؟ پادری) کے واسطے سے یا خدا کے کسی نائب کے توسط سے۔

برائیس نے لکھا ہے کہ "حکمرانوں اور شہروں بلکہ خود ہر شہر کے مختلف طبقوں میں باہم جو ختم نہ ہونے والے جھگڑے چلے آرہے تھے، ان سے تھک کر، اور یہ دیکھ کر کہ فتنہ و فساد کو کم کرنے کا جو واحد ذریعہ شہری آزادی کی صورت میں پایا جاتا تھا، وہ بھی گھریلو استبداد کاروں کی ترقی سے غائب ہوتا جارہا تھا، اس لیے دانتے نے ایک جذبات انگیز صدا بلند کی کہ کوئی ایسی قوت وجود میں آئے جو اس طوفان میں سکون پیدا کرسکے۔ لیکن اس لیے نہیں کہ آزادی کا خاتمہ کرے یا مقامی خود اختیارانہ حکومت کو پامال کرے بلکہ اس لیے کہ ان کی اصلاح اور ان میں اعتدال پیدا کرے اور بے بس اٹلی میں اتحاد اور امن کو بحال کرے۔ دانتے کا استدلال شروع سے آخر تک منطق کے بالکل مطابق ہے اور وہ نوبت بہ نوبت کبھی مقنن کی حیثیت میں گفتگو کرتا ہے، کبھی ماہر دینیات کی، اور کبھی ماورائے طبیعیات متکلم کی۔ اور اس کی (لافانی نظم) ڈیوائن کامیڈی کے لکھنے والے یعنی شاعر کی حیثیت صرف اس وقت غمازی کرتی نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اسلوب میں

کوٹ کوٹ کر زور بھرا ہوا ہے، وہ غیر مرئی چیز کو نہایت واضح طور سے دیکھ لیتا ہے اور کہیں کہیں ایک آدھ درخشاں و تابان استعارہ استعمال کر دیتا ہے"[1]

27 دانتے کی رائے میں شہنشاہت کے ذریعے سے عالمگیر امن حاصل ہو سکے گا۔ اور یہی سب سے بڑی اور سب سے اچھی بھلائی ہے۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "عالمگیر امن ہی وہ بہترین چیز ہے جو ہماری بھلائی کے لیے درکار ہے"۔ اس کی تجویز میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری بادشاہت میں ایک ہی قانون پایا جائے، بلکہ ہر قوم اپنا علٰحدہ قانون بنا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ بعض مشترک مفاد پائے جائیں گے، اس لیے امن کی خاطر ان مفادات کا انتظام کرنے کا حق شہنشاہ کو حاصل ہو۔

یہ شہنشاہت صرف "امن" ہی نہ ہوگی بلکہ "آزادی" بھی۔ بنی نوع انسان کو اس وقت تک بھلائی میسر نہیں آسکتی جب تک کہ اصول آزادی سے متمتع نہ ہو۔ اور یہ ایک بادشاہی کے تحت ممکن ہے کہ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ آزاد رہ سکے۔

دانتے نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہنشاہ پوپ سے بے نیاز ہے: "انسان کا دوگونہ مقصد ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اسے دوہری رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے: ایک طرف تو ابدی زندگی ہے اور اسی کے متعلق پوپ کو رہنما مقرر کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف دنیاوی بھلائی ہے، جس کا رہنما شہنشاہ مقرر ہے۔ خدا شہنشاہ کا انتخاب کرتا ہے، اور خدا ہی اس کو استقلال عطا کرتا ہے۔ انتخاب کنندہ

---

[1] جیمس برائیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" کا فرانسیسی ترجمہ جو اہیل دومرگ نے کیا تھا صفحہ ۳۴۵ [ہم نے اصل انگریزی کے صفحہ ۲۶۵ سے یہ ترجمہ کیا ہے تاکہ ترجمہ در ترجمہ ہونے سے فرق بہت زیادہ نہ ہو جائے۔ مترجم]

مشیت خداوندی کے اعلان کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ لیکن شہنشاہ جو دنیاوی معاملات کا مقتدر اعلیٰ ہے، چند معاملات میں پوپ کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیاوی بھلائی ایک فروتر حیثیت رکھتی ہے بہ نسبت آسمانی بھلائی کے۔ اسی لیے قیصر کو چاہیے کہ پیٹر کا وہ احترام کرے جو وہ اپنے باپ کا بھی نہیں کرتا، حقیقت میں اس ممتاز شاعر (دانتے) کے سیاسی تصورات میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جسے جسارت کہا جائے بلکہ جن پادریوں نے باویریا کے لوئیس کا ساتھ دینے اور تائید کرنے کے لیے بغاوت کی تھی، انھیں کو جسارت اور بدعت کا علمبردار کہنا چاہیے۔

پسٹوا کے مقنن اور شاعر چینوسینی بولدی نے بھی ساتویں ہنری کی حمایت کی تھی۔ لیکن وہ قرون متوسط کے عام تصور سے آگے نہ بڑھ سکا کہ ہر دو اقتدار یعنے دنیاوی اور روحانی دونوں خدا ہی کی نمایندگی کرتے ہیں۔

اطالوی مقنن اپنی تالیفوں میں ارسطو کی تعلیمات پر اکتفا نہیں کرتے ہیں۔ بے شبہہ وہ ارسطو سے اسی طرح سے استفادہ کرتے ہیں جس طرح اکویناس کے سینٹ ٹامس نے کیا تھا، لیکن وہ اس کے ماسوا قانون روما کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ البتہ وہ اس بات کی احتیاط کرتے تھے کہ وہ انتہا پسندی تک نہ پہنچ جائیں۔

رومی تصور کے مطابق شہنشاہ کو ایک مذہبی حیثیت بھی حاصل تھی: وہ اعلیٰ ترین مذہبی افسر بھی تھا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ خیال ابتدائی عیسائی شہنشاہوں کے زمانوں میں بھی رہا۔ ماہرین قانون اس خیال کی حمایت کی جرأت نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جینو کہتا ہے کہ پوپ اور شہنشاہ دونوں کے اقتدارات یکساں عظمت رکھتے ہیں۔ اور اس کی رائے میں ہر دو اقتداروں کا ماخذ ذات خداوندی ہی ہے۔ ان میں باہم فرق صرف یہ ہے کہ ہر دو کا دائرۂ عمل جدا جدا ہے۔

ان میں آپس میں جھگڑا زیادہ تر انسانی غلطیوں کی وجہ سے ہوا نہ کہ ان کے اقتدارات ہی میں کوئی طبیعی اختلاف پایا جاتا ہو۔ کلیسا کو شہنشاہت پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ اسی طرح شہنشاہ کو بھی نہ چاہیئے کہ پوپ پر حکومت چلائے۔ پوپ کے احکام، مملکت کے معاملات میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح سرکاری کشوری قوانین، جو کلیسا کی آزادی میں مخل ہوں، قابل تعمیل نہیں ہیں۔ جینو کی رائے میں پوپ کو دنیاوی اقتدار حاصل نہیں ہے اور پوپ کے ہاتھوں تاجپوشی سے شہنشاہی عظمت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ شہنشاہ صرف اس لیے شہنشاہ ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پوپ ہی کی طرح، اس کا بھی کوئی اعلیٰ تر افسر نہیں ہوتا: وہ شہنشاہت براہ راست خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔[1]

براٸیس کا خیال ہے کہ ساتویں ہنری کے ساتھ اٹلی میں تاریخ شہنشاہت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "دانتے کی کتاب ایک قبر کا کتبہ کہی جا سکتی ہے نہ کہ کوئی پیشین گوئی"۔[2] چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں جو اطالوی مقنن پیدا ہوئے ان کی تالیفوں پر یہ بیان بدرجۂ اولیٰ صادق آتا ہے۔

۱۳۵۴ء میں چوتھے شارل نے اپنی حماقت آمیز اطالوی مہم اختیار کی۔ ایک مورخ کہتا ہے: "ایسا نظر آتا تھا کہ وہ اٹلی کو ایک جنگی گھوڑے پر سوار ہنستے لوگوں کے بیچ میں سے عبور کر رہا تھا، گویا کہ کوئی تاجر ہو جسے میلے کو پہنچنے کی جلدی ہو"۔

بارتولے اس کی حمایت کرتا ہے۔ مگر یہ کتنے افسوسناک نظریے ہیں۔

---

[1] بچاپلی کی اطالوی کتاب "پستویا (پستوا) کے جینو کی سوانح عمری اور قانونی تالیفیں" صفحہ ۵۵ و مابعد۔

[2] براٸیس کی انگریزی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت" (فرانسیسی ترجمہ صفحہ ۳۴۵)

بارتولے خاموشی کے ساتھ قسطنطین کی عطا کو درست تسلیم کرتا ہے
کیونکہ اسے "مقام مقدس" کا ڈر ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لحاظ سے
تو حامیان شہنشاہت سے تھا، لیکن وہ حامیان پوپ پر بھی حملے کی
جسارت نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے طرز عمل کو یہ کہہ کر درست قرار
دیتا ہے کہ پرانے الفاظ نے اب اپنے معنے کھو دیے ہیں۔ فریق بندی
تبدیل ہو چکی ہے اور اب آداب برتاؤ کی ایک چیز رہ گئی ہے۔
وہ ہر اس شخص کو ملحد قرار دیتا ہے جو شہنشاہ کو دنیا کا آقا نہ تسلیم
کرے اور اس نے اعلان کیا کہ قیصروں کا جانشین قانونوں سے بالا ہے۔
(اصل لاطینی میں:) "قانونوں سے آزاد" ہے۔ ان الفاظ کے باوجود
یہ کہنے میں اسے کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ پاپائیت کو شہنشاہیت
پر برتری حاصل ہے اور یہ کہ شہنشاہت، پاپائیت کے دست نگر ہے۔ وہ
کہتا ہے کہ محض انتخاب کافی نہیں۔ انتخاب سے منتخب شدہ شخص
ایک آقا اور ایک عام سردار تو بنتا ہے، شہنشاہ نہیں۔ اس سے بڑھ کر
اس نے یہ بھی کہا ہے کہ شہنشاہ کی جگہ خالی ہو تو کلیسا منصری کے
فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ اصل میں ایک پاپائی دعویٰ تھا اور
بارتولے نے اپنی عظیم شہرت کی مدد سے اس کی تصدیق کی تھی جس
طرح کہ اس نے شہنشاہوں کے دعووں کی بھی تصدیق کی تھی۔ اس نے
چوتھے شارل کو کام کرتے دیکھا تھا۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ 29
شہنشاہ مذکور محض بے زور ہے اور کوئی معنے نہیں رکھتا۔ مگر اس کے
باوجود وہ شہنشاہت کے ہمہ گیر اقتدار پر ایمان لانے سے بھی ذرا
نہیں ہچکچاتا۔ اور اس کی رائے میں فرانس کا بادشاہ تک شہنشاہ کی
رعایا تھا۔ چنانچہ اس نے (لاطینی میں) کہا تھا: "میں یقین کرتا ہوں کہ
فرانس کا بادشاہ شہنشاہ کی رعیت ہے[1]"

---

[1] یکیاپلی کا اطالوی مضمون "بارتولے کے سیاسی تصورات" رسالہ آرکیفیو جوریدیکو ۱۸۸۱ء جلد (۲۷)

بارتولے اور بہت سے دوسرے اطالوی مقننوں نے شہنشاہت پسندانہ نظریے کی جو خاموش تائید کی اس کو ایک حد تک عملی اہمیت حاصل ہے۔ اس مشہور مقنن یعنے بارتولے نے کہا تھا: "جب تک شہنشاہت کو استقامت حاصل تھی، اس وقت تک تمام دنیا امن و امان سے بہرہ ور تھی جیسا کہ آگسٹس کے زمانے میں۔ اور جب شہنشاہت کو زوال آیا تو چوطرف ظلم و ستم کا راج ہوگیا۔" اس برائی کا ایک علاج ہونا چاہیے۔ اور اس نے درد بھری آواز میں (لاطینی میں) کہا تھا کہ: "آج کل اٹلی میں ہر طرف مظالم کا دور دورہ ہے۔" دیگر ممالک کے موںفوں نے اتحاد کے لیے کوشش کی ضرورت اگر ظاہر کی تو ان کے ذہن میں بھی اس کے مماثل ملحوظات ہی رہے ہوں گے۔ اتحاد بے شبہہ اکثر "مقامی خود مختاری" کے خلاف ہوتا تھا۔ اگرچہ ابتداءً یہ تحریک جاگیرداری نظام کے خلاف اٹھی جو نہ صرف بیحد کمینہ ہوگیا تھا، بلکہ اسی قدر تکلیف دہ اور ہولناک بھی بن گیا تھا۔ کیا قانون کا مقصد اعلیٰ یہ نہیں ہے کہ امن و نظام قائم کرکے آزادی سے بہرہ ور ہونے کا موقع پیدا کیا جائے؟ اور کیا اہل قانون کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ نظام قائم رکھنے کی خواہش کریں، خواہ کسی ذریعے سے ہو۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط سے قریب زمانے میں آرتھر ڈک نے اس سوال سے بحث کی تھی کہ اپنی جنگوں اور اپنے قوانین میں رومیوں نے کس حد تک انصاف کو ملحوظ رکھا تھا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جن قوموں پر رومیوں نے مظالم ڈھائے تھے، انھیں حق ہے کہ ہزار سال کے بعد اپنے سر سے جوا اتار پھینکیں۔ آرتھر ڈک نے یہ رائے قائم کی کہ وہ لوگ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ جرمنی کو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ کھوئے ہوئے صوبے واپس کیے جائیں۔ یہ محض مفروضہ نہیں ہے بلکہ اس کے مماثل دعوے حقیقت میں پیش کیے گئے۔ مگر واقعات نے ان کی تائید نہ کی۔ اوتون اعظم وہ

آخری شہنشاہ ہے جس کی سرداری کو فرانس نے تسلیم کیا تھا۔ انگلستان میں یوں کہنا چاہیے کہ شہنشاہت پسندانہ نظریہ محسوس ہوئے بغیر گزر گیا۔ اور اگر عملی طور سے بعض واقعات سے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ انگلستان کے متعلق بھی مقدس رومی شہنشاہت کے ماتحت ہونا معنوی طور سے مستنبط کیا جا سکے، تو حقیقت میں یہ ماتحتی عالم سیاست خارجہ کی ایک رسمی چیز تھی اور ایڈروڈ دوم کے مغرورانہ (لاطینی) اعلان کی کبھی تردید نہ کی جا سکی کہ: "انگلستان کی حکومت کو شہنشاہیت کی ہر ماتحتی سے آزاد کرا دیا گیا ہے۔"

30

قسطیلہ کے دسویں الفونسو کی اسپینی کتاب "سات ارکان" میں بھی اس کے مماثل دعوے کیئے گئے تھے۔ اس نے خود کوشش کی تھی کہ شہنشاہ کا رتبہ اُسے حاصل ہو جائے۔ اس کتاب کے رکن دوم کی فصل اول میں جو دیباچہ اور قاعدہ بیان ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ "شہنشاہ کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی شخص کی بھی دنیاوی معاملات میں اطاعت کرے بجز پوپ کے۔" قاعدۂ پنجم میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ بادشاہ اپنی مملکت میں دنیاوی معاملات کی حد تک بالکل اسی طرح خدا کے نائب ہوتے ہیں جس طرح شہنشاہ اپنی شہنشاہیت میں۔ اس کی شرح میں لکھا ہے کہ "بادشاہ اپنی بادشاہت میں حقیقت میں مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے۔" دسویں الفونسو کے نظام کے مطابق بادشاہوں کو بھی وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو شہنشاہوں کو بلکہ کچھ زیادہ ہی، کیونکہ یہ حق جانشینی کے باعث بادشاہ ہوتے ہیں، جب کہ شہنشاہ صرف اس لیے شہنشاہ ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ قلعے عطا کر سکتا ہے، شہنشاہ ایسا نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے اپنی شہنشاہت بڑھانی چاہیے گھٹانی نہیں: (لاطینی میں) "کیونکہ اسے چاہیے کہ اپنی سلطنت کو بڑھائے نہ کہ گھٹائے۔"

ایک بعد کے زمانے کے اسپینی ماہر قانون نے بیان کیا ہے کہ

اسپین کا بادشاہ اپنی مملکت میں مقتدر اعلیٰ ہے۔ اور ہر چیز اس کی ذات میں جمع ہوگئی ہے۔" (مکرر یہی الفاظ اصل لاطینی میں)۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں فرقہ سینٹ آگسٹائن کے ایک پیرو اونورے بونے نے ایک طویل بحث یہ معلوم کرنے کے لیے کی ہے کہ "کوئی کیونکر اس خیال کی تائید کرسکتا ہے کہ سلطنت فرانس شہنشاہ کی رعیت نہ سمجھی جائے؟"۔ وہ اپنی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے ان میں سے ایک کلیسا کا مفاد بھی ہے۔ بہت سے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جائز پوپوں کے خلاف (۲۲) بے ضابطہ پوپ بنے ہیں اور اکثر جائز پوپ کو فرانس میں پناہ لینی پڑی ہے۔ فرانس کے بادشاہ نے کبھی بھی کسی الحاد یا تفرقے کی تائید نہیں کی۔ اس کے بعد بونے کہتا ہے: "لیکن اگر میں بائبل کو سمجھ سکا ہوں تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بارہ سے زیادہ شہنشاہوں کے حالات میں یہ دیکھا ہے کہ وہ ملحد اور تفرقہ بند تھے۔" فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" کے مولف (یعنی بونے) نے اپنے آپ کو انگلستان اور اسپین کے صرف اس طرز عمل کی حد تک، جو شہنشاہت کے متعلق پایا جاتا تھا، محدود رکھا ہے۔ جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے اس نے لیوک کے ڈومینیکن پادری تولومیو کی شہادت پیش کی ہے۔ یہ پادری غالبًا اکوئیناس کے سینٹ ٹامس کی لاطینی کتاب "حکمرانوں کی رہبری" کے آخری حصے کا لکھنے والا بھی تھا اور اسی نے لاطینی زبان میں "جدید تاریخ کلیسا" اور کتاب "سنہ وار تاریخ" بھی تالیف کی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ انگلستان کلیسا کے ماتحت ہے۔ اور بونے کی رائے کے مطابق اس طرح انگلستان شہنشاہت سے علحدہ ہو جاتا ہے۔ رہا اسپین، سو بونے اس کے متعلق کسی فیصلے کے اظہار کی جراٴت نہیں کرتا۔[1]

[1] فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" مولفہ اونورے بونے باب (۸۳)

بہر حال اسی چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر پیئیر دِ دِ بوا نامی ایک ماہر قانون نے ایک مغرورانہ نظریے کی تائید کی تھی۔ اس شخص نے یکے بعد دیگرے، پہلے ایڈورڈ اور "خوبصورت فلپ" کی ملازمت اختیار کی اس کا نظریہ یہ تھا کہ شہنشاہیت ہمیشہ کے لیے اور ناقابلِ علیحدگی طور پر تاج فرانس کے ساتھ مرتبط ہو چکی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سب لوگ اس خواہش میں متفق ہیں کہ تمام دنیا شاہ فرانس کے ماتحت ہو جائے اور اس نظام العمل کو جامۂ عمل پہنانے، یعنی تمام دیگر حکومتوں کو ماتحت بنانے کے لیے اس نے پاپائیت سے مدد لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ تقریباً اسی زمانے میں اوکام نے لکھا تھا کہ فرانس شہنشاہیت سے الگ اور آزاد ہے۔ اس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ تقسیم پانچ سو سال پہلے عمل میں لائی جا چکی ہے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ اگر شہنشاہ اس کا حق رکھتا ہے کہ اپنی شہنشاہت کے لیے قوانین بنائے تو فرانس کا بادشاہ بھی اپنی بادشاہت کے لیے ایسا کر سکتا ہے وہ کہتا ہے کہ "حقیقت میں اس کے برخلاف ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اگر ایسا ہونا ضروری سمجھا جائے کہ نئی صورتوں کے پیدا ہونے پر نئے احکام دئے جائیں، جیسا کہ پیش آتا رہتا ہے، تو یہ احکام کون دے گا، اگر بادشاہ تک جو سب سے بڑا افسر ہے، ایسا نہ کر سکے؟"

بڑے ملکوں میں یہ خیال رائج رہا ہے کہ تاج شہنشاہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ خاصکر انگلستان کے قانون عمومی میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ انگریزی بادشاہت ایک شہنشاہت ہے اور تاج، شہنشاہ ہی کے لیے مخصوص ہے جیسا کہ پارلیمان کے مختلف قوانین اور خاصکر قانون نشان

(۲۴) ہنری ہشتم کیفیۃ نشان (۱۲) اور قانون نشان (۲۵) ہنری ہشتم کمیشن نشان (۲۸) میں اعلان کیا گیا ہے کہ بادشاہ سلطنت انگلستان کا افسر اعلیٰ ہے، نہ صرف معاملات ملکی میں بلکہ معاملات کلیسائی میں بھی۔ اس لیے کرۂ زمین پر وہ کسی کا ماتحت نہیں، نہ کسی اور انسان کا وہ

دست بگر، اور نہ ہی کسی کے سامنے جوابدہ۔

بلاکسٹن نے بیان کیا ہے کہ "جن توانین میں شہنشاہت اور شہنشاہی کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بادشاہ اپنے ممالک محروسہ میں اس سے کم خود مختار اور کم اقتدار اعلیٰ کا حامل نہیں ہے جتنا کوئی اور شہنشاہ اپنی شہنشاہت میں۔"

بعض ممالک میں بعض ذہین مولف یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بادشاہ کے خطاب میں کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو شہنشاہ کے خطاب سے برتر ہیں۔ چنانچہ ژاں ژوین نے "حکمرانوں کی جلالت" نامی فرانسیسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ اپنی بادشاہت میں جو حیثیت رکھتا ہے اس سے بڑھ کر اور اس سے بلند تر دنیا میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اور وہ لکھتا ہے کہ حضرت مسیح ہمارے خداوند نے کبھی اپنے کو شہنشاہ نہیں کہلوایا بلکہ بادشاہ۔

82 پوپوں کے مغرورانہ دعووں کی بھی ایسی ہی شدید مخالفت ہوتی رہی۔ دنیاوی طاقت اور مذہبی طاقت میں جو کشمکش ہوتی رہی اس کی تاریخ لکھنے کے یہ معنے ہیں کہ قرون متوسط کی آخری صدیوں کے متعلق جملہ سلطنتوں کی تاریخ لکھدی جائے۔[1] بہرحال کچھ معلومات ضروری ہوں گے۔

انگلستان کی حد تک ہم دیکھ چکے ہیں کہ ولیم فاتح نے پوپ کے دعووں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پوپ دوسرے الگزانڈر نے اس کو اپنے اثر سے مدد دی تھی اور اسے انگلستان میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی تا کہ اس علاقے کو دوبارہ مقام مقدس یعنے پوپ کا مطیع بنایا جائے۔ لیکن جب پوپ ساتویں گریگری نے، جس نے

---

[1] فریڈبرگ کی جرمن کتاب "مملکت اور کلیسا کے حدود اور ان کی تعدی کے خلاف ضمانتیں" مطبوعہ ۱۸۷۲ء

اپنے پیشرو کی گفت و شنید میں حصہ لیا تھا، نئے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس سے بحیثیت ماتحت، اطاعت کا حلف لے، تو بادشاہ نے اس سے انکار کر دیا اور پادریانہ روح کو ٹھکراتے ہوئے اس نے اسقفوں کو روما جانے ہی کی ممانعت کر دی۔

کنٹربری کے اسقف اعظم کے انتخاب کے وقت جو جھگڑے پیدا ہوئے تھے، اس کے نتیجے کے طور پر پوپ تیسرے انوسنٹ نے انگلستان کے خلاف اپنا امتناعی حکم صادر کیا۔ اور بادشاہ کو جماعت باہر کرتے ہوئے رعایا کو اس کے حلف اطاعت سے بری قرار دیا۔ اسی طرح اس نے بادشاہ "جان بے علاقہ" کو تخت سے معزول قرار دیا اور اس کا تاج فلپ آگسٹس کو عطا کر دیا۔ جان اس سے ڈر گیا، اور اس نے ایک منشور میں تمام راسخ العقیدہ لوگوں کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ اس نے "انگلستان کی بادشاہت مع اس کے جملہ حقوق اور مقبوضات کے پوپ کے تفویض کر دیے ہیں، یہ کہ وہ اب سے اپنے متعلق کلیسائے روما کے خراج گزار کی حیثیت سے برتاؤ کرے گا، یہ کہ وہ انوسنٹ اور اس کے جانشینوں کی مکمل اطاعت کا حلف اٹھاتا ہے۔ اور یہ کہ اپنی ماتحتی کی علامت کے طور پر وہ ایک سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا"۔ پوپ نے اس کو دوبارہ بحال کر دیا اور چاہا کہ اس کی مدد کرے جب کہ ملک کے امراء نے ہتھیار اٹھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ قومی آزادیوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ان واقعات سے جو سبق ملا وہ یہ تھا کہ انگلستان کے امراء ہوں کہ انگلستان کے پادری، کوئی بھی بادشاہ کی اندھی اطاعت کے لیے آمادہ نہ تھا۔

اس کے بعد کے دور میں "مقام مقدس" نے انگلستان کو پوپ کا ایک صوبہ قرار دیا اور پوپ کے بھیجے ہوئے نائب یہ دعویٰ کرتے رہے کہ انہیں وہاں اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہے۔ اور پوپ نے

اس ملک پر بوجھل خراج عائد کر دیا۔ لیکن روما کے مطالبات سے ایک عام مخالفت پیدا ہو گئی اور پہلے ایڈورڈ کو اپنی پارلیمان میں ایک ٹھوس تائید اس غرض کے لیے حاصل ہو گئی کہ پوپ آٹھویں بونی فاس کی بات کو مسترد کر دے جو چاہتا تھا کہ بادشاہ کو مجبور کر کے اس سے یہ تسلیم کرا لے کہ اس کو اسکاٹ لینڈ پر جو حقوق حاصل ہیں وہ پوپ ہی کو حاصل ہیں۔ دوسرے ایڈورڈ کے زمانے میں روما نے ایک آخری کامیاب کوشش کی بادشاہ نے اس کو تسلیم کر لیا کہ خراج کی ادائی واجب ہے۔ لیکن جب ۱۳۶۵ء میں پوپ پانچویں اُربان نے (۳۵) سالہ خراج کے جو ادا طلب رہ گیا تھا، مطالبے کی جسارت کی تو تیسرے ایڈورڈ نے اس کو ماننے سے انکار کیا اور اس بارے میں بھی وہ قوم کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔

ایک فرانسیسی مولف نے ان امتیازی خصوصیات کو نمایاں کیا ہے جو فرانسیسی قانون یا پارلیمان میں اور فرانسیسی اسقفیت میں اور فرانسیسی بادشاہت میں پائے جاتے ہیں۔ قانونی یا پارلیمانی فرانسیسیت نہیں چاہتی تھی کہ آیندہ سے کلیسائی یا کشوری انصاف روا رکھے، اور پوپ سے مرافعہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسقفی فرانسیسیت کی حالت کچھ اور ہی تھی، اور شاہی فرانسیسیت کی کچھ اور ہی۔ آخر الذکر کا ایک بلند مرتبہ ہے یعنے "مملکت اپنے گھر میں آقا سمجھی جائے"۔ اس کے نظریے کا یہ پہلا جملہ ہے ـــــ اور یہ کہ "مملکت کا مظاہرہ بادشاہ کی شخصیت میں ہوتا ہے"، اور یہ اس کے نظریے کا دوسرا جزء ہے۔[1] بادشاہ کو جو مطلق العنان اختیار حاصل تھا، وہ ایک سہ گانہ

[1] آلوتو کے دیباچے اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہوا فرانسیسی "مجموعۂ ہدایات جو فرانس کے سفیروں اور ایلچیوں کو ملحتامۂ ویسٹ فالیا سے انقلاب فرانس تک دیے جاتے رہے" مطبوعۂ روما ۱۸۸۴ء صفحہ ۴۰

حیثیت میں پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ سیاسی نقطۂ نظر سے اندرونی معاملات میں حکومت نہایت انتہائی استبدادیت پر مشتمل ہوگئی۔ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے نقطۂ نظر سے تاج کے حقوق کی حمایت انتہائی جوش اور سرگرمی سے کی گئی۔ اور دیگر بین الممالک نقطۂ نظر سے، اکثر اس خواہش میں کہ فرانس کے بادشاہ کو ایک بلند مرتبہ دلایا جائے مولفین بالآخر قانون بین الممالک کی نفی تک پہنچ گئے۔

پوپ آٹھویں بونی فاس اور بادشاہ "خوبصورت فلپ" میں جو کشمکش ہوئی اس سے پہلی مرتبہ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کی علمی بحث کا موقع پیدا ہوا، ورنہ اس سے پہلے ناکمل مباحث شایع ہوتے رہے۔ اب ہم مکمل تالیفوں سے دوچار ہوتے ہیں، جو صرف اس بات تک محدود نہ تھیں کہ مشہور و معروف نظریوں کو دہرادیں بلکہ نئے نظریے بھی پیش کیے جانے لگے۔ فرانس کی بادشاہت میں اور پوپ میں جو جھگڑا چھڑا، اس کا اختتام اول الذکر کی کامیابی کے ساتھ ہوا۔ اور یہ پوپ گیارھویں بے نوا اور خاصکر پوپ پانچویں کلیمان کے دور کا واقعہ ہے۔ اور پاپائیت ستّر سال تک تاج فرانس کی ماتحت ہوجاتی ہے۔ اس کشمکش کے زیادہ دیرپا نتائج بھی نکلے۔ چنانچہ اس کے باعث فرانس کا اتحاد مستحکم ہوگیا اور جب ۱۰ ۔ اپریل ۱۳۰۲ء کو پاریس کے گرجائے نوتردام میں "نمایندگانِ عمومی" (یعنے پورے ملک کے نمایندگانِ کلیسا اور نمایندگانِ امراء اور مابقی تہائی مملکت کے نمایندوں) نے اجتماع کیا اور بادشاہ کے جائز حقوق کی تائید کی تو کہنا چاہیے کہ پہلی مرتبہ پورے فرانس نے ایک ہی طرح سوچا اور ایک قومی خیال وجود میں آیا۔

مختلف سیاسی تالیفیں بھی اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک سلسلۂ سینٹ فرانسس کے مشہور مرید و معتقد ولیم آدکام کی تالیف ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ مشہور حقیقت پسند ڈنس اسکاٹ کا شاگرد تھا، جس کے جملہ

34

نظریات کی اس نے بعد میں بڑی قوت سے تردید کی۔ اغلب یہ ہے کہ وہ پارلیس میں پادری رہا ہو۔ اسی شہر میں اس نے اپنی لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "اختلاف مابین اقتدار صدر کلیسا و سلاطین ارضی جیسے ایک پادری اور سپاہی کے مکالمے کے طور پر مرتب کیا گیا ہے" تھا۔ اس کتاب میں اس نے ایک حیرت انگیز جولانیٔ طبع سے اس خیال کی حمایت کی تھی کہ کشوری اقتدار کو کلیسائی اقتدار پر برتری حاصل ہے۔

جیسا کہ کتاب کا نام "اختلاف" بتاتا ہے کہ یہ اختلاف ایک پادری اور ایک فوجی افسر کے مابین پیدا ہوتا ہے۔ اس مشہور فرانسسکانی پادری نے فوجی افسر کے منہ میں جس قطعی انداز کے الفاظ ڈالے ہیں اس کا ایک نمونہ یہ ہے: "کلیسا کو ذرا بھی اس کا حق نہیں کہ وہ دنیاوی معاملات کا فیصلہ کرے۔ اور اگر وہ اس گمراہی کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جسے بائبل نے ملعون قرار دیا ہے، تو ایک چیز یقینی ہے۔ وہ یہ کہ اس پر ایک بڑا عذاب نازل ہوگا۔"

یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی اور شہر آنانی میں وہ المناک منظر پیش آیا جس میں شارا کولونا اور نوگارے نے پوپ آٹھویں بونی فاس کی توہین کی تھی، اور جس میں کہتے ہیں کہ بد مزاج سپاہی نوگارے نے اپنی زرہ کے فولادی کڑے سے جانشین حضرت مسیح کو مارا تھا۔

سلسلۂ فرانسسکان کے مورخ واڈنگ نے اوکام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ ایک زندہ ذہانت کا مالک شخص تھا، لیکن مزاج میں اعتدال نہ پایا جاتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ معلوم کرنا چاہتا تھا جو مناسب ہو۔ اس کہ اس کا تک ڈر نہ تھا کہ آسمان کو مبارزت (چانلج) دے، اور پوپ کے مرتبے کا استخفاف کرے اور شہنشاہ کے مرتبے کو حد سے زیادہ چڑھا دے۔" حقیقت میں اوکام کے نظریوں کی جسارت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اس نے حضرت مسیح کی آمد کی غرض و غایت انسان کے صرف روحانی مفادات تک محدود قرار دی ہے۔ اور اس نے

لکھا ہے کہ: "مسیح کو ہرگز اس غرض کے لیے مقرر نہیں کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہوں کے جج اور محتسب (سنسر) بنیں۔ اور ضرورت ہے کہ کلیسا سے پوپ کے ہمہ گیر اقتدار کی تائید کرنے والوں کو نکال باہر کیا جائے"

جس زمانے میں اوکام نے اپنی کتاب "اختلاف" شایع کی، اسی زمانے میں ایک اور کتاب شائع ہوئی جس کا مولف ژان نامی ایک ڈاکٹر دینیات اور سلسلۂ سینٹ فرانسس ہی کا ایک رکن تھا۔ پاریس کا ژان، سوربون یعنے جامعۂ پاریس میں درس دیتا تھا۔ اوکام ہی کی طرح اس نے بھی بادشاہت کی خود مختاری کی حمایت کی۔ اس موقع پر شاید یہ امر ملاحظے میں لایا جاسکتا ہے کہ فرانسسکن پادریوں کا سلسلہ ہمیشہ ہی پاپائیت کا مخالف نظر آتا رہا اور اس کے برخلاف ڈومینیکن پادریوں کا سلسلہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پاپائیت کی حمایت کرتا رہا۔

پاریس کا ژان صرف بادشاہت کی تائید ہی میں بحث نہیں کرتا بلکہ اسے قسطنطین کے عطیے سے بھی اختلاف ہے۔ اس دستاویز کا ہم ذکر (صفحہ 23 پر) کر چکے ہیں اور قرون متوسط کی پوری تاریخ میں ہم کو جس کا جو بظاہر احترام کیا جاتا نظر آتا ہے، اس کی یہ دستاویز قابل ذکر شہادت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرضی دستاویزیں بنائی جاتی تھیں اور جعلسازی کا ارتکاب کیا جاتا تھا تاکہ جو دعوے کیے جاتے تھے ان کی تائید کیجا سکے۔

پاریس کے ژان سے پہلے بھی لوگوں نے قسطنطین کے عطیے پر اعتراض شروع کردیا تھا۔ چنانچہ ۹۹۹ء میں تیسرے اوتون نے اس دستاویز میں جو اضافے کیے گئے، ان کی تردید کی تھی۔ بارھویں صدی عیسوی میں ٹی ترب کے گوڈفرائے نے جو شہنشاہ کا حاجب تھا، یہ بیان کیا تھا کہ دستاویز عطیہ پر تنقیدیں ہوتی رہی تھیں کیونکہ بائبل میں اس بات کی مخالفت ہے کہ کلیسا اقتدار اعلیٰ کا استعمال کرے، اور یہ کہ حضرت یسوع مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ "جو چیز قیصر کی ہے

وہ قیصر ہی کو دیدو۔" اگرچہ پاریس کے ژان نے اس دستاویز کی اصلیت پر اعتراض نہیں کیا ہے لیکن اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ نافذ ہونے کے بالکل قابل نہیں۔ اس کی دو دلیلیں قابل ذکر ہیں: "جیسا کہ شرح میں بیان کیا گیا ہے شہنشاہ کو اس لیے آگستس کہا گیا ہے کہ اس کا فریضہ یہ ہے کہ مملکت کی عظمت میں اضافہ کرے نہ کہ گھٹائے۔ اور آخر میں یہ کہ شہنشاہ اصل میں شہنشاہت کا محض ایک انتظام کرنے والا شخص ہے۔" اس کے اپنے الفاظ لاطینی میں یہ ہیں "جو شہنشاہ آگستس کہلاتا ہے اس کا ہمیشہ یہ فرض ہے کہ مملکت کو بڑھائے نہ کہ گھٹائے"[1]

وائیکلف نے بھی قسطنطین کے عطیے کو برا بھلا کہا ہے[2] اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کلیسا کے حق میں ایک زہر ہے کیونکہ اگر پادریوں کو دولت ملے تو ان کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "امراء کو یہ حق ہے بلکہ ان کا یہ فریضہ ہے کہ پادریوں سے وہ دولت چھین لیں جس کا وہ بے جا استعمال کرتے ہیں۔" پندرھویں صدی عیسوی سے گزرتے ہوئے ہمیں یہ نظر آئے گا کہ لورینزو ویلا ؔفالا نے ۱۴۴۰ء میں اطالوی میں ایک کتاب تالیف کی۔ اس کا عنوان تھا "قسطنطین کے غلط اور جھوٹے عطیے کی تردید"۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا تھا کہ قسطنطین کا عطیہ خرافات پر مبنی اور غیر محقق ہے۔ بے شبہ فالا نے تنقیدی دلیلیں پیش نہیں کی ہیں بلکہ اس نے صرف غیر یقینی ہونے کو نمایاں کیا ہے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں ناقابل تردید دلائل سے اس دستاویز کا جعلی ہونا ظاہر و باہر

---

[1] اس کی یہ تالیف گولداسٹ کی لاطینی تالیف "مقدس رومی شہنشاہت کی بادشاہی" میں بطور ضمیمہ ملتی ہے۔

[2] لوراںٹ کی فرانسیسی کتاب "کلیسا اور مملکت" جلد (۱) صفحہ (۱۰۱)۔

کردیا گیا۔

منطقی طور سے اصلاحی دور کے مولفین کو قسطنطین کے عطیے پر اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ حقیقت میں اس دستاویز سے جو صورت حال ضمناً پیدا ہوجاتی تھی، وہ یہ تھی کہ کلیسا کو اصلی عیسائیت سے ہٹا دیا جائے اور وہ اصلی عیسائیت کو مکمل طور سے تہ و بالا کردیتا ہے۔ نوراں نے اس کو خوب اچھی طرح ظاہر کیا ہے۔ قرون متوسطہ کے الحاد پسند فرقے داخلی کلیسا کے خلاف ایک ردعمل تھے۔ ملحدوں نے سینٹ پال کی طرح یہ یقین کیا ہے کہ ہر عیسائی ایک پادری ہے۔ اور عوام اور پادریوں کے فرق کو نظر انداز کرکے انھوں نے کلیسا کے اقتدار پر، اس کی مذہبی بنیاد ہی میں، ضرب لگائی ہے۔ اگر عوام کی اور پادریوں کی زندگی میں کوئی فرق نہ ہو تو دنیاوی اور روحانی نظاموں میں بھی کوئی فرق نہیں رہ سکتا۔ اور ایک ہی سماج، ایک ہی اقتدار، اور ایک ہی قانون کا دور دورہ ہوجائے گا۔ اس طرح کلیسا کی پوری عمارت، اس کی آزادی، اس کے خصوصی تحفظات، اس کے امتیازات اور اس کے اقتدار سب تباہ ہوجائیں گے۔[1] پاپائیت نے خطرے کو محسوس کرلیا۔ اس نے اپنے مخالفوں پر شدت سے وار کیا۔ اور اس نے ان کو کلیسا کی طرف سے جاتِ باہر کردیا۔ اوکام اور پاریس کے ژاں تو ملحد سمجھے ہی گئے تھے، بعد میں پاڈوا کے مارسیلیو، ژاں دیوں کے ژاں اور اس کے کچھ عرصے بعد وائیکلف کو بھی ملحد قرار دیا گیا کیونکہ انھوں نے بھی عوام کے سماج کے اقتدار اعلیٰ کی حمایت کی تھی اور بیان کیا تھا کہ کلیسا کی آزادی ایک غصب ہے۔ اور کچھ اس طرح کے نظریے لکھ ڈالے تھے کہ "یہ ناممکن ہے کہ کوئی مملکت وجود میں آسکے جب کہ اس کے اندر ایک ایسا طاقتور جسد موجود رہے جو

---

[1] نوراں کی فرانسیسی کتاب "ہسٹری قانون بین الممالک" جلد (۱) صفحہ (۲۰۲)۔

مملکت کے حدود سے باہر اور اس کے قوانین سے بالا سمجھا جائے۔"

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اوکام، پادوا کے مارسیلے، ژان دیوں کے ژاں اور ان مولفوں نے جنھوں نے ان کی پیروی کی، انھوں نے حقیقت میں زمانۂ حال کے مجددین کی راہ تیار کی۔ چنانچہ انھوں نے قانون کو خالص دنیوی اور غیر مذہبی چیز بنانے اور قانونی اداروں سے تمام مذہبی تصور کو خارج کرنے کی تبلیغ اور تیاری کی؛ اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ "قانون کی حکومت صرف اسی دنیا سے متعلق ہے۔" جب ان کے نظریے مان لیے گئے تو کشوری معاملات میں رواداری کا دور دورہ ہوگیا۔

ان لوگوں کے خیالات پھیلتے گئے اور فرانس میں چودھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "فرزیہ کا خواب" نامی ایک فرانسیسی کتاب شایع ہوئی۔ اس نے عرصے تک ایک بہت بڑا اثر ڈالا۔ فرانسیسی اسے قیمتی یادگار سمجھتے ہیں جس میں ان کے دعووں کو درست قرار دینے والی شہادت اور ان کی "آزادیوں" کو تقدس دینے والا مواد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد اہم نکات اور خاص کر کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے مسئلے کے متعلق وہ اوکام کی تالیفوں اور اطالوی کتاب "حامیٔ امن" ہی کے خیالات کی ترقی یافتہ صورت اور اکثر تقریباً لفظی ترجمے پر مشتمل تھی۔ اسلوب کی حد تک بھی وہ غیر مذہبی سماج کے پرجوش حامیوں کی تالیفوں سے نرم تر ہے۔

باویریا کے شہنشاہ لوئیس کے دور میں پوپ کی برتری کے مسئلے پر پرجوش بحث ہوتی رہی۔ شہنشاہ کا پوپ بائیسویں جان سے جھگڑا چھڑا ہوا تھا۔ اور فرانسسکن سلسلے کے پادری شہنشاہ کے حلیف بنے رہتے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر عیسائیوں کے ہاں مذہبی فقیروں کے دو بڑے سلسلے قائم ہو چکے تھے۔ ان میں سے سلسلۂ ڈومینکن نے

مذہبی تبلیغ میں اپنے کو مشغول کرلیا اور ملحدوں سے مقابلہ کرتا رہا۔
دوسرا سلسلہ فرانسسکن پادریوں کا تھا جس نے وعظ اور تعلیم میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔ خاصے ابتدائی زمانے ہی سے جامعات پاریس و آکسفرڈ میں ان دونوں سلسلوں کے پادری تعلیم دیتے نظر آتے ہیں، اور قرون متوسطہ کی علمی تحقیقات کے اعلیٰ ترین ماہروں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ البرٹ اعظم، بونئے کا تیں ساں، سوسے کا ہنری، آکوپناس کا ٹامس دومینکن سلسلے کے درخشاں ترین ستارے ہیں۔ روجر بیکن، ڈنس اسکاٹ اور اوکام عیسائی روحانی تعلیم (سیمرائیک) کے علمبردار ہیں۔
چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر "حضرت مسیح کی غربت" کے متعلق غربت محض کی ضرورت پر یقین رکھنے کا مسئلہ تقریباً پورے فرانسسکن سلسلے کو ہمنوا بنا چکا تھا۔ پاپائیت نے اس نظریے کے خلاف فیصلہ صادر کیا اور اس نے بکثرت راہبوں کے خلاف الحاد کے شبہے پر کارروائی اختیار کی۔ اور اس طرح آسیس کے فرانسس کی پیروی کرنے والے رفتہ رفتہ مقام مقدس یعنے پاپائیت کے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔
۱۳۲۳ یا ۱۳۲۴ء میں بعض چھوٹے پادری پاویریا کے لوئیس کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان میں غالباً علاوہ لیوک کا فرانسس بھی شامل تھا اور شاید کاساں کا اوبرتینو بھی، جس نے کچھ ہی عرصے پہلے سلسلۂ سینٹ فرانسس کو چھوڑ کر سلسلۂ سینٹ بے نوا میں شرکت اختیار کرلی تھی۔ اس کے بعد بعض مشہور مولف بھی آئے جیسے ژاں دیوں کا ژاں اور پاڈوا کا مارسیلیے۔ ان کے بھی کچھ عرصے بعد سیزین کا میشل، ولیم اوکام اور برگامے کا بنوناگرادزیا بھی۔
ژاں دیوں کے ژاں نے گرجا کے پادری کی خدمت حاصل کرلی۔ مگر اس کا تعلق سلسلۂ فرانسسکن سے ذرا بھی نہ تھا۔ وہ ڈنس اسکاٹ کا شاگرد تھا اور جامعۂ پاریس میں مشہور پروفیسر بنا۔

اس کے اسلوب اور عادات تعلیم کے لحاظ سے وہ ابن رشد کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ مارسیلے کا تعلق پادوا کے ریمنڈینی کے خاندان سے تھا۔ اس نے فلسفے کی تعلیم اپنے پیدائشی شہر میں حاصل کی اور ایک پادری بن گیا۔ آیا اس نے بعد میں جامعہ اورلیان میں قانون کی بھی تعلیم حاصل کی تھی؟ یہ چیز واضح نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن ۱۳۱۲ء میں وہ جامعہ پارس کا مؤدب اعلیٰ (ریکٹر) نامزد ہوا۔ وہ دینیات، مذہبی قانون اور طب کی تعلیم دیتا رہا۔ عام طور سے یہ یقین نہیں کیا جاتا کہ وہ سلسلہ سینٹ فرانسس میں شریک ہو گیا ہو۔ لیکن وہ اس سلسلے کے متعدد ممتاز ارکان کے اثرات سے ضرور متاثر ہوا تھا، اور خاص کر اوکام تو اس کی ذہنیت پر واقعی چھا گیا تھا۔

38

جب پوپ بائیسویں جان اور باویریا کے لوئیس میں جھگڑے چھڑ گئے تو ان ممتاز لوگوں کی، جن کا ہم ابھی ذکر کریں گے، نظروں کا اس اہم مسئلے پر مبذول ہو جانا ناگزیر تھا کہ کلیسا اور مملکت میں کیا تعلق ہو؟ اسے یاد رکھا جائے کہ اوکام، خوبصورت فلپ اور پوپ آٹھویں بونی فاس کے جھگڑے میں حصہ لے چکا تھا اور جامعہ میں ابھی تک وہ خیالات تازہ تھے کہ کس طرح ۱۳۰۳ء میں وہ مجبور ہوا تھا کہ بادشاہ کا ساتھ دے اور پوپ کے فیصلوں کا مرافعہ مجلس شورائے عمومی میں کرے۔

مارسیلے نے ژاں دیوں کے ژاں کے ساتھ مل کر لاطینی میں کتاب "حامیٔ امن" تالیف کی تھی۔[1]

یہ دونوں مؤلف قدیم یونان پر اپنے کو مبنی کرتے ہیں۔ اور وہ محض برائے نام عیسائی ہیں۔ چنانچہ مارسیلے کے متعلق لوران نے اس چیز کا ذکر کر دیا ہے۔ اس بہادر مقابلہ کرنے والے میں یونانی

[1] یہ کتاب گولداشت کی مذکورۂ بالا تالیف جلد (۲) صفحہ (۱۵۴) و مابعد میں شامل ہے۔

قوم خود کو کبھی اقتدار اعلیٰ سے محروم نہیں کر دیتی بلکہ اس کے برخلاف قوت تنفیذی اسی کے ماتحت ہوتی ہے اور قوم ہی کو حق ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا انتخاب کرے جو اس بات پر مامور ہوتے ہیں کہ قانون کو نافذ کریں [39] اسی بنا پر قوم ہی کو حق ہوتا ہے کہ ان کارکنوں کی جانچ کرے اور ان کو بدلے یا معزول کرے[1] جو اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہیں۔

بارسیلے اور تراں دیلوں کے تراں نے اقتدار اعلیٰ کا جو نظریہ پیش کیا وہ قدیم یونان ہی کا نظریہ ہے۔ چنانچہ "کسی مملکت میں صرف ایک مقتدر اعلیٰ قوت ہوتی ہے۔ اور ایک سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتی۔ اگر متعدد ہوں تو نہ تو قوانین ممکن ہوں گے، نہ حکومت، نہ انصاف۔ دو اشخاص یا دو اجساد کو اقتدار اعلیٰ دیدیجئے تو ایک جس چیز کی خواہش کرے گا تو دوسرا اس کو نہیں چاہے گا۔ ان دونوں میں سے کس کی اطاعت شہریوں کے لیے ضروری ہوگی؟ اگر ان دونوں کے قوانین باہم متضاد ہوں تو کس کو ترجیح ہوگی؟ اگر ہر ایک کو اختیار سماعت کا حق ہے تو ایک ہی شہری ایک ہی بنائے نالش پر ایک ہی وقت دو مختلف عدالتوں میں بلایا جا سکے گا۔ اب وہ کس عدالت کے سامنے حاضر ہو؟ کیا دونوں کے سامنے یا کسی کے سامنے بھی نہیں؟ نظریے کی حد تک یہ چیز لغو ہوگی، تو واقعے کی حد تک نراج پیدا ہوگا۔ اور سماج ختم ہو جائے گا"[2]۔

وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں: مذہب، تصور اقتدار کے ایک منافی چیز سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ "حقیقت میں اقتدار کے ساتھ ضمنی طور پر جبر کا ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اور مذہب اور جبر دو ایسے تصورات ہیں جو ایک دوسرے کے منافی ہیں ...... جبر کرنے کا

---

[1] ۔ پاول ژانے کی فرانسیسی کتاب "اخلاقی اور سیاسی فلسفے کی تاریخ" جلد (۱) صفحہ (۴۴۴) و مابعد۔

[2] ۔ توراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۲) باب پاپائیت و شہنشاہیت صفحہ و مابعد اور اسی مولف کی فرانسیسی کتاب "کلیسا و مملکت" جلد (۱) صفحہ ۲۲۴)۔

اقتدار یا سزا دینے کی طاقت صرف مملکت کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کو کلیسا کے تفویض بھی کر دے تو کلیسا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ کلیسا جبر استعمال نہیں کر سکتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کلیسا کو کوئی حقیقی دنیاوی اقتدار حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ انجیل ایک تعلیم کا نام ہے۔ اگر طبیب یہ تعلیم دیتا ہے کہ صحت کی کس طرح حفاظت کی جائے اور کس طرح اسے بحال کیا جائے تو کیا اس کی بنا پر طبیب کو زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہو جائے گا؟ پادری روح کا طبیب ہے اور اسے موت اور حیات ابدی کے متعلق طبیب دنیاوی سے زیادہ اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا!"

کتاب "جامع امن" کے مولف بالکل یہ بات پسند نہیں کرتے کہ ایمان کے مسائل میں مادی جبر کام میں آئے؛ اس طرح وہ کشوری رواداری تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملحد ہوں کہ غیر مذہب والے، صرف خدا کے سامنے اور وہ بھی آیندہ زندگی میں جوابدہ ہوں گے۔ اور پادری کا صرف یہ کام ہے کہ ان کو متنبہ کر دے اور ان کو ان کے انجام سے پیش آگاہی بخش دے۔" اگر کشوری قانون ہمیشہ معقولیت کے مطابق رہے، تو الحاد اور غیر مذہب کی پابندی کے باعث کبھی کسی کو مادی سزائیں نہ دیجا سکیں گی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے، اور ایسا پیش آتا رہتا ہے کہ کشوری قانون غیر مذہب والوں کو ملک میں آنے کی ممانعت کر دیتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں پادری کو کوئی حق نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق کوئی رائے دے۔ کشوری حاکم عدالت سزا صرف اس لیے دیتا ہے کہ مملکت کے ایک قانون کی خلاف ورزی عمل میں آئی ہے۔"

40

مارسیلے اور ژاں دیوں کا ژاں اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ پوپوں کو کوئی خدائی حق پہنچتا ہو اور وہ سینٹ پیٹر کی اولیت کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: کوئی اس کو ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ [سینٹ پیٹر] روما میں رہا ہو۔" ان مولفوں کی رائے کے مطابق حواریوں کے سردار، یعنے حضرت مسیح کو جو تقدم تسلیم کیا جاتا ہے

وہ ان کی عمر [؟ ان کے زمانے] اور ان کے ایمان کی برتری کے باعث تھا۔ کتاب "حامیٔ امن" کے مولف یہ بھی کہتے ہیں کہ کلیسا کی غرض یہ نہیں ہے کہ اس دنیا کے معاملات کا انتظام کرے۔ اس کو تو حیات ابدی کے سوا کسی اور چیز میں مشغول ہونے کا حق نہیں۔ اور حیاتِ دنیوی "مملکت" کے دائرۂ عمل میں داخل ہے۔ پادری، چاہے وہ کوئی ہو، اگر ناجائز طور سے یہ اختیار حاصل کرلے کہ حلفِ اطاعت سے کسی کو بری کرے تو، ایسا پادری حضرت مسیح کے لائے ہوئے دین کی خلاف ورزی کرتا ہے اور الحاد کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ دنیاوی قانون ساز کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ کسی کو اسقف مقرر کرے، کسی کو پوپ بنائے، اور اسقفوں کی اسی طرح جانچ کرے جس طرح علاقۂ یہودیہ کے گورنر پیلاطس نے یسوع مسیح کے متعلق کیا تھا۔ دنیوی قانون ساز ان کو معزول کرسکتا ہے، مجالس شورائے مذہبی کو طلب کرسکتا ہے، اور ان کی صدارت کرکے ان کی کارروائیوں کا انتظام کرسکتا ہے۔ اسقف سب برابر ہیں۔ شہنشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں پر ترقی دے۔ اور یہ ترقی منسوخ بھی کیجاسکتی ہے۔

پوپ چھٹے کلیمان نے ۱۰ اپریل ۱۳۴۳ء کو ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مارسیلے سے بڑھ کر کسی بدتر ملحد کی کوئی چیز نہیں پڑھی ہے"۔ یہ اس بات کو تسلیم کرنا تھا کہ کتاب "حامیٔ امن" کے مولفوں کے وار کس قدر شدید تھے! کلیسا کے اقتدار سے شاذ ہی کبھی اس سے زیادہ صاف و صریح طور پر انکار کیا گیا ہو، اور شاذ ہی اس سے زیادہ ٹھوس استدلال نے پادریانہ دعووں کی لغویت کو واضح کیا ہو۔ اس کتاب نے رائے عامہ پر عظیم الشان اثر ڈالا۔ اس کی اشاعت ہی کے زمانے میں اس کا ایک فرانسیسی ترجمہ شایع ہوگیا۔ پھر ۱۳۷۶ء میں پاریس میں ایک تحقیقات یہ دریافت کرنے کے لیے شروع ہوئی کہ ایک خاص ترجمے کا

مولف کون ہے ؟ لیکن مجرم کا نام، جو یقیناً جامعہ کا ایک رکن ہی تھا، گمنام ہی رہ گیا ہے۔[1] اس کے بہت دنوں بعد ۱۵۳۵ء میں لندن میں ولیم مارشل نے لاطینی سے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے "حمایت امن" کے نام سے چھپوایا اور ۱۵۴۵ء میں جرمنی میں بازاری زبان میں اس کا ایک خلاصہ چھپا۔ اسی اثنا میں نظام پاپائیت نے پوری کوشش کر کے ایک ایسی کتاب کے مخطوطوں کو تباہ کرایا جس کے مولفوں کو ایک زمان پوپ نے جات باہر کیا تھا اور جس کی مندرجہ باتوں کو الحاد قرار دیا تھا۔

اوکام نے اپنی باری پر کشوری اقتدار کی حمایت شروع کی۔ اس کی زندگی کے اس زمانے کی تالیفیں کثیر اور اہم ہیں۔ کچھ تو بائیسویں جان، بارھویں بے نوا، اور چھٹے کلیماں کے خلاف ہیں، اور کچھ اس غرض سے تالیف ہوئی ہیں کہ کلیسا اور مملکت کے تعلقات کا مسئلہ واضح کیا جائے۔ چنانچہ حسب ذیل لاطینی کتابیں اسی زمرے میں شامل ہیں:[2] خود اس کی کتاب بائیسویں جان (یوحنا) کی غلطیوں کے متعلق"، "بائیسویں جان کی غلطیوں کا مجموعہ"، "مدافعتی خط"، "آٹھ مسائل کے فیصلے"، اور "مکالمہ" جس کے تین ممتاز حصے ہیں: پہلا ملحدوں کے متعلق، دوسرا بائیسویں جان کی غلطیوں کے متعلق، تیسرا پوپ اور مجالس شورائے کلیسا اور شہنشاہ کے اقتدارات کے متعلق"۔

یہ آخری تالیف بہت بڑی ہے لیکن اس کے متعدد حصے خاص کر وہ جو پوپ کے اقتدار اور مجالس شوریٰ اور شہنشاہ سے متعلق تھے، ضایع ہو گئے ہیں۔ یہ غالباً ۱۳۴۲ء اور ۱۳۴۳ء میں شہنشاہ کی خواہش پر تالیف کی گئی تھی۔[3]

---

[1] مگنتبرنگلر کی فرانسیسی کتاب "چودھویں صدی عیسوی کی ادبی تاریخ پر مقالہ" جلد (۱) صفحہ ۵۰۷۔

[2] یاوں تراسنہ کی کتاب مذکورۂ بالا جلد (۱) صفحہ ۳۹۰۔ ہرتسوک، پلٹ، اور ہاؤک کی جرمن تالیف

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پادوا کا مارسیلے، ولیم اوکام کے اثرات سے متاثر ہے۔ اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اوکام کے خیالات کلیسا اور مملکت کے تعلقات کے متعلق ان خیالات سے کچھ کم زوردار نہیں ہیں جو کتاب "حامیٔ امن" میں بیان ہوئے ہیں۔ اوکام شہنشاہی اقتدار کی برتری کے لیے جھگڑتا اور پاپائی دعووں پر حملہ کرتا رہا۔ اس کی رائے میں پوپ کی اطاعت صرف ان مسائل میں کیجانی چاہیے جو ایمان والوں کی جماعت کی نجات کے لیے ضروری ہوں اور معمولی عقل سلیم سے یہ معلوم کرلیا جاسکتا ہے کہ ایسی چیزیں کون کونسی ہیں۔ اور ہر اس شخص کو، جس نے خدائی قانون کی تعلیم پائی ہو، یہ حق حاصل ہے کہ اس کی جانچ خود ہی کرے، خواہ ایسا شخص مالدار ہو یا غریب، پادری ہو یا عامی۔ پوپ سے غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے اور اگر وہ کسی غلطی کا ارتکاب کرے تو سمجھدار لوگوں کا فریضہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کا مقابلہ کریں علماء کا مقابلہ اور طرح کا ہوگا، مذہبی افسروں کا اور طرح کا، بادشاہوں کا اور طرح کا، سیدھے سادے لوگوں کا اور طرح کا۔ پوپ کے فیصلے سے کوئی پابندی نہیں پیدا ہوتی۔ اور پوپ کے فیصلوں کا مرافعہ کیا جاسکتا ہے۔ اور خود پوپ کی تک تحقیقات کرکے اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ ملحد ہے تو اسقفوں کو چاہیے کہ اس پر الزام قائم کردیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو دیگر راسخ العقیدہ لوگوں اور خاص کر شہنشاہ کا فریضہ ہے کہ ایسا کرے۔ اگر پوپ کسی جرم کا شہرت پذیر طور سے ارتکاب کرے تو چاہیے کہ اسے رومیوں کی عدالت کے سامنے اس الزام کی جوابدہی کے لیے طلب کیا جائے۔ وہ رومیوں کا اسقف ہے۔ اور اگر رومی ایسا نہ کریں تو ہر راسخ العقیدہ کو یہ حق ہے کہ جب کبھی اسے اس بات کی کافی قوت حاصل ہو جائے کہ پوپ کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ "پراٹسٹنٹ دینیات اور کلیسا کی انسائکلوپیڈیا"۔ دیکھیے تحت عنوان "اوکام"۔

دنیوی قوت کے ذریعے سے گرفتار کر سکے تو اسے جوابدہی کے لیے اپنے سامنے طلب کرے۔ اگر پوپ ایمان والوں کے حقوق یا جائداد پر حملہ کرتا ہے یا ناجائز طور سے ان کو روک رکھتا ہے، تو اس صورت میں بھی پوپ کا پیچھا کیا جانا چاہیے۔ اوکام اس سے بھی بڑھ جاتا ہے: جملہ عیسائیوں کی عالمگیر مجلس شوریٰ سے بھی غلطی ہوسکتی ہے اور یہ بھی پیش آسکتا ہے کہ کلیسا کے پیروؤں کی اکثریت غلطی کرے اور صرف کمزور لوگوں اور ان پڑھ لوگوں میں صحیح ایمان باقی رہے۔ اوکام یہ بھی کہتا ہے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، کہ رومی کلیسا ہرگز حضرت مسیح کے صوفیانہ جسم کے مترادف نہیں ہے اور یہ کہ ہر ایک انفرادی کلیسا عالمگیر کلیسا کا ایک رکن ہوتا ہے۔ روما کے کلیسا کو کوئی سرداری حاصل نہیں اور نہ ہی پاپائیت کوئی خدائی ادارہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر پوپ کو پورے اختیارات مل جائیں تو انجیل کا قانون ایک غلام بنانے والا قانون بن جائے گا جو قانون موسوی سے زیادہ سخت غلامی عاید کرے گا، اور ہر کوئی پوپ کا غلام ہوجائے گا حالانکہ انجیلی قانون ایک آزادی کا قانون ہے۔" (لاطینی میں) "حالانکہ انجیلی قانون آزادی کا قانون ہے۔"

اوکام اور مارسیلے اور دیگر بڑے محرکین کے خیالات ان کے مرنے کے ساتھ غائب نہیں ہوگئے۔ خیال کی غیر مادی دنیا میں کوئی مرتا نہیں ؛ بلکہ توالد کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ مذکورۂ بالا مولف جو چیز خود پوری طرح حاصل نہ کرسکے، وہ مستقبل کا نظام العمل بن گیا۔ جن اصلاحوں کا وہ خواب دیکھتے رہے ان کا اچھا اختتام ہوا اور عوام یعنے غیر پادری لوگوں کا سماج روز افزوں اپنے کو ان زنجیروں سے چھڑاتا چلا گیا جن سے کلیسا نے اس کو جکڑ دینا چاہا تھا۔ اور جدید مملکت کی تاسیس مذہبی عقاید کے باہر اور ان سے بالا رہ کر عمل میں آئی۔

اس سے بھی کچھ اور زیادہ ہوا۔ اوکام اور مارسیلے کے ساتھ ایک نیا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ جو "درست" بھی تھا اور "تونگر" بھی یعنی

مملکت کے خود مختار ہونے کا خیال۔ جس چیز کا ان مولفوں نے دعویٰ کیا تھا اس سے خود بخود یہ بات مانی پڑتی ہے کہ ایک سے زیادہ خود مختار وحدتیں ایک ساتھ قائم رہ سکتی ہیں اور یہ مولف اس خیال سے دوچار ہوگئے کہ ایسی مملکتوں میں باہم حقوق و فرائض کا تبادلہ ہوگا اور ان حقوق و فرائض میں کسی مذہبی خیال کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ان مولفوں نے اپنے آپ کو ایک قانون بین الممالک کے تصور کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور یہ قانون بین الممالک پادریانہ اقتدار سے بالکل اسی طرح الگ تھا جس طرح اندرونی قانون ملک۔

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک نفیس اور ممتاز ذہنیت نے جلوہ دکھایا۔ یہ اینیاس سلفی یوس کی تھی۔ اس نے پایس دوم کے نام سے پاپائیت کا نکوئی تاج زیب سر کیا تھا۔ اس پوپ نے ایک کتاب لاطینی میں تالیف کی جس کا نام "رومی شہنشاہیت کا آغاز اور اس کا اقتدار" تھا۔ یہ حکمرانی میں وحدت کا حامی تھا اور اس نے یہ تسلیم نہ کیا کہ شہنشاہ کی موجودگی میں کوئی اور انفرادی مقتدران اعلیٰ بھی ہو سکتے ہیں۔ پوپ پایس دوم کی رائے میں بادشاہوں کو چاہیئے کہ بادشاہ اعلیٰ کی اسی طرح ماتحتی کریں جس طرح بطریرک اور آرک بشپ (اسقف اعظم) اور اسقف، پوپ کی کرتے ہیں۔ لیکن اپنی تالیفوں میں سے ایک اور میں سلفی یوس یعنی پوپ پایس دوم نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ شہنشاہ اور پوپ حقیقت میں کیا بن چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے جرمنی کے حکمرانوں سے کہا تھا کہ "شہنشاہ کا اقتدار منفی ہے، تم اس کی صرف اتنی اطاعت کرتے ہو جتنی تم مناسب سمجھتے ہو۔ اور تم اس اطاعت کو کم سے کم ہی کر دینا چاہتے ہو۔۔۔ عیسائیت ایک دھڑ ہے جس کے سر نہیں اور یہ ایک ایسی جمہوریت ہے جس میں نہ تو قانون پائے جاتے ہیں اور نہ مجسٹریٹ۔ پوپ اور شہنشاہ ہی کی تعظیم و توقیر بڑے افسر (بادشاہ) کرتے ہیں [کسی اور کی نہیں]۔ پوپ اور شہنشاہ چکاچوند تو کرتے ہیں مگر محض سراب ہیں۔

43

چنانچہ ان کو احکام دینے کا کوئی اقتدار باقی نہیں اور کوئی ایسا شخص نہیں پایا جاتا جو ان کی بات سنے"۔ ہمہ گیر طاقت رکھنے والی پاپائیت حقیقت میں شہنشاہت میں ضم ہوگئی تھی اور یہ دونوں دیو خاک میں پڑے تھے۔ اس کے باوجود بہت دنوں تک شہنشاہ کے اقتدار کا تصور دماغوں کو ستاتا رہا۔ اس نقطۂ نظر سے ارازمس کے دوست ژاک انتولی کی لاطینی تالیف[1] عجیب وغریب ہے۔ یہ شخص قانون مذہبی کا پروفیسر تھا اور علاقۂ کامبرے کے اسقف کا صدر نائب (ڈیکار) تھا۔ ۱۵۰۲ء میں اس شخص نے پرزور طور سے ان چند اطالوی مولفوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جو شہنشاہ کی برتری کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ اس نے یہ اعلان کیا کہ شہنشاہ تمام زمینوں حتیٰ کہ سمندر کے جزیروں کا بھی مالک ہے اور یہ کہ دنیاوی اختیار سماعت استعمال کرنے کا حق ہمیشہ کے لیے اسی کو حاصل ہے!

---

[1] (لاطینی میں) "یہ کتاب شہنشاہ کے حکم محکم سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے۔۔ اس کا مولف قانون مذہبی کا استاد علامہ ماہر یعقوب نڈل برگنسزی ہے۔ آنتورپ میں ۱۵۰۲ء میں کنندہ کاری کے مطبع تھیوڈور مارٹنس میں چھاپی گئی۔"

44

حضرت مسیح کی تعلیم خاص کر امن کے لیے تھی۔ سچ پوچھیے تو انجیل نے جنگ کو بالکلیہ طور سے ناجائز نہیں قرار دیا۔ لیکن عیسائی تعلیم فطرۃً اس بات کے خلاف تھی کہ قوت کا استعمال کیا جائے۔ اور ابتدائی صدیوں میں کلیسا کے پادریوں نے جنگ کی شدید ترین مخالفت کی۔ اس کے سوا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ رضا و تسلیم کی جو تعلیم حضرت مسیح نے دی تھی، اس میں غلو پایا جاتا تھا؛ مسیحیت پر ایمان رکھنے والے کو نہ صرف اس بات کی ممانعت تھی کہ قوت کے ذریعے سے اپنی حفاظت کریں، بلکہ انھیں اس کی تک اجازت نہ تھی کہ جائز ترین ہتھیار سے بھی حکومت کے قانون سے مدد لے سکیں۔

اسکندریہ کے کلیماں، ترتولیاں، اوری ژین، لاک تانش اور ان کے علاوہ دیگر مشاہیر نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہتیار سے کسی بھی طرح

مدد دینی ناجائز ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک امن ایک خدائی واقعہ ہے اور جنگ ایک شیطانی واقعہ۔ پیغمبروں نے جس امن کی پیشین گوئی کی تھی، اس کی تک ایک صوفیانہ تعبیر کی جانے لگی تھی۔ کیا حضرت مسیح نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس طرح کا امن نہیں دے رہے ہیں جس طرح دنیا دیتی ہے، بلکہ خدائی امن؟

اوسی بوس نے کہا تھا کہ "کافروں میں شیاطین مسلسل جھگڑے برپا کرتے رہتے تھے۔ حضرت یسوع نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس طرح دنیا میں امن قائم کر دیا۔" لاکتانس نے بڑے اچھے الفاظ میں فتوحات اور فاتحین کو برا بھلا کہا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اچھا تو تم اس طرح حیات دوام حاصل کرنی چاہتے ہو؛ شہروں کو تباہ کرنا، بستیوں کو ویران کرنا، آزاد لوگوں کو نیست و نابود کرنا یا انہیں غلام بنا لینا؛ جتنا زیادہ یہ لوگ تباہی پھیلائیں، لوٹیں، اور لوگوں کو قتل کریں، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے کو شریف اور شہرت مآب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کو نیکی کے نام سے موسوم کر کے فخر کرتے ہیں۔ جو شخص ایک آدمی کو قتل کرتا ہے، اسے مجرم سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی ہزاروں آدمیوں کا قتل عام کرے، زمین میں خون کی طغیانی برپا کرے، ندیوں کو لاشوں سے پاٹ دے، تو اسے دیوتاؤں میں شمار کیا جانے لگتا ہے۔"

اوری ژین نے اپنے مذہب کی امن دوستی پر ان الفاظ میں مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ "ہم کسی قوم کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے، اور ہم جنگ لڑنا نہیں سیکھتے کیونکہ ہم حضرت مسیح کے واسطے سے امن کی اولاد بنے ہیں۔"

غیر عیسائی شہنشاہوں کے زمانے میں پیروان مسیحیت فوجی خدمت انجام دینے سے انکار کرتے رہے۔ جب قسطنطین اعظم تخت پر آیا اور اس نے کلیسا اور حکومت کے تعلقات میں ایک بنیادی انقلاب

45

پیدا کر دیا تو جنگ کے خلاف انتہا پسندانہ جذبات میں ایک ردِ عمل پیدا ہو گیا۔ اس وقت تک مسیحیت پر ایمان لانے والے کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جنگ کو ایک ملعون کام خیال کرتا ہے۔ اب نئے شہنشاہ نے اس کی کوشش کی کہ "پڑاؤ کی زندگی" کو تقدس حاصل ہو۔ لیکن سپاہی کو اب بھی پہلے کے مقابلے میں کچھ کم خون بہانا نہیں پڑتا تھا۔

کیا فوجی ملازمت ایک جائز پیشہ ہے؟ اس سوال کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ کلیسا نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ شہنشاہ قسطنطین اور لسی نیوس نے عیسائیوں سے متعلق جو فرمان جاری کیا وہ ۳۱۳ء کا ہے۔ اس کے بعد کے سال سے ہر وہ شخص جو مذہبی بنیادوں پر فوجی خدمت سے کنارہ کشی اختیار کرتا' دارو گیر کا مستوجب ہونے لگتا۔[۱] چند بلند تر ملفوظات نے اس حل کو جائز قرار دیا تھا۔ نوزائیدہ کلیسا نے ایک سماجی ضرورت کے طور پر غلامی کو قبول کیا تھا جسے وہ اصولاً ناپسند کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ "سپاہیانہ" پیشے کو بھی برداشت کر سکے اور "جنگ" سے بھی جنگ کرے۔[۲] کلیسا کے ایک پادری سینٹ آتھاناس نے لکھا تھا کہ کسی جائز جنگ میں کسی کو قتل کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ باعثِ عزت بھی ہے۔

سب سے بڑھ کر سینٹ آگسٹائن نے جنگ کے جائز ہونے کے خیال کو کامیاب بنایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مشہور مفکر جنگ کی ہولناک مصیبتوں کو تسلیم نہیں کرتا' یا ان کو ناپسند نہیں کرتا' یا وہ لڑائیوں میں اعتدال کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس پر اس خیال نے تسلط حاصل کر لیا تھا کہ ہتیار اٹھانا جائز بھی ہو سکتا ہے۔

۱۔ کیبلاں کی فرانسیسی کتاب "آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے کے عیسائی کتبات گال میں" جلد (۱) دیباچہ صفحہ (۸۱)۔

۲۔ ایضاً جلد (۱) صفحہ ۸۶۔

46 جب فلاقیوس مارسلیس نے اس سے دریافت کیا تھا کہ آیا عیسائی نظریات کے مطابق، قوانین جنگ اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ یورپ پر وحشیوں کے حملے کی صورت میں انتقامی کارروائیاں اختیار کرے؟ اس کا اس نے جواب دیا تھا کہ "اگر عیسائی قانون تمام جنگوں کو ناجائز قرار دیتا تو انجیل میں نجات کے خواہشمند سپاہیوں سے کہا جاتا کہ ہتیار پھینکدیں اور فوج کو چھوڑ دیں۔ لیکن ان سے صرف یہ کہا گیا ہے: ہر طرح کی تعدی اور فریب دہی سے بچو اور اپنی تنخواہ پر قناعت کرو۔ اگر اس طرح کے سپاہیوں کی ایک جمعیت تیار کی جائے جیسا کہ ہمارا مذہب حکم دیتا ہے، تو پھر وہ لوگ جو مسیحیت کو حکومت کے خلاف چیز سمجھتے ہیں، وہ یا تو یہ کہنے کی جراءت کریں کہ ایسی جمعیت بھی جمہوریت کی دشمن ہے، ورنہ وہ پھر اس کا اقرار کریں کہ اس مذہبی حکم کی اچھی طرح اطاعت کی جائے تو ہی نجات حاصل ہوگی۔"[1]

مانی نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ زرتشتیت، بدھ مت اور عیسائیت سب کو ایک ہی نظام مذہبی میں جمع کردے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہمہ اوست کے نظریے پر پہنچا یعنے انسان سب ذات الوہیت ہی سے نکلے ہیں اور وہ الوہیت ہی کا ایک جزء ہیں اور عالم کا وجود حیوانات، نباتات اور جمادات پر مشتمل خیال کیا گیا۔ اس طرح امن پسندی کی روح ناگزیر طور پر اس کی تعلیم میں سرایت کر گئی۔ چنانچہ مانویت نے اسے ایک گناہ قرار دیا کہ کسی درخت یا کسی جانور کو تباہ کیا جائے اور یہ تعلیم دی کہ کسی آدمی کو کسی صورت سے بھی حق حاصل نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے آدمی کی جان لے۔ سینٹ آگسٹائن نے خاص کر اس مانوی نظریے کی تردید کی کوشش کی کہ "شر" کا تعلق اصل میں انسان اور خدا دونوں سے الگ ایک علحدہ چیز

[1] لوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ۴ حصہ عیسائیت صفحہ ۲۲۴ و مابعد — لیکی کی انگریزی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ و مابعد — ہرت ژوگ کی جرمن کتاب "پراٹسٹنٹ دینیات اور کلیسا کی انسائیکلوپیڈیا" تحت کلمہ "جنگ"

سے ہے سینٹ آگسٹائن نے اسی طرح بے نظیر شدت کے ساتھ قانون جنگ کے متعلق قانونی نظریے سے جنگ کی ۔

قرون متوسطہ میں ایک ناگزیر ردعمل کے باعث اس جاگیرداری نظام کے بالمقابل جو جھگڑوں، تباہی اور لڑائیوں کا شایق تھا، کلیسا نے نئے سر سے جنگ کی کُلی مخالفت کی ۔ لیکن واضح رہے کہ اس سے مراد صرف عیسائیوں کی باہمی لڑائیاں ہیں ۔ کلیسا نے پادریوں کو اس بات کی ممانعت کی کہ خون بہائیں یا سزائے موت کے فیصلے صادر کریں عوام الناس میں سے جو لوگ ہتیار اٹھاییے ہوتے، ان کو کلیسا نے کفارے اختیار کرنے کا حکم دیا گویا کہ وہ کوئی نجس ہستیاں ہوں ۔ ایک مجلس شورائے مذہبی نے ولیم فاتح کے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے کسی کو قتل کیا ہو وہ ہر ہر مقتول کے عوض ایک ایک سال تک کفارہ اختیار کریں، اور ہر ہر مجروح کے عوض چالیس چالیس دن، اور ہر اس شخص کے متعلق جس کو مجروح کرنے کا انھوں نے ارادہ کیا ہو تین تین دن کا کفّارہ شروع کریں[1]۔

47 خود ناجائز جنگ کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ وہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ایک سزا ہے ۔ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر اور پندرھویں صدی کے آغاز میں اونورے بونے اور کرسٹین ڈ پیزان نے یہ نظریہ قبول کر لیا کہ جنگ اصل میں ایک جائز چیز ہے ۔ چنانچہ کرسٹین اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہے کہ "جو جنگ اور لڑائی کسی جائز جھگڑے کے لیے کی جائے، وہ سوائے اس کے کوئی چیز نہیں کہ اس شخص تک انصاف کو پہنچایا جائے جس کا وہ حق ہو"۔ بونے جائز اور ناجائز جنگ میں امتیاز کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ ناجائز جنگوں کا اصل باعث انسانوں کے گناہ ہی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ وہ جنگ کو گناہوں کا

---

[1] ۔ لوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ہفتم جاگیرداری نظام اور کلیسا" صفحہ (۴۳ ۲)

کفارہ سمجھتا ہے اور وہ یہ معلوم کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ "کون لوگ جنگ میں زیادہ قوی ہیں، کون زیادہ مبنی بر انصاف اور کون بر سر گناہ۔" اس کی نظروں میں جنگ کرنے والوں کا فریضہ پوری طرح معین ہے کہ "ہتھیار چلانے والے لوگ خدا کے کارندے ہوتے ہیں جو اسی کی اجازت سے گناہگاروں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ان کے خلاف اس دنیا میں وہی کام انجام دیتے ہیں جو دوسری دنیا کے متعلق دوزخ کے شیاطین [دوزخ کے نگراں فرشتے مراد ہیں۔ مترجم]۔" یہی شخص ایک اور جگہ اس سوال سے بحث کرتا ہے کہ آیا جنگ قانون الہٰی کے تحت کوئی مردود چیز ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے: "یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ ایک اچھی اور نیکی کی چیز ہے کیوں کہ اپنے صحیح مفہوم میں جنگ سوائے اس کے کسی اور چیز کا خیال نہیں کرتی کہ حق کے خلاف جو فعل ناجائز ہوا ہو اس کی اصلاح کی جائے اور جو جھگڑے پیدا ہوئے ہیں ان کی جگہ امن بحال کیا جائے؛ جیسا کہ کتاب مقدس میں درج ہے۔ اگر جنگ میں متعدد برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، تو یہ جنگ کی فطرت کے باعث نہیں ہے بلکہ جنگ کے برے استعمال کے باعث ہیں۔" فرانسیسی کتاب "شجرہ حروب" کے مولف بونے نے یاد دلایا ہے کہ حاکم عدالت کو انصاف کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اگر کوئی حاکم عدالت خود ظلم کرے تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادارۂ عدل گستری ایک بری چیز ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیوں کہ ظلم کرنا ادارۂ عدل گستری کے باعث نہ ہوگا بلکہ اس ادارے کے برے استعمال اور برے حکام عدالت کے باعث۔ اصل میں ہر بھلائی اور نیکی کی خدا ہی کی طرف سے توفیق ہوتی ہے۔" یہی مولف یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ جنگ انصاف پسند لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، مذہبی قانون کی طرف سے بھی، کشوری قانون کی طرف سے بھی اور قانون فطرت کی طرف سے بھی۔

جنگ کا اصل میں جائز ہونا ایک ایسا نظریہ تھا جس کے مانع
باقی رہے، جیسا کہ ہمیں بیان کرنے کا موقع ملے گا۔ اس نظریے کی
سنجیدہ مخالفت کسی نے نہیں کی سوائے ایک شخص وائیکلف کے جو
قرونِ متوسطہ کی بیباک ترین ذہانتوں میں سے ایک تھا اور جس
نے اس مبارک سلسلے کو جاری رکھا جس پر قرونِ متوسطہ کے انگریز
مصلحین مشتمل ہیں۔ چنانچہ یہ گروس ٹیسٹ اور بریڈوارڈن کا جانشین
ہوا تھا۔ جنگ کے جواز پر اس نے جو حملہ کیا تھا، وہ اتنا شدید
تھا کہ اس کے بعد دو صدیوں سے زاید عرصہ گزرنے کے باوجود
یہ ضروری خیال کیا گیا کہ اس عظیم شخصیت کے دلائل کی تردید کی جائے

پوپ گیارھویں گریگری کی وفات پر چھٹے اربان اور ساتویں
کلیماں دو اشخاص منصب پاپائی کے مدعی بن کر کھڑے ہوئے۔ وائیکلف
نے دونوں ہی مدعیوں کو ناحق ٹھیرایا اور جب چھٹے اربان نے
انگلستان میں اس تحریک کی ابتدا کروائی کہ ساتویں کلیماں کے پیروؤں
کے خلاف ایک مقدس صلیبی جنگ کی جائے تو وائیکلف نے اس
ہنگامے میں اپنے کو الجھا لیا اور بکثرت تحریروں کے ذریعے سے
اس قابلِ سرزنش کوشش کو برا ٹھیرایا۔ چنانچہ لاطینی کتاب "مظالم
یا پادریوں کی جنگ" اور لاطینی کتاب "مذہبی قسم کی باتیں" اسی کے
متعلق لکھی گئی تھیں۔ اس کی رائے میں ہر جنگ فی نفسہ ناجائز ہے
اور اس کا دعویٰ کیا گیا کہ پوپ اگر جنگ کا حکم دے تو وہ نیکی کی
روح کے خلاف کارروائی ہے۔ وائیکلف کا بیان ہے کہ عہد نامۂ قدیم
یعنی توریت سے استدلال نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس وقت لوگ
اس غرض کے لیے جنگ کر رہے تھے کہ خدا کے متعلق جو ناانصافیاں
کی گئی تھیں ان کا انتقام لیں۔ مزید برآں اگر پروردگار نے نئے
قانون یعنی انجیل کی حفاظت قوت کے ذریعے سے کرنے کی اجازت
دی ہے تو بہرحال اس نے کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی

48

فتوحات کا حق اصل میں ایک بڑے پیمانے پر چوری کے مترادف ہے اگر قادرِ مطلق فتوحات کا حکم دے تو ہی فتح درست ہوسکتی ہے، اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں۔" اسی مصلح نے یہ بھی کہا تھا کہ "خداوندا! اس سوار کی کیا ہی عزت کی جاتی ہے جو انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کرچکا ہو۔ جلاد اس سے زیادہ اشخاص کو قتل کرتا ہے اس کی اس سے زیادہ عزت ہونی چاہیے۔ جانوروں کو مارنے والے قصاب کی عزت اپنے بھائیوں کو قتل کرنے والے قصاب یعنے سپاہی سے زیادہ ہونی چاہیے کیوں کہ یہ فطرت کے نسبۃً کم مخالف ہوگا۔"

لولارڈ کے مسلک نے وائیکلف ہی سے ترقی پائی تھی اور وائیکلف کے ہاں قتل و خون کے خلاف جس دہشت کا اظہار ہے لولارڈ کے پیروؤں میں بھی وہی چیز نظر آتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی ہتیار اٹھانے کی ہر صورت کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور خون بہانے کی ممانعت کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف جو نظریے منسوب ہیں ان میں ایک وہ نظریہ بھی ہے جو غلط لاطینی میں لکھا گیا ہے اگرچہ اپنے منشاء کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے اور جو سزائے موت کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسے انجیل کے خلاف ٹھیراتا ہے۔ چنانچہ وہ لاطینی عبارت یہ ہے: "انسان کا قتل کرنا چاہے جنگ کے ذریعے سے ہو، یا دنیاوی اغراض کے لیئے، انصاف رسانی کی غرض سے قانون کے بہانے سے متعلق ہو، یہ عہد نامۂ جدید یعنے انجیل کے صریح مخالف ہے کیوں کہ انجیل کا قانون رحم اور کرم سے لبریز ہے۔"[1]

یہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام

---

[1] جان وائی کلف کے اختلافی رسائل کا [لاطینی] مجموعہ شائع کردہ شرلے صفحہ (۳۶۶)

49 اور سولھویں صدی کے آغاز پر انگلستان میں چند رحم پرور اور راسخ الخیال لوگ گذرے ہیں مثلاً جان کولٹ، ٹامس مور، اور اراسمس جو امن کے ویسے ہی زبردست حامی تھے۔ ٹامس مور اور اراسمس کے امن پسندانہ نظریے حقیقت میں کولٹ ہی کے زیر اثر ہے اور کولٹ کے خیالات کا ماخذ جاننے کے لیے وائیکلف تک ہی جانا کافی ہے۔[1]

---

[1] مزید براں دیکھئے آگے صفحہ (391)

باب چہارم

بین الممالک جھگڑوں کی یکسوئی

۴۹

ہمارے زمانے میں انسانیت جس درجے تک ترقی کر چکی ہے اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا سب سے اعلیٰ مظاہرہ مملکت کی ذات میں مرتکز ہوتا ہے۔ مملکت کے باہر اور مملکت کے اوپر کوئی ایسی قوت نہیں پائی جاتی جو قانون بنا سکے، یا حقوق کا نفاذ کرا سکے۔ جہاں تک اصولی بحث کا تعلق ہے، ہتیار سے مدد لینی جائز ہے کیوں کہ کوئی ایسی قوت نہیں پائی جاتی جو معمولاً اپنی مرضی و مشیت دوسری مملکتوں پر چلا سکے کیوں کہ وہ خود بھی قانونی شخصیت سے اتنی ہی متصف ہوتی ہیں۔ کسی ایک معینہ صورت میں قوت کا استعمال اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ضروری اور ناگزیر نہ ہو گیا ہو۔ جنگ اصل میں جھگڑوں کو چکانے کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن وہ ایک انتہائی طریقہ ہے جس کا استعمال صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اختلافات کی یکسوئی کا قطعاً کوئی اور امکان باقی نہ رہا ہو۔ جیسا کہ سینٹ آگسٹائین نے (لاطینی میں) بیان

کیا تھا کہ "امن کو اپنی مرضی و مشیت سے حاصل کرنا چاہیے اور جنگ کو صرف ضرورت پر"۔ یہ مقولہ گراتیان نے اپنی تالیف میں شامل کیا ہے اور قرون متوسط کے اکثر مولفوں نے اسے لفظ بہ لفظ دہرایا بھی ہے۔ اور یہ اس مسئلے کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ کو چاہیے کہ اپنے رجحان اور اپنی مشیت سے امن کو برقرار رکھے اور وہ جنگ اس وقت تک نہ کرے جب تک کہ انتہائی ضرورت لاحق نہ ہو۔

جنگ کیے بغیر جھگڑے چکانے کے جو طریقے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلے دوستانہ کوشش اور دوسرے عملی یا واقعاتی طریقے۔ اب ہم اس بات کی تحقیق کریں گے کہ قرون متوسطہ میں کونسے طریقے خاص طور پر مستعمل ہوتے تھے۔

50

فصل اول

دوستانہ کوشش

گروتیوس نے بیان کیا ہے کہ جنگ نہ ہونے دینے کے لیے تین ایسے طریقے ہیں جن کو دوستانہ کوششوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پہلے باہم اختلاف رکھنے والے فریقوں میں دوستانہ تبادلۂ خیال، دوسرے تحکیم (ثالثی) کے ذریعے سے مصالحت کرنا اور تیسرے قرعہ[1] ہم یہاں صرف پہلے دو طریقوں سے بحث کریں گے۔ قرعے کے متعلق یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس کا استعمال مختلف موقعوں پر ہوا ہے خاص کر ان جھگڑوں میں جو تقسیم کے موقع پر یا حق تقدم (سینیارٹی) کے سلسلے میں پیدا ہوئے۔ یہ چیز خاص کر سنہ ۱۶۰۸ء میں نظر آتی ہے جب شہنشاہ نے شہنشاہی مجلس سے سفارش کی تھی کہ جو حکمران حق تقدم کے متعلق جھگڑ رہے ہیں ان کے رتبے کا فیصلہ کرنے کے لیے قرعہ ڈالے۔ اسی طرح سنہ ۱۷۰۹ء میں برلین کا سفر کرتے وقت ڈنمارک اور پولینڈ کے بادشاہوں نے قرعہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا چاہا کہ پہلی مرتبہ حق تقدم

[1] گروتیوس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ و صلح" کتاب سوم حصہ دوم باب (۲۳) ف ۷، ۸ و ۹۔

کس کو حاصل ہوگا۔ بجز اس کے کہ نوبت بہ نوبت متبادل طور سے وہ اس حق کا استعمال کریں۔

گروٹیوس نے جن دوستانہ تبادلہ ہائے خیال کا ذکر کیا ہے وہ قرون متوسطہ میں معدوم نہیں ہیں۔ لیکن ان ملاقاتوں میں کچھ اتنی زیادہ احتیاطیں برتی جاتی تھیں اور ان کو کچھ اتنا زیادہ ناپسند کیا جاتا تھا کہ دوستانہ تبادلۂ خیال کو جھگڑے چکانے کا کوئی معمولی طریقہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں بے اطمینانی کا اتنا زیادہ عنصر شامل ہونے کی وجہ اس زمانے کا نظام حکومت ہے جو شاہی یا جاگیرداری اصول پر مبنی تھا اور حکمران کی مرضی ہی پر سب کچھ مبنی ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے حکمران کی ذات پر قبضے کا سوال بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا[1]۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حکمران نہ صرف باضابطہ طور سے اس کا مطالبہ کرتے تھے کہ انھیں آزادانہ آنے جانے کا اطمینان دلایا جائے بلکہ وہ خود ہی انتہائی تفصیل کے ساتھ اپنی احتیاطیں خود برتتے تھے۔ ایک مولف نے اس کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ مونٹرو کے پل پر جو المناک جان لیوا حملہ ہوا تھا اور جس میں برگنڈی کے ڈیوک ژاں بے باک کو قتل کر دیا گیا تھا، اس کی افسوسناک یاد برقرار تھی۔ اور پندرھویں صدی عیسوی کی پوری سیاست خارجہ کی تشکیل اسی نے کی تھی[2]۔ اس کے علاوہ حقیقت میں ملاقاتوں کے نتیجے عموماً مضر ہوتے تھے اور تذبذب پسند مورخ کومین نے جو اس کے اسباب سے واقف تھا، اس بارے میں طویل صفحات لکھ مارے ہیں جن میں وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جب دو حکمران اس غرض سے باہم ملتے ہیں کہ جھگڑوں کا فیصلہ کریں تو یہ امر فائدے سے

51

---

[1] مود لاکلا ڈیبکیر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۰۸)

[2] ایضاً صفحہ ۲۰۹۔

زیادہ نقصان رساں ہی ثابت ہوتا ہے[1]۔

مصالحت کی حالت بالکل جدا ہے۔ گروتیوس اس اصطلاح میں نہ صرف غیر جانبداروں کی دوستانہ دخل ہی اور ثالثی و وساطت کو شامل سمجھتا ہے بلکہ اس چیز کو بھی جسے واقعی مصالحت کہا جاسکتا ہے[2]۔

فریقین کے دوستوں کا یک بیک اپنے حسن خدمات کو پیش کرتے ہوئے دخل دینا ایک الگ چیز ہے اور ثالثی ایک الگ چیز ہے کیونکہ اس میں فریقین اس مصالحت کرانے والی دخل دہی کو قبول بھی کرلیتے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ان دونوں قسموں میں امتیاز کیا جانے لگا۔ چنانچہ دخل دہندہ یا صلح کار اُن ثالثوں کو کہا جانے لگا جن کی دخل دہی کو فریقین نے صراحت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ اس کے برخلاف ثالث یا وساطت کار ان لوگوں کو کہا جانے لگا جنھیں فریقین کی طرف سے ایک واقعی "تفویض" حاصل ہوچکی ہو[3]۔

ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جن میں مختلف حکمرانوں نے اپنے حسن خدمات کا پیشکش کیا ہو یا اپنی ثالثی قبول کروائی ہو تاکہ کسی کشیدگی کا ازالہ ہوجائے یا دوستانہ تعلقات بحال ہوجائیں۔

پوپ کی حیثیت صلح کار اعظم کی تھی۔ جب ہم صلح کے اعادے اور صلح کے معاہدوں سے بحث کریں گے، تو اس وقت اس مسئلے پر بھی ہم مکرر نظر ڈالیں گے۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ پوپوں نے اکثر اپنے حسن خدمات پیش کیے اور ان کی کوششیں اکثر کامیاب بھی رہیں۔

---

[1] فلپ کومین کی فرانسیسی کتاب "یادداشتیں" حصۂ دوم باب (۸)

[2] گروتیوس کی لاطینی "قانون جنگ و صلح" کتاب سوم حصۂ سوم باب (۲۰) ت ۴۶ و ۴۷۔

[3] ہنری کوچے ای کی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح کی تین کتابوں کی شرح" مطبوعہ لوزان ۱۷۵۱ء جلد (۴) صفحہ ۳۷۲ — ساموئل کوچے ای کی لاطینی کتاب "مشہور گروتیوس کا دیباچہ" جلد (۵) صفحہ ۲۴۸ مطبوعہ لوزان — دے آل ڈبور بان کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد (۵) صفحہ ۶۵۶۔

صلح کرانے کا کام پوپوں کا کچھ اجارہ نہ تھا۔ مختلف بادشاہ اور حکمران بھی یہی کام انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی توجہ کو کامیابی حاصل ہونی ہمیشہ ضرور نہیں رہی۔ چنانچہ مورخ کومین نے گیارھویں لوئی اور "شارل جسارت مند" (برگنڈی کے آخری ڈیوک) کے جھگڑوں کے متعلق یہ مزیدار بات لکھی ہے کہ "پرتگال کا یہ بیچارہ بادشاہ، جو بہت اچھا اور انصاف پسند تھا، یہ خیال کرنے لگا کہ وہ برگنڈی کے جس ڈیوک کے پاس جارہا ہے وہ اس کا چچازاد بھائی ہے اور یہ کہ بادشاہ اور ڈیوک میں جو جھگڑا ہے وہ اس کا فیصلہ کرادے گا"[1]

82 جس چیز کو صحیح معنوں میں مصالحت کہا جاسکتا ہے، وہ بہ نسبت وساطت یا ثالثی کے زیادہ پیش آتی رہی ہے۔ قرون متوسطہ میں اس کا زیادہ رواج تھا۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی کے بعد اس کا اتنا رواج نہ رہا[2] قرون متوسطہ کی مشہور کتاب "کونسولا تو دیل مارے" (بحری قواعد) کی ایک نفیس عبارت میں اس کا پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں اس موضوع پر کیا خیالات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی جہاز گرفتار ہونے کے بعد دوبارہ رہا کرالیا جاتا تو اس کے متعلق اس کتاب میں جو قدیم رواجات بیان ہوئے ہیں ان میں لکھا ہے کہ اگر جہاز والے باہم متفق نہ ہوسکیں تو ان کو چاہیے کہ اس جھگڑے کا فیصلہ پنچایت پر چھوڑ دیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "یہ منصفانہ بات ہوگی کہ کوئی شخص اپنے حق کو دوسرے پر قوت و زور کے ساتھ نافذ نہ کرے۔ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے اور نہ ہی اسے اس بات کا کبھی یقین ہوسکتا ہے کہ کسی آیندہ نوبت پر اسے بھی کہیں اس طرح نقصان اٹھانے پر

[1] فلپ کومین کی فرانسیسی کتاب "یادداشتیں" حصہ اول باب ۸۔
[2] کرسٹوف فون شلائی نٹس کی سنہ ۱۸۳۱ء میں ہلم اشتات میں شایع شدہ لاطینی کتاب "صلح کارانہ گفت و شنید مابین اقوام کی تشریح"۔

مجبور نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنے جھگڑے کو پنچایت کے علم میں لائے تاکہ نہ تو خدا اور نہ ہی انسان اس کے خلاف الزام لگانے کا موقع پا سکیں"۔

چند واقعات کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۱۷۶ء میں آراگون اور نوار کے بادشاہوں نے اپنا ایک جھگڑا انگلستان کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اس کی جانچ کرے۔ ہر دو فریق مقدمہ نے بادشاہ انگلستان کی تحکیم کی تعمیل کا اطمینان دلانے کے لیے بطور ضمانت چار قلعے پیش کیے، اور انھوں نے اپنی طرف سے مختار کل نمایندوں کو مقرر کیا کہ وہ انگریزی بادشاہ کے پاس جا کر اس کے فیصلے کا علم حاصل کریں۔ فریقین کو تیس دن کی مہلت دی گئی تھی تاکہ وہ "عدالت" کے سامنے حاضر ہوں۔ اور اس مدت کے گزرنے کے بعد جو فریق بھی حاضر ہونے سے قاصر رہے گا، وہ اپنے ضمانت میں رکھے ہوئے قلعوں سے محروم ہو جائے گا۔ حکم کی موت کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا تھا کہ ایسی صورت میں بادشاہ انگلستان کی جگہ بادشاہ فرانس یہ کام انجام دے۔

مونٹ فورڈ کے سائمن نے انگریزی جاگیرداروں کو ساتھ لے کر جب تیسرے ہنری کے خلاف ایک سخت خانہ جنگی کی تو ہر دو فریقوں نے سینٹ لوئی کو اپنے باہمی دعووں کا پنچ مقرر کیا۔ چنانچہ فرانس کے اس بادشاہ نے فریقین کو بمقام آمیاں طلب کیا اور وہیں تیسرے ہنری اور جاگیرداروں کے نمایندوں نے اپنی اپنی بحث کی۔ ۲۳ جنوری ۱۲۶۴ء کو لوئی نے اپنا مشہور فیصلہ صادر کیا جس میں اس نے ہنری کے حق کو پوری طرح تسلیم کیا تھا۔ اگرچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فیصلہ بالکل بھی بر انصاف نہ تھا اور کسی نے اس کو مانا بھی نہیں [لیکن یہاں صرف یہ عمل دکھانا ہے کہ ایسی چیزیں بھی تحکیم کے لیے پیش ہوتی رہی ہیں۔ اس معاملے کا انجام بیان کرنے کے لیے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ] اس کے بعد

جو واقعات جلد جلد پیش آئے ان کے سلسلے میں مونٹ فورڈ کے سایمن نے ۱۲۶۵ء کی مشہور پارلیمان طلب کی۔ پھر لڑائیاں چھڑ گئیں اور آخر انگریزی آزادیوں کا یہ مشہور حامی ایفشزہام میں میدان جنگ میں کھیت رہا۔

53 تیسرے الگزانڈر کی وفات پر پہلے ایڈورڈ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے دعوت دی گئی تھی کہ اسکاٹلینڈ کے تخت کے (۱۲) امیدواروں میں سے کون صحیح حقدار ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک اہم تحکیم کا واقعہ پیش آیا۔ ایڈورڈ اول اور "خوبصورت فلپ" کے جھگڑوں میں پوپ آٹھویں بونی فاس نے دخل اندازی کی تھی۔ ۱۲۹۶ء میں تو اس نے ان دونوں بادشاہوں کو اپنی اعلیٰ عدالت کے سامنے حاضر ہونے کا حکم بھی بھیجا لیکن فرانس کی طرح انگلستان میں بھی اس کے دعووں کی غیر مغلوب مخالفت ہوئی بلکہ ان کے باعث اس زمانے میں ایک پرزور جھگڑا اس موضوع کے متعلق چھڑ گیا کہ کشوری (یعنے غیر مذہبی) اقتدار کے حدود کیا ہیں۔ ۱۲۹۸ء میں دونوں بادشاہ اور پوپ مصالحت کرتے نظر آتے ہیں اور ہر دو حکمرانوں نے یہ بات منظور کرلی کہ اپنا جھگڑا پوپ آٹھویں بونی فاس کی تحکیم کے لیے پیش کریں۔ احتیاطاً انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ انھوں نے اس تحکیم کو جو منظور کیا ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ پوپ کو اپنے عہدے کے باعث ایسا کوئی حق حاصل ہے بلکہ انھوں نے محض اپنی پسند سے یہ انتخاب کیا ہے اور اگر وہ چاہتے تو پوپ کے سوا کسی اور شخص کا بھی اس غرض کے لیے انتخاب کرسکتے۔ اس تحکیم کا فیصلہ ۲۷ جون ۱۲۹۸ء کو صادر ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہر دو بادشاہوں نے پوپ آٹھویں بونی فاس کو اس کی خانگی حیثیت میں انتخاب کیا تھا۔ گویا حقیقت میں پوپ آٹھویں بونی فاس نے نہیں بلکہ بے نو اگابیتانی نامی شخص نے [جو بونی فاس کا اصل نام تھا] یہ فیصلہ صادر کیا تھا۔ لیکن حَکَم نے اپنے حدود اختیار سے تجاوز کیا تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ پوپ نے

صدر پادریوں کی باقاعدہ مجلس میں سنایا۔ چند ہی دنوں بعد پوپ نے اس فیصلے کے متعلق ایک بُل یعنے مذہبی فرمان بھی صادر کیا اور بادشاہ انگلستان کے سفیر یعنے ڈرہام کے اسقف کو اس بات کا ذمہ دار گردانا کہ وہ اسے فرانس کے بادشاہ تک پہنچائے۔

۱۳۱۷ء میں انگلستان، قسطیلہ، آراگون اور پرتگال کے بادشاہوں نے فرانس اور فلانڈرس کے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ پوپ بائیسویں جان کی تحکیم کو منظور کرے۔ اور ساتھ ہی یہ تحفظ کیا کہ فلانڈرس والے اور وہاں کا بادشاہ اس تحکیم کو صرف اس لیے منظور کریں گے کہ "وہ محض ان کی اپنی ذاتی خواہش کے مطابق ہے"۔

فرانس کے علاقہ ؔقالوا کے حکمران فلپ نے ۱۳۳۴ء میں بطور حَکَم ایک مقدمے میں فیصلہ صادر کیا تھا جس میں ایک فریق تو بوہیمیا کا بادشاہ اور مختلف جرمن حکمران تھے اور دوسری طرف برابان کا ڈیوک فریق تھا۔ اس نے اپنے فیصلے میں بیان کیا تھا کہ "فیصلہ کرنے کے لیے نامزد ہونے اور انتخاب کیے جانے کے باعث، ان معزز لوگوں میں جو ہمارے عزیز دوست ہیں، صلح کرانے اور دوستانہ طور سے جھگڑا چکانے کے لیے..."

چودھویں صدی عیسوی میں ڈنمارک کے بادشاہ اور ہول اِنسٹائن کے جاگیرداروں نے شہنشاہ زیگِس مُوند کو اس غرض کے لیے حَکَم مقرر کیا تھا کہ شلیس وِش (سایلیشیا) کے متعلق پیدا شدہ ایک جھگڑے کا فیصلہ کرے۔

54

گیارھویں لوئی نے قسطیلہ اور آراگون کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا اور اسی طرح آسٹریا کے زیگِس مُوند اور سوئٹزرلینڈ والوں کے جھگڑے کا بھی۔

ہالینڈ کے علاقہ گیلدر کے ڈیوک اور ژولیر کے ڈیوک نے بارھویں لوئی کو اپنا واحد حَکَم نامزد کیا تھا۔ بادشاہ لوئی نے اپنی پارلیمان سے مشورہ کیا کہ وہ اپنے فیصلے کے لیے جس مشیر کو چاہے طلب کرسکتا ہے

کیونکہ "کسی حکمران کا یہ ایک صحیح طریقہ ہوتا ہے اور اس کا قدرتی فریضہ بھی کہ بغیر مشورے کے نہ تو کوئی کام کرے اور نہ حکم دے"۔

ایک دلچسپ واقعہ سولھویں صدی عیسوی میں پیش آتا ہے۔ ۸ جون ۱۵۴۶ء کو فرانس اور انگلستان میں پانچ لاکھ بارہ ہزار اشرفیوں کے بقیہ قرض کے متعلق ایک معاہدہ ہوا تھا۔ انگلستان کو قرض خواہ ہونے کا دعوی تھا۔ طے ہوا کہ یہ معاملہ دو اشخاص کے تفویض کیا جائے گا جن میں سے ایک ایک کا تقرر ایک ایک فریق معاہدہ کی جانب سے ہوگا۔ اور اگر یہ دونوں پنچ تین مہینوں کے اندر فیصلہ نہ کرسکیں تو دونوں حکمرانوں میں سے ہر ایک دو دو مشیران قانون کا انتخاب کرے گا جو کسی اجنبی حکمران کی رعایا ہوں اور ان کا فیصلہ فریقین معاہدہ اور ان کے جانشینوں کے لیے قابل پابندی ہوگا۔

لاطینی کتاب "نہایت بچے عیسائی بادشاہ ہنری کے زمانے کے اہم مقدمات پر مباحث" میں جو اغلباً ۱۵۵۶ء میں شایع ہوئی تھی (۳۰۰) سے زیادہ فیصلوں کا ذکر ہے، جو اس کتاب کے مولف راول ایبی فام نے بادشاہ ہنری دوم کی طرف منسوب کیے ہیں[1]۔ ان میں ایسے متعدد جدت بھرے تصور بھی ملتے ہیں جن کا تحقق ممکن نہیں ہوسکا۔ اسی طرح ان میں بعض عجیب رجحانات بھی نظر آتے ہیں جو بیمار ذہنیت کا نتیجہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ ایبی فام پارلیمان پاریس کا وکیل تھا۔ اس نے فیصلہ نمبر (۲۵۹) میں اس بڑی جماعت کی اصلاح سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سابق میں وہ اتنی مقدس اور عمدگی کے ساتھ چلائی جارہی تھی کہ بیرونی حکمران اس کے پاس انصاف طلبی کے لیے حاضر ہوتے اور اس کے معقول فیصلوں کو مانتے تھے۔

---

[1] نیس کا فرانسیسی مضمون "راول ایبی فام وکیل پارلیمان پاریس" فرانسیسی "رسالہ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" بابتہ ۱۹۰۸ء میں۔

کیوں کہ انھیں کسی اور جگہ اتنا زیادہ انصاف اور سلامتی حاصل نہیں ہوتی تھی"۔ یہی ریمارک ایک صدی پہلے شاعر انتوان داستی نے بھی کیا تھا۔ یہ اورلیان نے حکمران شارل کا وفادار دوست تھا اور اس کے لیے وہ لاطینی میں کتابیں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نظم موں فرا کے مارکویس کے نام معنون کی تھی جس میں اس نے شہر پاریس کی عظمت کے راگ گائے ہیں۔ اس میں اس نے وہاں کے عجائبات میں سے ایک وہاں کی پارلیمان بھی بیان کی ہے "جس کے انصاف کی شہرت اتنی بڑی ہے کہ اجنبی حتیٰ کہ غیر مذہب والے بھی بعض وقت اپنے مقدمے اس کے ہاں رجوع کرتے ہیں"۔

باپوں کی کتاب پر ایک تعلیق میں ایسی متعدد نظیروں کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں پاریس کی پارلیمان کو حکم بنایا گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "نامور کے کونٹ نے جب ثالوا کے شارل سے، ترنتے کے فلپ نے برگنڈی کے ڈیوک سے، لورین کے ڈیوک نے شاتیوں کے گائی سے، سافائے کے ڈیوک نے ڈوفینے کے شہزادے سے، اور قسطیلہ کے بادشاہ نے پرتگال کے بادشاہ سے جب جھگڑا کیا تو انھوں نے پاریس کی پارلیمان کے سپرد اپنا اپنا معاملہ کیا۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ اس عدالت کی عظمت و جلالت کتنی قدیم ہے۔ چنانچہ اجنبی بادشاہ اور حکمران تک اپنے جھگڑوں میں اس کا تحکیم کے لیے انتخاب کرتے رہے ہیں"[1]۔

گرے نوبل کی پارلیمان کو وسیع سیاسی اختیارات حاصل تھے اور وہ ملک کے نظم و نسق میں بھی حصہ لیا کرتی تھی۔ پہلے فرانسوا کے زمانے میں اس کا انتخاب اس غرض کے لیے ہوا تھا کہ وہ حکمرانوں میں

55

---

[1] باپوں کی فرانسیسی کتاب "فرانس کی مقتدر عدالتوں کے عمدہ فیصلوں کا مجموعہ" حصہ چہارم، عنوان ششم، فیصلہ (۱۴)۔

ہیلانے کے کچھ علاقے کے متعلق جو جھگڑا ہو رہا تھا اس کا فیصلہ کرے۔
۱۵۰۷ء میں دی ثروں کی پارلیمان کے ایک رکن کا انتخاب اسپین کے بادشاہ اور سوئٹزرلینڈ (سوئٹزرلینڈ) والوں نے اس غرض کے لیے کیا تھا کہ "آزاد کونٹی" کے متعلق ان کے دعووں کا فیصلہ کرے۔
۱۶۱۳ء اور ۱۶۱۴ء میں گرے نوبل کی پارلیمان نے ایک تحکیم کے سلسلے میں دو فیصلے صادر کیے تھے۔ آسٹریا کے آرک ڈیوک اور ورٹیم برگ کے آرک ڈیوک میں موں بے لیار کی کونٹی کے متعلق جھگڑا تھا اور فریقین مقدمہ ہی نے اس پارلیمان سے رجوع کیا تھا۔
یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پوفنڈورف نے اس بات پر زور دینا ضروری خیال کیا ہے کہ تحکیم کے لیے منتخب ہونے والے شخص کے فرائض کیا کیا ہیں۔ چنانچہ اس کو چاہیے کہ سب سے زیادہ اس بات کا لحاظ کرے کہ کسی ستایش یا شکایت کی پروا کیے بغیر فیصلہ کرے اور صرف حق و انصاف کے مطابق تصفیہ کرے۔ پوفنڈورف کی کتاب کے مترجم باربیراک نے اس سلسلے میں فرانچسکو گچاردینی کا حوالہ دیا ہے جس نے اپنی "تاریخ اٹلی بابتہ ۱۴۹۲ء تا ۱۵۳۲ء" میں ایک خاصا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ۱۵۱۲ء میں شہنشاہ مکس میلیان نے قسا بنس پر فتح حاصل کرنے کے بعد اس بات پر نسبتہً زیادہ آمادگی ظاہر کرنی شروع کی تھی کہ ونیس والوں سے صلح کرے۔ یہ ہمیشہ روما میں گفت و شنید کرتا رہا۔ آخر ونیس کے سفیروں نے گورک کے اسقف کی (جو اٹلی میں شہنشاہ کا صدر نائب تھا) تائید سے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کی جمہوریت کو شہنشاہ مکس میلیان کے ساتھ جتنے بھی جھگڑے ہیں وہ تحکیم کے لیے پوپ دسویں لیو کے پاس پیش کیے جائیں۔ یہ آمادگی پُرخلوص نہ تھی۔ اسقف اور سفیر سب ہی کو اتنے اہم معاملے کے ایک مشتبہ حَکَم کے ہاتھ سپرد کیے جانے پر دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اور انھوں نے اس مصالحت کی تجویز پر دستخط کرنے اس وقت تک پسند نہ کیے جب تک کہ

پوپ نے ان میں سے ہر ایک سے مخفی اور علٰحدہ علٰحدہ طور سے یہ وعدہ نہ کر لیا کہ وہ ان کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

56

مصالحت کے سلسلے ہی میں اکثر کسی حکمران کی دخل دہی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال چودھویں صدی میں ملتی ہے۔ ہالینڈ اور دریائے رائن کے علاقوں کے جاگیرداروں کو (جن کی جاگیریں فرانس میں تھیں اور جو نہیں چاہتے تھے کہ شہنشاہ کے حکم کے بغیر ثالوا کے فلپ کے خلاف ہونے کا فیصلہ کریں) ہموار کرنے کے لیے تیسرے ایڈورڈ نے باویریا کے لوئی کو مخاطب کیا۔ شہنشاہ نے شہر کوبلنٹس میں ۳ ستمبر ۱۳۳۸ء کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کی۔ تیسرے ایڈورڈ نے اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا اور شہنشاہ سے نیز مقدس رومی سلطنت کے دیگر حکمرانوں سے، التجا کی کہ ثالوا کے فلپ سے انصاف حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں کیوں کہ فلپ غیر منصفانہ طور سے پلانٹاگینٹ کے پرانے مقبوضوں اور فرانس کے تاج پر متصرف ہے۔ لوئی نے ایڈورڈ کی درخواست کو اپنی مقتدرانہ حیثیت میں قبول کیا اور خود ہی اس نے فلپ پر چوری کا الزام عائد کیا کیوں کہ اس نے ان جاگیروں کا، جو شہنشاہیت کی طرف سے اسے ملی تھیں، خراج ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔ اپنے بڑے بڑے ماتحت حکمرانوں کی رضامندی سے شہنشاہ نے فلپ کے متعلق اعلان کیا کہ اب اسے "مقدس رومی سلطنت کی حفاظت کا قطعاً کوئی حق نہیں رہا"۔ اور اس نے تیسرے ایڈورڈ کو دریائے رائن کے بائیں کنارے کے جملہ صوبوں میں سات سال کے لیے اپنا نائب مقرر کیا اور ساتھ ہی اس کو فوجی انتظام اور اقتدار اعلیٰ کے جملہ حقوق بھی عطا کیے۔ مجلس شوریٰ کا ایک اور اجلاس علاقۂ لِم بُورگ میں بمقام ہرک منعقد ہوا اور تیسرے ایڈورڈ نے ایک تخت پر بیٹھ کر اور اپنے سر پر تاج رکھ کر شہنشاہی باجگزاروں کی "وفاداری اور اطاعت شعاری" کا اظہار قبول کیا۔

قرون متوسطہ میں مختلف حکمران اپنے دعووں کو اچھی بنیادوں پر قائم کرنے کی جو محتاط کوشش کرتے تھے اس کا منشا سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اس بات کا مظاہرہ کریں کہ انصاف انھیں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ یہ چیز ہمیں رائے عامہ سے ان کی اپیلوں میں بھی ہویدا نظر آتی ہے۔

پوپ سے جھگڑے کے دوران میں دوسرے فریڈرک نے یکے بعد دیگرے کارڈینلوں (صدر پادریوں) اور رومی باشندوں اور عیسائی حکمرانوں سے ایسی ہی اپیل کی تھی۔ اس نے عیسائی حکمرانوں کے نام ایک خط میں یہ کہہ کر پوپ کے دعووں کی تردید کی ہے کہ یہ مذہبی اقتدار، اپنی عظمت کے لیے، اصل میں دنیاوی اقتدار ہی کی عنایت کا رہین منت ہے۔ اور اس کے باوجود وہ اس کے احسانات کو بھلا رہا ہے اور مقدس رومی سلطنت کو اپنے قدموں میں روندنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سابق میں وہ خود انگلستان کے بادشاہ اور دیگر حکمرانوں کے ایک ماتحت کے رتبے پر پہنچ چکا تھا۔

ایک اور اہم واقعہ، جس میں اس طرح کی اپیل راست نہیں کی گئی تھی بلکہ بالواسطہ اور ایک حد تک پوشیدہ تھی، اس وقت پیش آیا جب پہلا ایڈورڈ حکمرانی کر رہا تھا۔ پوپ آٹھویں بونی فاس نے اسکاٹ لینڈ کے متعلق ایڈورڈ کی اختیار کردہ سیاست کے متعلق مشوروں اور تنبیہوں میں ناکام ہونے کے بعد، اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ مملکت قدیم زمانے سے کلیسا کے ماتحت ہے اور اس نے انگریز حکمران کے نام حکمنامہ بھیجا کہ اسکاٹ لینڈ کے ان تمام صدر پادریوں کو رہا کر دیا جائے جو قید کر لیے گئے ہیں۔ اور اس کو اس بات کی دعوت دی کہ اگر اسے کوئی دعوے ہیں تو ان کی تائید میں دستاویزیں پوپ کے ملاحظے میں پیش کرے۔

پوپ کا فرمان بادشاہ کو پہنچایا گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اسے ملک کے اعیان و اکابر کے پاس پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور بادشاہ نے

57

ایک اہم دستاویز تیار کرائی جس کی تالیف کے لیے تمام خانقاہوں کی تاریخوں اور ملک کے عالم ترین پادریوں سے استفادہ کیا گیا تھا۔

یہ دستاویز بظاہر پوپ کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے لیکن اس کا اصل منشا رائے عامہ کو متاثر کرنا تھا۔ یہ ایک عجیب سی چیز ہے۔ اور اس میں خوشی کے ساتھ اس چیز کو واضح کر دیا گیا ہے کہ انگلستان کے آغاز سے متعلق کیا کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہو گیا۔ چنانچہ پارلیمان نے پوپ کو ایک زبردست جواب دیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسکاٹ لینڈ ہمیشہ ہی سے انگلستان کی ایک جاگیر رہا ہے اور یہ کہ اس علاقے کے متعلق بادشاہ اپنی حقیقت کی شہادت پوپ کے پاس نہیں پیش کر سکتا اور اگر وہ چاہے بھی تو پارلیمان اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔

"خوبصورت فلپ" اور پوپ آٹھویں بونی فاس میں جو جھگڑے ہوئے ان کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مرتبہ رائے عامہ سے اپیل کی گئی۔ لندن کے محافظ خانۂ دستاویزات میں اس عہد کا ایک تذکرہ پایا جاتا ہے۔ واقعات پاریس میں پیش آئے ہیں۔ "سینٹ جان بپتسمہ دہندہ" کی عید کے موقعے پر اورلیاں کے اسقف نے "بادشاہ اس کے بچوں، آرک بشپوں، اسقفوں، پادریوں، حکمرانوں، فرانس کے مذہبی افسروں، مذہبی سلسلوں کے بڑے لوگوں اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد کے سامنے" ایک وعظ کیا تھا جس میں اس نے واضح کیا تھا کہ پوپ نے بادشاہ پر حملہ کیا ہے اور یہ کہ بادشاہ اور اس کے مشیروں نے چند چیزیں مرتب کی ہیں جن سے دین کی ترقی مقصود ہے ایک پادری اس کا لاطینی متن پڑھتا ہے اور دوسرا اسے فرانسیسی میں سناتا ہے۔ اس آخر الذکر نے یہ بھی اضافہ کیا کہ فرانس کے بادشاہ ہمیشہ ہی راسخ العقیدہ رہے ہیں اور یہ کہ انھوں نے کلیسا اور اسقف روما کے مسکن کی، اور دیگر عیسائی بادشاہوں کے بالمقابل، زیادہ بہتر

حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ بھی کہا کہ: "پوپ غلطی میں غلطان ہے؛ وہ یہ کہتا ہے کہ ابدی زندگی کا کوئی وجود نہیں اور اس بیہے اس نے روما کی ایک بڑی شخصیت کی تو بہ قبول کرنے سے انکار کیا ہے حالانکہ وہ مر رہا تھا۔ اس کو اصرار ہے کہ روما میں مذہبی چیزوں کی خرید و فروخت ممنوع رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خرید و فروخت کا اجارہ خود اس کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ اسے جادوگروں اور جادوگرنیوں پر اعتقاد ہے اس نے کلیسا کی حیثیت گھٹادی ہے۔ اور اس کی حیثیت کو روز بروز ان جنگوں کی وجہ سے کم ہی کرتا رہا ہے جو اس کے اپنے افعال سے ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عیسائی قانون کو تباہ کردے۔ اس نے یہاں تک کہا ہے کہ کلیسائیت کی تباہی اسے زیادہ منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ فرانس کے بادشاہ اور بادشاہت کو تباہ کرنے کے متعلق اس کی تجویز کا نفاذ نہ ہو سکے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ روما کا کلیسا ہی واحد اور اکیلا کلیسا ہے۔ اور اس نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک فرانسسی کی جگہ ایک کتا ہونا پسند کرتا ہے۔" اس پادری نے، جس کا نام ژریل ذرمونو تھا، مزید برآں یہ کہا کہ "پوپ کو اس کی غلطیوں میں باقی رہنے نہیں دیا جا سکتا۔" ان کے علاوہ اور بھی شکائیتوں کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ اس کے بعد دو راہبوں نے وعظ کیا۔ پھر پاریس کے ایک معزز شخص نے اٹھ کر حاضرین سے یہ کہا کہ وہ بتائیں کہ آیا وہ اس سے متفق ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ بادشاہ اور اس کی بادشاہت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ چند افسران تصدیق کنندہ ان کے جواب کی یادداشت لیں گے۔ حاضرین کی اکثریت نے چلا کر کہا کہ: ہاں ہاں۔ اور دوسرے ہی دن بادشاہ نے بھیکو راہبوں" کے پاس [جو صرف بھیک پر پلنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے]، اپنے تصدیق کنندہ افسر بھیجے اور ہر ایک کے خیالات دریافت کروائے

58

ایسے بہت سے لوگ پائے گئے جنھوں نے انکار میں جواب دیا اور ایسے بھوں کو حکم ملا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔

ثالوا کے فلپ اور تیسرے ایڈورڈ کے جھگڑے کے سلسلے میں متعدد بیانات شایع ہوئے۔

"خوبصورت شارل" کی وفات ۱۳۲۸ء میں ہوئی اور اس کی بیوی ژان دیفث ر وجون کہ حاملہ تھی اس لیے ثالوا کے کونٹ فلپ کو نائب السلطنت بنایا گیا۔ مگر ملکہ کو ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس پر ثالوا کے فلپ اور انگلستان کے تیسرے ایڈورڈ، دونوں نے تاج فرانس پر اپنے حقوق جتانے شروع کیے۔ ان میں سے فلپ اگر "خوبصورت شارل" کا چچا زاد بھائی تھا تو ایڈورڈ اس کا بھانجا۔ اس پر ملک کے تینوں بڑے طبقے یعنے پادری، امراء اور مابقی عمائد مدعو ہوئے جن میں تمام معززین، پادری، علماء اور ملک کے وہ تمام دیگر لوگ شامل تھے جو اس طرح کے معاملات کے ماہر تھے۔ بحث دو نکات پر ہوئی۔ ایک تو قدیم سالیکی قانون [قدیم وحشی فرانس کا] اور دوسرے رواج عام۔ سالیکی قانون میں لاطینی میں بیان ہوا تھا کہ "سالیکی سرزمین کا کوئی حصہ عورت کو وراثت میں نہیں مل سکتا؛ وہ پوری کی پوری مرد وارث کو ملے گی"۔ چنانچہ اب تاج فرانس کے متعلق اس کا اطلاق کیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ "خدا، عقل اور انصاف کے مطابق فلپ کا حق سب سے زیادہ ظاہر ہے"۔

۱۳۲۹ء میں ایڈورڈ نے بادشاہ فرانس کی سرداری کو گوی آین کی ڈیوکی اور پوں تیو کی کونٹی اور دیگر علاقوں کے متعلق جو فرانس میں اس کے قبضے میں تھے، تسلیم کیا، لیکن اس نے صرف یہ اعتراف کیا کہ اس "تسلیم" سے منشا صرف ایک توسل کو ماننا ہے۔ البتہ اس نے صرف ایک عمومی "تسلیم" پیش کی جس میں یہ وعدہ تھا کہ جونہی وہ انگلستان پہنچے گا وہ اپنے محافظ خانے میں دستاویزوں کی

تلاش کرائے گا کہ آیا یہ تسلیم اس قسم کی ہونی چاہیے جیسی کہ فلپ کی خواہش تھی اور اگر اس کا جواب اثبات میں نکلے تو وہ حسبہ اعلان کرے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے منشور کے ذریعے سے جس پر اس کی بڑی مہر کا نشان ثبت تھا، ۳۰ مارچ ۱۳۳۱ء کو اس وعدے کی تکمیل کی۔ لیکن ۱۳۳۵ء میں ان دونوں بادشاہوں میں غلط فہمی شروع ہوگئی۔ ۱۳۳۶ء میں فلپ نے ایڈورڈ سے یہ دریافت کروایا کہ آیا یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہ فلپ کے جانی دشمن رابیر دار تو اسے ساز باز کر رہا ہے جسے فرانس سے جلا وطن کیا گیا تھا؟ ایڈورڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فلپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص جو اس کا وفادار ہو "روبیر کو کسی قسم کا مشورہ، آرام یا مدد نہ دے"۔ پھر اس نے تیسرے ایڈورڈ کے خلاف اس بناء پر کارروائی شروع کروائی کہ ہر مقتدر اعلیٰ کو اپنے ماتحتوں پر حق ہوتا ہے اور پے ری گور کے افسر انصاف کو اس پر مامور کیا کہ گوی این کا علاقہ ضبط کرلے۔

اس کے جواب میں تیسرے ایڈورڈ نے ایک اعلان شایع کیا جس میں وہ شکایتیں درج تھیں جو اسے فرانس کے فلپ کے خلاف پیدا ہوئی تھیں اور فرانس کے لیے نائبان عمومی نامزد کیے۔ اس نے "بادشاہ انگلستان و فرانس" کا لقب اختیار کیا۔ اور اپنے ہتھیاروں کے نشان میں چیتے کے ساتھ لیلی کے پھول بھی بنائے۔ فلپ اس پر ناراض ہوا اور اس کے جوابوں میں ایک عجیب چیز ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس کے خیال میں ایڈورڈ کے خلاف کارروائی مہمل تھی "کیوں کہ وہ اس طرح یہ ظاہر کرتا نظر آتا تھا کہ وہ اپنے جزیرے کو ترجیح دے رہا ہے جو فرانس کی طاقتور بادشاہت کے سامنے ایک حقیر مالیت رکھتا ہے"۔ ۱۳۴۰ء میں ایڈورڈ نے اپنے خطاب میں ترمیم کی اور اپنے آپ کو "بادشاہ فرانس و انگلستان اور سردار آیرستان" سے موسوم کیا۔

اثنائے جنگ میں بادشاہ انگلستان نے اپنی قوم سے ایک راست اپیل کی۔ ایک نوٹ آرک بشپوں، اسقفوں اور سربرآوردہ جاگیرداروں کو

59

مخاطب کرکے شایع کیا گیا۔ اس میں یہ یاد دلایا گیا تھا کہ ایڈورڈ نے جنگ نہ ہونے دینے کے لیے ڤالوا کے فلپ کو اچھی سے اچھی تجویزیں پیش کیں۔ اور آخر میں اس کا جو جواب ملا تھا اسے بھی بیان کیا گیا تھا۔
تیسرے ایڈورڈ نے بتایا کہ فرانسیسیوں نے جہازوں کو پکڑ لیا تھا ملاحوں کو مار ڈالا تھا اور انگریزی ساحلوں پر گھس کر "چوری، قتل، ڈاکے اور دیگر ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا تھا" اس نے فرانس کے بادشاہ پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے اس کے خلاف "پوپ اور عیسائیت کے دیگر اکابر کو" بھڑکایا تھا۔ آرک بشپوں، اسقفوں اور جاگیرداروں کو حکم دیا گیا کہ اس نوٹ کی اطلاع پادریوں اور عوام الناس کو دیں اور ان سب کو بادشاہ کی مدد کے لیے آمادہ کریں[1]
یہی چیز اس خط میں بھی نظر آتی ہے جو بادشاہ نے ۱۳۴۶ء میں ڈومی نیکن فرقے کے ایک صدر پادری کو لاطینی میں لکھا تھا کہ وفاداروں اور پادریوں پر یہ امر "عمومی اور خانگی اجتماعوں میں وعظوں کے ذریعے سے" واضح کرے کہ ڤالوا کے فلپ کے خلاف جنگ کے کیا اسباب ہیں[2]۔ فرانس کے بادشاہ نے انگلستان کے بادشاہ کی اس بارے میں پیروی کی اور اس نے بھی رائے عامہ کو مخاطب کیا۔ ان دونوں بادشاہتوں میں گرجوں کے خطبہ گاہ ان اپیلوں سے گونجنے لگے جن میں جنگ کو درست ٹھیرایا جا رہا تھا۔[3] فرواسار نے ہمیں بتایا ہے کہ تولوز کا آرک بشپ "ایک بڑا پادری اور بہادر شخص" تھا جو "اس طرح اور اس عمدگی سے فرانس کے بادشاہ کے جھگڑے کا" پرچار کرتا تھا کہ پورا جنوبی علاقہ فرانس کی طرف مائل ہو گیا۔" بالکل اس کے مماثل طریقے پر انگلستان کے بادشاہ نے

60

[1] ریمر کی لاطینی کتاب "حلیفیاں" جلد (۲) حصہ سوم صفحہ ۱۸۳۔
[2] ایضاً جلد (۲) حصہ چہارم صفحہ ۱۹۳۔
[3] نوروں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۱) متعلق بہ "تومیتیں" صفحہ ۳۰۰۔

اپنی مملکت میں پرچار کیا اور لندن میں ایک خصوصی اسقف کا اس غرض کے لیے تقرر کیا کہ متعدد شاندار اور خوش آہند پیشین گوئیاں کرے اور اپنے وعظوں اور پیشین گوئیوں میں لوگوں کو یہ کہے اور ان کو یہ دکھائے کہ فرانس کا بادشاہ اور وہاں کے لوگ نہایت سخت غلطی اور ناانصافی میں مبتلا ہیں اور انھیں سے جنگ کا دوبارہ آغاز کیا ہے۔ اور ان کا یہ فعل ان مختلف وجوہ اور اسباب کے باعث، جو اس نے واضح کیے تھے، حق اور معقولیت کے خلاف تھا۔" آخر میں فرواسار نے لکھا ہے کہ "ہر دو بادشاہوں کے لیے جنگ کے باعث یہ ناگزیر بھی تھا کہ اپنے جھگڑے کے وجوہ مرتب کر کے اپنی رعایا کو بتائیں اور اس سے ہر ایک بادشاہ کو یہ توقع تھی کہ اس کے حق میں زیادہ زبردست تائید کا جذبہ پیدا ہو سکے گا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ہر دو سلطنتوں میں ہر کوئی انہیں جذبات سے معمور ہو گیا۔"

تیسرے ایڈورڈ نے ایک اور موقعے پر پوری عیسائی دنیا کو مخاطب کیا۔ سنہ ۱۳۵۶ء میں فرانس کے بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا کہ نوار کے شارل نے فرانس کے بٹوارے کے لیے بادشاہ انگلستان سے ساجھا کر لیا ہے۔ تیسرے ایڈورڈ نے ایک سہ گانہ احتجاج بادشاہ ژاں کے طرز عمل کے خلاف کیا۔ ایک احتجاج تو پوپ کو مخاطب کر کے کیا گیا تھا، دوسرا شہنشاہ کو اور تیسرا ایک کھلی چٹھی کے طور پر حضرت مسیح پر ایمان لانے والے تمام بادشاہوں، حکمرانوں، ڈیوکوں، مارکوئیسوں، معزز لوگوں اور عوام کو۔[1]

قرون متوسطہ میں سیاسی ضرورتوں سے اپنے دعووں کی تائید کے دلائل واضح کرنے کی جو ضرورت پیش آتی تھی اس کا ایک نیا مظاہرہ اس طور سے ہوا تھا کہ قانونی مشوروں کے ذریعے سے اپنے دعووں کی تائید حاصل کی جائے۔ چنانچہ نمونت روئی کے ژاں نے جو شہر پیرس کا اعلیٰ حاکم عدالت تھا اور پانچویں شارل اور چھٹے شارل کے زمانے میں

[1] فرواسار کی فرانسیسی کتاب "تواریخ" جلد (۱) حصہ دوم باب (۲۶۷)

زندہ تھا، اپنی ایک فرانسیسی تالیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "سابق بادشاہ انگلستان تیسرے ایڈورڈ نے تاج شاہی پر جو حقوق جتائے تھے اس کے اسباب پر مشتمل رسالہ" ہے۔ مولف نے اس میں یہ ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے کہ "یہ ایک رواج اور حکم ہے جو اس وقت سے برابر چلا آرہا ہے جب سے کہ فرانس میں عیسائی بادشاہ ہوئے اور جس کی شارلیمان نے بھی صراحت کے ساتھ توثیق کی ہے کہ کوئی عورت، یا ایسا مرد جو کسی عورت کی اولاد میں ہو اور فرانس کے شاہی خاندان کے کسی مرد کی اولاد میں نہ ہو، تو وہ ہرگز جانشین نہیں بن سکتا اور فرانس کے تاج کا وارث ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ قاعدہ فرانس میں اس وقت سے بنا چلا آرہا ہے جب سے کہ وہاں عیسائی بادشاہ ہونے لگے ہیں اور شارلیمان نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور یہی سالیکی قانون ہے۔"

61

اپیل کی ایک اور مشہور مثال "عمومی جھگڑا"، نامی رسالہ ہے جو ۱۴۱۶ء میں بادشاہوں، حکمرانوں، جاگیرداروں، شہروں اور روئے زمین پر بسنے والے تمام ایمان والوں کے نام شایع کیا گیا۔ اس میں پولینڈ کے لاڈسلاس اور لتھوانیا کے وی تولد نے راہبوں کے ٹیوٹانی سلسلے کے شہامت باز سورماؤں کی زیادتیوں کو برا بھلا کہا ہے۔

ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہم یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ۱۷ اپریل ۱۵۳۶ء کو شارل کین (یعنی پانچویں شارل) نے پوپ، اعلیٰ پادریوں کی مقدس جماعت، اور شہر روما میں رہنے والے سفیروں کی موجودگی میں ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے اپنی سیاست خارجہ کے اہم خط و خال بیان کیے تھے۔ ماکوں کے اسقف نے جو فرانسوا اول کا سفیر تھا، فوراً اس سے یہ واضح کرنے کی خواہش کی کہ وہ صاف صاف الفاظ میں فرانسوا اول کے متعلق اپنی سیاست کی تفصیل بیان کرے۔ شارل کین نے جواب دیا کہ اس نے یہ تقریر پوپ کی ذات تقدس مآب کو اور پوری دنیا کو اپنے افعال کا جائزہ دلانے کے لیے کی تھی اور منشا یہ ہے کہ رہتی دنیا تک

لوگ خود یہ فیصلہ کر سکیں کہ اس میں اور فرانس کے بادشاہ میں کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جو جھگڑے پیدا ہو چکے ہیں وہ صرف تین ہی طریقوں سے ختم ہو سکتے ہیں یعنے یا تو نہایت خونریز جنگ کے ذریعے سے جو عیسائی جمہوریت کے لیے انتہائی نامناسب چیز ہوگی۔ یا اس طرح سے کہ وہ اور فرانسوا اول شخصی طور سے دو دو ہاتھ کر لیں "جس میں ہر ایک اپنا لبادہ اوڑھا ہوا ہو اور تلوار اور خنجر ہاتھ میں ہوں کیونکہ دو میں سے کسی ایک کا مرجانا زیادہ چھوٹی برائی ہوگی بہ نسبت اس کے کہ بہت سا عیسائی خون بہایا جائے"۔ یا بالآخر اس طرح سے کہ دونوں میں ایک مناسب صلح ہو جائے۔ شہنشاہ نے مزید برآں یہ بھی کہا کہ وہ اپنی تقریر کی نقل پوپ کو بھیجے گا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ اسے چھپایا جائے تاکہ پوری دنیا اس سے واقفیت حاصل کر سکے[1]۔

---
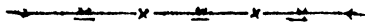
[1]۔ گاشار کی فرانسیسی فہرست "سرکاری کتب خانہ پاریس کے مخطوطات متعلق بہ تاریخ بلجیم کے انتخابات" جلد (۱)، صفحہ ۴۷۴)۔

فصل دوم

عملی طریقے

ہمارے نظریے کے مطابق اصطلاح "انتقام" یا مواخذے میں وہ تمام انفعالی کارروائیاں شامل ہوتی ہیں جو کوئی حکومت اس غرض کے لیے کسی دوسری مملکت یا اس کی رعایا کے جان و مال کے خلاف عمل میں لاتی ہے کہ زیر بحث اختلافی مسائل کے متعلق یا تو حق حاصل کرے یا اُن کے متعلق کوئی منصفانہ تلافی چاہے یا ضرورت پڑے تو انصاف اپنے ہاتھوں میں لے۔[له] اس کے متعلق یہ فرانسیسی اصطلاح (رِپ ری زائی) ہے وہ اطالوی سے ماخوذ ہے اور اس کے لفظی معنے مواخذہ یعنی باز گرفت یا دوبارہ پکڑ لینے کے ہیں۔

اس وسیع مفہوم میں اگر انتقام کی اصطلاح کا استعمال کریں تو قرون متوسط میں عام طور پر اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ حیوانی قوت کا استعمال کیا جائے اور لڑائی جھگڑوں کا آغاز کر دیا جائے، بجائے اس کے کہ مسالمانہ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ بٹایا جائے۔

لیکن انتقام میں ایک اور خصوصی مفہوم بھی داخل ہوتا ہے۔ یعنی

له۔ ہیفٹر کی فرانسیسی کتاب "یورپ کا قانون بین الممالک" ف ۱۱۔

اس میں ایک قسم کا قبضہ یا ضبطی بھی شامل ہوتی ہے[۱]۔ پرانے مولف انتقام کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں: عمومی اور خصوصی۔ انتقام عمومی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ متضرر مملکت اپنے جملہ آدمیوں کو اس کی اجازت دے کہ ضرر رساں مملکت اور اس کی رعایا کی ذات وجائداد پر قبضہ کریں۔ انتقام خصوصی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ متضرر مملکت اسی قسم کا اختیار چند معین افراد کو عطا کرے۔ یہ دونوں اس قاعدے کے تحت آجاتے ہیں جو بنکر شوئیک نے مرتب کیا ہے کہ نہ تو انتقام عمومی سے حالت صلح ختم ہوتی ہے اور نہ انتقام خصوصی سے۔ اس کے لاطینی الفاظ یہ ہیں کہ "انتقامی کارروائی بجز حالت صلح کے کسی اور صورت میں وقوع میں نہیں آسکتی"[۲]۔

لیکن ایک چیز بیان کرنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اس کے بہت دنوں بعد تک بھی جنگ کی ہولناکیاں باقی رہیں۔ اور اگر اس میں کوئی اشک شوئی کی چیز تھی تو یہ تھی کہ رفتہ رفتہ وہ بدترین ادارے ختم ہوتے چلے گئے جو جنگ شروع کرانے میں مدد دیتے یا اس کو بھڑکاتے تھے۔ غلام بنانا، انتقامی کارروائی کرنا، خانگی افراد کا جنگ شروع کرسکنا — یہ سب کمزور ہوتے گئے۔ اور بالآخر ختم ہوگئے۔ دشمن کی خانگی جائداد اسی زمانے میں خشکی کی لڑائیوں میں محفوظ سمجھی جانے لگی تھی اور وہ لمحہ دور نہ تھا جب حق و انصاف کو ایک اور مستقل فتح حاصل ہو اور بحری لڑائی میں بھی دشمن کی خانگی جائداد گرفتاری سے محفوظ سمجھی جانے لگے۔

63

انتقام کا متعلقہ مواد ہماری توجہ مبذول کرالیتا ہے۔ چنانچہ قانون بین الممالک کی ایک سے زیادہ چیزوں کی اس سے توضیح ہوجاتی ہے اور یہ ایک ایسا باب ہے جو بین الممالک تعلقات کے ارتقاء کی تاریخ کے متعلق دلچسپی سے خالی نہیں۔

---

[۱] دو کانژ کی لاطینی لغت "قرون متوسطہ کے مولفوں کی استعمال کی ہوئی لاطینی اصطلاحیں" بر موقع۔

[۲] بنکر شوئیک کی لاطینی کتاب "قانون عمومی کے مسائل" جلد (۱)، باب (۲۴)۔

نظریۂ انتقام اس تصور پر مبنی ہے کہ جو چیز کسی ایک جسد (یعنی جماعت) کے فرائض میں داخل ہو وہ اس جسد کے ہر عضو پر بھی فرض ہوگی۔ چنانچہ اس نظریے کے تحت پوری جماعت کسی جرم یا فعل ناجائز کی ذمہ دار قرار پاتی ہے، چاہے اس کا ارتکاب اس جماعت کے صرف ایک فرد ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔ بشرطیکہ اس جماعت نے اپنے اس فرد کو اس جرم کے ارتکاب سے روکنے میں کامیابی حاصل نہ کی ہو[1]۔ اس اصول پر صدیوں عمل کیا جاتا رہا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرون متوسطہ میں اس کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ کسی مملکت کی جملہ رعایا کسی زیادتی کی ذمہ دار قرار دی جاتی تھی، چاہے اس کا ارتکاب ان میں سے صرف ایک فرد ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔ اسی طرح زیادتی کا ارتکاب مملکت کے کسی ایک فرد کے خلاف کیا جاتا تو سمجھا جاتا کہ اس کا ارتکاب پوری مملکت کے خلاف عمل میں آیا ہے۔ خود کلیسا نے بھی یہ قاعدہ اختیار کر لیا تھا۔ اور بارہا کسی ایک شخص کے قرض یا ایسے فعل ناجائز کی جس کی سزا نہ دے دی گئی ہو ذمہ داری پورے ملک پر عائد کی جاتی۔ اور اس ملک کے تمام پادریوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے منع کر دیا جاتا۔

اس اجتماعی ذمہ داری کا تصور قرون متوسطہ کے سماج میں کچھ اس شدت سے سرایت کر گیا تھا کہ عرصۂ دراز تک انتقام کے لیے جو ضبطیاں عمل میں آجاتیں، ان کو درست قرار دیا جاتا رہا اور اس کے لیے کسی اجازت کی تک ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک حکمران کی رعایا کو دوسرے حکمران کی رعایا سے کوئی نقصان پہنچتا تو متضررین کو حق ہوتا کہ ضرر رسانوں ہی کے نہیں بلکہ ان کے ملک کی جملہ رعایا کے خلاف ہر قسم کی عملی کارروائیاں اختیار کریں، اگر ان کو ان کے نقصان کی تلافی نہ کر دی جائے۔ بعض سفارتی دستاویزوں میں بھی اس نکتے کو پوری طرح

[1] موڈ لاکلا تبیسیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاولی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۲۶۔

تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ خاص کر ۱۲۲۸ء، ۱۲۳۵ء اور ۱۲۳۸ء کے معاہدوں میں جو انگلستان و فرانس میں طے ہوئے تھے، یہ چیز نظر آتی ہے۔ ۳ر فبروری ۱۲۳۵ء کو جو معاہدہ طے ہوا تھا، اس میں ایک فقرہ صراحت کے ساتھ اسی کے متعلق ہے۔ اور یہی فقرہ بعض بعد کے معاہدوں میں بھی دہرایا جاتا نظر آتا ہے۔[۱]

ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ انتقامی کارروائی کے سلسلے میں صرف خانگی طور سے جنگ کر لی گئی ہو۔ چنانچہ تقریباً ۱۲۹۲ء میں دو ملاح تھے۔ ان میں سے ایک نارمنڈی والا تھا اور دوسرا انگریز۔ بائیون کی بندرگاہ میں انھوں نے آپس میں ایک جھگڑا مول لیا اور ماربیٹ تک نوبت پہنچی اور انگریز نے اپنے حریف کو زخمی کر دیا۔ چونکہ بائیون کے حکام عدالت نے کوئی کارروائی اختیار نہیں کی، اس لیے نارمنڈی والے ملاحوں نے بادشاہ فرانس سے اپیل کی۔

64

"خوبصورت فلپ" نے اس موقع پر دخل دہی سے جو انکار کیا وہ ایک ناقابل معافی غفلت تھی۔ اس پر نارمنڈی والوں نے یہ طے کیا کہ انصاف خود ہی حاصل کر لیں اور وہ سب سے پہلا انگریزی جہاز جو ان کے ہاتھ آئے چھین لیں۔ اور جہاز پر جتنے بھی لوگ ہوں، چاہے چھوٹے یا بڑے سب کو پھانسی دے دیں۔ انگریز ملاحوں نے خوب شور و شر کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں حکومتوں کی کارروائی کے بغیر فریقین نے حلیفیاں بھی

---

[۱] چنانچہ لاطینی میں وہ دفعہ یہ ہے "جب کبھی صلح کی حالت میں کسی پر مداخلت (یعنی زیادتی) کی جائے تو اس مداخلت کی تلافی یوں کی جائے گی کہ اس مداخلت [بیجا] کی اطلاع صلح کنندہ حکمرانوں کو دی جائے گی جو خاص اسی غرض کے لیے جمع ہوں گے ..... اور اگر اس کے دو مہینے بعد تک بھی معاملۂ نزاعی کی کوئی تلافی نہ کی جائے تو پھر تب معاملۂ نزاعی کا شخص متعلقہ [یعنی مستغیث و متضرر] یہ اختیار رکھتا ہے کہ اپنی نزاع کی پیش رفت خود ہی کرے تا آں کہ مکمل تلافی عمل میں نہ آجائے۔ اور اگر ہم اپنے [ایسے] آدمی کو زیادتی کرنے اور ساتھ ہی تلافی سے انکار بھی کرنے والے کے خلاف کوئی مدد دیں تو یہ مدد ظلم نہ قرار دی جا سکے گی۔"

قائم کرلیں، ایک نے آئرلینڈ اور ہالینڈ والوں سے اور دوسرے نے فلانڈرس اور بے نوا وائوں سے۔ اور نارمنڈی والوں کے دو سو جہاز انگریزی سمندروں میں دندناتے ہوئے پہنچے اور ان تمام انگریز ملاحوں کو مار ڈالا جو ان کے ہاتھ میں پڑتے رہے۔ انگریزوں نے بھی ایک بیڑا تیار کیا اور کہتے ہیں کہ انھوں نے ہزاروں نارمنڈی والوں کو قتل کرڈالا۔ اس قدر خون خرابے کے بعد آخر دونوں ملکوں کے بادشاہوں نے اپنی رعایا سے یہ معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "خوبصورت فلپ" نے ایڈورڈ اول کو غداری کے الزام میں اپنے بڑے بڑے ماتحت حکمرانوں پر مشتمل عدالت میں جوابدہی کے لیے طلب کیا اور جب انگلستان کے بادشاہ نے اس کی تعمیل نہیں کی تو فلپ نے گوی این کی ڈیوکی (جو ایڈورڈ کی مملوکہ تھی) ضبط کر لی[1]۔

انتقام جس طور سے لیا جایا کرتا تھا، اس سے ایک ہولناک خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس لیے شہنشاہی دستوروں میں اور پادریوں کی مجالس شوریٰ کے احکام میں اس کو مردود قرار دیا گیا ہے۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ اس نے انتقامی کارروائیوں کو اور خانگی جنگوں کو منسوخ قرار دے دیا ہے۔ اور ۱۲۷۴ء میں لیوں میں جو عمومی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی تھی اس نے بھی ان دونوں چیزوں کو نصفت کے خلاف قرار دیا تھا۔

ان شاہی و مذہبی احکام کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا کوئی کمل حل تو حاصل نہ ہو سکا، لیکن بعض ناکمل وسائل سے کسی قدر اصلاح عمل میں آسکی۔ چنانچہ اس کو تو تسلیم کیا گیا کہ قوت کا استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اس پر بعض پابندیاں اور بعض شرطیں بھی عائد کردی گئیں۔

یہ اصلاح ابتداءً اٹلی میں ہوئی۔ چونکہ وہاں خود مختار شہروں کی

---

[1] وارڈ کی انگریزی کتاب "یوروپ کے قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کی تحقیق" جلد اول صفحہ ۲۹۵۔

بہت بڑی تعداد پائی جاتی تھی اور ان کے تجارتی تعلقات بہت ترقی یافتہ تھے، اس لیے وہاں قانون انتقام کو ایک منظم صورت دی جا سکی۔ مختلف شہروں کے دستور اور مختلف جمہوریتوں میں طے شدہ معاہدے یہ قرار دینے لگے کہ اگر کوئی اجنبی اپنی ذمہ داری کی تعمیل سے انکار کرے تو قرض خواہ کو چاہیے کہ اس اجنبی پر اختیار سماعت رکھنے والے حاکم عدالت کے ہاں حاضر ہو۔ اور اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوتا تو اسے اختیار تھا کہ اس بارے میں حکام عدالت کو درخواست دے کر اجازت نامۂ انتقام حاصل کرے۔ ایسے اجازت نامے "منشور انتقام" کہلاتے تھے اور ان میں اس بات کی اجازت ہوتی کہ اس مملکت کی، جس نے انتقام کی اجازت دی ہو، سرزمین میں فریق ثانی یعنے ملزم کے جتنے بھی ہم وطن پائے جائیں، ان سب کی ذات اور جائداد کے خلاف گرفتاری کی کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔ گرفتار شدہ

65

اشخاص شہر کے صدر حاکم عدالت کے پاس حاضر کیے جاتے۔ گرفتار شدہ جائداد کے متعلق بھی یہی عمل ہوتا۔ گرفتار کنندہ اپنے طرز عمل کے درست ہونے کو ثابت کرتا۔ گرفتار شدہ اشخاص محبس عمومی میں قید کیے جاتے اور گرفتار شدہ جائداد گرفتار کنندہ کی حفاظت میں رہنے دی جاتی تا آنکہ اس کے ضرر کی تلافی نہ کردی جائے۔ اگر ایسی کوئی تلافی عمل میں نہ آتی تو گرفتار کنندہ کو اختیار ہوتا کہ گرفتار شدہ لوگوں کے فدیے اور دیگر جائداد سے اپنے نقصان کی تلافی کرے۔ البتہ یہ ضروری ہوتا کہ جو رقم زائد ہوتی وہ واپس کردینی پڑتی۔

انتقام کے ادارے کا یہ سرسری خاکہ ہے۔ کرسٹین ڈی پیزان [یعنی شہر پیزا والی کرسٹین جو ایک مشہور مولفہ گزری ہے] اس کی تعریف یوں کرتی ہے کہ:۔

"انتقام کا حق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ملک کی رعیت، خواہ وہ فرانسیسی ہو یا کوئی اور، کسی طاقتور اجنبی کے ہاتھ سے ضرر اٹھائے اور انصاف حاصل نہ کرسکے، تو

ایسی صورت میں بادشاہ اس متضرر کو ایک اجازت نامہ عطا کرے گا جس کی بنیاد پر وہ ضرر رساں کے وطن سے آنے والے تاجروں اور دیگر لوگوں کو پکڑ، گرفتار اور قید کر سکے گا، ان کا مال قبضے میں لے سکے گا اور یہ لوگ اس وقت تک ماخوذ رہیں گے جب تک کہ وہ مدعی کو اس کا حق نہ دلا دیں اور نقصان کی تلافی نہ کر دیں[1]"

باوجود ان قیود سے مقید ہونے کے، انتقام کا طریقہ بے انتہا ضرر رساں ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ مختلف حکومتوں نے اس کو بھانپ لیا اور اس زمانے میں جب کہ ہمارے بیان کردہ مفہوم کا ادارۂ انتقام تشکیل پا رہا تھا تو مختلف معاہدے اس غرض کے لیے کیے گئے کہ اس کو منسوخ قرار دیں۔ ایک معاہدہ جو ۱۱۹۵ء ہی میں برلیس اور فیرار میں طے ہوا تھا، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ان معاہدہ کنندہ شہروں میں سے کسی ایک کا کوئی باشندہ دوسرے شہر کے کسی باشندے سے کوئی معاہدہ کرے تو اسے صرف اپنے مدیون کے خلاف چارۂ کار حاصل ہوگا نہ کہ اس مدیون کے دائنین کے خلاف۔ وہ اصل میں گویا دائن ہی سے معاہدہ کرتا ہے۔ مورا توری نے اس قسم کے معاہدوں کی متعدد مثالیں دی ہیں[2]۔

ہامبورگ کے رسم و رواج میں بھی یہی اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہاں بیان کیا گیا تھا کہ "ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس سے

---

[1] کرستین دو بیران کی فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" حصۂ چہارم باب (۶) مخطوطۂ کتب خانۂ شاہی واقع بروسیل مخطوطہ نشان (۹۰۱۰)۔

[2] مورا توری کی لاطینی کتاب "قرون متوسط کے اطالوی آثار" جلد ۴ صفحہ ۳۴۴ و مابعد۔ اچھا سیر حاصل بحث جو اٹلی کے شریک وفاق اور باہم مسالمانہ تعلقات رکھنے والے شہروں کے متعلق ہے — اسی کتاب کی جلد ۴ صفحہ ۷۱۱ و مابعد میں پیچیدہ بحث "انتقام"۔

معاہدہ کر رہا ہے۔ دائن کو چاہیے کہ اپنے مدیون کے خلاف ایسی عدالت میں نالش دائر کرے جو اس پر قدرتی طور سے اختیار سماعت رکھتی ہو۔ اور اگر اسے وہاں انصاف حاصل نہ ہو تو [شہر ہامبورگ کی] مجلس اس کی مدد کرے گی"۔

ایک معاہدۂ صلح ۱۲۶۰ء میں شہر بروگیس میں فلانڈرس کے فلپ اور ہینو کے فلوراں میں طے ہوا تھا۔ اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ "اگر فلانڈرس والوں میں سے کوئی ہالینڈ کی سرزمین میں لٹ جائے یا اس کا مال چوری جائے، تو جس جگہ واقعہ پیش آئے وہاں کے باشندوں کا فرض ہوگا کہ وہ مال واپس دلائیں اور لٹیرے کو رہا کردیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو ہالینڈ کا جاگیر دار چھے پنچوں کی مدد سے خود ہی یہ کام انجام دے گا۔ .... یہ کہ اگر فلانڈرس کا کوئی تاجر ہالینڈ سے گزرتے ہوئے کسی قرض کے باعث گرفتار ہو جائے تو وہ تاجر ایک اقرار پر اس سے چھٹکارہ پائے گا اور اس کے سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ لیکن اگر گرفتار کنندہ کا اس سے اطمینان نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس تاجر کو کسی عام حاکم عدالت کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر اس کے پیش کردہ اقرار کے باوجود اس تاجر کو روک رکھا جائے یا اس پر کوئی موانع عائد کیے جائیں تو ہالینڈ کا جاگیردار اسے اس کے جملہ اخراجات اور ہرجہ مع سود ادا کرے گا"۔

انگلستان میں تیسرے ہنری نے لیوبک کے معززین کو ایک منشور عطا کیا تھا، جس کی بنا پر وہ اپنے کسی دوسرے ہم وطن کے قرضوں کے باعث گرفتار نہیں کیے جاسکتے تھے بجز اس کے کہ لیوبک کے حکام عدالت مدیون کو ادائی پر مجبور کرنے سے تساہل کریں۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر برے من، انشاڈ، ہامبورگ اور اور ہانوفر کے شہروں کو یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ علاقۂ گھنٹ کے رہنے والے ان کو ان نقصانوں کا بھی ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو سکتی ہیں فلانڈرس کے تاجروں کے ہاتھوں ان کو پہنچیں؛ اور ان شہروں کے لوگ جب اس علاقے میں جاتے ہیں تو ان سے ایسے نقصانوں کا انتقام

لیا جاتا ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ بے قصوروں کو ایک ایسے قصور کی سزا دی جائے جس کے روکنے پر یہ قادر نہ تھے۔ اصل قصور وار تو وہ امراء ہیں جو تاجروں کو لوٹ کر چکنے سے اپنے مستحکم قلعوں میں چلے جاتے ہیں۔"[1] ان شہروں نے باہم معاہدہ کیا کہ شہر گنت کے تاجروں کے ساتھ آیندہ پورا انصاف کیا جائے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں الموحدین کی سلطنت کے حصے بخرے ہونے پر جو عربی یا بربری حکومتیں وجود میں آئیں، ان سے اطالوی شہروں نے معاہدے کیے، اور وہاں بھی اسی کی مماثل تجویزیں نظر آتی ہیں۔ ہم آیندہ یہ چیز واضح کریں گے کہ مغرب یعنی بحر متوسط کے ساحل پر طرابلس سے مراکش تک اسلامی طاقت کو کس طرح عروج حاصل ہوا۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ جب یہاں کے حکمرانوں نے اپنے سیاسی مفادات مشرق کے عربوں سے منقطع کر لیے تو ان کے تجارتی تعلقات عیسائیوں کے ساتھ روز افزوں ہوتے گئے۔ چنانچہ متعدد معاہدے طے کیے گئے اور ان معاہدوں میں بتایا گیا ہے کہ نہ صرف شخصی آزادی، کاروباری آزادی، سکونت گاہ اور کلیساؤں کی بے روک ٹوک اجازت اور (ان کے اپنے) قونصلوں کا ان پر اختیار سماعت ہوگا بلکہ یہ اہم اصول بھی تھا کہ ذمہ داری خالص انفرادی ہوگی۔ اور طے ہوا تھا کہ کسی عیسائی کو نہ تو تکلیف دی جائے اور نہ اس سے بازپرس کی جائے جب کہ قرض یا جرم یا فعل ناجائز یا کوئی اور قابل مواخذہ کام کسی اور عیسائی کا کیا ہوا ہو بجز اس کے کہ یہ اس مجرم کا ضامن ہو۔[2] ایک معاہدے میں جو سنہ ۱۲۳۱ء میں

67

[1] "فارن کومینش کی تالیف "فلانڈرس کی تاریخ اور اس کے کشوری و سیاسی ادارے لغایۃ سنہ ۱۳۰۵ء" کا فرانسیسی ترجمہ جو گیلڈولف نے کیا جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۳۔

[2] ماس لاتری کی (فرانسیسی) تالیف "قرون متوسطہ میں شمالی افریقہ کے عربوں کے ساتھ عیسائیوں کے

آراگون کے بادشاہ اور تونس کے بادشاہ میں طے ہوا تھا یہ بیان کیا گیا تھا کہ "تاجر شاہی بیان کے بھروسے پر سکونت اختیار کریں گے اور سفر کرینگے اور کسی کو کسی اور شخص کے فعل کے باعث کبھی تکلیف نہیں دی جائے گی"۔

انگلستان کے بادشاہ کے پاس ۱۳۶۹ء میں ایک شکایت پہنچی جو قسطیلہ کے بادشاہ نے نہیں بلکہ قسطیلہ اور بسکے کے ملک التجار اور ملاحوں نے کی تھی۔ اور انھوں نے تین سفیر روانہ کیے تھے۔ ان کا دعویٰ اس امر کے متعلق تھا کہ چھے اسپینی جہاز انگریزوں نے پکڑ لیے ہیں، اگرچہ انگلستان اور قسطیلہ میں دوستی کا معاہدہ پایا جاتا ہے۔ بادشاہ انگلستان نے جواب دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے واجبات کو صرف اسی وقت پورا کرے گا جب قسطیلہ والوں کے ہاتھوں نقصان اٹھائے ہوئے انگریزوں کے متعلق انصاف کیا جائے۔

۶ اکتوبر ۱۳۳۳ء کو جو دستاویز لکھی گئی تھی اس میں یہ نظریہ بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اولاً تلافی کا مطالبہ کیا جانا ضروری ہے۔ اور یہ کہ انتقام کا اجازت نامہ صرف اسی وقت دیا جاسکے گا جب کہ انصاف کرنے سے انکار کیا جائے۔ چنانچہ اس دستاویز کے ذریعے سے تیسرے ایڈورڈ نے اس اجازت نامۂ انتقام کے خلاف احتجاج کیا تھا جو آراگون کے بادشاہ نے اپنی رعایا میں سے ایک کے وارث کو عطا کیا تھا۔ انگلستان کے بادشاہ نے یہ بتانے کی پر زور کوشش کی کہ آراگون کے باشندے کو جس معاملے کی شکایت ہے وہ ایڈورڈ دوم کے زمانے میں پیش آیا تھا؛ یہ کہ اس نے خود ہی انصاف کرنے کا پیشکش کیا تھا، یہ کہ متضرر شخص نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ اپنے دعووں کی صحت کو ثابت کرے؛ یہ کہ وہ خود اس پر آمادہ ہے کہ ان جانشینوں کے لیے تلافی کا سامان کرے لیکن خود انھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ تعلقات کے متعلق معاہدات صلح و تجارت اور دیگر دستاویزیں" صفحہ ۴۸۔

جواب دیا ہے کہ وہ مقدمہ چلانا نہیں چاہتے اور انھوں نے ملزموں کا نام بتانے سے بھی انکار کیا ہے۔ تیسرے ایڈورڈ نے اس کے آخر میں یہ لکھا تھا کہ ان حالات میں اجازت نامۂ انتقام کی عطا کا کوئی موقع نہیں ہے اور یہ کہ تجربہ کار اور رائے ظاہر کرنے کے اہل لوگوں کی یہ رائے ہے کہ (اصل لاطینی میں): "عقلمند اور تجربہ کار لوگوں کی نظر میں قانوناً اس کا کوئی حق نہیں ہوتا کہ ہماری اپنی یا ہماری رعایا کی جائداد کے سلسلے میں "اجازت نامۂ سرحد" یا اجازت نامۂ مواخذہ عطا کیا جائے"[1]۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں شخصی استثنا عمل میں لائے گئے ہوں۔ چنانچہ فرانس کے آٹھویں شارل کے زمانے میں بادشاہ کی مجلس شوریٰ نے آرقیس نیوں کے دو تاجروں کو ایک امن نامہ اور اجازت تجارت عطا کی جس کے تحت ایک سال تک وہ آرقیس نیوں کے خلاف عمل میں لائی جانے والی انتقامی کارروائیوں میں شریک نہ سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ ان کو اجازت تھی کہ اپنا تمام اسباب اور پورا سامان تجارت لاسکیں بشرطیکہ وہ انھیں کا ہو۔ اور غلط بیانی کی صورت میں اسے ضبط کرلیا جائے گا، نیز ان کا امن نامہ منسوخ سمجھا جائے گا اور مزید برآں بادشاہ حسب صوابدید انھیں سزا دے سکے گا[2]۔

اس کے بعد اس کی مکرر کوششیں کی گئیں کہ اس برائی میں کمی کی جائے۔ چنانچہ ان کوششوں میں سے ایک کے ذریعے سے ایک ادارہ قایم کیا گیا کہ "محافظین امن" مقرر کیے جائیں اور فریقین معاہدہ اپنی شکایتیں انھیں کے پاس پیش کریں۔ اس طرح سے اجازت نامۂ انتقام کے عطا کیے جانے سے بچنے کی کوشش کی جاتی تھی[3]۔

---

[1] ریمر کی لاطینی کتاب "میثاقیات"، جلد اول حصہ سوم صفحہ ۱۰۰۔

[2] موولاکلاڈییئر کی فرانسیسی کتاب "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۴۴۔

[3] ہیوٹر کی جرمن کتاب "قانون بین الممالک کی تاریخ اور علم پر چند اضافے" صفحہ ۱۵۶۔

[شمال مشرقی جرمنی کے چند شہروں نے بشمول لیوبک ۱۲۴۱ء میں ایک محالفہ قائم کیا تھا جس کا منشا بحری ڈاکوؤں وغیرہ سے حفاظت تھا] اِس محالفہ "ہان زیاتی" نے یہ قاعدہ بنانے کی کوشش کی کہ کسی تاجر کو کسی اور شخص کے کسی فعل کے باعث خواہ وہ اُس کا نوکر ہی کیوں نہ ہو، نہ تو گرفتار کیا جائے اور نہ اس کا مال ضبط کیا جائے۔ اور یہ کہ کسی شہر کے باشندوں میں سے ایک یا چند کے افعال کی ذمہ داری اس وقت تک پورے شہر پر عاید نہ کی جائے جب تک کہ وہ شہر مدعی پر انصاف کا دروازہ پوری طرح بند نہ کردے۔ اس کے معاوضے میں "ہان زیاتی" شہروں میں جو معاہدے طے ہوئے، ان میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ ان شہروں میں سے کسی ایک میں بھی جو عدالتی فیصلہ صادر ہوگا وہ سب کے ہاں قابل نفاذ سمجھا جائے گا۔

شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتقامی کارروائیاں قانون بین الممالک کے اداروں میں سے ایک ادارہ تسلیم کرلی گئی تھیں اور اس پر چودھویں صدی کے بڑے بڑے اطالوی شارحین نے بہت زیادہ توجہ کی۔ ان میں سے اکثر نے اس ادارے سے اپنی عام کتابوں میں بحث کی ہے۔ بارتولے نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ دوسرے مولفوں نے اس بحث میں ایک حد تک ضمیر کا سوال بھی پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر بارتولے نے خاص طور پر اس سوال سے بحث کی ہے کہ آیا انتقامی کارروائیاں ضمیر کی عدالت اور قانونِ ملک کی عدالت میں جائز قرار دی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور ساتھ ہی وہ اس کے دلائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

بارتولے نے اپنی لاطینی کتاب "رسالۂ انتقامات" ایسے زمانے میں تالیف کی تھی جب بے شمار جھگڑے پائے جاتے تھے؛ یا جیسا کہ خود مولف نے لکھا ہے کہ، کسی اقتدار برتر سے مدد لینی ممکن نہ تھی۔ ایسے زمانے میں یہ کتاب اُس عہد کے تصورات کی اچھی اور صحیح

ترجمانی کرتی ہے۔[1]

اس کتاب کی ابتدائی سطریں قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ بارتولے نے لکھا ہے کہ رومی شہنشاہت کے زمانے میں انتقامی کارروائیاں شاذ تھیں۔ یہ اُس وقت سے ایک روزمرہ کی چیز بن گئی ہے، جب سے کہ انسانوں کے گناہوں کے باعث یہ شہنشاہت بے جان ہوگئی ہے۔ اور نہ صرف بادشاہ و حکمران بلکہ بڑے اطالوی شہر تک کم از کم واقعے کی حد تک اپنے سے برتر کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل جو اس طرح عام ہوگیا ہے، کیا اسے ضمیر کی عدالت میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ [خط کشیدہ حصہ اصل لاطینی میں ہے۔ مترجم] ہمارا مشہور شارح اس موقعے پر بائبل کی اس عبارت سے استدلال کرتا ہے کہ "جو روح گناہ کی مرتکب ہوگی، وہی مرے گی۔ بیٹا ہرگز اپنے باپ کے ظلم کا ذمہ دار نہ ہوگا۔" اس سے یہ نتیجہ نکالنا مدنظر معلوم ہوتا ہے کہ انتقامی کارروائیاں ناجائز قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قرون متوسط کے مولفوں میں سے اکثر کے ہاں ایک خصوصیت ہے کہ وہ معقولیت اور منطق سے عاری ہوتے ہیں اور اپنی

69

[1]۔ بارتولے دے ساسو فراتو کی لاطینی تالیف "متورسے مایل اور رسایل" مطبوعہ لیون ۱۵۳۲ء "رسالۂ انتقامات" ورق ۲۵ و مابعد۔

یہاں بعض اور لاطینی رسالوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے: کاتی ژکانی بس کا "رسالۂ انتقامات کہ آیا ضرر سے ہرجہ و نقصان پیدا ہوتا ہے" لودی کے مارتن کا "رسالۂ انتقامات"۔ یہ دونوں زی لیتی کے لاطینی "رسالہ ہائے قانون عمومی" میں شامل ہیں۔ مزید براں گیورگ لوریش کی "گرفتاریاں اور انتقامات" آندرے دال نیبر کا "خلاصہ متعلق بہ انتقامات" بابت ۱۶۱۰ء۔ اشتاقل کا "حقوق انتقام پر مقالہ" ۱۶۱۷ء ہل برشن اول رک ہونیوس کا "انتقاموں پر مقالہ" ۱۶۱۸ء۔ ذومی نیک خان آردم کا "انتقاموں پر مقالہ" ۱۶۲۰ء۔ کوباغ کا "انتقامات کے حقوق کی مدافعت پر رسالہ"۔ اسی مولف کا "رسالہ کہ انتقاموں کی اجازت کون دے سکتا ہے؟" اسی مولف کا "رسالہ کہ انتقاموں کے جائز وجوہ کیا ہیں؟" تساعت ہوفٹ کا "انتقامات" ۱۶۲۳ء۔ آندرے ونتر کا "انتقاموں پر مقالہ"۔

تالیفوں میں انھوں نے اکثر اس کی پروا نہیں کی ہے کہ اگر کسی چیز سے استدلال کریں تو اس کے پورے نتائج کا لحاظ کریں۔ بارتولے پر بھی اس بارے میں اس کے ہمعصر اثرات پڑے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ انتقامی کارروائیوں کو ایک جگہ ناجائز قرار دیتا ہے تو گھڑی بھر بعد ان کو جائز بھی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ان کو بائبل کے حوالے سے ملعون قرار دیتا ہے تو سنٹ آگسٹائن کے حوالے سے، جس نے جنگ کو جائز قرار دیا تھا، وہ ان انتقامی کارروائیوں کو روا اور درست ثابت کرتا ہے۔ اگر حکمران کی اجازت، معاملے کی منصفانہ حیثیت، اور نیک نیتی کی سہ گانہ شرط پوری ہو جائے تو پھر انتقامی کارروائیاں "ضمیر کی عدالت" میں بھی جائز بن جاتی ہیں۔ یہ "قانون ملک کی عدالت" میں اس لیے جائز نہیں ہوتی ہیں کہ کوئی شخص انصاف اپنے ہاتھ میں لینے کا مجاز ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ حکمران کی اجازت اور معاملے کا حق بجانب ہونا انتقامی کارروائی کی اندرونی برائی کو محو کر دیتے ہیں۔ اور اس بارے میں اس تک ضرورت نہیں ہوتی کہ (لاطینی الفاظ ہیں) "انتقامی کارروائی میں راستی اور نیک نیت پائی جائے"۔ کیوں کہ ضمیر کی عدالت کے برخلاف قانون ملک کی عدالت نیت سے بحث نہیں کرتی۔

انتقامی کارروائیوں کی اجازت دینے کا حق کیسے حاصل ہوتا ہے؟ بارتولے کے مطابق اس کا ماخذ نہ تو قانون ملک ہے اور نہ ہی قانون مذہبی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ قانون الٰہی اور قانون بین الممالک کے تحت حاصل ہوتا ہے۔ قانون بین الممالک کے مطابق ہر وہ چیز منصفانہ سمجھی جاتی ہے جسے کوئی انسان اپنی ذاتی حفاظت کے لیے انجام دے۔ کوئی شہر اعلان جنگ کر سکتا ہے، خواہ صرف ایک آدمی کی حفاظت ہی کا مسئلہ درپیش کیوں نہ ہو۔ اور کوئی فرد اعلان جنگ کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنی جان اور مال کی حفاظت مقصود ہو۔ اگر کوئی شہر یا کوئی سردار انصاف کرنے میں تساہل یا انکار کرے تو وہ

اس شخص کے مدیون بن جاتے ہیں جو انصاف کا طلبگار ہے۔ چنانچہ جس وقت دیگر تمام چارہ ہائے کار بے اثر ثابت ہوجائیں تو دائن کو حق ہوتا ہے کہ اپنے مدیون کو پکڑلے۔ اسی قاعدے میں توسیع کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی شہر یا سردار کی رعایا کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ انصاف سے انکار کرنا ایک فعل ناجائز کے مماثل بن جاتا ہے اور اس فعل ناجائز کی سزا دینے کے لیے ہر انسان کو جنگ کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ (لاطینی مقولے ہیں) "فعل ناجائز یا مضرت کی صورت میں اگر شخص متعلق حق رسائی میں غفلت کرے تو ایسے تمام ملکوں نیز ان کے ماتحت لوگوں کے خلاف جنگ کی جاسکتی ہے۔" بے شبہہ یہ فخر سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں اور ان سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ قانون کی اہمیت پر نہایت پختہ اعتقاد رکھا جاتا تھا!

انتقام کی اجازت دینا ایک طور سے بے حد خلاف منطق امر کہا جاسکتا ہے۔ ایک حکمران کسی دوسرے حکمران کی جگہ کیسے اختیار چلاسکتا ہے اور اس کی رعایا کے متعلق اختیار سماعت کیسے حاصل کرسکتا ہے؟ بارتولے نے اس نکتے پر بحث نہیں کی ہے۔ اس کے نزدیک انتقامی کارروائی ایک جنگی واقعہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کی نظروں میں ایک خاص قسم کی جنگ ہے۔ اس زمانے کے ایک ماہر قانون نے اس کی جو توضیح کی تھی اس کا ذکر بالدے نے کیا ہے۔ چنانچہ بالدے نے جس مولف کا ذکر کیا ہے وہ اکثر شارحین کے برخلاف یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ صرف حاکم عدالت کو اس کا حق ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی اختیار کرنے کی اجازت عطا کرے جو اس کے اختیار سماعت میں نہ ہوں، اور نہ اس کے علاقے میں انھوں نے معاہدہ کیا ہو، اور نہ ہی وہاں کسی فعل ناجائز کا ارتکاب کیا ہو۔ اور یہ اختیار تنہا مقتدر اعلیٰ یا اس کے نمایندے کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی توضیح یہ کہہ کر کی ہے کہ

جس حاکم عدالت کو اس مقدمے کی سماعت کرنی چاہیے، وہ اس سے انکار یا تغافل کرتا ہے تو عدالتی اختیار سماعت مدعی [کے علاقے] کے حاکم عدالت پر منتقل ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ اختیار اسے اور طور پر حاصل نہیں ہوتا۔

اس امر کا معلوم کرنا اہمیت رکھتا ہے کہ انتقام کی اجازت دینے کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، تقریباً تمام مولف یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ اختیار صرف مقتدر اعلیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ بارتولے نے (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ "انتقامی کارروائی کی اجازت دینا جنگ کا اعلان کرنا ہے۔ لیکن کسی منصفانہ جنگ کا اعلان سوائے ایسے فرد کے کوئی اور نہیں کر سکتا جس کے اوپر کوئی اور افسر نہ ہو"۔ اس سلسلے میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ بارتولے نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اگر وہ قانون بین الممالک میں داخل ہو جائے تو یہ کوئی اچھی دلیل نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ انتقامی کارروائی کی اجازت کسی طرح اعلان جنگ کے مماثل نہیں قرار دی جا سکتی۔ بالدے نے بھی پرزور طور سے یہ ثابت کیا ہے کہ "انتقامی کارروائی کی اجازت دینے کا حق صرف حکمران کو ہوتا ہے"۔

کرستین ڈپیزان "ہتھیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" میں اپنے استاد سے مخاطب ہوکر ان الفاظ میں اظہار خیالات کرتی ہے کہ "استاد! میں تجھ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا تمام سردار انتقامی کارروائی کی اجازت دے سکتے ہیں؟ میں تجھ سے کہتی ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جیسا کہ خود تونے کہا ہے اور دیگر طور پر بھی جواب دیا گیا ہے کہ کوئی سردار اس وقت تک مقدمے کی سماعت نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اختیار سماعت کے متعلق مقتدر اعلیٰ نہ ہو۔ اور چوں کہ انتقام کی اجازت دینے کا یہ واقعہ اپنی نوعیت اور حالت کے لحاظ سے جنگ کے مماثل ہوتا ہے، اس لیے یہ

71

کام کوئی ایسا شخص نہیں کرسکتا جو سردار بلا توسط و علی الاطلاق نہ ہو، جیسا کہ فرانس کا بادشاہ اپنی سلطنت میں ہے"۔[1]

انتقام کی اجازت دینے کی درخواست کوئی قانونی کارروائی نہیں ہے بلکہ وہ مقتدر اعلیٰ کی طاقت سے استفادہ کرنا ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کے خلاف یہ کارروائی اختیار کی جاتی ہے ان کو یہ حق ہوتا ہے کہ ان کی جوابدہی کی بھی سماعت کی جائے اور ان کی طرف سے کوئی اور نائب یا مختار بھی پیش ہوسکتا ہے حتیٰ کہ کوئی ہموطن بھی۔

اجنبیوں کو انتقامی کارروائی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ کیا جلاوطنوں اور باغیوں کو یہ اجازت عطا کی جاسکتی ہے؟ متعدد شارحین اس بات کی تائید میں نظر آتے ہیں کہ جلاوطنوں کو تو اجازت دی جاسکتی ہے لیکن اس سے انکار کیا ہے کہ اس میں حیات باہر لوگ شامل سمجھے جانے کی نفرت انگیز صورت پیدا کی جائے۔ اس سلسلے میں ان مولفین نے تسلیم کیا کہ انتقاموں کی بجوں کہ (لاطینی الفاظ ہیں) "عدالتی کارروائی کے ذریعے سے حفاظت کی جانی زیادہ بہتر ہے بہ نسبت جنگی کارروائیوں کے"، اس لیے جلاوطن اس کی اجازت وکیل یا مختار کے ذریعے سے حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر مولفوں نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور بیان کیا ہے کہ اگر جلاوطنوں پر کوئی زیادتی کی جائے تو اس سے ان کے شہریوں کے خلاف کسی فعل ناجائز کا ارتکاب نہیں سمجھا جائے گا۔ (لاطینی میں) "ایسوں کے خلاف فعل ناجائز کا ارتکاب ہو تو شہر کے خلاف فعل ناجائز نہیں ہوتا"۔

انتقام کی اجازت نہ تو عورتوں کے خلاف دی جاتی تھی، نہ پادریوں کے خلاف، نہ طلبہ کے خلاف، نہ سفیروں کے خلاف، نہ مقامات مقدسہ کے زائرین کے خلاف، نہ گواہوں کے خلاف، نہ ان

---

[1] سی گونتینین ڈی پیزان کی کتاب مذکور مخطوطہ بروسیل، حصۂ چہارم باب (۱۰۰)

تاجروں کے خلاف. جو کسی میلے میں شریک ہوں (تو خاص اس میلے کے مقام پر)، اور نہ ہی ان ملاحوں کے خلاف جو طوفان کے باعث کسی بندرگاہ میں پناہ گزین ہوئے ہوں یا جہاز کی تباہی کے بعد کسی ساحل پر پہنچے ہوں۔ قانون مذہبی کے مجموعے میں ایک صریح قاعدہ پادریوں یا مذہبی افسروں کے اس بارے میں مستثنیٰ ہونے کے متعلق پایا جاتا ہے۔ اس قاعدے کا حکم ۱۲۷۴ء میں لیوں میں منعقد ہونے والی مذہبی مجلس شورائے عام نے دیا تھا۔

انتقام کی اجازت ملنے کے بعد اس کا استعمال صرف اس علاقے میں ہوسکتا تھا جس کی حکومت نے وہ اجازت عطا کی ہو۔ یہ اس کی خاص خصوصیت ہے۔

ضبطیوں کی اجازت حدود ارضی کے باہر بھی دی جاسکتی ہے لیکن اصطلاحی طور سے ان کو انتقام نہیں کہتے ہیں بلکہ "مارک" یعنے سرحد کا اجازت نامہ کہا جاتا ہے۔ لفظ مارک وہی ہے جو [مرج، مرغزار، مرزبان، گلمرگ (واقع کشمیر) وغیرہ میں پایا جاتا ہے اور وہ] پرانی فرانسی میں "مرشہ" ہے جس کے معنے سرحد کے ہیں۔

72 ایک دلچسپ دستاویز ریمر نے نقل کی ہے۔ ۱۲۹۵ء میں بائیون کے ایک تاجر نے، جس پر لزبن کے ملاحوں نے لوٹ مار کی تھی، بادشاہ انگلستان کے نائب متعینہ صوبہ گاسکنی سے اجازت نامۂ انتقام اور اجازت نامۂ سرحد کے عطا کیے جانے کی التجا کی تھی اور اپنے نقصانوں کے اعداد و شمار پیش کر کے بیان کیا تھا کہ پرتگال کے بادشاہ نے اس مال غنیمت کا دسواں حصہ بطور حصۂ حکومت کے وصول کر لیا ہے۔ نائب مذکور نے ایسا اجازت نامہ عطا کردیا جس کی بادشاہ نے بعد میں توثیق بھی کردی[1]۔ اجازت نامۂ سرحد اور اجازت نامہ انتقام کی

[1]۔ اس اجازت نامے میں (لاطینی میں) لکھا تھا کہ: ہم نے برناڈ کو جو اجازت دی تھی وہ

اصطلاحیں بعد میں بلا امتیاز مترادف طور پر استعمال ہونے لگیں۔

اس طرح کے اجازت نامۂ انتقام کے سلسلے میں جو جوابی انتقام کا اجازت نامہ دیا جاتا تھا اسے "جوابی اجازت نامۂ سرحد" یا "جوابی مواخذہ نامہ" کہا جاتا تھا۔

اب بندشی کارروائیاں بھی اختیار کی جانے لگیں۔ اور یہ قاعدہ بھی بنایا گیا کہ جہازوں کے تمام کپتانوں کو بندرگاہوں سے روانہ ہوتے وقت حلف دیا جایا کرے کہ وہ انتقامی کارروائیاں عمل میں نہیں لایا کریں گے۔ اسی کے مماثل احکام ۱۴۴۰ء اور ۱۴۶۸ء میں انگلستان و فرانس کے مابین طے شدہ معاہدوں میں نیز ۱۴۸۹ء میں انگلستان اور اسپین کے مابین طے شدہ معاہدے میں ملتے ہیں۔

کیا اشخاص کو بھی پکڑ لیا جا سکتا ہے؟ انتقام کے متعلق جو نظریہ ہے اس کے مطابق محض اصول کی حد تک تو اس کا جواب اثبات میں ہے اور گرفتاری کی اجازت دی جاتی ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ قیدیوں کو حاکم عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور انہیں جوابدہی کا موقع دیا جائے۔ بلی تی زیو کے ثراک نے یہ قاعدہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اس کے اور اس کے وارثوں اور جانشینوں کے حق میں جاری رکھی جاتی ہے اور اختیار دیا جاتا ہے کہ پرتگال کی بادشاہت، خاص کر مذکورہ شہر لزبن کے باشندوں کی ذات و جائداد پر اپنے یا اپنے آدمیوں کے حق میں، قبضہ کرے جب کہ وہ ان کو ہمارے آقائے نامدار بادشاہ کی سرزمین میں پائے۔ اسے ایسے اسباب کو اس وقت تک اپنے پاس رکھنے کا حق ہوگا تا آنکہ مذکورہ چھنی ہوئی جائداد کی مالیت مع مصارف برنارڈ یا اس کے وارثوں اور جانشینوں کو واپس نہ مل جائیں۔ یہ اجازت پانچ سال تک نافذ رہے گی یا اس وقت تک جب تک کہ بادشاہ سلامت کی یا ہماری مرضی ہو۔" (ربمر کی کتاب "حلیفیاں" جلد (۱) حصہ سوم صفحہ ۱۵۰)۔

نقل کیا ہے کہ بے قصور اشخاص گرفتار نہیں کیے جا سکتے ۔ اور اس نے بیان کیا ہے کہ گرفتاری صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہونی چاہیے جنھوں نے ناانصافی کا یا تو خود ارتکاب کیا ہے یا اسے گوارا کیا ہے ۔ ناانصافی کو گوارا کرنے والوں کے سلسلے میں اس نے حکام عدالت کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن اس کی مخالف رائے بالآخر کامیاب ہوگئی اور یہ کہا جانے لگا کہ قصور ان سب کا ہو جاتا ہے جن کو مجموعی شہر سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔

جوں ہی وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کے لیے انتقامی کارروائی کی اجازت دی گئی تھی تو وہ حق ختم ہو جاتا ہے یعنی جب ذمہ دار شخص وہ چیز ادا کر دے جو اس پر واجب تھی ۔ چنانچہ (لاطینی میں) : "اگر کوئی اور چیز ان لوگوں کے قبضے میں آئے جن کو مواخذے کا حق حاصل تھا تو انھیں چاہیے کہ اسے سرکاری افسروں کے سامنے پیش کریں اور پھر وہ واپس کردی جائے" انتقامی کارروائیوں کے سلسلے میں اگر واجب الادا سے زیادہ مالیت کی چیز حاصل ہو جائے تو بحق افسران حکومت کے سپرد کر دینی چاہیے، جو بالآخر واپس کر دی جاتی تھی ۔

73

اجازت نامۂ انتقام سے جو شخص بے جا فائدہ اٹھائے تو وہ اس کا ذمہ دار قرار پاتا ۔ اور اسے چوگنا ہرجانہ دینا پڑتا ۔

کیا وہ شخص جس کے خلاف انتقامی کارروائی عمل میں لائی گئی ہو، اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اپنے شہر میں اس شخص کے خلاف چارہ جوئی کرے جو اس کو نقصان پہنچانے کا باعث بنا تھا ؟ اس سوال پر زور و شور سے بحث کی گئی ہے ۔ آرنا کے ژاک نے تو اس کا اثبات ہی میں جواب دے دیا ہے ۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ قصوروار حکام عدالت کے خلاف چارہ جوئی کا دروازہ کھلا ہوا ہے ۔ لیکن بہرحال انتقامی کارروائی کی بھینٹ چڑھتے ہوئے شخص کو اس کا حق نہ تھا کہ اپنی نوبت پر ان لوگوں کو گرفتار یا ان کی جائدادوں کو

چھین لے جو اس کو نقصان پہنچانے والے شخص کے ہم شہر باشندے ہوں، کیوں کہ اس طرح خانگی انتقام کی اجازت سمجھی جائے گی اور زیادتیوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس آخری نکتے پر اتفاق رائے تو نہیں ہے لیکن بارتولے اس بارے میں صریح رائے رکھتا ہے اور وہ اس کے نفی میں حکم دیتا ہے۔ صرف وہ شخص جسے انتقامی کارروائی سے نقصان پہنچا ہو اور ساتھ ہی یہ نقصان غیر منصفانہ ہو، تو اسے حق ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں جائز رسم و رواج کے مطابق اجازت نامۂ انتقام کی درخواست کرے۔ اس صورت میں یہ اجازت نامہ "جوابی اجازت نامۂ سرحد" یا "جوابی مواخذہ نامے" کی حیثیت رکھتا۔

انتقامی کارروائیوں کے عمل میں لانے سے صلح بالکل نہیں ٹوٹتی اس میں شک نہیں کہ بارتولے اس رائے کو تسلیم کرتا نظر نہیں آتا لیکن وہ اس کے خلاف رائے کی بھی قطعی تائید کرتا نظر نہیں آتا۔ بہرصورت یہ نظریہ ہی مسلّم رہا کہ مسالمانہ تعلقات برقرار رہتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ادارۂ انتقامات کو اکثر ممالک نے تسلیم کرلیا اور تقریباً ہر ملک میں یہ خیال کیا جانے لگا کہ اس اجازت کے دینے کا حق وہاں کے حکمران کے اقتدار اعلیٰ کی ایک علامت ہے۔ اور معاہدات کے ذریعے سے ان کے متعلق یہ قاعدہ بنایا جانے لگا کہ ان کو عمل میں لانے میں مہلت مقرر کی جایا کرے اور اس مہلت کے اختتام کے بعد ہی ان کا نفاذ عمل میں آیا کرے۔[۱]

انگلستان میں تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں ایک قانون وضع ہوا کہ بادشاہ کو انتقام اور مواخذے کی اجازت کا حق ہے۔

---

[۱] بارڈسو کی فرانسیسی کتاب۔ "اٹھارویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" جلد (۲)، مقدمہ، صفحہ ۱۳۱۔

پانچویں ہنری کے زمانۂ حکومت میں ۱۴۱۶ء میں جو قانون وضع ہوا اس میں بتایا گیا تھا کہ بادشاہ اجازت نامۂ انتقام عطا کر سکے گا بجز اس کے کہ کسی معاہدے کے ذریعے سے اس کا رواج منسوخ کیا گیا ہو۔ اس قانون کے مطابق فریقین کو چاہیے تھا کہ مہر شاہی کے نگران افسر یعنی لارڈ پرائوی سیل کے ہاں رجوع ہوں، جو نقصان کی تلافی حاصل کرنے کی اجازت کی درخواستوں پر کارروائی کرتا۔ اگر کسی مناسب مدت کے اندر فریق مطلوب، تلافی کا سامان نہ کر دیتا تو لارڈ چانسلر شخص متضرر کو اجازت نامۂ انتقام عطا کر دیتا جس پر بڑی شاہی مہر ثبت ہوتی، اور جس کی بنا پر اسے اجازت ہوتی کہ ضرر رساں مملکت کے باشندوں پر حملہ کرے اور ان کی جاید اد چھین لے۔ اور اس اجازت نامے کے بعد اسے لیٹرا اور بحری ڈاکو قرار دیے جانے کا خطرہ نہ رہتا۔

74

فرانس میں عرصۂ دراز تک پارلیمان کے اختیارات میں یہ عمل بھی شامل رہا کہ وہ اجازت نامہ ہائے انتقام عطا کر سکتی ہے۔ نبرے نے لکھا ہے کہ "یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب ہمارے بادشاہ کثیر تعداد میں پارلیمان میں آتے تھے اور پارلیمان سے اہم امور مملکت میں مشورہ لیا کرتے تھے۔" اس کے سوا نبرے نے باصرار بیان کیا ہے کہ اجازت نامۂ انتقام کا حق صرف بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "اس کا حق بادشاہوں کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں کہ کسی شخص کو اس کا اختیار عطا کرے کہ اپنے دشمن سے خود ہی انتقام لے یا اس غرض کے لیے ہتیار اٹھائے یا کسی ایک انسان کو کسی دوسرے کے بجائے گرفتار کرے یا یہ کہ کسی ایک کے قرض کے عوض کسی دوسرے کا اسباب چھینے اور بیچ ڈالے۔" مزید برآں اس نے بیان کیا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ۱۲۷۳ء میں لاتوستیں میں جو قانون منظور ہوا اس میں لکھا ہے کہ فلانڈرس کی کونٹیس (جاگیرداری) نے جو اجازت نامۂ انتقام عطا کیا تھا کہ ایک انگریز تاجر کا اسباب

چھین لیا جائے'، اسے منسوخ کر دیا گیا؛ اور اسے حکم دیا گیا کہ آیندہ اس کے مماثل چیز اختیار نہ کرے۔[1] ۱۴۸۴ء میں پادریوں، جاگیرداروں اور باقی ملک کے نمایندوں کی سہ گانہ مجلس عمومی میں، جس کا انعقاد طور میں ہوا تھا، اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ان کی رائے میں ذات شاہانہ اس بات کی سختی سے نگرانی رکھے گی کہ اجازت نامۂ انتقام یا جوابی انتقام نامہ بے قاعدہ طور سے عطا کر دیے جائیں۔ اس کے بعد کے سال بادشاہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ اجازت نامۂ انتقام کا عطا کرنا اقتدار اعلیٰ کے خصوصیات میں قدرتی طور سے شامل ہوتا ہے۔

یہاں ایک اہم چیز بیان کرنی ضروری ہے۔ ۱۴۸۵ء کے حکمنامے میں وقت واحد میں نہ صرف ہمارے بیان کردہ حالت امن کے انتقام ناموں کا ذکر ہے بلکہ حالت جنگ کے انتقام ناموں کا بھی۔ اور حالت امن کے انتقام ناموں کے ساتھ ساتھ حالت جنگ کے انتقام نامے بھی مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اول الذکر کا مقصد سب جانتے تھے کہ وہ خشکی اور سمندر دونوں جگہ عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ حالت جنگ کے انتقام ناموں سے مقصد یہ تھا کہ بحری جنگوں میں گمنام لٹیرے جو کارروائیاں کیا کرتے تھے، ان میں تخفیف عمل میں آئے۔[2]

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ انتقام کے طریقے کو پوری طرح منسوخ ہی کر دینے کی تجویزیں پیدا ہو گئیں۔

وینیس تمام دنیا کی تجارت کا ایک مرکز تھا۔ اور ظاہر ہے کہ نظام انتقام سے اسے صرف نقصان ہی نقصان تھا۔ اس لیے وہاں کی

75

---

[1] لبرے کی فرانسیسی کتاب "بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ پر رسالہ" جلد (۲) فصل (۱۰)۔ یہ تالیف اس کے مجموعۂ تصانیف میں شامل ہے۔

[2] مارتینس کی فرانسیسی کتاب "جنگی بیڑے، مال غنیمت لینے اور خاص کر ضبطیاں عمل میں لانے کے متعلق ایک مضمون" صفحہ ۳۱۔ ویس کی فرانسیسی تالیف "بحری جنگ" صفحہ ۲۳۔ ۱۱۸۔

مجلس حکومت نے ۱۴۲۳ء ہی میں طے کر دیا تھا کہ انتقاموں کی اجازت دینی بند کر دی جائے۔ لیکن ۱۴۶۵ء میں بڑی مجلس شوریٰ پرانے فیصلے پر عود کر آئی[1] ۱۴۹۰ء میں انگلستان کے بادشاہ نے میلان کے ڈیوک کو ایک عمومی اجازت نامۂ سفر عطا کیا جس کی بنا پر میلان کے باشندوں کو انگلستان میں تجارت کے لیے آنے کی اجازت تھی اور وہ انتقامی کارروائیوں کے اطلاق سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔ ۱۵۱۵ء میں انگلستان اور فرانس نے معاہدہ کیا کہ یہ دونوں ملک آپس میں انتقامی کارروائیوں کو منسوخ کر دیں اور آیندہ سے اجازت نامۂ انتقام معینہ طور پر صرف ان لوگوں کے خلاف عطا کیے جائیں جو بذات خود قصور کے مرتکب ہوئے ہوں [نہ کہ ان کے ہموطنوں کے خلاف جو خود بے قصور ہوں] اور یہ بھی صرف اس وقت جب کہ وہ اپنی ذمہ داری کے پورا کرنے سے عدالتی طور پر انکار کریں۔[2]

۲۴ فبروری ۱۴۹۶ء کو ساتویں ہنری اور "حسین فلپ" (فلپ لیون یا فلپ اول) کے مابین ایک معاہدہ طے ہوا تھا۔ اس معاہدے کو فلانڈرس والے "عظیم الشان رابطہ" کہنے لگے، کیونکہ اس کے مطابق ہر دو معاہدہ کرنے والے حکمرانوں کی رعایا کو تجارت کی آزادی مل گئی اور اس کے تحت یہ بھی طے ہوا کہ اگر کوئی نقصان پہنچے تو نہ تو کوئی اجازت نامۂ انتقام دیا جائے، نہ "اجازت نامۂ سرحد"، نہ جوابی انتقام نامہ، نہ شخصی گرفتاری، نہ اسباب کی ضبطی اور نہ ہی جنگ۔ بلکہ ان دونوں حکمرانوں میں سے کوئی ایک اس نقصان کی تلافی کر دے گا اور حالات کو حالت ابتدائی پر واپس لائے گا۔ اسی معاہدے کے شرایط کے تحت وہ اجازت نامۂ انتقام اور "اجازت نامۂ سرحد"

---

[1] اس لاتری کی فرانسیسی تالیف "قانون انتقام قرون متوسط میں" صفحہ ۴۶۔

[2] موولاکلا تیبیر کی فرانسیسی تالیف "نائکیا تیلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۲۴۲۔

جو سابق میں عطا ہو چکے ہوں وہ پوری طرح ساقط ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی مقدمے کے حالات کی تحقیق کے بعد معاہدۂ ہذا کے فریقین اس کے خلاف کوئی فیصلہ کریں۔[1]

۸ رجون ۱۴۸۶ء کو انگلستان اور فرانس میں جو معاہدہ ہوا اس میں خاص کر یہ چیز بتائی گئی ہے کہ ہر دو حکمران اپنے اس حق سے دستبردار ہوتے ہیں کہ "اجازت نامۂ انتقام"، "اجازت نامۂ سرحد" اور "جوابی انتقام نامہ" عطا کریں بجز اس کے کہ خود اصل قصور والوں کے خلاف ہوں؛ اور یہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ انصاف سے علانیہ انکار کیا جائے۔ اور اس انکار کا، ہرجے کی تلافی کی ہدایت اور عدالت میں حاضری کا طلب نامہ بھیجنے کے بعد، قانون کے مطابق ثابت کیا جانا ضروری ہوگا۔

۱۵۶۰ء میں اورلیاں میں جو عمومی مجلس سہ گانہ (یا دریوں، جاگیرداروں، اور باقی ملک کی) منعقد ہوئی تھی، اس میں جاگیرداروں نے مطالبہ کیا تھا کہ اجازت نامۂ سرحد اور جوابی انتقام نامے منسوخ کر دیے جائیں اور سفیروں کو ہدایت دی جائے کہ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ [فرانس کے] بادشاہ کی رعایا پر بیرونی حکمران نہ تو خشکی میں اور نہ ہی سمندر میں کوئی زیادتی کریں۔

لیکن اس اثناء میں حالت امن کی انتقامی کارروائیاں قرون متوسط کے مقابلے میں شدید تر ہو گئیں۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے مولف اس مسئلے پر اس طور سے بحث کرتے ہیں کہ گویا وہ کوئی اسی زمانے کا واقعہ ہو۔ اور وہ انھیں دلایل کو دہراتے ہیں جو سابقہ صدیوں میں ماہرین قانون پیش کرتے رہے تھے۔

[اسپین کا ماہر قانون] کوئاز ورفیاس ایک لمحے کے لیے بھی ان کے

76

[1] ریمر کی لاطینی کتاب "طیلفیان"، جلد (۸) قسم چہارم صفحہ ۳ ۸۔

جواز پر شبہہ نہیں کرتا۔ اس کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس کی اجازت کوئی ایسا حکمران دے جو اعلان جنگ کر سکتا ہو۔

آیالا پہلے واقعات سے بحث کرتا ہے اور پھر بیان کرتا ہے کہ "ہمارے زمانے میں انتقامی کارروائیاں اس صورت میں جائز سمجھی جاتی ہیں جب کہ کسی معینہ قوم کے لیٹرے یا بحری ڈاکو یا دیگر اشخاص کسی قتل کا ارتکاب کریں، یا کسی نقصان یا ہرجے کا باعث بنیں یا یہ کہ جن لوگوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے وہ سوائے اس کے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ ملزم جن لوگوں کے سپرد اپنے آپ کو کر دیں، نیز وہ لوگ جو ان ملزمین کو پناہ دیں ان کی جانب سے ان ملزمین کی تحویل عمل میں آجائے[1]"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولف کو یہ چیز بھی کھٹکی کہ کسی قصوروار کے عوض کوئی بے قصور سزا نہ پا جائے۔ چنانچہ وہ بائبل کے احکام کا اس بارے میں انبار لگا دیتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ کارروائی جائز ہے بشرطیکہ بے قصوروں کو ان کی ذات کی حد تک کوئی سزا نہ ملے، البتہ ان کے مال پر سزا کا اثر پڑ سکتا ہے۔

آن ری زوش نے انتقامی کارروائیوں کی تائید میں مروجہ عمل درآمد پیش کرنے کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے کہ بسا اوقات وہ کسی نقصان یا ہرجے کی تلافی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہیں۔ نہ تو زوش، اور نہ ہی آیالا اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انتقامی کارروائی کے لیے اشخاص کو گرفتار کیا جائے۔ بلکہ صرف ان کے مال پر انتقامی کارروائی کو محدود کرنا ضروری قرار دیتے ہیں[2]۔

گروتیوس نے یہ تو پوری طرح تسلیم کر لیا ہے کہ آل پی این کا

---

[1] آیالا کی لاطینی کتاب "جنگ کے قواعد و قوانین اور فوجی ضبط" جلد (۱) باب (۴) ف ۳۔

[2] آن ری زوش کی لاطینی کتاب "گریگری نہم کے احکام کی شرح" جلد (۵) باب (۲۶)۔

لاطینی میں بیان کردہ قاعدہ صحیح ہے کہ "اجتماعی ذمہ داریاں افراد کو پابند نہیں کرتیں اور اسی طرح افراد کی ذمہ داریاں جماعت کو پابند نہیں کرتیں۔" لیکن اس کے باوجود گروتیوس یہ بیان کرتا ہے کہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور خود ساختہ قانون بین الممالک کے ذریعے سے یہ مسلّم ہوچکا ہے کہ کسی مملکت کی رعایا کا جملہ مادی اور غیر مادی مال اس کی مملکت یا اس کے حکمران کی ذمہ داریوں کے لیے یا براہ راست خود ان کی اپنی ذمہ داریوں کے لیے گویا زیر کفالت و ضمانت سمجھا جائے گا حتیٰ کہ حق کی ادائی نہ ہونے کی صورت میں وہ دوسروں کے قرض کا بھی ذمہ دار ہوجاتا ہے۔[1]

اس سے کوئی بیس سال پہلے ایک مشہور مشورہ دہی عمل میں آئی تھی۔ اور وہ اسپین کے وکیل سرکار جنتی لیس کی کتاب میں متعدد فصلوں کی بنیاد کا کام دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی عدالت میں ایک کارروائی جاری تھی۔ اس موقع پر جنتی لیس نے نہایت زور وشور سے انتقامی کارروائیوں کے عمل میں لائے جانے پر حملہ کیا ہے۔ اپنی کرخت اور درشت لاطینی میں اس نے اس بربریت پسندانہ رواج پر حملہ کیا ہے: "میں کہتا ہوں کہ اجازت نامہ سرحد کا یہ حق نہایت ملعون چیز ہے" اور اس قابل ہے کہ ہمارا نہایت ربانی بادشاہ اسے مردود قرار دے۔ کیونکہ یہ جنگ جنگ نہیں ہے بلکہ نہتے لوگوں، تاجروں اور دیگر میدان جنگ سے دور لوگوں کے خلاف ڈاکہ زنی عمل میں لاتا ہے۔"[2]

ستر ھویں صدی کے اواخر سے انتقام ناموں کا رواج باقی نہ رہا۔ اس کے بعد سے شاذو نادر ہی اس کی مثالیں ملتی ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آج کل اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔ یہ رواج خلاف اخلاق تھا۔ اور زمانۂ حال کے لوگوں کے ضمیر نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ اور یہ ادارہ نابود ہوچکا ہے۔

77

[1] گروتیوس کی لاطینی کتاب "قانون جنگ وصلح" کا بار بیئراک کا کیا ہوا ترجمہ کتاب سوم باب دوم ف۲۔

[2] برٹش میوزیم کے مخطوطات لانڈز ڈون، جلد (۱۳۹)۔

78

باب پنجم

خانگی جنگ

جنگ کرنے کا حق سوائے مقتدر اعلیٰ کے کسی کو نہیں حاصل ہوتا۔ کسی منظم سماج میں یہ مملکت کے امتیازات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق جس طرح زمانۂ قدیم پر ہوتا ہے اسی طرح زمانۂ حال پر بھی۔ اس کے برخلاف قرون متوسط میں یہ نظر آتا ہے کہ خانگی جنگ کا وجود اس لیے تھا کہ اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔ اس زمانے میں جس کسی کو کافی قوت حاصل ہوتی وہ اپنا انصاف آپ ہی کر لیتا۔ اور جماعت کی جگہ فرد نے لے لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ہر شخص میں پوری قوم کا اقتدار مرتکز ہو گیا ہے۔ اگر کسی شخص کو قوت و طاقت حاصل ہوتی تو اس کی جنگ کا وہی اثر ہوتا جو مملکت کے حکم سے اور مملکت کی نگرانی میں کی ہوئی جنگ کا۔ قوت و طاقت کا منشاء بھی حق کے نفاذ میں مدد دینا تھا۔

"خانگی جنگ" قرون متوسط میں ایک بڑی مصیبت تھی۔ جرمنی

فرانس، اٹلی، اسپین، انگلستان غرض قریب قریب تمام جاگیرداری یورپ میں ایک ایسی حالت نظر آتی تھی جو اصول کی حد تک تو یکساں تھی، صرف تفصیلات میں اختلاف پایا جاتا تھا۔

جرمنی کے قدیم قانون کے تحت ہر وہ فعل جس سے کسی کو نقصان پہنچے، خانگی جنگ کا باعث بنتا؛ اور ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے بدلہ لینے کا حق عطا کرتا تھا۔ اس قسم کی صورت حال ظاہر ہے کہ ذرا بھی ترقی یافتہ تمدن میں باقی نہیں رہ سکتی۔ جبر و قوت کے اس غیر محدود استعمال کے بعد ایک نئی صورت حال جگہ پکڑنے لگی، جس میں جبر و قوت کو تو تسلیم کیا گیا، لیکن اسے بعض تحدیدات کے ساتھ محدود کر دیا گیا تھا۔ خانگی جنگ کا حق یعنی "دستار" اور قانون انتقام جسے قانون جبر یا لاٹھی راج بھی کہا جاتا ہے، اب قانونی اداروں میں اپنے لیے جگہ بنا لیتا ہے۔

79

جبر و قوت کے استعمال پر تحدیدات عائد کیے گئے۔ خصوصی جنگوں کا طریقہ معین کیا گیا اور جو قواعد اس سلسلے میں بنے وہ قانون موضوعہ کے نظام کا ایک جزء ہو گئے۔

اس ادارے کے دو رخ ہیں۔ ایک تو اس کو قانون تعزیرات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ قانون اس وقت تک حقوق خانگی سے جدا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح اس کو قانون سیاسی کے نقطۂ نظر سے بھی لحاظ میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی آخر الذکر نقطۂ نظر سے ہم یہاں بحث کریں گے۔

قانون سیاسی کے نقطۂ نظر سے خانگی جنگ بہت کچھ اس امر پر مبنی تھی کہ مرکزی حکومت کو کتنی زیادہ یا کم قوت حاصل ہے۔ اگر مرکزی حکومت اپنے کو قوی پاتی تو خانگی جنگوں کو دبا دیتی اور ان کے جواز سے اختلاف کرتی۔ لیکن اگر مرکزی قوت کمزور اور شکست خوردہ ہوتی تو اسے خانگی جنگوں کو تسلیم کر لینا پڑتا۔

اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ خانگی جنگ ابتداءً ان ملکوں سے غائب ہوگئی جہاں حکومتی تصور نے زیادہ تیز ترقی کی تھی۔ اس میں انگلستان اور جرمنی کا فرق بہت نمایاں ہے۔ انگلستان میں خانگی جنگ کی یاد ہی بھلا دی گئی ہے اور جرمنی میں ابھی تک اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح جرمنی اور فرانس کا فرق بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ فرانس میں خانگی جنگ کی اجازت صرف جاگیرداروں کو حاصل ہوتی ہے، اور جرمنی میں اس کا حق ہر کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

خانگی جنگ، پر جو اولین ممانعتیں عائد کی گئیں وہ سیاسی اقتدار کے باعث تھیں۔ ان کے جراثیم اس "امن" میں بھی نظر آتے ہیں جس سے جرمن نسل کی تمام قوموں میں ہم دوچار ہوتے ہیں[1]۔

جب "شاہی امن" نے پوری طرح ترقی پالی تو اس کے لیے خانگی جھگڑوں کے دبانے پر توجہ کرنی ناگزیر ہوئی اور بعض لوگوں نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ شارلیمان نے بلا امتیاز تمام خانگی جنگوں کو ممنوع کردینے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش خود شہنشاہ کے جیتے جی بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اور جب وہ مرگیا تو تاراج اور فتنہ و فساد اپنی حد کو پہنچ گئے۔ پھر قرون متوسط کا سب سے ہولناک زمانہ شروع ہوا اور دو صدیوں تک زمین پر ظلمت چھائی رہی۔

اس پورے زمانے میں اگرچہ قانون اور امن کو حکمرانوں کے کمزور ہاتھ بچا نہ سکے، لیکن کلیسا، ان کی حفاظت کرتا رہا۔

امن کلیسا کا مطمح نظر تھا، اور اس نے اس کے تشکل پذیر ہونے کی کوشش کی۔ سنہ ۹۹۰ء ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ جنوبی فرانس کے صوبہ وار اسقف اس قسم کے قواعد شایع کرتے رہے جن کا مقصد جبر و زیادتی کا اختتام تھا۔ ابتدائی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

[1] پرو بوا کی فرانسیسی کتاب "اقوام جدید کے قانون تعزیرات کی تاریخ جلد(۱) صفحہ ۴۸ و مابعد۔

ایک صدی بعد پھر نئے سر سے کوشش شروع ہوئی۔ اب جنگ کو مکمل اور بے لگام جواز حاصل ہونے کی کوئی تائید نہیں کرتا تھا۔ کلیسا نے اس پر اکتفا کی کہ "خدائی صلح" قایم کرے اور معینہ دنوں میں ہر قسم کی لڑائیوں کو روک دے[۱]۔

یہ تحریک ابتداءً علاقۂ آکی تین سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ اس قسم کی صلح کا قاعدہ اس مجلس شورائے مذہبی میں باضابطہ طور سے منظور ہوا جو سنہ ۱۰۹۵ء میں کلیرمون میں منعقد ہوئی تھی اس کی بار بار تجدید بھی ہوتی رہی اور بالآخر اس کی آخری مرتبہ توثیق سنہ ۱۱۷۹ء میں لاتران میں منعقد ہونے والی تیسری مجلس شورائے مذہبی میں عمل میں لائی گئی؛ اور قرار دیا گیا کہ وہ عیسائیت کا عام قانون سمجھی جائے[۲]۔

ان "حرام دنوں" میں خانگی جنگ عمل میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔ دنوں کے انتخاب میں حضرت مسیح کے آخری کھانے (عشائے ربانی) ان کے ابتلاء سے گزرنے، ان کے دفن کیے جانے، اور دوبارہ زندہ ہونے کو دخل تھا۔ چنانچہ سال کے ہر ہفتے میں چہارشنبے کی شام سے دوشنبے کی صبح تک یہ حرمت قایم رہتی، اس کے بعد سال کے چند معین اوقات مثلاً عید میلاد مسیح کی تیاری کے زمانے (یعنے کرسمس سے چار ہفتے قبل) سے (آغاز جنوری پر) ہفتۂ ظہور مسیح تک؛ اور اسی طرح ایسٹر کے پہلے اتوار سے تین ہفتے قبل سے لے کر ایسٹر کے ہفتے تک؛ نیز حضرت مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تاریخ سے اس ہفتے تک جس میں حضرت موسیٰ کو الواح توریت ملنے کی تقریب منائی جاتی ہے (جو ایسٹر کے پچاس دن بعد ہوتی ہے)؛ اور اس طرح کے مختلف ایام عید۔ جن دنوں میں لڑائی

---

[۱] [عربوں کے "اشہر حرم" پیش نظر رہیں۔ مترجم]۔

[۲] گلک ہیون کی جرمن تالیف "خدائی صلح کی تاریخ"۔

کی اجازت تھی ان میں بھی پادری، راہب، خانقاہوں کے ملازم، زائرین، تاجر، کسان اور زرعی کام پر چلنے والے جانور ہر قسم کے جبر و زیادتی سے محفوظ قرار دیے گئے۔ چنانچہ قانون مذہبی میں (لاطینی میں) یہ قرار دیا گیا کہ "ہم یہ نئے سرے سے حکم دیتے ہیں کہ پادری، راہب، خانقاہ کے ملازم، زائر، تاجر، گاؤں والے خواہ آرہے ہوں یا جارہے ہوں یا زراعت کا کام انجام دیتے ہوں اور اسی طرح وہ جانور جو پانی دینے یا زراعت کے سلسلے میں کام دیتے ہیں پوری طرح محفوظ رہیں۔"[1]

جو کوئی ان "حرام دنوں" کی پروا نہ کرتا اسے ذات باہر کر دیا جاتا اور ایسے شخص کو کوئی قتل بھی کر دیتا تو سزا نہیں دی جاتی۔ مزید برآں ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی جس میں قاضیان امن نشست کر کے مقدمات کی سماعت کرتے۔ مجالس شورائے مذہبی نے ان کو (لاطینی میں) "امن آرا" یا "حکام امن آرا" کا نام دیا تھا۔ ان حکام عدالت نے اسقفوں کی رضامندی سے ان مقدموں کی سماعت شروع کی جو سابق میں کلیسائی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے۔ اس سے لڑائیوں اور جبر و زیادتیوں کا خاتمہ تو نہیں ہو گیا؛ البتہ کلیسا نے اس مرض کی تخفیف کا جو علاج تجویز کیا تھا وہ کچھ دنوں تک اور چند مقاموں میں کامیاب ہوا۔ لیکن پھر وحشت و بربریت ہی نے تسلط جما لیا۔ اس پر کلیسا نے پادریوں کو ایسے لوگوں کی عبادت کروانے سے روکنا شروع کیا۔ مگر اس سے کچھ نہ ہوا۔ بھائی چارے قائم ہونے لگے۔ "برادران امن"، جن کی حفاظت کلیسا کرتا تھا، اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے لگے کہ جو امیر اور کرایے کے ٹٹو کلیسائی جماعتوں کو اپنے قدموں تلے روندتے تھے ان سے مقابلہ کریں۔ برائی کا پھر بھی ازالہ نہ ہو سکا۔ لیکن اب وہ لمحہ آچکا تھا جب مقتدر اعلیٰ نئے سرے سے قوت اپنے ہاتھ میں

[1] لاطینی کتاب "گریگوری نہم کے احکام" جلد (۱) فصل ۳۴ عنوان صلح و امن ۲۔

لے کر نراج کے خلاف اعلان جنگ کرنے لگے۔
انگلستان میں سکسنی کے قدیم قوانین کے مطابق امن کا ادارہ کافی اچھی ترقی کر چکا تھا۔ ہر آزاد شخص کو اس کا حق تھا کہ اس کے گھر میں امن رہے؛ اور اس پر اس وقت تک حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ ہرجے کی تلافی کرنے کے لیے اس سے پہلے مطالبہ نہ کر لیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی اسے سات دن کی مہلت ملتی تھی۔ بادشاہ کے گھر کا امن اس کی سکونت گاہ اور اس کے آس پاس کے رقبے کو محفوظ بنا دیتا تھا۔ بادشاہ کو اختیار تھا کہ خاص خاص اشخاص یا مقامات کو امن عطا کر دے۔ فتح کے بعد، انگلستان میں جو چار بڑی شاہراہیں گذرتی تھیں، ان کو اور دریاؤں کو مامون بنا دیا گیا۔ پھر تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "امن شاہی" کوئی امتیازی چیز نہ رہی بلکہ وہ ایک عمومی حق بن گیا۔[1]

یہ قابل لحاظ ہے کہ انگلستان میں خانگی جنگیں اتنی زیادہ نہ ہوئیں جتنی دیگر ممالک میں۔ رابرٹ سن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور وہ اس سے یہ معقول نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ فاتح نے کتنا غیر معمولی اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ کہ یہی چیز اس کے جانشینوں کو وراثت میں منتقل ہوئی تھی۔[2]

جہاں تک انگریزی نظام کا تعلق ہے، وہ حقیقت میں بہت خاص ہے۔ گو وہ تصور اصل میں جرمن ہے۔ چنانچہ جب رومیوں کی فوج کے آخری دستے برطانوی سرزمین سے چلے گئے تو جرمن قبیلے اور جوٹ اور ساکسن باشندے اور انگریز سب ایک ایسے ملک میں بسنے لگے جو مفلس

---

[1] سر فریڈرک پالک کا مضمون انگریزی رسالہ "لا کوارٹرلی ریفیو بابت ۱۸۸۵ء" میں۔
[2] رابرٹ سن کی کتاب "شارل کیں کی تاریخ" کا فرانسیسی ترجمہ مولفہ سوآر جلد اول، ثبوت اور تشریحیں تعلیق (ص ۱۲۱)۔

اور کمزور کر دیا گیا تھا اور اس میں یہ قوت نہ تھی کہ پکت اور اسکاٹلینڈ کے باشندوں سے مقابلہ کر سکے یا وائی کنگ یعنے اسکینڈینیویا کے لٹیروں کی تاخت و تاراج کو روک سکے۔ اسی ابتدائی بنیاد پر جدید جرمن عناصر جگہ پکڑنے لگے۔ اور جب آٹھویں صدی عیسوی کے اختتام اور نویں صدی کے آغاز پر ڈنمارک کی پہنچے اور گیارھویں صدی میں نارمنڈی والے وہاں آئے تو یہ نئے لوگ بھی جرمن نسل ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

"انگریزی۔ساکسنی" تمدن اس پر مبنی تھا کہ کسانوں کی ایک آزاد جماعت ہو اور ان کے سر پر ایک موروثی بادشاہ پایا جائے۔ اعلیٰ ترین اختیار قومی مجلس میں مرتکز ہوتا تھا۔ مجلس اعیان میں، جسے وٹن آگے موٹ کہتے تھے، شہزادے، جاگیردار اور ماہر مشیر شریک ہوتے تھے۔ یہی مجلس قوانین بناتی اور اعلیٰ ترین عدالت کا کام دیتی نیز امن اور صلح کے مسائل میں اپنی رائے ظاہر کرتی۔[1]

اڈگار اور کانٹ کے زمانے میں شاہی اختیارات مستحکم ہو گئے۔ اور اسی آخر الذکر بادشاہ کے زمانے میں جاگیرداری نظام نے بھی ترقی پائی۔ ولیم فاتح نے ماضی کو ذرا بھی نہ چھیڑا اور اس ابھرتی ہوئی جاگیرداری ہی کو برقرار رہنے دیا۔ لیکن اس نے اس کو وہ خصوصی نوعیت عطا کر دی جو نارمنڈی کے نظام میں پائی جاتی تھی۔ اور آیندہ نزاع پیدا ہونے کا سد باب کر دیا۔

اگر منطق کا اطلاق کر کے دیکھیں تو، جیسا کہ مختلف مولفوں نے بیان کیا ہے، جاگیرداری نظام میں سرپرست اور آسامی کی دہری نوعیت پائی جاتی ہے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ آسامی اپنے سرپرست یا آقا سے براہ راست تعلق رکھتی اور بادشاہ سے انہیں کوئی واسطہ نہ

82

[1] ۔ اسٹبس کی انگریزی کتاب "منتخب منشور" صفحہ ۱۲۔ نیز گلاسون کی فرانسیسی کتاب "انگلستان کے قانون اور سیاسی دستوری اور عدالتی اداروں کی تاریخ اور ان کا موازنہ فرانس کے قانون اور اداروں کے ساتھ" جلد (۱) صفحہ ۳۹۔

ہوتا۔ اکثر ممالک میں یہی صورت حال تھی۔ انگلستان میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جاگیرداری قانون کے دیگر تمام اصول تسلیم کیے جاتے تھے۔ اور اس نظام میں وہی پوری طرح سرایت کر گئے تھے۔ صرف اس اصول کو رد کر دیا گیا تھا کہ مرکزی اقتدار نہ مانا جائے، جس سے بالآخر یہ نتیجہ نکلتا کہ خود جاگیرداری نظام کے خلاف ایک کشمکش حیات شروع ہو جاتی۔ اس کے برخلاف [انگلستان میں] یہ قاعدہ قرار دیا گیا کہ ہر جاگیر بادشاہ کی عطا سمجھی جائے۔

انگلستان کی تاریخ میں بہرحال ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب خانگی جنگیں زور و شور سے جاری تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب انگلستان کو براعظم یورپ میں عظیم الشان شکستیں اور نقصان ہوئے تو شاہی اقتدار ٹوٹ پھوٹ گیا۔ یارک کے رچرڈ نے کمزور چھٹے ہنری سے مقابلہ شروع کیا، اور وہ جنگ شروع ہوئی جسے "دو گلاب کے پھولوں کی جنگ" کہا جاتا ہے [کیوں کہ حریفوں میں سے ایک کا نشان سفید گلاب تھا تو دوسرے کا سرخ گلاب]۔ اور اس زمانے میں متعدد خانگی جنگیں بھی چھڑ گئیں اور جب تک ساتویں ہنری کا مدبرانہ نظم و نسق اور اس کے وزیروں یعنے ایمپشن اور ڈڈلے کی فراست نیز "ستاروں والی چھت" کی غیر معمولی عدالت کام نہ کرنے لگے اس وقت تک بڑے بڑے جاگیرداروں کی شورش بندی ختم ہو کر ان کی عقل ٹھکانے نہ لگی۔[1]

ناخیرا کی قومی مجلس میں قسطیلہ کے ساتویں الفونسو نے ۱۱۲۸ء میں "رہیڈالگو" یعنی اسپینی امراء اور جاگیرداروں میں امن، محبت اور باہمی دوستی کے نفاذ کا اعلان کیا اور اس نے ان کو اس بات کی ممانعت کی کہ ان میں سے کوئی بھی دوستوں کے خلاف قتل یا زیادتی کا

---

[1] ڈینیٹن کی انگریزی کتاب "انگلستان پندرھویں صدی میں" صفحہ ۳۰۶۔

ارتکاب کرے اور دوسروں کی زمین میں جنگ آزمائی کرے جب تک کہ خود اس کو اشتعال نہ دلایا گیا ہو یا صلح کے ٹوٹ جانے کی اطلاع نہ دی گئی ہو۔ اور اس کا باضابطہ طور سے امتناع عمل میں آیا تھا کہ اشتعال دلانے کے بعد نو دن تک ایک دوسرے پر دست درازی کرسکیں۔ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو اس اعلان شاہی کے مطابق وہ غدار سمجھا جاتا اور اسی الزام میں اسے بادشاہ کے پاس پیش کیا جاتا۔ قرون متوسط میں قانون کے جو اسپینی مجموعے تیار ہوئے ان میں سے اکثر میں یہ قاعدہ مندرج ہے۔

قسطیلہ کے قدیم "فویرو" یعنی منشور میں بیان ہوا ہے کہ خانگی جنگ کی صورت میں جاگیرداروں کو بعض خاص مراعات حاصل ہوں گے اور اجازت تھی کہ جاگیردار کو اس کے دوست مدد دیں، جب وہ اسے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہوا پائیں۔ اور اس وقت ان کو یہ معلوم کرنے تک کی ضرورت نہ تھی کہ آیا کوئی اشتعال دلایا گیا تھا۔ اس بارے میں ذمہ داری صرف اصل مقابلہ کرنے والے ہی پر عائد ہوتی تھی۔ اسی منشور میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ صلح کے ٹوٹ جانے کی اطلاع دینے کے نو دن بعد جاگیردار کو حق تھا کہ اپنے حریف کو اشتعال دلائے اور اس کی بے عزتی کرے اور اس کے تین دن بعد وہ اس کو قتل بھی کرسکتا۔

آراگون میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ہویس کاس کی مجلس قومی مین ۱۲۷۴ء میں پہلے ژاک نے خانگی جنگ کی ممانعت کی بجز اس کے کہ اشتعال دلایا گیا ہو۔ اشتعال کی صورت میں بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ دس دن کی مدت گزرنے سے پہلے حملہ نہ کیا جائے۔ اسی حکمران نے یہ بھی چاہا تھا کہ جو لوگ دو جاگیرداروں کی جنگ میں شخصی اور عملی حصہ نہ لیں تو ان کو بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیے جیسا کہ دِوبوا نے بیان کیا ہے —— یہ ناطرفدار بنا دیے جانے کی

کارروائی تھی۔ کسان، پادری، یہودی، اطاعت شعار عرب، بیوائیں، یتیم اور تمام نہتے لوگ ان حفاظتی احکام کے موضوع قرار پائے[1]۔

فرانس میں خصوصی جنگ کی تنظیم نہایت واضح اصول کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ فلپ ڈبومانوار نے اس چیز سے اس طور پر بحث کی ہے کہ گویا وہ کوئی قانونی مسئلہ ہے[2]۔

اس ذریعے سے ہر قسم کی مضرت کا بدلہ نہیں لیا جاسکتا تھا، بلکہ صرف اس جرم کی صورت میں جو بے رحمانہ اور مہلک اور عمومی ہو۔

جنگ کا اعلان فعل کے ذریعے سے بھی ہوسکتا اور قول کے ذریعے سے بھی۔ فعل کے ذریعے سے اعلان اس وقت سمجھا جاتا جب کھلم کھلا جھگڑا شروع کیا جاتا اور ہتیار پر ہاتھ ڈالا جاتا۔ اس صورت میں وہ لوگ جو جھگڑے اور اختلاف کے وقت موجود ہوتے، اس جنگ میں شریک ہوجاتے۔ قول کے ذریعے سے جنگ کا اعلان اس وقت ہوتا جب دھمکیاں دی جائیں یا دشمن کو اشتعال دلانا شروع ہوجاتا۔ اسی کو دِفی داتیو یعنے اعلانِ مبارزت کہتے۔

جنگ کا بانی یعنے وہ شخص جو اس کا اعلان کرتا اور جو اس بات کا مدعی ہوتا کہ اس کے حریف نے اس کے خلاف تعدی کی ہے، وہ اس جنگ کا سردار یا سرغنہ بن جاتا۔

جو لوگ لڑائی میں اس کے ساتھ شریک ہوتے، ان میں اولاً قریبی رشتہ دار شامل ہوتے۔ اگر جنگ کھلم کھلا اور اعلان کے ذریعے ہوتی تو جنگ کے سرغنے کے رشتہ دار کسی خصوصی اعلان کے بغیر خود بخود

---

[1] دِ دبوا کی فرانسیسی تالیف "اسپین کے قانون تعزیرات کی تاریخ" صفحہ (۱۱۵) و (۱۴۹۴)۔

[2] فلپ دبومانوار کی فرانسیسی تالیف "بُوتُوازی کے رواج" باب (۵۹)۔

[3] دِو کانژ کی فرانسیسی تالیف سلیس لوئی کی تاریخ جس کی تالیف ژروین ڈیل نے کی اور جس پر جدید ملاحظات اور تاریخی مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے"۔ دیکھئے مقالہ ۲۹ "نجی جنگ اور قانون جنگ کے متعلق رواج" صفحہ ۳۰۳ وما بعد۔

اس میں شریک سمجھ لیے جاتے اور اکثر اوقات اپنی مرضی کے خلاف اس میں پھنس جاتے۔ یہ فریضہ اتنا اہم سمجھا جاتا کہ کوئی شخص اس سے اس وقت تک اپنے کو علحدہ نہ کرسکتا جب تک کہ رشتہ داری سے دستبردار نہ ہو اور ساتھ ہی وراثت سے محروم نہ ہوجائے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس درجے تک کی رشتہ داری سے جنگ کے سرغنے کا ساتھ دینے کی ذمہ داری پیدا ہوتی۔ اس کا فیصلہ یہ دیکھنے کے ذریعے سے ہوتا تھا کہ قانون مذہبی نے کن کن رشتہ داروں کو نکاح کے اغراض کے لیے محرم قرار دیا ہے۔ جس زمانے میں کلیسا نے سات پشت تک کے بھائی سے نکاح حرام رکھا تھا تو آٹھ پشت تک کے بھائیوں کو جنگ میں حصہ لینا پڑتا۔ سنہ ۱۲۱۵ء میں لاتران کی پانچویں مجلس شورائے مذہبی نے یہ ممانعت چار پشت کے رشتے ہی تک محدود کردی اور جنگ کرنے کی ذمہ داری بھی اسی درجے کے رشتہ داروں تک محدود ہوگئی۔ دو حقیقی بھائیوں کو آپس میں جنگ کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی کیونکہ ایک کے جتنے رشتہ دار ہوتے وہی سب کے سب دوسرے کے بھی رشتہ دار ہوتے۔ جنگ میں ایک مرتبہ شریک ہونے کے بعد بھی رشتہ دار اس سے الگ ہوسکتے لیکن اس کے لیے ضروری ہوتا کہ دشمن سردار کو اس کے آقا (بادشاہ) کی عدالت میں طلب کرکے یہ بیان کریں کہ انھوں نے جھگڑے کے اصل باعث کے متعلق کوئی رضامندی نہیں دی ہے اور انھیں قسم کھا کر یہ بھی وعدہ کرنا پڑتا کہ وہ اب اس میں مزید حصہ لینا نہیں چاہتے۔

آسامیوں کے لیے ضروری تھا کہ جنگ کے سرغنوں کا ساتھ دیں۔ اور اگر وہ اس میں شریک ہوتے تو ان پر حملہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔

خانگی جنگ کرنے کا حق نہ تو ان لوگوں کو حاصل تھا جو

مقتدر اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے اور نہ ہی شہروں کے عام معززین کو۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ ایک شریف آدمی کے سوا کوئی اور جنگ نہیں کر سکتا۔ عوام الناس کو ایسی جنگ، کا حق اس وقت تک حاصل نہ ہوتا جب تک بادشاہ ان کو اس کی خصوصی اجازت نہ عطا کرے۔

خصوصی جنگ کا اختتام یا تو اس طور سے ہوسکتا جسے صلح کا نام دیا جاسکتا ہے یا [جنگ سے دستبرداری کا] "اطمینان" دلانے کے ذریعے سے۔ اسی طرح جنگ کا اختتام اس طور پر بھی ہوسکتا کہ اول تو ہر دو فریق "جنگ کی ضمانت" کا عذر کریں یعنی جاگیردار یا آقا کی عدالت میں حاضر ہوئے ہوں اور اسی نے ان کو حکم دیا ہو کہ معاملے کا فیصلہ باہمی مقابلے کے ذریعے سے عمل میں آوے۔ اور دوسرے اس وقت بھی جب کہ جرم یا تعدی کا انتقام عدالت کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو۔

مذکورہ بالا اطمینان دہانی کے متعلق کچھ تشریح ضروری ہوگی۔ جو فریق جنگ میں شریک نہ ہونا چاہتا یا اس سے علحدہ ہو جانے کی خواہش کرتا اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے جاگیردار یا اس کی عدالت کے پاس رجوع ہو اور بتائے کہ اس کے حریف نے اس کو اطمینان دہانی عطا کردی ہے یعنے اطمینان دلایا ہے کہ اسے جانی یا مالی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے اور جس بنا پر جنگ شروع ہوئی تھی وہ مسئلہ مقتدر اعلیٰ کے فیصلے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مقتدر اعلیٰ اپنے ماتحت کو حکم دیتا کہ وہ فریق ثانی کو مطلوبہ اطمینان دہانی عطا کرے اور یہ اطمینان دہانی اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کے لیے بھی قابل پابندی ہوتی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس اطمینان دہانی کے لیے فریقین میں سے کسی ایک کی جانب سے مطالبہ ہونے کی ضرورت تھی۔ مقتدر اعلیٰ براہ راست اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا؛ البتہ اس کو یہ حق

85

ضرور حاصل تھا کہ امن یا عارضی صلح کے لیے ان کو مجبور کرے۔

خانگی جنگ سے جو مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں ان کو ایک حد تک رفع کرنے کے لیے جو اولین تدبیریں اختیار کی گئیں ان میں سے ایک سینٹ لوئی کی طرف سے آغاز کردہ "شاہی چالیس دن" کا امن ہے۔ اور بعض مولف تو اسے فلپ آگسٹ کی طرف سے جاری کردہ قرار دیتے ہیں۔ دوکانژ نے اس کا مقصد یوں بیان کیا ہے کہ "یہ اکثر پیش آتا رہا ہے کہ کسی جنگ کے سرغنے کی اولاد یا دیگر رشتہ داروں کو جنگ کے چھڑنے کی کوئی اطلاع نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مبارزت اور اشتعال دلائے جانے کی۔ بنا برآں ان کے رشتہ داروں کے دشمن ان کو بے خبری کی حالت میں جا دبوچتے ہیں۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا کہ سرغنے کی اولاد اس لڑائی میں اس وقت تک شریک نہ سمجھی جائے جب تک کہ اعلان جنگ اور اشتعال دلائے جانے پر چالیس دن نہ گزر جائیں بشرطیکہ یہ لوگ ان حاضرین میں موجود نہ ہوں جن کی موجودگی میں کسی جھگڑے یا دیگر عملی ذرائع سے جنگ کا آغاز ہوا ہو[1]"

چالیس دن کی یہ مہلت جنگ کی تیاریوں کے لیے استعمال کی جا سکتی، یا "اطمینان دہانی" اور جنگ سے اپنی علیحدگی کے لیے، یا عارضی صلح کے لیے، یا مستقل صلح کے لیے۔ جو کوئی "شاہی چالیس دن" کی پروا کیے بغیر اپنے حریف کے رشتہ داروں کی جان یا مال پر دست درازی کرتا تو اسے بطور غدار کے سزا دی جاتی۔ چالیس دن کی یہ مدت جنگ کے اصل سرغنے کو البتہ بالکل نہ ملتی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر بعض اور تدبیریں

---

[1] دوکانژ کی فرانسیسی کتاب "سین لوئی کی تاریخ" مقالہ نمبر ۲۹ "خانگی جنگ اور قانون جنگ کے رواجات" صفحہ ۳۳۳۔

آغاز ہوئیں جن سے اس پر اور زیادہ تحدیدایں عائد کی گئیں۔ سنہ ۱۲۹۶ء
میں "خوبصورت فلپ" نے اس بات کی قطعی ممانعت کا حکم دیا کہ بادشاہ خود جس
زمانے میں جنگ میں مصروف ہو تو کوئی بھی خانگی جھگڑے شروع کیے جائیں
اس نے سنہ ۱۳۰۵ء اور سنہ ۱۳۱۴ء میں جو احکام دیے ان میں سنہ ۱۲۹۶ء کے
حکمنامے کی توثیق کی گئی ہے۔ "خوبصورت فلپ" کی موت پر مختلف صوبوں
کے جاگیردار اس امر پر اصرار کرنے لگے کہ خانگی جنگ کا کرسکنا ان
کے امتیازات میں سے ایک ہے۔

سنہ ۱۳۱۵ء میں ان کا مطالبہ پورا ہوتا ہے اور "شاہی چالیس دن"
کا قاعدہ رواج باہر ہوجاتا ہے۔ سنہ ۱۳۳۰ء میں ایک شاہی حکمنامے نے
پورے علاقۂ آکی تین میں خانگی جنگوں کی اجازت دے دی، لیکن یہ
ضروری قرار دیا کہ ان کا قبل از قبل اعلان کیا جایا کرے۔ اور یہ بھی حکم
دیا کہ جس زمانے میں خود بادشاہ کو بیرونی لڑائیوں کی مصروفیت
ہوگی تو یہ خانگی جنگیں ملتوی کردی جائیں گی۔ جنگ کے حق کے استعمال
پر جو شرطیں عائد کی گئیں ان کے تحت یہ ممکن ہوگیا کہ افسران شاہی
اس غرض کے لیے دخل دہی کریں کہ ان شرطوں کی پوری تعمیل ہو۔
سنہ ۱۳۵۲ء کا حکمنامہ یہ ضروری قرار دیتا ہے جو جاگیردار اس مہم کی
سرداری کرنے والا ہو، وہی فریق ثانی کو پیام اشتعال و مبارزت
روانہ کرے اور یہ کہ کسی دوسرے شخص کو خانگی جنگ کا حق نہ ہوگا۔
اس کے ایک ہی سال بعد "شاہی چالیس دن" کا قاعدہ بحال کردیا گیا۔
سنہ ۱۳۶۱ء کے حکمنامے میں سب سے پہلی مرتبہ اس کی صراحت کے ساتھ
ممانعت کی گئی کہ "جاگیرداروں کے امتیازات اور رواج کے باوجود
کسی بھی قسم کی خانگی جنگ کی جاسکے۔

اس کے چھے سال بعد ایک نیا تنسیخی حکمنامہ جاری ہوتا ہے جس
نے یہ ضروری قرار دیا کہ "خاطی جلاوطن کیے جاسکیں گے اور ان کے
قریبی رشتہ دار اور دوست گرفتار و قید کرلیے جاسکیں گے"۔ سنہ ۱۴۱۳ء میں

86

ایک اور فرمان کے ذریعے سے خانگی جنگ کی ممانعت کی گئی[1] یہ اس وقت تک باقی رہا حتیٰ کہ گیارھویں لوئی نے جاگیرداری نظام ہی کو توڑ نہ ڈالا۔

جرمنی میں یہ برائی پوری شدت کے ساتھ جاری رہی اور حق قوت یعنے لاٹھی راج اپنے پورے نتائج کے ساتھ ایک مسلمہ قاعدہ سمجھا جاتا رہا۔ اور اس حق سے ہر کوئی مستفید ہو سکتا تھا۔ یہ نہ بھلایا جائے کہ جرمن شہنشاہت' بادشاہت کے تصورات سے متاثر ہو چکنے کے باوجود حقیقت میں ایک وسیع اعیانیت ہی رہی اور ماتحت حکمرانوں کی خود مختاری قریب قریب مکمل ہی رہی اور مرکزی اقتدار کا اثر تقریبًا صفر رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جھگڑوں اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ برابر جاری رہا۔ شہنشاہ' شہر' جاگیردار' اور عامہ رعایا یہ سب بارہا اس کی کوشش کرتے رہے کہ اس تکلیف دہ صورت حال کا کوئی علاج کریں۔ فریڈرک باربروسہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس غرض کے لیے لڑتا رہا کہ ملک کے امن کا احترام کیا جائے۔ اس کے جانشینوں نے بھی اسی طرز عمل کو اپنا نمونہ بنایا۔

توبرمبرگ کی مجلس قومی نے جو شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوئی تھی' ایک عمومی امن کا اعلان کیا اور اس کی ممانعت کی گئی کہ خانگی جنگیں کی جا سکیں بجز اس کے کہ کوئی شخص اپنی ذات یا اپنے باپ یا اپنے حلیف کا انتقام لینا چاہتا ہو۔ اور خود اس صورت میں بھی اس کی اجازت نہ تھی کہ حریف کو باقاعدہ طور سے اطلاع دینے کے بعد

---

[1] دیولوا کی فرانسیسی کتاب "فرانس کی تعزیرات کی تاریخ" صفحہ ۵۲ و مابعد۔

[2] فون ویشتر کی جرمن تالیف "جرمن تاریخ پر مضامین خاص کر جرمن قانون تعزیرات کی تاریخ پر" صفحہ ۴۹ و مابعد۔ نیز دیکھیے یولیوس بررک کی جرمن تالیف "قرون متوسط کی جرمن دولت عامہ کے قانون انتقام کے اصول"۔

87 تین دن گزرنے سے پہلے کوئی حملہ کیا جائے۔ ان احکام کی اکثر تجدید بھی ہوتی رہی۔

یہ علاج ناکافی ثابت ہوا۔ اس لیے "معاہداتی امن" کا اضافہ عمل میں آیا۔ اس کی ایک مثال ۱۲۵۴ء میں ملتی ہے۔ دوسرے فریڈرک کو معزول کرنے پر جرمنی میں جس قسم کا تراج پھیل گیا تھا اس سے قوانین بیکار ہو گئے تھے، امن و امان برطرف ہو گیا تھا، عوام الناس کے لیے اطمینان رخصت ہو چکا تھا، اور خانگی جنگوں نے واقعی قزاقی اور ڈاکہ زنی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دریائے رائن اور سواب کے صوبوں کے جاگیرداروں نے ان علاقوں میں کسی اور برتر اقتدار کی قطعاً غیر موجودگی کے باعث خاص کر ایک ہولناک اباحیت برپا کرنے کا امتیاز حاصل کر لیا۔ اور یہ علاقے قتل اور لوٹ کی وارداتوں سے لبریز ہو گئے۔ ماینس اور ٹری یئر نیز کولون کے آرک بشپوں نے ۱۲۴۷ء میں بمقام ورمس اور اس کے بعد بمقام ماینس ان حکمرانوں سے ایک معاہدہ کیا جو اس قسم کی لوٹ مار سے سب سے زیادہ نقصان اٹھا رہے تھے۔ نیز دریائے رائن کے دونوں کناروں پر سوریش سے کولون تک بسے ہوئے (۶۰) سے زیادہ شہروں سے بھی۔ اور ان معاہدہ کرنے والوں نے اقرار کیا کہ امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کے خلاف یہ سب مل کر ایک مدامی جنگ کریں گے۔

"حق قوت" میں بھی تنظیم پیدا کی گئی۔ چنانچہ شاہی احکام کا ایک سلسلہ نیز ۱۳۵۶ء کا "زرین فرمان پاپائی" اس غرض کے لیے جاری ہوئے کہ اس کے قواعد پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔ چنانچہ قرار دیا گیا کہ جو کوئی انتقامی جنگ تو مول لے، لیکن وہ شرطیں پوری نہ کرے جو اس کے لیے عائد کی گئی ہیں، تو وہ ملک کی امن شکنی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اور اسے وہ سزا دی جائے گی جو اس جرم کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اعلان مبارزت ایک پیام رساں کے

ذریعے سے کیا جاتا، جو حریف کے گھر والوں کے لیے کوئی اشتعال انگیز چیز انجام دینا۔ جنگ کے چھڑ جانے پر کلیسا سے تعلق رکھنے والے مذہبی افسروں بیماروں، زائروں، تاجروں اور کسانوں پر دست درازی نہیں کی جاتی۔

جرمن شہروں کی تاریخوں میں انتقامی لڑائی کی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب مل سکتا ہے۔ "شہری امن"، جس کے ذریعے سے شہر کے آزاد باشندوں کی حفاظت کا اطمینان دلایا جاتا، وہ نہ صرف تمام شہریوں کو حاصل ہوتا بلکہ اجنبی بھی اس میں شامل سمجھے جاتے۔ اور شہر کی فصیل کے اندر کوئی خانگی جنگ روا نہیں رکھی جاتی۔ البتہ حدود شہر کے باہر لڑائیوں کی جو اجازت دی گئی تھی اس کے معنے صرف یہ تھے کہ شہر والے اگر اس میں حصہ لیتے تو حکام شہر ان کے خلاف کوئی چارہ کار نہیں اختیار کرتے۔ جلدی ہی کسی شہر کے باشندوں کے مابین خانگی جنگ کی ممانعت عمل میں آگئی، بلا لحاظ اس کے کہ وہ جنگ کس جگہ لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر ۱۱۵۶ء میں جو قانون بمقام ثورمس بنایا گیا اس کی رو سے اگر کوئی شخص اپنے ہم شہری کا تعاقب حدود شہر کے باہر کرے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ شہنشاہی علاقے کے کس حصے میں عمل میں آیا، تو اس کے متعلق خیال کیا جائے گا کہ گویا اس نے شہر کے اندر ہی اس فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی بنا پر اسے سزا دی جائے گی۔[1]

متعدد شہروں نے بعض عجیب احکام صادر کیے۔ چنانچہ انھوں نے اجنبیوں کو تو آپس میں انتقامی لڑائی لڑنے کی اجازت دی لیکن اس شرط سے کہ جو کوئی اس میں حصہ لے وہ اپنے حقوق شہری سے دست بردار ہو جائے۔ اس طرز عمل کا باعث ذمہ داری کے پھیل پینے کا خوف تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اس کا رواج نظر آتا ہے کہ

88

[1] فون ماورر کی جرمن کتاب "جرمنی کے شہری دستوروں کی تاریخ" جلد (۱) صفحہ ۳۶۹ وما بعد۔

شہروں کے باشندے "اجازت کی سرفرازی" کی درخواست کرتے اور اپنے حقوق شہری سے دست بردار ہوتے تاکہ جنگ میں حصہ لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دست برداری عارضی ہوتی اور جھگڑا چکنے کے بعد لڑائی میں حصہ لینے والے اپنے اپنے شہروں میں اپنی پرانی حیثیت دوبارہ حاصل کر لیتے۔[1]

خود شہر بسا اوقات خانگی جنگ کرتے۔ کبھی تو طاقتور خاندانوں کے خلاف، کبھی مختلف شہر آپس میں، اور کبھی خود اپنے بادشاہ کے خلاف۔ بہر حال اس قسم کا منظر صرف جرمنی ہی میں نہیں پیش آرہا تھا۔ انگلستان میں پہلے ایڈورڈ اور دوسرے ایڈورڈ کے زمانے میں "پانچ بندر گاہیں" اور دیگر تجارتی شہر سدا اپنے ہمسایہ ساحلوں کے باشندوں سے لڑتے رہے۔ ہالم نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ ریمر کے مجموعے میں جو دستاویزیں ہیں ان میں سے آدھی سے زیادہ انھیں جھگڑوں کی نسبت ہیں اور ان جھگڑوں کی شہادت دیتی ہیں جو ناروے اور ڈنمارک کے جہاز رانوں سے پیش آتے رہے۔ خود رقابتوں کے باعث انگلستان کے مختلف شہروں میں خونریز جھگڑے ہوتے رہے۔ فلانڈرس، زیلانڈ اور فرانس کے ساحلی شہر بھی اپنے جھگڑوں میں ہتھیار سے برابر مدد لیتے رہے۔[2] جرمنی کی اضطراب انگیز حالت سے ایک خصوصی ادارہ وجود میں آیا جسے "آوس ترے گے" یعنی پنچایت کہنے لگے چنانچہ جرمن شہنشاہت کی مختلف مملکتیں باہمی جھگڑوں کے لیے پنچ مقرر کرنے لگیں۔

جرمنی سے خانگی جنگ کو ختم ہونے کے لیے صدیاں لگ گئیں۔ ترکوں کے خطرے سے جو دہشت پیدا ہوگئی تھی اسی کے دباؤ کے تحت

---

[1] ایضاً جلد (۱) صفحہ ۴۱۳ و مابعد۔

[2] ہالم کی فرانسیسی کتاب "یورپ قرونِ متوسطہ میں" باب ۸ حصہ دوم۔

۱۴۹۵ء میں ثورمش کی مجلس قومی نے مکرر اندرونی امن کا اعلان کیا اور شہنشاہی مجلس کو اس بارے میں اعلیٰ ترین اختیار سماعت عطا کرکے یہ حق دیا گیا جرمن "ریحد" کے مختلف "اعضاء" میں جو جھگڑے پیدا ہوں، ان کا قطعی فیصلہ کرے، اور اس فیصلے کا کہیں اور مرافعہ نہ ہوسکے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک اس حکمنامۂ ثورمس کی پچیس سے زیادہ مرتبہ توثیق کرنی پڑی۔

خانگی جنگ کا حق اٹلی میں بھی ایک مسلّمہ امر تھا۔ اس کے باعث وہاں عظیم الشان تباہیاں نازل ہوئیں۔ جو شہنشاہی قوانین جرمنی اور اٹلی میں قابل نفاذ تھے، انھوں نے اس صورت حال کی نزاکت کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ ایک قانون جو خاص کر اٹلی کے لیے بنایا گیا تھا، اس میں یہ حکم تھا کہ "تمام ڈیوک، مارکوئیس، کونٹ، کپتان، ثانفاشور یعنی جاگیردار، صوبوں کے گورنر، قونصل، اور شہروں کے عمومی حکام عدالت، غرض یہ کہ جملہ آزاد اشخاص جن کی عمر (۱۸) اور (۶۰) سال کے مابین ہو، اس بات کا حلف لیں کہ امن کو ملحوظ اور باقی رکھیں گے اور یہ کہ وہ اس حلف کی ہر پانچ سال بعد تجدید کیا کریں"۔ اس حلف کی خلاف ورزی پر شہروں کو تو سو سو اشرفیوں تک جرمانہ کیا جاتا تھا اور معمولی شہریوں کو چھے چھے اشرفیوں تک۔ امن شکنی سے جن لوگوں کو نقصان پہنچتا انھیں ان کے ہرجے کے تناسب سے معاوضہ دلایا جاتا۔[۱]

فریڈرک باربروسہ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اٹلی میں خانگی جنگ اور بہت دنوں تک برقرار رہی۔

اس امر کا بیان کرنا کافی دلچسپ ہے کہ "بیت المقدس کے قواعد" [جو تیرھویں صدی کے آغاز میں گوڈفرائے دبوئیوں کے حکم سے عیسائی سلطنت بیت المقدس کے لیے تیار کیے گئے تھے] خانگی جنگ کے

[۱]۔ دبوا کی فرانسیسی تالیف "جدید قوموں کے قانون تعزیرات کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۵۰۴۔

حق کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ چیز اس مملکت میں جائز نہیں سمجھی جاتی تھی۔

سویڈن میں یہ بربری رواج سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک پھلتا پھولتا رہا۔ اوروں کی طرح بلند مرتبہ پادری بھی وسطی اور جنوبی یورپ میں اس حق کا اپنے لیے استعمال کرتے رہے، لیکن وہ اس کا استعمال اپنے نائبوں یا مختاروں کے ذریعے سے کرواتے تھے۔ اور سب سے آخر میں جو لوگ اس حق سے دستبردار ہوئے وہ بھی یہی تھے۔ گستاف واسا کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش آئی کہ ایک سرکاری قانون نافذ کر کے ان لوگوں کے قبضے سے بہت سے قلعے لے لیے جائیں اور اُن قلعوں کی حفاظت بادشاہ کے سپرد کی جائے۔

وارڈ نے بیان کیا ہے کہ پولستان (پولینڈ) کو چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ کے برابر کسی اور ملک نے خانگی جنگ کو اتنے زیادہ دنوں جاری نہیں رکھا[1]۔

اس کے علاج کے متعلق بادشاہوں کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی ہے۔

[1] سترھویں صدی کے بعد سے خانگی جنگ صرف شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ وارڈ نے بیان کیا ہے کہ مانفسیلڈ کے ارنسٹ اور سکسنی کے برنارڈ نے اپنے ہی طور پر "تیس سالہ جنگ" کے دوران میں جنگیں شروع کی تھیں (دیکھیے وارڈ کی انگریزی کتاب "یورپ کے قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کے متعلق تحقیقات" جلد (۲) صفحہ ۳۱۲۔

ریال نے بھی دو مثالیں دی ہیں جو چودھویں لوئی کے زمانے کی ہیں۔ ۱۶۸۳ء میں بوئیوں کے ڈیوک نے، جو شخصی طور سے فرانس کی رعایا تھا اور جس کی ڈیوکی تاج فرانس کی حفاظت میں تھی، چودھویں لوئی کے دشمنوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ اور اس کا اعلان بادشاہ کے حکم سے پاریس میں شائع اور چسپاں کیا گیا تھا۔ اسی سال اشافت لو کے پادری نے، جو شہنشاہیت کے ماتحت حکمرانوں میں سے ایک کہلایا جاتا تھا، فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ دیکھیے ریال دو کوربان کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد ۵ صفحہ ۳۴۴)

وہ تدبیریں تو اختیار کرتے تھے لیکن انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ شاہی خزانوں کے حسابات اس کے متعلق اشاروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے مراسلے بکثرت ہیں جن میں جاگیرداروں پر یہ بات واجب قرار دی گئی تھی کہ اپنے خونریز جھگڑوں کو ختم کردیں اور اپنی شکایتوں کو حکمرانوں کے انصاف کے لیے پیش کریں۔ پارلیمان بھی اس میں مداخلت کرتی ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا کہ جاگیرداروں کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس نے ملزموں کو نام لے کر بھی متعین کیا۔ مگر یہ سب بےسود ہی رہا[1]۔ اس المناک داستان کی تکمیل کے لیے ان خانگی جنگوں کے علاوہ شاہی اقتدار کے خلاف بغاوتیں بھی بکثرت پھوٹ پڑتی رہیں۔ سترھویں صدی کا ایک انگریز مولف اسکاٹ لینڈ والوں پر بظاہر مبالغہ آمیز طور سے یہ الزام لگاتا ہے کہ انھوں نے ایک بربری طریقے سے اپنے حکمرانوں میں سے چالیس کو قتل کردیا تھا۔ اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان میں سے بیس سے زیادہ موت کے ذریعے سے ان تکلیفوں سے بچ گئے جو ان کو دی جانے والی تھیں یا تباہ حالی میں موت سے دوچار ہوئے۔ اس سے ایک صدی پہلے جارج بکنن نے جو بڑا زبردست مخالف بادشاہت شخص تھا اپنی لاطینی کتاب "بادشاہ کے حقوق اسکاٹ لینڈ والوں پر" میں اس نظریے کی تائید کی ہے کہ ظالم پرور ارہی کردینا چاہیے۔ اور اس نے مسرت کے ساتھ ایسی بارہ مثالیں دی ہیں جن میں اسکاٹ لینڈ کے بُرے بادشاہ یا تو قید کردیے گئے تھے یا جلا وطن یا قتل۔

نظریات کی دنیا میں خانگی جنگ کے ادارے کی تائید نہیں کی جاسکتی تھی۔ جو کوئی جنگ کا نام لیتا تو اس سے مراد مقتدر اعلیٰ کے اقتدار کا عمل میں آنا مراد ہوتا۔ جس واحد جنگ کی اجازت دی جاسکتی ہے وہ

[1] لاطینی کتاب "خزانوں کے حسابات" جلد (۱) دیباچہ صفحہ ۵۹۔

سرکاری جنگ ہے۔ قانون روما بھی اس بارے میں دھوکا نہیں دیتا، اور اس میں صراحت کے ساتھ (لاطینی میں) یہ قاعدہ بیان کیا گیا کہ "ہتھیاروں کی کسی قسم کا بھی استعمال حکمران کے علم کے بغیر کوئی اور نہیں کر سکتا"۔ شہنشاہ ثاؤنی ٹین اور قالنس کے حکنامے میں (لاطینی میں) یہ قانون درج ہے، کہ "کسی کو بھی ہرگز یہ حق نہ ہوگا کہ ہمارے علم اور اجازت کے بغیر ہتھیاروں کو حرکت میں لائے"۔ قرون متوسط کے ماہرین قانون کے متعلق ہم اس واقعے کو جتنا بھی نمایاں طور سے واضح کریں وہ کم ہی ہوگا کہ وہ عام طور پر قانون روما کے تصورات سے متفق تھے، اور انھوں نے اس بارے میں جو بھی خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بالکل صاف ہیں۔ اور حقیقت میں یہ ماہرین قانون ہر جگہ اس بات کے لیے لڑتے رہے کہ مرکزی اقتدار کو اس کے سب سے زیادہ قیمتی خصوصیات میں سے ایک واپس دلادیں۔ شروع سے وہ یہ کہتے رہے کہ صرف وہی شخص جنگ کرنے کا حق رکھتا ہے جس سے اوپر کوئی اور مسلمہ سردار نہ ہو۔ اور بارتولے نے بیان کیا ہے کہ اگر ایسے شہروں میں آپس میں جھگڑا پیدا ہو جو کسی ایک مقتدر اعلیٰ کے ماتحت ہیں تو حقیقت میں اسے جنگ ہی نہیں کہہ سکتے۔

ان درست خیالات کی تائید کرنے میں ماہرین قانون اکیلے نہ تھے۔ چنانچہ خود تیرھویں صدی میں اکویناس کے سینٹ ٹامس نے، جس کا اثر قرون متوسط کے خیالات پر عظیم الشان پڑا ہے، یہ لکھا ہے کہ کسی جنگ کے منصفانہ قرار دیے جانے کے لیے تین شرطوں کا مطالبہ ہونا لازمی ہے، ان میں سب سے مقدم یہ ہے کہ (لاطینی میں) "حکمران کی اجازت سے جنگ کی جائے"۔ یہ کہنے سے کہ جنگ کی اجازت حکمران کی طرف سے دی جانی چاہیے، یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی اور خانگی شخص اپنے طور پر جنگ کا اختیار نہیں رکھتا۔ چنانچہ یہ ممتاز ماہر دینیات ٹامس (جو کتاب "دینیات کے چوٹی کے مسائل" کا مولف ہے)

ایک طرف تو یہ بیان کرتا ہے کہ خانگی افراد اپنا حق عدالت کے سامنے آکر جتا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ یہ بیان کرتا ہے کہ سپاہیوں کا طلب کرنا مقتدرِ اعلیٰ کا ایک اختیاری فعل ہے۔ اور چونکہ حکومت حکمران کے سپرد کی جاتی ہے، اس لیے اس حکومت کی مدافعت بھی اسی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

اکوئناس کے سینٹ ٹامس نے جنگ اور عدل گستری میں ایک مماثلت بھی قایم کی ہے۔

جنگ کا اعلان کس کی طرف سے عمل میں آسکتا اور جنگ کون کرسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال پیدا کرنے لگا کہ اس بات کو معلوم کیا جائے کہ مقتدرِ اعلیٰ کون ہے؟

نظریے کی حد تک اس کا حل آسان ہے۔ پوپ اور شہنشاہ پوری طرح خود مختار ہیں۔ انھیں کو جنگ کا اعلان کرنے اور جنگ کرنے کا حق ہے۔ لیکن عمل کی حد تک یہ معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ پوپ اور شہنشاہ نے اپنے آپ کے متعلق یہ اعلان کرلیا تھا کہ وہ دنیا کے آقا ہیں، لیکن ہر طرف ایسے حکمران یا شہر نظر آتے تھے جو اپنے اوپر کسی اور اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان ماہرینِ قانون نے تسلیم کرلیا کہ پوپ اور شہنشاہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی جنگ کے حق کا استعمال کرسکتے ہیں۔

"فیرژیے کا خواب" نامی فرانسیسی کتاب میں اس نظریے کو عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ "جو حکمران زمین پر کسی اور کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ نہیں مانتا ہے، وہ عدالتی طریقۂ کار کو چھوڑ کر جنگ کرنے میں حق بجانب ہوسکتا ہے.... اور کوئی فرد رعیت اپنے مقتدرِ اعلیٰ کی اجازت کے بغیر جنگ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ایک قانون میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے یعنی: (لاطینی میں) ہتھیاروں کے استعمال کے قواعد، پہلا قانون، کتاب نمبر (۱۱)[۱]"

---

[۱] فرانسیسی تالیف "فیرژیے کا خواب" حصۂ اول باب (۱۴۷)۔

آونورے بونے اس رائے کو قبول کرلیتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر کرسٹین ڈپیزان ہے، جو اس کو مزید ترقی دیتی ہے۔ چنانچہ:
"ان لوگوں کو جو اس نکتے پر بھٹک سکتے ہیں، اگر صحیح بات بتانا چاہیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشک و شبہہ حق اور قانون دونوں کے مطابق جنگ یا لڑائی کا اختیار کسی اور کو نہیں سوائے مقتدران اعلیٰ کے۔ مثلاً شہنشاہ، بادشاہ، ڈیوک، اور دیگر دنیاوی حاکم جو اسی طرح کے دنیاوی اختیارات کے نقطۂ نظر سے بڑے سردار ہوں"

92

یہ نکتہ فرانس کے قانون عمومی میں معتقدات کی سی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔ کرسٹین ڈپیزان نے اسے ایک معقولیت پسندانہ بنیاد دے دینی چاہی۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "نہ کسی بیرن یعنی جاگیردار کو اور نہ ہی کسی اور شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس بات کا کوئی اختیار ہے؛ بجز اس کے کہ اس کا اقتدار اعلیٰ رکھنے والا سردار اس کی اجازت اور رضامندی دیدے اور اسے درست قرار دیدے.... کیونکہ اگر اس کے خلاف ہوسکے تو مقتدر حکمران کس کام آئیں گے جب وہ اپنی رعایا میں سے ہر ایک کے لیے حق کا نفاذ اور حق رسانی نہ کرسکیں؟ اور ان پر کسی استعمال بالجبر کے ذریعے سے ظلم ہو تو ان کی حمایت اور حفاظت نہ کرسکیں؟ جیسا کہ اچھا چرواہا اپنی بھیڑوں کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال دیتا ہے، اسی طرح رعایا کے لیے ان کے راعی یعنی حکمران کو ایک پناہ گاہ بن جانا چاہیے، جب کہ رعایا کو کوئی مصیبت پیش آئے۔ اور اچھا حکمران اپنی رعایا کی خاطر ہتھیار اٹھائے گا، جب اس کی ضرورت ہو۔ یعنی اپنی پوری قوت سے رعایا کی مدد کرے گا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کرے، چاہے یہ مدد عدالتی ذرائع سے ہو، چاہے ہتھیار اٹھانے کے ذریعے سے[1]۔ یہ اصل میں

---

[1] کرسٹین ڈپیزان کی فرانسیسی تالیف "ہتھیاروں کے کارنامے اور شجاعت کے متعلق کتاب" حصہ اول باب (۳)۔

ایک ادیبانہ انداز اور لطیف اسلوب میں اسی قاعدے کی توضیح کرنا ہے جس کے متعلق ہم نے دیکھا کہ قانونِ روما نے اس کو اتنی صفائی کے ساتھ قایم کردیا تھا۔

ژاں لوپس نے اپنی لاطینی کتاب "استاد و شاگرد کے مکالمے" کے ایک مکالمے میں یہ سوال کیا ہے کہ "جو لوگ بطورِ واقعہ اپنے اوپر کسی سردار کو تسلیم نہیں کرتے، جیسے فرانس کا بادشاہ یا اسپین کا بادشاہ، آیا وہ صحیح معنوں میں جنگ کرسکتے ہیں یا نہیں؟" مولف نے اس کا جواب اثبات میں یوں دیا ہے کہ "ہاں۔ کیونکہ انھیں حکمرانانہ حقوق حاصل ہیں۔ اور انھیں کسی برتر سردار سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر کوئی اور سردار ہوتا ہی نہیں[1]"

فلپ ویلانت نے، جو ایک فلانڈری ماہرِ قانون تھا، قانونِ جنگ کے متعلق چند دلچسپ سطریں مختص کی ہیں۔ چنانچہ خاص کر اس سوال سے بحث کرتے ہوئے کہ کونسے حکمران جنگ کرنے کا حق رکھتے ہیں، اس نے پوپ اور شہنشاہ کا ذکر کیا ہے: "کیونکہ ان کے اوپر کوئی سردار نہیں ہوتا۔" اس مولف کی رائے میں باقی تمام دوسرے حکمرانوں کو جنگ کرنے کا بطورِ واقعہ تو اختیار ہوتا ہے لیکن بطورِ حق نہیں کیونکہ جہاں تک حق کا سوال ہے ایسے حکمرانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے برتر سرداروں کو تسلیم کریں۔ البتہ اس مولف نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ غاصبانہ تصرف اور رواج بے شبہہ اس آخر الذکر قاعدے کے خلاف ہیں۔ ان دیگر حکمرانوں میں ویلانت نے اسپین، انگلستان، اور اسکاٹ لینڈ کے بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔

نکولاس اے ڈر ہارڈی ایک قابلِ لحاظ شخص گزرا ہے۔ اس نے

---

[1] ژاں لوپس (یعنی لوپیس) کی لاطینی کتاب "حکمرانوں کی حلیفی کے متعلق مکالماتی رسالہ"۔ رسائل قانون عمومی جلد (۱۲) ورق ۳۰۲ و مابعد۔

نوبت بہ نوبت ہالینڈ کی مجلس شوریٰ کی اور مالی نیس کی مجلس شورائے اعظم کی صدارت کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس نے لاطینی میں "مشورے" نامی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اس میں اس نے واضح کیا ہے کہ حکمران کی اجازت کے بغیر کوئی جنگ نہیں کرسکتا، اور یہ کہ حقیقت میں حکمران اس بارے میں رومی عوام کا قائم مقام ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں: "اگر قانون قدرت کا امن کے ساتھ انطباق عمل میں آئے تو اس کا مطالبہ ہوگا کہ اجازت لی جایا کرے مشورہ لیا جایا کرے، بحث مباحثہ کیا جایا کرے اور تاجروں کو اطلاع دی جایا کرے تاکہ وہ ہنگامہ آرائی کے اندر حفاظت اور سلامتی سے رہ سکیں۔"

ژول فیرے تی نے، جو شارل کیں کا ایک عہدہ دار تھا، لکھا ہے کہ پوپ کو چھوڑ کر باقی تمام حکمران شہنشاہ کے ماتحت ہیں اور اسی سے اپنے امتیازات و اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ ہیں: "جن کو ایسے امتیازات حاصل نہ ہوں وہ شہنشاہیت کے حقوق اور علاقوں پر غاصبانہ تسلط رکھنے والے سمجھے جائیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی حکمران اپنی بہادری کے ذریعے سے اپنا وہ مقبوضہ علاقہ غیر عیسائیوں سے حاصل کریں مثلاً اسپین اور پرتگال کے بادشاہ۔"

الفونسو الوارِ ینتس خیرے ای زو نے اپنی حد تک اس خیال کی تائید کی ہے کہ حقیقی جنگ کا اعلان شہنشاہی اجازت دہی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ شہنشاہ کو یہ حق رومی عوام سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ اگر جنگ کسی اور کی اجازت سے کی جائے تو جنگ کے ذریعے سے جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ حاصل نہ ہوسکیں گے، خاص کر قید کرنے کا حق۔ البتہ اس مولف نے تسلیم کیا ہے کہ اس کے زمانے میں رواج کے باعث، جو اصل میں ایک بگڑی ہوئی اور فسادی صورت حال کہی جاسکتی ہے، تمام بادشاہ جنگ کا اعلان خود کرتے ہیں اور اس

بارے میں نہ تو پوپ سے مشورہ کرتے ہیں اور نہ شہنشاہ سے؛ اور ایسی جنگ کو ایک درست اور حقیقی جنگ تصور کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک حق کا تعلق ہے، اسپین کا بادشاہ شہنشاہ کو اپنا سردار نہیں تسلیم کرتا، کیونکہ اسپینیوں نے اپنا علاقہ [شہنشاہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ] غیر عیسائیوں سے چھینا ہے۔ اس مولف نے پھر بھی یہ بیان کرنا ضروری سمجھا ہے کہ فرانس والے شہنشاہ کے ماتحت ہیں[1]۔

[اسپینی مولف] فرانسوا دے فیتوریا اس بات کی طرف مائل نظر آتا ہے کہ جنگ کرنے کا حق صرف "مکمل جمہوریت" ہی کو حاصل ہونا چاہیے۔ اس اصطلاح سے وہ ایک ایسی جماعت مراد لیتا ہے جو قائم بالذات ہو، جس کے اپنے قوانین ہوں، جس کے اپنے حکام عدالت ہوں۔ کیونکہ مکمل اسی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ بلی نے شہنشاہ کی ماتحتی سے آزاد حکمرانوں میں فرانس اور اسپین کے بادشاہوں کے علاوہ میلان کے ڈیوک کا نام بھی شامل کیا ہے جو اپنے علاقوں میں ایک واقعی حکمران ہے اور مکمل اقتدار رکھتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ شہنشاہ[2]۔ اسی مولف نے بارتولے اور بالدے کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے تے نیس والوں کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ "فل گوسے کے بیان کے مطابق تے نیس ایک نیا روما ہے، وہ ایک عمومی وطن ہے، اور اس پر شہنشاہی قوانین کے ذریعے سے حکمرانی نہیں ہوتی ہے بلکہ قدرتی انصاف اور اس قانون کے ذریعے سے جو اس نے خود وضع کیا ہے[3]"۔

94

---

[1] ۔ اللفونسو الوارینس خیرے ای رو کی لاطینی تالیف "پوپ اور شہنشاہ کے حقوق پر تبصرہ" باب (۱۴) منصفانہ وغیرہ منصفانہ جنگ۔

[2] ۔ بلی کی لاطینی تالیف "فوجی اور جنگی معاملات پر رسالہ" حصہ اول حقوق عمومی کی بحث۔

ایبیری کوس جنتی لیس کی مشہور تعریف میں بھی یہی مفہوم پنہاں ہے اور وہ لاطینی تعریف یہ ہے کہ "جنگ پبلک (سرکاری) اسلحہ کے ذریعے سے منصفانہ مقابلے کا نام ہے۔"

جیسا کہ سر ٹرا ورس ٹوس نے دکھایا ہے کہ جنتی لیس کی تعریف کے مطابق جنگ خانگی اشخاص کے مابین ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہاں جنگ سے مراد وہ صورت ہے جب اس کے حقوق اور واجبات قانون عمومی کے دائرہ عمل میں آجاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو تعریف گروشیوس نے کی ہے وہ محض ناکافی ہے۔ جیسا کہ گروشیوس نے لکھا ہے کہ "جنگ وہ صورت یا حالت ہے جس میں فریقین کسی جھگڑے میں قوت سے مدد لیتے ہیں۔" اس تعریف سے خانگی جنگ اور ڈویل یعنی دو آدمیوں کا مقابلہ یہ دونوں اس اصطلاح میں شامل ہو جاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جلد (۱۶) ورق (۳۳۵) و مابعد۔

باب ششم

جنگ کے اسباب

گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" کی تمہید میں بیان کیا ہے کہ اس کے پیشرؤں نے عام طور پر جنگ کے متعلقہ مواد کو صرف سطحی طور سے چھوا ہے۔ اس نے صرف بلتسازار دے آیالا اور البیریکوس جنتی لیس کو اگرچہ بے عدیل قرار دیا ہے لیکن پھر بھی ان دونوں کے خلاف اس نے ایک دوسری شکایت کی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے ایک خاص نکتے یعنے جنگ کے منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کے متعلق کافی بحث نہیں کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "آیالا نے بالکل وہ وجوہ بیان نہیں کیے ہیں جن کی بنا پر کسی جنگ کو منصفانہ یا غیر منصفانہ کہا جاتا ہے۔ جنتی لیس نے چند عام چیزوں کو جن سے وہ اجمالی طور سے بحث کرتا ہے، حسب دلخواہ نمایاں ضرور کر دیا ہے لیکن اس نے متعدد عمدہ اور عجیب مسایل کو چھوا تک نہیں ہے اگرچہ وہ مسایل نہایت عام واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔"

ہم نے اس کی طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے۔ گروتیوس کو بھول ہوئی ہے۔ جہاں تک خاص اسباب جنگ کے مسئلے کا تعلق ہے، اگر واقعی کوئی ایسی قابل ملامت چیز پائی جاتی ہے جس سے گروتیوس کے پیشرو نہیں بچ سکتے تو وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اس بحث کے متعلق چپ سادھ لی تھی[1] ۔ ورنہ ان کی اکثریت اس بحث کے متعلق غیر معمولی توجہ کرتی ہے اور بہت سے تو عجیب عجیب نتائج پر پہنچتے ہیں۔ اگر ان کے خلاف واقعی کوئی تنقید کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے ایک ضرورت سے زیادہ موشگافی سے، نیز مبالغہ آمیز استدلال کی نزاکت آرائی سے، امتیازات پیدا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ماہران قانون میں سے خاص کر متکلین نے اس بحث میں ایک غیر معمولی مناظرانہ روش اختیار کی ہے جس میں ارسطو کا طاقتور اثر کام کرتا ہے کیونکہ وہی ان کے فلسفے کی اساس تھا، جیسا کہ سینٹ آگسٹائن ان کی دینیات کی اساس تھا۔

جیسا کہ بلونچ لی نے بیان کیا ہے، ایک شریف اور فیاض شخصیت جو قانون بین الممالک کی بہترین تالیفوں میں سے ایک کا مصنف ہو اور جو صرف اس بات پر قانع نہ رہنا چاہتا ہو کہ اخلاقی مسایل پر تفصیل سے بحث کر دے، وہ صرف اسی بات کی کوشش کر سکتی ہے کہ ایک فلسفیانہ انداز میں قانونوں کو معلوم کرے اور ان کی علتوں کا پتا چلائے۔ اور وہ ان متکلم ماہرین قانون کے خلاف، جنھوں نے اس موضوع پر انتہائی ناانصافی کے ساتھ بحث کی ہے، زور و شور کے ساتھ برس پڑتا ہے۔ لوری مر کا یہ بیان ٹھیک ہے کہ اصلاح عیسائیت کی تحریک کے زمانے سے پروٹسٹنٹوں کو کیتھولکوں کے خلاف کچھ اتنے شدید تعصبات تھے کہ وہ ان کو اس امر کی بھی اجازت

---

[1] نیس کی فرانسیسی کتاب "جنگ کا قانون اور گروتیوس کے پیشرو" مطبوعہ ۱۸۸۲ء۔

نہیں دیتے کہ فرقۂ مخالف کے متعلق ناطرفداری کے ساتھ رائے قایم کرسکیں۔[۱]

یہ بالکل طبیعی بات تھی کہ جن مباحث کی طرف گروتیوس نے اشارہ کیا ہے، ان کی قرون متوسطہ کے دوران میں انتہائی توجہ کے ساتھ وضاحت کی گئی ہو۔ قانون اور دینیات کی تعلیم اس وقت بے انتہا عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر لمحہ یہ اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ جنگ کے زمانے میں ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟ اور اس مسئلے کی بحث و تنقیح سے ناگزیر اسباب جنگ کے مسئلے سے بھی بحث کی ضرورت پیش آتی۔ ایک اور چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ قرون متوسط میں ذہین لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہوئی تھی۔ اور اس زمانے کے قابل لوگوں اور محنت پسند مولفوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے نازک مسایل پر بڑی دقیقہ رس بحث کی ہے۔ اس زمانے کے جامعات نے بھی اہم کام انجام دیا ہے، کیونکہ وہاں اساتذہ ایک ناقابل یقین بہادری کے ساتھ درس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ نیز ہمیں یہ بات بھی نہیں بھلانی چاہیے کہ قرون متوسط کا تمام آخری حصہ علی الاعلان قانونی رجحان لیے ہوئے تھا اور اس کی پوری تاریخ کی تہ میں قانونی تصورات کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی چیز اس زمانے کی بنیادی قوت محرکہ تھی جس طرح آج کل کے زمانے میں بنیادی قوت محرکہ اول تو قوت و طاقت ہے اور اس کے بعد دعایہ اور پرچار۔[۲] یہ چیز اتنی صحیح ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ صرف ماہرین قانون ہی

---

[۱] جیمس لوری مر کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کے احکام" مطبوعہ ۱۸۸۴ء جلد (۱) صفحہ ۱۰۔

[۲] اسٹبس کی انگریزی کتاب "قرون متوسط اور زمانۂ جدید کی تاریخ اور متعلق موضوعوں پر سترہ تقریریں" صفحہ (۲۰۹)۔

کسی ملک میں حکمرانی کے فرایض انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی تالیف "ژرژبیے کا خواب" کی کتاب اول کے آخر میں لکھا ہے کہ "کسی بادشاہ کے لیے سب سے اہم امر اور قابل مطالعہ چیز یہی ہوسکتی ہے کہ اپنی رعایا پر عقلمند لوگوں کے مشورے سے اچھی طرح حکمرانی کرے۔ اس سے مراد میں خاص طور پر ماہرین قانون کو لیتا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قانون مذہبی اور قانون روما کے ماہر ہوں نیز رسم و رواج، دستوروں اور شاہی قانونوں سے خوب واقف ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے مشوروں سے رعایا پر حکمرانی کی جانی چاہیے نہ کہ فلسفہ پڑھنے والوں کے مشورے سے۔ جن اصولوں کے مطابق رعایا پر حکمرانی کی جانی چاہیے وہ اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات کی کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ عمومی طور پر یہ علم ضرور حاصل کرتے ہیں لیکن انھیں اس کا عملی تجربہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کو عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں...... فلسفیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ رعایا پر حکمرانی کے اصول کو صرف چاٹ جائیں اور اس کے استعمال اور عملی تجربے سے سروکار نہ رکھیں۔ اس کے برخلاف ماہرین قانون اس کا استعمال کرتے اور اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔"

قرون متوسط کے نظریے، جو قانون جنگ کے متعلق تھے، چار ماخذوں سے حاصل ہوئے تھے: کچھ تو رومی نظریے، دوسرے سینٹ آگسٹائن، تیسرے قانون مذہبی (اور اس سلسلے میں خاص کر گراتیان کی کتاب "احکام")، اور چوتھے اکوئناس کے سینٹ ٹامس کی کتاب "چوٹی کے مسایل"۔ مولفین کے ہاں اختلافات پیدا ہوتے رہے، بعض نے تو جدت بھرے خیالات بھی پیش کیے۔ چاہے وہ ہمیشہ ٹھیک نہ رہے ہوں۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی پوری عیسائی دنیا میں قریب قریب ایک ہی نظریہ کار فرما رہا۔ قانون مذہبی اور قانون روما کی تعلیم اور اطلاق اس غرض کے لیے بہترین آلۂ کار بن گیا کہ جنگ کیسے

97

منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کے متعلق تصورات کا پرچار کیا جائے۔ بالکل یہی حال پرائیجت یا کفاروں کی عدالت کا تھا جہاں ہر لمحے غیر منصفانہ طور سے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت اور ظالمانہ طور سے کی ہوئی زیادتیوں کا سوال اٹھا کرتا تھا۔

ان مولفوں کی رائیں دلچسپ ہیں۔ وہ اس بات کی مجسم شہادت ہیں کہ کس طرح خیالات میں ارتقاء عمل میں آیا اور کس طرح ایک مسلسل ترقی پائی جاتی رہی۔ ہم یہ بات نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ اس سب کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ رابرٹ فلنٹ نے کیا صحیح بات کہی ہے کہ مفکرین کے خیالات بھی اس طرح تاریخی واقعات ہیں جس طرح لڑائیاں اور فتوحات، یا سیاسی واقعات اور انقلابات[1]۔ انسانیت کی الجھنوں بھری ترقی میں یہ بیان کر دینا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ متعدد فیاضانہ خیالات اس سے زیادہ بلندیوں تک پرواز کرتے رہے ہیں جتنا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ کسی چیز کی صحت معلوم کرتے وقت مقابلہ کرنے یا اس کا مطالعہ کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ماضی کی طرف رجوع کریں۔ اسی لیے لمحات اولین کے کارپردازوں کی خدمات کا اعتراف کرنا مقتضائے انصاف ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کمال دولی سلسلے کے راہب گراتیاں کی تالیف "احکام" نے قرون متوسطہ میں کتنی بڑی وقعت حاصل کر لی تھی حتیٰ کہ دانتے کو اس کے متعلق کہنا پڑا کہ انہی تالیفوں کے باعث وہ ہر ایک قانون کے متعلق اتنا مفید ثابت ہوا تھا کہ اسے جنت میں جگہ دینی پڑتی ہے۔" اس کتاب "احکام" کے حصہ دوم کی تیئیسویں[23] "وجہ" میں جنگ کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔

[1] رابرٹ فلنٹ کی انگریزی کتاب "تاریخ فلسفۂ تاریخ" جلد (۱) صفحہ ۳۔

98

اس فصل کا عنوان (لاطینی میں) "مسائل فوج و جنگ" ہے اور یہ فصل آٹھ مسائل پر منقسم ہے۔

پہلا مسئلہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ "کیا جنگ کرنا ایک گناہ ہے؟" اس کا جو جواب دیا گیا ہے وہ معقول ہے۔ اس سلسلے میں گراتیان نے انجیل کے احکام کا حوالہ دیا ہے جن میں ہر جگہ نرمی کی سفارش کی گئی ہے اور انتقام سے روکا گیا ہے۔ ان احکام کی بناء پر یہ یقین کرنا پڑتا، کہ ہتھیار کا استعمال مطلقاً ممنوع ہے اگر پادریوں نے یہ نہ لکھا ہوتا (اور کلیسا کے طرز عمل نے یہ نہ بتایا ہوتا) کہ اعتدال کے جذبات دل میں رکھتے ہوئے بھی ان لوگوں کی سرکوبی کی جا سکتی ہے جو ناانصافیوں کے مرتکب ہوں تاکہ وہ آیندہ پھر انھیں ناانصافیوں کا ارتکاب نہ کریں — گویا اس مولف نے تسلیم کیا ہے کہ جنگ جائز ہوسکتی ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ ناگزیر ہوگئی ہو۔ اور اس مولف کے مطابق جو شخص کسی قوت کا استعمال کرنا چاہے تو اسے لڑائی میں اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ: "جنگ صرف ضرورت کی بناء پر ہوسکتی ہے..... وہ ایک حالت مخاصمت ہے جسے لالچ اور بے رحمی کے ذریعے سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے، بلکہ صرف اس مقصد کے لیے کہ امن تک پہنچ سکیں ...... جب تک تم جنگ کرتے رہو اس وقت تک تم پر امن [؟ پرسکون] رہو اور جب فتح حاصل ہو جائے تو اپنے حریفوں سے امن کے فوائد منوالو۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ پُر امن لوگ کیا ہی خوش قسمت ہیں کیونکہ انھیں کو خدا کے بچے کہا جائے گا۔ اگر انسانی امن جس سے دنیاوی سلامتی حاصل ہوتی ہے، اتنا میٹھا ہے تو خدائی امن جس سے ابدی سلامتی حاصل ہوگی کتنا نہ میٹھا ہوگا!...... اسی لیے جس دشمن کے خلاف ہم لڑیں اس کو صرف ضرورت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہیے۔ نہ یہ کہ ہمیں اس کی چاہت ہو.....

لیکن جس طرح جبر کا استعمال اس شخص کے خلاف کیا جاتا ہے جو مقابلے پر اتر آتا ہے اور لڑتا ہے، اسی طرح رحم، شکست خوردہ پر کھانا چاہیے، قیدی پر کھانا چاہیے، اس شخص پر کھانا چاہیے جس سے امن کے متعلق کوئی خطرہ نہ پایا جاتا ہو"۔ سینٹ آگسٹائن نے پوپ بونی فاس کے نام جو امر تحریر کیا تھا، اور جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں اس کی یہاں پوری کی پوری نقل کردی گئی ہے۔

سینٹ آگسٹائن نے مانوی مذہب والوں کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، اسی سے اخذ کرکے گراتیان نے ان چیزوں کی فہرست دی ہے جن کا کرنا جنگ میں نامناسب ہے۔ اور وہ چیزیں یہ ہیں: نقصان پہنچانے کی خواہش، انتقام میں بے رحمی، ٹھنڈا نہ ہونے والا غصہ اور اجڈپن مقابلے میں وحشیانہ پن، اوروں پر مسلط ہونے کا جذبہ اور اسی کی جیسی تمام دوسری زیادتیاں۔ چنانچہ اس نے ہپون کے مشہور پادری یعنی سینٹ آگسٹائن کے الفاظ کو یہاں بھی دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ جنگ کرنا کوئی فعل ناجائز نہیں ہے لیکن لوٹ کی خاطر جنگ کرنا ایک گناہ ہے۔

99

قرون متوسط کے ابتدائی زمانے میں دو قابل لحاظ اہمیت رکھنے والی شخصیتیں پیدا ہوئی تھیں، جنھوں نے متوسط کو قدیم تمدن سے جا ملایا تھا یعنی اٹلی کا بوئے چے اور اشبیلیہ کا سینٹ ایزی ڈور۔ بوئے چے نے جو شہر راقیقے کا ایک ممتاز شہری تھا، عیسائی دنیا کے لیے یونانی خیالات محفوظ کردیے۔ ارسطو اور اس کے شارحین کی کتابوں کے ترجمے کرکے اس نے ارسطو کے فلسفے کو روشناس کردیا۔ جب پاویا میں اسے قید کردیا گیا تو اس نے "فلسفیانہ تسلی" نامی کتاب تالیف کرکے افلاطونی خیالات بھی پھیلائے۔ دوسری طرف اشبیلیہ کے پادری ایزی ڈور نے کچھ کم خدمتیں نہیں انجام دیں۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "فقہ اللغۃ" میں پورے پرانے تمدن اور قرون متوسط کے ابتدائی زمانے کے تمدن کا

پیچھوڑ جمع کر دیا۔ اس کی "تالیف" مدرسوں کے نصاب میں شامل ہوگئی۔ حتیٰ کہ انگریز پادری "قابل احترام سینٹ بیڈ" نے اس کا چربہ اڑایا تو دوسرے انگریز ماہر دینیات آلکوئن نے اس کو اپنے مطالعے میں رکھا اور رابان ٹور نے اس کی نقل کی۔[1]

سسیرو کے مکالمات جو "جمہوریت" یا "دولت عامہ" کے متعلق ہیں اور جن کا بڑا حصہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں آنجیلو مائے کو دستیاب ہوگیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بارھویں صدی عیسوی ہی میں ایک مفقود "تالیف" بن گئے تھے، مگر اشبیلیہ کے اسی دور نے سسیرو کا ایک اہم خیال اپنی تالیفوں میں محفوظ کر دیا ہے۔

چنانچہ اس نے اپنی کتاب "فقہ اللغۃ" کے اٹھارھویں حصے میں جنگ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ چار قسم کی جنگیں ہوتی ہیں؛ منصفانہ جنگ، غیر منصفانہ جنگ، کشوری جنگ اور ماورائے کشوری جنگ۔ اس آخرالذکر اصطلاح سے مراد وہ ایسی جنگ لیتا ہے جو ہم خاندان جنرلوں میں ہو۔ چنانچہ اس نے لاطینی میں لکھا ہے کہ "جائز جنگ وہ ہے جو پیشگی اطلاع دے کر [اپنی] چیزوں کو واپس لینے یا دشمن کو دھکیلنے کے لیے کی جائے۔ ناجائز جنگ وہ ہے جو جائز وجہ سے نہیں بلکہ وحشت و بربریت [یا لوٹ کھسوٹ] کے لیے شروع کی جائے۔ اس کے متعلق سسیرو نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں لکھا ہے کہ: وہ جنگیں ناجائز ہیں جو بغیر کسی وجہ کے شروع کی جائیں۔ چنانچہ سوائے انتقام لینے یا دشمن کو دھکیلنے کے کسی اور امر کی خاطر جنگ کرنی جائز نہیں اور یہی چیز تھوڑے سے اضافے کے ساتھ تولیوس نے یوں بیان کی ہے کہ: کوئی جنگ اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی

---

[1] بورے کی فرانسیسی کتاب "وزی گوتھیوں کے عہد میں اشبیلیہ کا عیسائی مکتب خیال" صفحہ ۱۰۲۔

[2] اس نقطہ پر بحث آگے آتی ہے اور دو تعلیقات بھی آئندہ صفحہ پر دیے گئے ہیں (مترجم)۔

جب تک کہ وہ [دشمن کو اِعذار و اِنذار یعنی] دھمکی دے کر اور اعلان جنگ کر کے [اپنی] چیزوں کی واپسی کے مقصد کے لیے نہ ہو[1]" ہیں، وہ تمام

---

[1] - یہ عبارت آنجیلو مائے کے دریافت کردہ جعلی پر لکھے ہوئے مخطوطے میں نہیں ملتی۔ سسیرو نے اپنی لاطینی کتاب "فرایض کے متعلق" میں بیان کیا ہے کہ جنگ کو جائز بنانے کی جتنی شرطیں تھیں انھیں رومیوں کے قانونِ فیتیالی (مجلس خارجہ) نے نہایت عمدگی سے مدون کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اس قانون سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے شروع کرنے سے پہلے ہرجے کے مطالبے کا تصفیہ نہ کرا دیا جائے۔ اور ابھی اس کا اعلان نہ ہوا ہو تو جب تک کہ ان لوگوں کو اطلاع نہ دیدی جائے جن کے خلاف جنگ کی جانے والی ہے"۔

"جمہوریت کے متعلق" نامی سسیرو کی کتاب میں ایک عبارت تھی جو سینٹ آگسٹائن کی تالیف "خدا کا شہر" میں نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ ہپّو کے اسقف سینٹ آگسٹائن نے بیان کیا ہے کہ "میں جانتا ہوں کہ "جمہوریت کے متعلق" نامی کتاب کے تیسرے حصے میں اس خیال کی تائید کی گئی ہے کہ کوئی عقلمند جمہوریت کبھی جنگ نہیں کرتی بجز اس کے کہ وہ ایک فریضہ ہو یا ذاتی سلامتی کے لیے ضروری ہو"۔ (اصل لاطینی عبارت کے بھی جو یہاں نقل کی گئی ہے یہی معنے ہیں۔ مترجم) ـــــ ایک دوسری جگہ سسیرو یہ بتانے کے لیے کہ سلطنت کی نجات سے وہ وہ کیا مراد لیتا ہے اور کس قسم کی نجات اس کے پیش نظر ہے، یوں خیال آرائی کرتا ہے: "یہ تکلیفیں جن کا کند سے کند طبیعتوں کو بھی احساس ہوتا ہے، افلاس، جلا وطنی، قید اور آلام کو چھوڑ کر افراد رعایا تو فوری موت کو پسند کرنے لگتے ہیں لیکن مملکتوں کے لیے سب سے بڑی تکلیف تو وہی موت ہے جس کے پاس عامۂ افراد تکلیفوں سے بچنے کے لیے جا پناہ لیتے ہیں۔ حقیقت میں کسی مملکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے تشکیل کی جائے۔ اسی لیے کسی جمہوریت کے لیے کوئی قدرتی فنا کا سوال نہیں ہے جس طرح کہ عام آدمی کے لیے موت نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ مطلوب بھی ہوتی ہے۔ کسی جمہوریت کا غائب ہو جانا، تباہ ہو جانا، اور فنا ہو جانا ایک چھوٹے پیمانے پر خود دنیا کا تباہ ہو جانا کہا جا سکتا ہے"۔ بے شک مذکورۂ بالا خیالات میں ایک بلندی پائی جاتی ہے

100

جنگیں جو بے وجہ شروع کی جائیں وہ سسیرو کے مطابق ناجائز ہیں۔ اور سسیرو نے اس کے بعد ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسی جنگ کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا اگر وہ اعلان کیے بغیر کی گئی ہو اور اس کی اطلاع نہ دی گئی ہو اور اس کا منشا تلافی کی خواہش نہ ہو۔ سسیرو کے الفاظ "پیشگی اطلاع دے کر"[1] میں اسی دور نے یہ بات مضمر پائی کہ جنگ کا اعلان کیا جانا ضروری ہے۔ گراتیان نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے لیکن وہ مذکورہ بالا الفاظ کی جگہ "بذریعۂ حکم نامہ"[2] کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس طور سے یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ با اقتدار شخص کے حکم سے جنگ کی جانی چاہیے۔ گراتیان نے سینٹ آگسٹائن کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ "جائز جنگوں کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ وہ جنگیں ہیں جن کے ذریعے سے مضرتوں کا انتقام لیا جاتا ہے۔ مثلاً جب کسی صورت میں کسی قوم یا شہر کا ہتھیاروں کے ساتھ اس وجہ سے پیچھا کیا جائے کہ اس نے اپنے افراد میں سے کسی کو برائی کے کرنے سے روکنے میں غفلت کی یا اس چیز کے واپس دلانے میں تساہل کیا جو ناجائز طور سے لے لی گئی تھی۔ لیکن وہ جنگ جو خدا کے حکم سے کی جائے، اس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ایسی جنگ میں کوئی بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ کس کو کیا سزا دی جانی چاہیے۔ کیونکہ وہ شخص جو فوجوں کی قیادت کرے، اور وہ جم غفیر جن پر فوجیں مشتمل ہوتی ہیں،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جیسا کہ قبل میں نے بیان کیا ہے۔ ایک رومی، اس "سدا آباد شہر" کے ایک باشندے سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

[1] لاطینی لفظ: ہیرے دِک تو۔ پیشگی کہنا۔ لیکن اسی لفظ کے معنی حکم حاکم کے بھی ہیں گویا لفظ کی تحلیل کر کے پیشگی اطلاع مضمر مانی گئی ہے [مترجم]۔

[2] لاطینی لفظ: "اے دِک تو" = کہنا، یعنی حکم حاکم — دیکھو تعلیق بالا گویا یہاں ابہام کو رفع کر دیا گیا ہے (مترجم)۔

ان کو بانیان جنگ کی جگہ ایک بلند تر مشیت کے نافذ کرنے والے سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا۔"

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ "ان مولفوں کی تعداد کثیر ہے جنھوں نے جنگ کو جائز بنانے والی شرطوں کی تحقیق و تنقیح کی ہے۔

101

اب دو قسم کے رجحان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک قسم ان مولفوں کی ہے جو جنگ کے زیادہ حامی نہ بھی ہوں تو کم سے کم اس کو روا قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک اور قسم ان مولفوں کی ہے جو جنگ کے سخت مخالف ہیں۔ اور کسی طرح مانتے ہی نہیں۔

قرون متوسط میں ایک بڑی ذہین شخصیت سوسے کے ہنری کی گزری ہے، جو لاطینی کتاب "زرین خلاصہ" کا مولف اور آوستیا کا کارڈنل بشپ تھا۔ اس نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ جنگ کے متعلق ہمیشہ ہی یہ تصور ہوگا کہ وہ ناجائز اور قابل لعنت ہے اور یہ کہ اس کے جواز اور منصفانہ ہونے کا جو دعویٰ کرے اسے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ لیکن بعض دیگر مولف اس کے برخلاف جنگ کو ایک معمولی و عادتی واقعہ خیال کرتے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ژول فیرتی نے اعلان کیا تھا کہ شبہے کی صورت میں ہر اس جنگ کو جائز ہی سمجھا جائے گا جس کا اعلان شہنشاہ یا پوپ یا ایسے حکمرانوں نے کیا ہو جو اپنے اوپر کسی اور سردار کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلتازار دے آیالا کی تالیف ۱۵۸۲ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کسی جنگ سے پورے حقوق جنگ حاصل ہوجانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اسے ان اشخاص نے کیا ہو جن پر لفظ "دشمن" کی تعریف صادق آتی ہو اور جو جنگ کرنے کا اختیار رکھتے ہوں۔

اسپین کا ایک ڈومینیکی پادری سینٹ ریموند دے پاں آفور تے کو نویں گریگری (پوپ) نے اس غرض کے لیے مامور کیا تھا کہ اس نے ۱۲۳۴ء میں جو مذہبی احکام شایع کیے تھے ان کا مجموعہ تیار کرے۔ اس پادری نے ایک نہایت اہم بیان اندرونی آواز یعنے ضمیر کے متعلق

لکھا ہے۔

تو یہ اور گناہ کی تلافی کے پیشکش کا تصور جب ارتقا پانے لگا تو رفتہ رفتہ یہ خیال کیا جانے لگا کہ جس پادری کے سامنے اعتراف گناہ کیا جاتا ہے، اسے ایک حقیقی اختیار سماعت ہوتا ہے، گویا کہ وہ حاکم عدالت ہے۔ ورنہ اس سے پہلے جب اعتراف گناہ کی نوعیت ایک خالص مذہبی فعل کی تھی، تو اس کی حیثیت محض رسمی تھی۔ تیرھویں صدی کے شروع میں اعتراف گناہ واجب قرار دیدیا گیا اور اعتراف قبول کرنے والے پادری کا کام صرف یہ تھا کہ اخلاقی معاملات سے تعلق رکھے۔

اس سے پہلے ہی فلیمش بری کے رابرٹ نامی ایک انگریز نے اس کی طرح ڈال دی تھی۔ ریموند دے پاں آفورتے، جو ایک پختہ کار ماہر قانون مذہبی تھا، اسی کی پیروی کرتا ہے۔ اور اس کے بعد متعدد مولف پیدا ہوئے جنھوں نے لاطینی میں "خلاصے" (یا چوٹی کے مسائل) نامی کتابیں لکھیں۔ گروتیوس نے اپنی نوجوانی میں ایک کتاب "مال غنیمت کے قانون پر یادداشت" نامی لکھی تھی۔ اس میں اس نے ان میں سے متعدد لوگوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ انھیں کتابوں میں بکثرت نظائر سے بحث کی گئی، انھیں میں نازک نازک امتیاز پیدا کیے گئے، اور انھیں میں ان وجوہ و اسباب کا بھی ذکر ہوا جن کو کسی نہ کسی حل کی تائید یا مخالفت کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریموند دے پاں آفورتے نے قانون جنگ کی بحث بھی نظر انداز نہیں کی ہے۔ اور اس کی کتاب کے حصۂ دوم باب (۵) میں جو ڈاکوؤں اور لیٹروں کے متعلق ہے، وہ جنگ کے جواز کی شرطوں سے بحث کرتا ہے اور ان کو پانچ قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی اشخاص، اشیاء، اسباب، نیت اور بانی۔ شخص تو دنیادار ہونا چاہیے، مذہبی نہیں۔ اشیاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی ہوں جو چھین لی گئی تھیں اور وطن کی مدافعت کی جانی چاہیے۔ جنگ اس لیے ضروری ہو کہ اس کے ذریعے سے

امن قایم کیا جاسکے۔ رحم، انصاف اور اطاعت شعاری کے جذبات مقاتل کی نیت میں موجزن ہوں، نہ کہ نفرت اور لالچ۔ اور لڑائیوں کا حکم باافتدار شخص کی طرف سے ملنا چاہیئے۔[1]

سوسے کا ہنری جو پہلے سِستروں کا پھر امبرون کا اسقف بنا اور آخر میں آوستیا کا کارڈنیل بشپ۔ اس نے جنگوں کی جو تقسیم کی تھی اس کی قرون متوسطہ کے بہت سے مولفوں نے پیروی کی ہے۔

اس نے جنگ کی سات قسمیں قرار دی ہیں :-

(۱) رومی جنگ جو ایمان والوں اور غیر مذہب والوں میں ہوتی ہے اس ممتاز ماہر قانون مذہبی نے بیان کیا ہے کہ یہ جنگ جائز ہوتی ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ روما عیسائی مذہب کی مادر وطن ہے۔

(۲) قانونی جنگ جو حاکم عدالت کے حکم کے باعث ایمان والوں کے خلاف کی جاتی ہے۔ یہ جنگ بھی درست ہے۔

(۳) متکبرانہ جنگ وہ لڑائی ہے جو باغی اپنی حکومت سے کریں۔ یہ جنگ ناجائز ہے۔

(۴) حلال جنگ وہ جائز جنگ ہے جو کسی حکمران کے حکم سے کی جائے۔

(۵) جسارت آمیز جنگ وہ ناجائز جنگ ہے جو ایمان والے اپنی جائز حکومت کے خلاف کریں۔

(۶) خود پسندانہ جنگ وہ ناجائز جنگ ہے جو ایمان والے محض اپنی خواہش کی بنا پر کرتے ہوں۔

(۷) ضروری جنگ وہ ہے جب ایمان والے اس وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ دشمن کے خلاف اپنے آپ کی مدافعت کریں۔

---

[1] اسپین کی عربی جامعات میں حدیث وفقہ کی کتابوں میں صدیوں یہ چیزیں پڑھائی جاتی رہیں۔ (مترجم)۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نہایت حیرت انگیز قانونی کتاب کی تالیف اسپین میں عمل میں آئی ۔ یعنی [تسطیلہ کا] "سات ارکان" نامی مجموعۂ قوانین، جس کا ہم اوپر [صفحہ (10) میں] ذکر کر چکے ہیں اس میں ایک ہی ساتھ کلیسائی قانون کا بھی ذکر ہے، سیاسیات کا بھی، قانونِ مدنی یا کشوری کا بھی، ضابطے کا بھی، تعزیرات کا بھی [جو اغلب ہے کہ اسپین کی اسلامی کتب فقہ کا اثر ہو ۔ مترجم] اور اس میں ان تمام امور کے متعلق مواد و احکام کی عظیم الشان کثرت ہے ۔ قانونِ جنگ کی اس میں جو بحث ہے، وہ بڑی ترقی یافتہ ہے ۔ اور اس طرح "سات ارکان" نامی مجموعہ، قانونِ بین الممالک کی تاریخ کی ایک قیمتی یادگار بن جاتا ہے ۔ قرونِ متوسطہ کی اسپینی قانون سازی میں تیز گام اور قبل از وقت پختگی کا ایک نادر مظاہرہ اسے اوروں سے ممتاز کرتا ہے ۔ اور یہ بات خاص کر "سات ارکان" پر صادق آتی ہے ۔ اور قوموں کے قوانین کے مقابلے میں یہ مجموعہ کئی صدی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے" اور بظاہر یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ قرون متوسطہ میں اسپین قانون سازی کے ملکے میں رومیوں کا وارث ہو گیا تھا ۔ [یا عربوں کی شاگردی کا اثر تھا ؟ مترجم]

"سات ارکان" نامی مجموعے کی تالیف ۱۲۵۶ء اور ۱۲۶۵ء کے درمیان ہوئی ۔ بادشاہ سینٹ فردیناند نے تجویز کی تھی کہ ایک یکسانیت لیا ہوا مجموعۂ قوانین مرتب کرائے جس کے سات اجزا (یا ارکان) ہوں اور اس کا نام "سپتینا ریو" (ہفت گانہ) رکھا تھا ۔ اگرچہ اس تجویز کی تکمیل سے پہلے موت نے اسے آلیا، لیکن اس کے بیٹے دسویں الفونسو نے، جو اِل سابیو (یعنی عقلمند، اور زیادہ صحیح الفاظ میں "عالم") کے لقب سے مشہور ہے، اس خیال کو نہیں بھلایا ۔ اور "سات ارکان" کے شروع میں اس نے اپنے ممتاز پیشرو کے متعلق ایک اثر انداز اشارہ کروایا ۔

یہ تالیف قانونِ مذہبی اور قانونِ روما پر مبنی تھی ۔ اس نے

103

فوراً ہی قانونی حیثیت نہیں حاصل کی۔ خود بادشاہ کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانوں اور رعایا کے لیے نظریات کی ایک [درسی] کتاب تالیف کرائے۔ پھر بھی اس کتاب کو اس میں دیر نہیں لگی کہ ایک بڑی وقعت حاصل کرلے۔ ۱۳۴۸ء میں جو مجلس قومی القلعہ میں منعقد ہوئی تھی، اس کی رضامندی سے گیارھویں الفونسو نے اس کا ایک حصہ اپنے مشہور "حکمنامے" کے بعد [یا آخر میں] شایع کیا۔ اس آخرالذکر قانون کی ہنری دوم نے ۱۳۶۷ء کی مجلس میں توثیق کر دی۔ جب فردیناند اور ایزابیلا کی حکمرانی شروع ہوئی تو پھر "سات ارکان" کے سند ہونے سے کسی کو انکار نہ رہا۔

الفونسو کی اس تالیف کے مطابق، جنگ میں بھلائی بھی ہے برائی بھی۔ اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ کی چار قسمیں ہیں: جائز جنگ، ناجائز جنگ، کشوری جنگ اور ماورائے کشوری جنگ۔ یاد رہے کہ الفونسو کی یہ تقسیم اشبیلیہ کے اِسی ذور کی نقل ہے[1]۔ جہاں تک جائز جنگ کا تعلق ہے، اس نے اس کے تین اسباب بیان کیے ہیں: اولاً مذہبی مفاد کے لیے، کہ اس کی ترقی ہو اور اس کے دشمنوں کی تباہی ہو۔ دوسرے بادشاہ کی مدافعت کے لیے۔ تیسرے ملک کی آن و عزت اور بقا کے لیے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "یہ تحقیق کر لینا مفید ہے کہ جنگ جائز ہو۔ کیونکہ اگر وہ منصفانہ اور جائز ہو تو خدا کی تائید کا یقین ہو جاتا ہے۔ مزید برآں، مقاتلوں (لڑنے والے سپاہیوں) کی ہمت بڑھ جاتی ہے، دوست اپنی مدد پیش کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں، اور یہ بھی کہ خود دشمن گھبرا جاتا ہے" پرانے زمانے کے لوگ ان خیالات کا اظہار پسند کرتے تھے۔ اور بوسے نے اپنی فرانسیسی تالیف "کتاب مقدس سے ماخوذ سیاسیات" میں نفیس الفاظ میں انھیں خیالات کا یوں اظہار کیا ہے کہ

[1] دیکھیے اوپر صفحہ 99 نیز ابن خلدون کے مماثل خیالات کے لیے نیچے صفحہ (108) مترجم۔

اگر وجہ اچھی رہی ہو تو اس سے جنگ میں اور فائدوں کے علاوہ ہمت اور اعتماد یہ دونوں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ نا انصافی کے خلاف نفرت وحقارت سے قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ پختگی اور زیادہ بہادری سے لڑتے ہیں۔ بلکہ یہ تصور کرنے کا بھی موقع ہوتا ہے کہ خدا ساتھ ہے، کیونکہ اس معاملے میں انصاف ہے تو طبعاً وہ [خدا] اس کی حمایت کرتا ہے۔ جب کوئی بے ضرورت اور محض دل کی چاہت سے جنگ کرتا ہے تو یہ فائدہ جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ واقعہ جس کے ذریعے سے خدا اپنے احکام اور اپنے نہایت مخفی اقتدارات سے فتح عطا کرتا ہے، — وہ واقعہ چاہے کچھ ہی ہو آدمی اپنی طرف سے خود انصاف نہ کرے تو دوسری طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مساوی قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔"

104

اکوئیناس کے سینٹ ٹامس نے اپنی کتاب "دینیات کے تمام چوٹی کے مسائل" ۱۲۶۳ء اور ۱۲۶۹ء کے مابین تالیف کی۔ وہ کوئی قانون داں شخص نہ تھا، لیکن قانون مذہبی کی آبیاری کرنے والوں پر اس کا اثر بے انتہا قابل لحاظ ہے۔

چنانچہ اس کی کتاب کے حصۂ دوم کی دوسری فصل کے چوتھے مسئلے کی پہلی بحث میں جنگ کے جواز سے بحث کی گئی ہے اور وہ کہتا ہے کہ جنگ کا اعلان اگر مملکت کی مدافعت اور مصلحت عامہ کے لیے ہوا ہو، اور یہ اعلان ملک کے نظم ونسق کے ذمہ دار کی طرف سے کیا جائے تو ایسی جنگ قابل گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ اچھی نیت سے کی گئی ہو۔ البتہ دوسری صورتوں میں جنگ نادرست ہوگی۔

جنگ کے جواز کے لیے اس نے تین شرطیں یوں بیان کی ہیں:-

"(۱) حکمران کی اجازت، جس کے حکم سے کہ لوگ جنگ کر سکتے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی خانگی فرد کو جنگ کرنے کا حق نہیں کیونکہ ایسے شخص کو اپنے حق کی مدافعت کے لیے اپنے سے بالاتر افسر کے پاس انصاف کے لیے رجوع کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ اسی طرح خانگی فرد کے ہاتھ میں یہ چیز

نہیں کہ وہ لوگوں کا جتھا فراہم کر سکے جس کی جنگ میں ضرورت ہوتی ہے
اس کے برخلاف مملکت کی نگرانی چونکہ حکمرانوں کے تفویض ہوتی ہے،
اسی لیے ان کے کسی ماتحت شہر یا مملکت یا صوبے کی مدافعت انھیں
سے متعلق ہوتی ہے۔

(۲) یہ ضروری ہے کہ جنگ کی کوئی منصفانہ وجہ ہو۔ یعنی جن پر
حملہ کیا جاتا ہے وہ قصور کے ارتکاب کے باعث حملہ کیے جانے کے
مستوجب ہو چکے ہوں۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن نے کہا ہے کہ: ان
جنگوں کو منصفانہ کہنے کا رواج ہے جن میں کسی مضرت کا بدلہ لینا
مقصود ہو مثلاً جب کوئی قوم یا شہر اس کے اپنوں میں سے کسی کے
برے کام پر اس کو سزا دینی یا ناجائز طور سے چھین لی ہوئی چیز
واپس کرنی نہ چاہے تو اس سے مواخذہ کرنا۔

(۳) جو لوگ لڑائی لڑتے (یا جنگ کرتے) ہوں ان کی نیت ٹھیک ہو۔ دوسرے
الفاظ میں ان کی تجویز یہ ہو کہ بھلائی کریں یا برائی کو روکیں۔ اس
کے متعلق اسی ماہر کو یہ کہنا پڑا ہے کہ خدا کے سچے بندے انھیں جنگوں
کو جائز اور مقدس سمجھتے ہیں جو کسی لالچ یا بے رحمی کے لیے اختیار
نہ کی گئی ہوں بلکہ وہ امن کی محبت میں کی جائیں اور ان کا مقصد
شریروں کی تذلیل [؟ سرکوبی، مترجم] اور اچھوں کی تائید ہو۔
اسی لیے یہ ہو سکتا ہے کہ جنگ کا جائز طور سے اعلان ایک جائز
مقصد سے ہوا ہو اور پھر بھی وہ اس بناء پر ناجائز ہو جائے کہ اس
جنگ کرنے والوں کی نیت بگڑی ہوئی ہو۔ کیونکہ سینٹ آگسٹائن
نے کہا ہے کہ: ضرر رسانی کی خواہش، بدلہ لینے میں بے رحمی، ایک
نہ دبنے والا جوش غضب جسے کسی طرح بھی ٹھنڈا نہ کیا جا سکتا ہو، حملے
میں وحشت انگیزی، اوروں پر مسلط ہونے کا جذبہ اور اسی طرح
کی تمام دوسری زیادتیاں اس لائق ہیں کہ ان کو کسی جنگ میں
ملعون قرار دیا جائے۔"

105

آکوی ناس کے سینٹ ٹامس نے اس پر بھی اصرار کیا ہے کہ جو لوگ جائز جنگ کرتے ہیں اُن کا مقصد امن ہوتا ہے اور وہ صرف اس "بُرے امن" کے مخالف ہوتے ہیں جس کے متعلق، کسی انجیل بیت کے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس قسم کے امن کو اس زمین پر لانے کے لیے ہرگز تشریف نہیں لائے ہیں۔ وہ سینٹ آگسٹائن کا یہ خیال یاد دلاتا ہے کہ: لوگ امن کی خواہش اس لیے نہیں کرتے کہ اس کے ذریعے سے جنگ حاصل کریں بلکہ جنگ اس لیے کی جاتی ہے کہ امن حاصل ہو۔ وہ لکھتا ہے: "بنا بر آں لڑنے میں امن پسند رہو تاکہ جن لوگوں سے تم لڑتے ہو انھیں شکست دینے کے بعد تم انھیں ایک نفع بخش صلح پر آمادہ کر سکو۔"

جن لوگوں کے خیالات سے دیگر مولفین کو نئی نئی چیزیں سوجھیں ان میں ایک فرانسسکانی سلسلے کا راہب مونالدے بھی ہے۔ اس نے سنہ ۱۲۷۴ء سے پہلے پیش آنے والے جملہ نظائر کے متعلق ایک "خلاصہ" مرتب کیا جو قانونِ روما اور قانون مذہبی دونوں پر بیک وقت مبنی تھا۔ وہ جائز جنگ سے بحث کرتے ہوئے گراتیان کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کی تالیف نے اہمیت اختیار کر لی اور اعتراف گناہ کرانے والے پادریوں کے لیے درسی کتاب کا کام دینے لگی۔

فرانس کے مشہور ماہرین قانون میں سے ایک آں ری بوائش تھا۔ یہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں پاریس میں پروفیسر تھا۔ اس نے ایک لاطینی تالیف "احکام مذہبی کی، پانچ کتابوں میں شرح" لکھی جس میں اس نے سوسے کے ہنری ہی کی تقسیم قبول کی ہے کہ جنگ کی سات قسمیں ہیں۔ بہر حال وہ امن کی تلقین کرتا ہے اور زبور کے یہ (لاطینی) الفاظ دہراتا ہے، "نیک لوگ زمین کے وارث بنیں گے اور کثیر امن سے مستفید ہوں گے۔" نیز انجیل کے یہ (لاطینی) الفاظ کہ "مبارک ہیں امن پسند اور یہی خدا کے

بیٹے کہلائیں گے"[1]

اسی صدی کے نصف دوم میں ایک اور مولف نے "جنگوں کا جھنڈا" نامی کتاب تالیف کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مولف کا نام شہامت باز (یعنی نائٹ) ژوفراے ڈلاتور لاندری تھا۔ جنگ کے اسباب سے اس میں کم بحث ہے۔ اس تالیف کا بڑا حصہ بعض بیکار مباحث پر مشتمل ہے، جن میں حکمرانوں کے فرائض اور شہامت بازوں کے خصائص سے بحث کی گئی ہے[2]۔

106

قانون روما کے شارحین نے بھی اس موضوع سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک حاشیے میں لکھا ہے کہ "بذات خود تو قانون بین الممالک غیر منصفانہ ہے کیونکہ اس سے خلاف انصاف چیزیں پیدا ہوتی ہیں لیکن وہ اس وقت منصفانہ بن جاتا ہے جب اس سے پیدا ہونے والی جنگوں کا اعلان شہنشاہ اور رومی قوم نے کیا ہو"۔ آزوں نے لکھا ہے کہ صرف ایسی ہی جنگیں قانون بین الممالک کے تحت روا ہو سکتی ہیں، جن کا اعلان یا تو شہنشاہ نے کیا ہو یا رومی قوم نے۔ بالدے اور آن جیلو (جو اطالوی شہر پیروسہ کا باشندہ تھا) یہ بیان کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک کا آغاز نسل انسانی کے ساتھ ساتھ نہیں ہوگیا بلکہ انسانی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی ہوئی، اور یہ کہ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگوں کا آغاز اولین انسانوں کے ساتھ ساتھ نہیں ہوگیا، بلکہ وہ اس وقت شروع ہوئیں جب انسان علٰحدہ علٰحدہ ملکوں میں مستقل طور سے بس گئے۔ اور ان جنگوں کا منشا یہ ہوتا تھا کہ اپنی مقبوضہ اراضی کی مدافعت کی جائے۔ بالدے نے تین قسم کی جنگوں کو تسلیم کیا ہے:

---

[1] ہنری کس بواش کی لاطینی تالیف "احکام مذہبی کی پانچ کتابوں میں شرح" مطبوعہ وینیس صفحہ ۱۴۵)۔

[2] فرانسیسی کتاب "بیوے ای کے ژاں کا نوعمر بچہ" دیباچہ از قلم کا ٹی فاٹر" صفحہ ۲۹۸)۔

اقدامی، مدافعتی، اور بغرض بازیابی [یہی اصطلاحیں لاطینی میں بھی دی گئی ہیں ـــــ مترجم] اور اس نے ان طریقوں سے بحث کی ہے جن کی وجہ سے جنگ ناجائز ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے پانچ چیزیں تسلیم کی ہیں۔ اور اس بارے میں واقعۃً وہ پان آفورتے تسمے رئیموند کو سند بناتا ہے اور اسی کی طرح (لاطینی میں) یہ پانچ شرطیں ضروری قرار دیتا ہے: اشخاص، اشیاء، اسباب، نیت اور اجازت دہندۂ جنگ۔ جو شخص جنگ کرتا ہے وہ جنگ کرنے کی قوت رکھتا ہو، جس چیز کے باعث جنگ کی جاتی ہے وہ مبنی بر انصاف ہو؛ جنگ ناگزیر ہو گئی ہو، یہ نہیں کہ اس کی چاہت ہو؛ نیت یہ نہ ہو کہ بدلہ لیا جائے؛ اور آخری شرط یہ کہ جو حکمران جنگ کا اعلان کرتا ہے اسے اس اعلان کا حق ہو۔

لیکن قانون روما کے ماہرین کی اکثریت اکوئی ناس کے سینٹ ٹامس کی پیروی کرتی ہے اور جائز جنگ کی شرطوں کو تین عنوانوں میں تقسیم کرتی ہے: اشخاص، اسباب، اور نیت۔ لیگنانو (واقع اٹلی) کا ژاں (یجنہ) بھی بالدے کا ہمعصر تھا۔ اس نے جنگ کے متعلق عجیب عجیب خیالات ظاہر کیے ہیں۔ وہ نہ صرف قانون مذہبی و قانون روما سے دلچسپی رکھتا تھا بلکہ ساتھ ہی علم نجوم کا بھی اسے شوق تھا۔ اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے اس کے خیالات کا کیا باعث تھا۔ جنگ کی اس نے لاطینی میں ایک نہایت عام تعریف کی ہے کہ وہ جنگ ایک جھگڑا ہے جس کی بنیاد فساد پر قایم ہوتی ہے۔ اور وہ انسان کی اس چاہت کے باعث ہوتا ہے کہ فساد کا خاتمہ کر دیا جائے۔" جنگ یا تو روحانی جنگ ہوتی ہے یا جسمانی جنگ۔ روحانی جنگ یا تو آسمانی ہوتی ہے یا انسانی۔ اور جسمانی جنگ یا تو عالمگیر ہوتی ہے یا مخصوص۔ روحانی جنگ کی آسمانی قسم وہ ہے جس میں فرشتے خدا سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور روحانی جنگ کی قسم انسانی وہ ہے جب انسان اپنے ان جذبات و خواہشات کے

107

خلاف، جن کی اصل شیطانی ہوتی ہے، کشمکش کرتا ہے۔ روحانی جنگ کے مماثل جسمانی جنگ ہے کیونکہ ہر جسمانی فعل کا باعث کوئی نہ کوئی آسمانی عنصر ہوتا ہے۔ اور اسی بناء پر جنگ معنوی طور سے ایک ناپسندیدگی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس ناپسندیدگی کی بنیاد ستاروں میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، لیناتُو کا ژاں جو علم نجوم کا دھنی تھا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس چیز کو ثابت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا محبوب نظریہ یہ تھا کہ جنگ کے بغیر دنیا پنپ ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نظریے کو صاف صاف اور مکمل طور سے تو قبول نہیں کرتا لیکن یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے قبول کرنے میں کوئی گناہ نظر نہیں آتا۔

وہ ہر انسان کے معاملات میں ستاروں کا اثر پایا جانا بیان کرتا ہے اور یہی چیز اسے حکومتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس نے بیان کیا ہے کہ جنگ کے ذریعے سے اس ناپسندیدگی کا جو اس طرح پیدا ہوتی ہے، علاج کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور جنگ اپنی یہ حیثیت لیے ہوئے خدا کے پاس سے آتی ہے۔ اور ہر وہ صلاحیت جو بھلائی کی طرف لے جاتی ہے، خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ لیناتُو کے ژاں نے بیان کیا ہے کہ "حقیقت میں جائز جنگ کے پیش نظر بھلائی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد پورے عالم کا امن اور آرام ہوتا ہے۔ اور جب خدا اس کی اجازت دیتا ہے تو گویا وہ ایک طبیب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ خدا چونکہ دنیا کا محافظ ہے، اس لیے وہی جنگ کا حکم دیتا ہے تاکہ جرایم اور افعال ناجائز کا قلع قمع ہو جائے۔ خدا چونکہ خالق ہے، اس لیے خلقت کے لیے زمین پر وہ اجرام فلکی کے توسط سے اپنا منشار روبہ عمل لاتا ہے۔ اور مختلف اجرام فلکی کے اثرات مختلف ہوتے ہیں"[1]

---

[1] لیناتُو کے ژاں کی لاطینی تالیف "رسالۂ جنگ" رسایل قانون عمومی، جلد ۱۱ حصہ (۱۷۳)۔

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ عدالتی علم نجوم کی آبیاری خالدیہ اور مصر کے پجاری نیز یونانی اور رومی کرتے رہے۔ اور یہ علم قرون متوسط میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جب ریاضی داں پیدا ہوئے تو ارسطو کے خیالات کو تقویت حاصل ہوئی۔ اور یہ بیان کیا جانے لگا کہ ستاروں کو محرک اول سے حرکت حاصل ہوئی تھی اور اسی حرکت کو وہ باقی خلقت تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح سے وہ خدا اور مخلوقات سفلی کے مابین واسطے کا کام دیتے ہیں[1]۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک کو نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد تھا اور وہی اسے گھیرے رہتے تھے۔ بعد میں تو متعدد بادشاہوں اور حکمرانوں نے علم نجوم سے سیاسیات میں مدد لینی شروع کی۔ روما تک اس عمومی احاطے سے باہر نہ رہ سکا اور پاری ڈگراسس نے جو کلیسائے پاپائی کا افسر مراسم تھا، اپنی لاطینی کتاب "روز نامچے" میں بتایا ہے کہ پوپ دوسرے یولیوس نے بظاہر نجومیوں کی بیان کردہ چیزوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی اس فضول علم کی تائید نہیں کی لیکن اس نے ان عام اعتقادات کی تردید بھی نہیں کی جو اس علم کے متعلق مانے جاتے تھے۔

اپنی نوبت پر چودھویں صدی عیسوی میں ایک زبردست عرب مولف پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق رابرٹ فلنٹ کو کہنا پڑا ہے کہ نظریۂ تاریخ کے ماہر کی حیثیت سے ژیکو کے قبل کسی زمانے میں بھی اور کسی ملک میں بھی اس کا کوئی عدیل و مماثل نہیں پیدا ہوا یعنی ابن خلدون۔ اس نے اپنی تاریخ کے مشہور مقدمے میں اسباب جنگ سے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں[2]۔

108

---

[1] شارل ژوردین کی فرانسیسی کتاب "قرون متوسطہ کا تاریخی اور فلسفیانہ سیر" صفہ ۵۶۱)۔

[2] رابرٹ فلنٹ کی انگریزی کتاب "تاریخ فلسفۂ تاریخ" جلد (۱) صفہ ۸۲)۔

ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ "جنگ اور دیگر اقسام کی جدال وقتال فطرت میں اسی وقت سے موجود ہیں جب سے کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس کا باعث انتقام کی ایک خواہش ہے جو چند انسانوں کو دوسرے کے خلاف ہوتی ہے .... جنگ انسان کے لیے ایک طبعی چیز ہے۔ اس سے کوئی قوم اور کوئی نسل خالی نہیں۔ اس انتقام کا سبب کبھی تو غیرت و رقابت ہوتی ہے، کبھی زبردستی وزیادتی، کبھی خدا اور خدا کے دین کی حمایت کا جذبہ، اور کبھی ملک کی حمایت اور وہاں امن و امان قایم کرنے کی کوشش۔ ان میں سے پہلی قسم کی جنگ اکثر ہمسایہ قبایل اور ہمسر خاندانوں میں ہوتی ہے۔ دوسری محض زیادتی اور ظلم ہے اور اکثر وحشی صحرا نشین قوموں میں ہوتی ہے..... تیسری وہ ہے جسے شریعت میں جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ اور چوتھی وہ سرکاری جنگ ہے جو باغیوں اور اطاعت شکنوں سے کی جاتی ہے۔ ان چار قسموں میں سے پہلی دو زبردستی اور زیادتی پر مشتمل ہوتی ہیں اور آخری دو حقیقی جہاد اور منصفانہ[1]"

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں آونورے بونے نے جو شلونے کی خانقاہ کا صدر تھا، چھٹے شارل کے نام اپنی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" معنون کی۔ مولف نے اپنی کتاب کے اس عجیب نام کی یوں توضیح کی ہے کہ "اگر میری کتاب کے نام سے تم کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ میں ایک رنج و الم کے درخت کے سایے میں ہوں، تو تم خود یہ دیکھ لوگے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مقدس کلیسا جس عظیم الشان

[1] فرانسیسی کتاب "پاریس کے کتب خانۂ قومی اور دیگر کتب خانوں کے مخطوطات کے حالات معہ اقتباسات" شایع کردۂ مجلس علمی فرانس، جلد (۲۰) حصۂ اول، صفحہ ۵۷۔

[یہاں مولف نے ایک فرانسیسی کتاب سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔ ہم نے اصل عربی سے (دیکھیے باب سوم فصل ۲۸) ترجمہ کیا اور بعض فروگزاشتوں کا ازالہ بھی۔ مترجم]۔

مصیبت کے دور سے گزر رہا ہے اس کے باعث کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا...... اس کے بعد تم اس عظیم الشان اختلاف کو بھی دیکھ لوگے جو آج کل عیسائی بادشاہوں اور حکمرانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد تم اس بہت بڑی تکلیف اور فساد کو بھی دیکھو گے جو مختلف فرقوں میں پایا جاتا ہے پس [مصائب کے] اس [شاخ درشاخ] درخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب کو [جس کا نام جنگوں کا درخت ہے] چار حصوں میں مرتب کرتا ہوں"

بونے کی تالیف حقیقت میں کلیسا کی ان تکلیفوں ہی کے متعلق ہے جو حضرت مسیح کی آمد سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئیں۔ اسی طرح اس میں "چار سلطنتوں" یعنے بابل، قرطاجنہ، مقدونیہ اور روما کی تباہی اور مصیبتوں کا نیز "عام" اور "خاص" جنگوں کا بھی ذکر ہے۔ کتاب کے آخری دو حصے قانون جنگ کی ایک اچھی خاصی کتاب پر مشتمل ہیں اور ہمارے اس علم کی انتہائی قیمتی یادگاروں میں سے ایک ہے۔ اونورے بونے بڑے بڑے شارحوں کا ہمعصر تھا۔ اسی لیے کتاب "شجرۂ حروب" اطالوی اساتذہ کی تحریروں کے لفظی ترجموں کے اقتباسات سے بھری ہوئی ہے۔ اب جنگ کے فطری اسباب کے متعلق ہم اس کی معصوم خیال آرائیوں کا جو خلاصہ بیان کرنے والے ہیں وہ یا تو لینانو کے ژراں سے ماخوذ ہے یا کم از کم ایک ایسے مولف سے جس کے دونوں ہی مشترکہ طور پر خوشہ چین ہوں ـــــ کیونکہ قرون متوسطہ کے مولف بغیر کسی شرم و حیا کے دوسروں کے افکار ذہنی کی لوٹ مار کر لیا کرتے تھے اور وہ اسے اصطلاحی طور سے "مچھلیوں کا شکار کرنا" یا "اسباب باندھنا" کہتے تھے :-

"اساتذۂ قانون کے مطابق جنگ صرف ایک فتنہ وفساد یا مناقشہ ہے، جو انسان کی خواہش پر ناگوار چیزوں کے لیے نازل ہوتا ہے تاکہ فریق ثانی کو مصالحت اور معقولیت کی طرف واپس

109

لایا جائے۔" اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں کہ دنیا امن ہی کی حالت میں رہ سکے۔ "ایک ناممکن چیز ہے کہ آسمان آرام لیتا رہے یعنی وہ ان حالات پر کوئی حرکت نہ کرے۔ کیونکہ آسمان مشارق سے مغرب کی طرف جو مسلسل گھومتا رہتا ہے، وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آسمان خود حرکت کرتا ہے۔ اور یہ کام وہ ہر روز کرتا رہتا ہے۔ اجسام ارضی آسمان ہی کی حرکت کے مطابق متحرک ہوتے ہیں۔ اس سے آگے چلو، اجسام ارضی اصل میں اَجرام فلکی ہی کی حکمرانی میں ہیں، جیسا کہ فلاسفہ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صاف بات ہے کہ اَجرام فلکی ہی سے اشیائے ارضی کو ان کی ناپسندیدہ طبیعت اور اختلاف احوال حاصل ہوتا ہے۔"

اونورے بونے اس خیال کو اور ترقی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "ایسے متعدد شہر ہیں جو اپنے آغاز ہی سے ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے ہیں حالانکہ اس محبت کے حصول کے لیے اپنے آغاز سے کبھی ایک نے دوسرے کی نہ تو کوئی خدمت کی ہے اور نہ ایسا کام جس سے محبت پیدا ہو سکتی ہو۔ اس کے بر خلاف تمہیں ایسے بھی شہر ملیں گے جنھوں نے اپنے آغاز سے کبھی ایک دوسرے کی برائی نہیں کی لیکن پھر بھی ان میں ہمیشہ نفرت ہی پائی جائے گی۔"

ایک عجیب چیز سمجھ کر ہم نے اس عبارت کو نقل کر دیا۔ البتہ یہ بیان کرنا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ایک اور عبارت میں اونورے بونے حق حکمرانی کے آغاز کی حقیقت بیان کرتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ سوال پیش کرتا ہے کہ "اختیار ساعت اور آقائی" کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ اس کا وہ جواب دیتا ہے کہ: "احکام مذہبی کے مطابق میں تجھ سے کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حکم سے پیدا ہوتی ہے..... لیکن اگر کوئی یہ حجت کرے کہ آغاز عالم پر تو خدا نے انسان کو یہ

لہ۔ اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصہ سوم باب دوم

110

حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دوسروں پر آفاقی جائے' ــــ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ حجت صحیح ہوگی ۔ لیکن خدا نے انسانوں کو عقل' احساس اور تمیز یا صوابدید کی قوت عطا کی تاکہ وہ معقولیت کے ساتھ اور مناسب طور سے زندگی گزار سکیں ۔ کیونکہ ان تمام چیزوں میں جن کے اجزاء و اعضاء ہوتے ہیں' ہمیشہ ایک صدر یا سردار کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں کوئی سردار نہ رہے تو یقیناً وہاں حسن انتظام مفقود رہے گا۔ ہر عادلانہ اور حقیقی [؟ حق پسندانہ] اختیار سماعت خدا کی طرف سے پیدا ہوتا اور لوگوں کے انتخاب سے آتا ہے ۔"

کرسٹین ڈپیزاں بہت سی چیزیں اونورے بونے سے اخذ کرتی ہے ۔ اس کی فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کا ایک حصہ تو اپنا کا حال ہے' لیکن دوسرا حصہ یا تو فرؤں تیں سے ماخوذ ہے یا تے ژیس سے ۔ اور ایک اور حصہ ایک جیتے جاگتے اور دلچسپ مکالمے پر مشتمل ہے جس میں کرسٹین ڈپیزاں اور اونورے بونے جنگ کے متعلق مختلف مسایل پر بحث کرتے ہیں ۔ فرؤں تیں نے شہنشاہ دیوکلے سیاں کے زمانے میں "جنگی چالیں" نامی جو کتاب تالیف کی اور تے ژیس نے شہنشاہ قالنتی نیان کے زمانے میں "فوجی ادارات" کے نام سے جو تصنیف لکھی وہ فن حربیات کے لیے ایسی یادگاریں بن گئیں جن کو ہمیشہ دیکھا جاتا اور جن کا احترام کیا جاتا تھا ۔

"ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کے حصۂ اول کا چوتھا باب پورے کا پورا اس مسئلے کی بحث کے لیے وقف ہے کہ "وہ کونسی تحریکیں ہیں کہ جن سے ہی خاص کر جنگیں اور لڑائیاں پھوٹ پڑتی ہیں ۔" چنانچہ کرسٹین کہتی ہے کہ "اس چیز کے متعلق اچھے غور کے بعد مجھے یہ نظر آتا ہے کہ عام طور پر ایسی پانچ بنیادی تحریکیں ہیں جن پر اسباب جنگ مبنی ہوتے ہیں ۔ ان میں سے

تین تو حقوق کے متعلق ہیں اور باقی خواہش کے متعلق[1]"

قانونی اسباب یہ ہیں :۔

(۱) حق اور انصاف کی تائید۔

111 (۲) جو برے لوگ ملک، علاقے اور قوم کو روندنا، تکلیف دینا اور ان پر ظلم کرنا چاہتے ہیں، ان سے مقابلہ۔

(۳) کسی علاقے، کسی جاگیر یا کسی اور چیز کو جسے غیر منصفانہ طور سے چھین لیا اور غصب کر لیا گیا ہو، اور جو حکمران کی ہو یا اس ملک کے اختیار سماعت میں رہی ہو یا اس کی رعایا کی ہو، تو اس کو واپس لینا۔

---

[1]۔ یہاں ہم نے بروسیل کے کتب خانۂ شاہی کے مخطوطہ نشان (۹۰۱۰) کے حوالے سے یہ چیزیں نقل کی ہیں۔ ۱۴۸۸ء میں ویرار نے پاریس میں جو فرانسیسی کتاب شایع کی اس کا نام "فن شہامت تے ژیس کی رائے کے مطابق" تھا اور اسی کے آخر میں "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" تھی۔ حقیقت میں یہ کتاب کرستین ڈپیزاں کی ہے اور جہاں کہیں کتاب میں کرستین نے اپنے متعلق مونث ضمیریں اور صیغے استعمال کیے تھے ان سب کو ویرار نے مذکر صیغے بنا دیا ہے اور بجائے عورت کے ایک مرد گفتگو کرتا ہے۔ ویرار نے چند مخطوطوں کے مطابق اپنا متن مرتب کیا ہے لیکن بروسیل کے کتب خانۂ شاہی میں ایک مخطوطہ ہے جس کا نام "فن جنگ" ہے جو کرستین کی لکھی ہوئی اصل تالیف ہی ہے، بجز ان ترمیموں کے جو ویرار نے کی ہیں۔ اس مخطوطے کا نمبر (۱۰۲۰۵) ہے۔

مونفین میں خاصے طویل عرصے تک اس بات کے متعلق جھگڑا رہا کہ آیا "ہتیاروں کے کارنامے اور شہامت کے متعلق کتاب" کرستین ڈپیزاں ہی کی تالیف ہے۔ لیکن لندن مرتبت ناشر ولیم کاکس ٹن کو ذرا بھی دھوکہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ۱۴۸۹ء میں اس نے اس کے آخر میں جو سطریں انگریزی میں لکھی تھیں وہ یہ تھیں "یہاں پر وہ کتاب ختم ہوتی ہے جو پیزا کی کرستین نے تے جیس کی لاطینی کتاب "متعلق بہ امور فوجی" اور فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" سے اخذ کی تھی"۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرانسیسی مخطوطہ اس کو ساتویں ہنری نے سپرد کر کے چاہا تھا کہ اس کو ترجمہ کر کے چھاپا جائے" تا کہ جو

جو اسباب خواہشات پر مبنی ہیں وہ یہ ہیں :-
(۱) کسی مضرت کا جو دوسرے سے پہنچی ہو انتقام لینا۔
(۲) اجنبی علاقوں اور ملکوں کو فتح یا حاصل کرنا۔
قانونی اسباب میں سے (۱) پر بے انتہا احتیاط کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور کرسٹین اس کی تین ذیلی قسمیں بیان کرتی ہے :-
(۱) کلیسا اور اس کے جائداد کی حمایت ــــ یہ ہر عیسائی پر واجب ہے۔
(۲) کسی ماتحت حکمران کی مدد جب کہ وہ مدد کا طلبگار ہو اور اسے جائز جھگڑا پیش آیا ہو اور حکمران نے اس جھگڑے کی مسالمانہ یکسوئی کی کوشش بھی کر دیکھی ہو۔
(۳) وہ مدد جو کسی جاگیردار یا کسی اور "اپنے دوست" یا کسی ملک کو دی جائے بشرطیکہ جھگڑا حق بجانب ہو۔
یہ چیز قابل ذکر ہے کہ کرسٹین ان شرطوں کے متعلق یہ نہیں کہتی کہ حکمران ہی تنہا ان کی جانچ کر سکتا ہے بلکہ وہ یہ رائے دیتی ہے کہ حکمران کو چاہیے کہ "عقلمندوں" سے مشورہ کرے۔ جنگ کے متعلق وہ کہتی ہے کہ وہ حکمران عقلمندوں کی مجلس شورائے اعظم اپنی پارلیمان میں طلب کرے گا اور اگر وہ مجلس کسی کی ماتحت ہے تو اپنے مقتدر اعلیٰ کی پارلیمان میں۔ اور وہ نہ صرف اپنے ملک والوں کو جمع کرے گا بلکہ جانبداری کے ہر شبہے سے باہر ہونے کے لیے وہ بیرون ملک کے بھی ایسے عقلمندوں کو جمع کرے گا جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ کسی فریق کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ ان عقلاء میں بڑائے جاگیرداروں کو بھی بلایا جائے، ماہرین قانون کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ شرفاء سپہ گری کا پیشہ اختیار کریں وہ یہ بھی جان لیں کہ انہیں جنگ میں کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے"۔

جو لوگ حاضر ہوں ان کے سامنے ہر چیز صحیح صحیح طور سے اور بغیر رنگ آمیزی کے خود پیش کرے گا یا پیش کرائے گا"۔ اس کی بعض نظیریں بھی ہیں۔ کالے کا معاہدہ ۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۳۶۰ء کو ہوا تھا۔ اس کی رو سے بادشاہ ژاں نے تیسرے ایڈورڈ کو پوں تیو، پوا تو اور گوی ینین کے علاقے سپرد کردیے تھے، لیکن ان علاقوں کا اقتدار اعلی اپنے لیے باقی رکھا تھا۔ کم از کم اس بارے میں فرانسیسی تعبیر یہی تھی۔ جب پانچواں شارل تخت نشین ہوا تو اس نے ایک ایسی تدبیر شروع کی جس کے ذریعے سے یہ سپرد کردہ علاقے اس کو واپس مل جائیں بغیر اس کے کہ قانون کی کوئی خلاف ورزی ہو، کم از کم ظاہرداری کی حد تک۔ گوی ینین کے متعدد جاگیرداروں نے اپنی شکایتیں پیش کیں اور فرانس کے بادشاہ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ عدالت امرار میں ان ناانصافیوں کے خلاف، جن کا ارتکاب ہوا تھا، استغاثہ پیش کریں۔ بادشاہ نے اپنی مجلس شوری کئی بار منعقد کی اور چاہا کہ بولونیا، موں پے لیے، تولوز، اور اور لیسیاں کی جامعات اور روما کی متعدد عالم شخصیتوں کی رائے حاصل کرے۔ جب ان کے جواب سے اس کو اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ اس کا دعوی حق بجانب ہے تو اس نے حکمران ویلز کے نام تاریخ پیشی کے مقرر کرنے کی اطلاعیں بھیجیں۔ پھر پانچویں شارل نے ملک کے تینوں قسم کے نمایندوں سے مشورہ کیا اور آخر میں عدالت امرار نے ایک فیصلہ صادر کیا جس کی رو سے گوی ینین اور دیگر تمام علاقے جو فرانس میں شاہ انگلستان کے قبضے میں تھے، پانچویں شارل کے حق میں ضبط کرلیے گئے اور اس کی مملکت میں ضم کردیے گئے تھے۔ ۹ر مئی سنہ ۱۳۷۰ء کو بادشاہ کا جو مہری فرمان نکلا اس میں اس فیصلے کی توثیق کی گئی۔

سنہ ۱۴۱۳ء اور سنہ ۱۴۲۰ء کے مابین آرنولد گائیل ہوفن نے گروے نن ڈیل کی خانقاہ میں جو بروسیل کے قریب ہے ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "ضمیر کا آئینہ موسوم بہ گنوتو سولی توس" تھا۔ یہ "گنوتو سولی توس"

حقیقت میں یونانی محاورہ تھا یعنی "تو خود اپنے آپ کو پہچان"۔ آرنولد اصل میں رُوتَردام کا باشندہ تھا۔ اس نے قانون مذہبی کی تعلیم اٹلی میں گاس پار کالد ربنی اور وزا بار لا جیسے اساتذہ سے پائی تھی کہ پھر یہ سینٹ آگسٹائن کے (کیپانن یعنی) عہدہ دار پادریوں کے حلقے میں داخل ہوگیا۔ اس کی تالیف کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بہرحال یہ بیان کرنا چاہیے کہ "قتل نہ کرو" کے متعلق احکام بیان کرتے وقت اس مولف نے جنگ کی وہ ہفت گانہ تقسیم نقل کردی ہے جو سوسے کے ہنری کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ مولفین کی رائے میں منصفانہ جنگ میں فاتح کو کوئی چیز واپس دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔[1]

ایک دلچسپ کتاب ژاں تی بر ژو جاگیردار موت، مارتیں ہوریں اور ماسٹر ریوٹے نے بیوے ای کے ژاں کے حکم سے جو سان سیر کا کونٹ تھا، تالیف کی۔ اس کتاب کی عبارت آمیز آزاد بیانی نے انگریزی تباہی کو مدعو کیا تھا۔

بیوے ای کے ژاں کی فرانسسی تالیف "نوعمر بچہ" جس زمانے سے تعلق رکھتی ہے، وہ ایک اہم زمانہ تھا یعنی سنہ ۱۴۲۴ء سے سنہ ۱۴۵۳ء تک۔ "نوعمر بچہ" نامی کتاب میں ایک ایسے نوعمر کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس نے ہتھیار چلانا نیا نیا سیکھا ہے، اور جو بڑے بڑے رتبوں پر پہنچ جاتا ہے۔ مولف اولاً اسے یگانگی کی حالت میں دکھاتا ہے یعنی وہ تنہا تھا اور اپنے سوا کسی اور کے لیے جوابدہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ گرہستی کی حالت میں ہوتا ہے یعنی اسے متعدد دیگر لوگوں کی گزر اوقات کے لیے کام کرنا پڑتا ہے اور آخر میں

---

[1] روتردام کے آرنولد کی لاطینی کتاب "ضمیر کا آئینہ" یا "تو خود اپنے آپ کو پہچان" مطبوعہ بروسل سنہ ۱۴۷۶ء۔ عنوان دوم کتاب اول، باب نمبر ۵ "قتل نہ کرو"، مسئلہ (۳۷) متعلق بہ جنگ۔

سیاسی حالت میں۔ اور وہ ایک بڑے ملک کا حکمران ہوتا ہے۔ یہ "نوعمر بچہ" خود بیوے ای کا ڈراں ہی ہے۔ اور مولف کا اصل میں منشاء یہ تھا کہ اپنے وطن میں واپس آنے کے بعد جب اس نے یہ کہانی ۱۴۶۲ء میں لکھنی شروع کی، اپنے تجربوں سے ان نوجوان جاگیرداروں کو مستفید کرے جو ملازمت کی عمر رکھتے ہوں اور ان کو اطاعت شعاری کی، اور مقابلہ کرنے کی، اور بالآخر حکومت کرنے کی تعلیم دے۔

113

"نوعمر بچہ" نامی کتاب کا مولف جنگ کے وہ قواعد بیان کرتا ہے جو قیدیوں، تقسیم حصص، تقسیم مال غنیمت اور پروانۂ راہداری کے متعلق ہیں۔ یہ مولف انصاف، ایمانداری اور راستبازی کی تعلیم دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ صرف انھیں کے ذریعے سے امن حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ امن "ہتھیاروں کی ہر شاندار کامیابی پر ترجیح دینے کے قابل چیز ہے۔ اور یہی دنیا کے آغاز ہی سے جنگ کے قابل نفرت سرچشموں کو خشک کرتا رہا ہے اور اسی کے باعث وہ بدبختانہ تحقیر و انکار اور رشک و رقابت کے جذبات نہیں پیدا ہوتے جو ہمیشہ حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کرتے ہیں۔" لیکن جنگ بعض وقت ایک "اچھی اور جائز بنیاد پر مبنی جھگڑا" ہوسکتی ہے اور اس صورت میں "وہی انصاف ہوگا اور وہی حق کی حمایت سمجھا جائے گا۔"

سپہ گری کا پیشہ بیوے ای کے ڈراں کو پھسلا دیتا ہے۔ وہ اپنے پیشے کا عاشق ہے۔ اور اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ جوش میں آجاتا ہے۔ وہ جنگی بہادری کی تعریف کرکے اسے آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ "جو کوئی کسی بڑی فوج کا سردار ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے کو نمایاں کیا کرے، سر اٹھا کر چلا کرے اور کوچ اسی وقت کرے جب سورج کافی بلند ہو تاکہ وہ اپنے ہتھیار چمکا سکے اور اس طور پر کہ سورج اس کی زرہ کو جگمگاتا رہے۔" اسے "اچھے کپتان" لاایر کی بات یاد آتی ہے جو اس نے اپنے سپاہیوں میں سے ایک سے کہی تھی کہ "اگر تو

چاہتا ہے کہ ڈر کبھی تیرے پاس نہ پھٹکے تو اس بات پر تیار رہا کر کہ پہلا وار کرنے کا ہمیشہ تجھی کو موقع ملے۔" یہ مولف جنگ کی مصیبتوں سے ناواقف نہیں ہے، لیکن یہ مصیبتیں صرف معمولی روحوں کو پہنچتی ہیں، ورنہ بلند تر روحوں کے لیے تو خدا کی ذات میں تسکین و آرام کا سامان موجود ہوتا ہے: چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "مصیبتیں، خطرے، افلاس اور قحط جو [اس سے] پیدا ہوتے ہیں، ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں کیونکہ جو لوگ ایک شریف دل کے مالک ہوں اور قوت اور اعتبار کے صفات سے متصف ہوں تو ان کے لیے اس دنیا میں ان چیزوں سے بڑھ کر کوئی اور خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو کچھ ہے، جنگی زندگی ہی ہے یہ ایک خوشگوار پیشہ ہے اور نوجوانوں کے لیے اچھی چیز۔ خدا بھی ان کو چاہتا ہے اور تمام دنیا بھی۔ اور جنگ کے زمانے میں بہت کچھ باہمی محبت لوگوں میں آپس میں پیدا ہو جاتی ہے۔[۱]

سپہ گری کے پیشے کی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ "ایسے لوگوں کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ کیونکہ سپاہی یا تو مرجاتا یا قابل عزت افلاس کی حالت میں زندگی گزارتا ہے یا بالآخر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ بن جائے۔"

ایک تالیف جو انگلستان میں ہوئی تھی، وہ پندرھویں صدی کے نصف اول سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ قانون جنگ سے متعلق ہے۔ اس کے مولف کا نام نکولاس اپٹن ہے اور اس کتاب کا لاطینی نام

---

[۱] ۔سینٹ پارے کے لاکیورن کی فرانسیسی تالیف "نوعمر بچہ" نامی کتاب کے دو مخطوطے جن کا پاریس میں ۱۵۲۹ء میں چھپے ہوئے نسخے سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ادبی یادداشت ہے جو کتبات اور ادب لطیف کی شاہی اکاڈیمی کے رجسٹروں سے ماخوذ ہے۔ دیکھیے جلد ۲۲۔ بیوے ای کے ژاں کی کتاب "نوعمر بچہ" جس کا دیباچہ کامی فاقر نے لکھا تھا اور جسے لیوں لے بستر نے باضافہ حواشی ایڈٹ کیا تھا" مطبوعہ پاریس ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۹ء۔

114

فوجی مسایل پر چار کتابیں" ہے۔ ایمن اس وقت انگریزی فوج کے ساتھ تھا جب وہ اورلیاں کا محاصرہ کیے پڑی تھی۔ وہیں اس کا سرپرست یعنے سالسبری کا کونٹ مرگیا۔ اب وہ اپنے ایک اور سرپرست کے مشورے سے مذہبی سلسلے میں داخل ہوگیا اور بعد میں سالسبری کا عہدہ دار پادری (کپانن) بن گیا۔

یہ تالیف سچ پوچھئے تو شہامت اور اسلحہ بازی پر ایک رسالہ ہے' جو بارتولے کی لاطینی کتاب "تمغے اور ہتیار" سے مشابہت رکھتی ہے' اور اسی سے ماخوذ بھی ہے۔ لیکن دوسری لاطینی کتاب جس کا نام "فوجی فرایض کے متعلق" ہے' اس میں ایمن نے قانون جنگ سے بحث کی ہے۔ وہ اس بارے میں گراتیان کے قدم بقدم چلتا ہے اور مختلف موقعوں پر لنانو کے ژاں کا بھی حوالہ دیتا ہے اور وہی تقسیم قبول کرلی ہے جو لنانو کے ژاں نے بیان کی تھی کہ روحانی جنگ یا تو آسمانی ہوتی ہے یا انسانی؛ اور جسمانی جنگ یا عالمگیر ہوتی ہے یا خصوصی۔ لیکن ایمن اس خواب آرائی میں اپنے آپ کو نہیں پھنسا لیتا جو بولونیا کے پروفیسر یعنی ژاں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں قانونی ڈوئل (یعنی دو آدمیوں کی دست بدست لڑائی یا مبارزت) کو تسلیم کرلیا گیا ہے اور لومبارد کے بھی بکثرت حوالے ہیں۔ انتقام یا مواخذے کی بھی اچھی احتیاط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس کا جو طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے وہ بتادیا گیا ہے اور اس کے اصول بھی بیان کردیے گئے ہیں۔ ایمن اس کے جواز کے متعلق خود کچھ نہیں کہتا بلکہ صرف بارتولے' لیے نو کے گای' بل ژوکے ژاک' آندریا کے ژاں اور بالدے کا حوالہ دے دیتا ہے۔ اس کتاب کا ایک جملہ دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے متعلق ایمن اسی بے رحم نظریے کو قبول کرتا ہے' جو بالدے نے پیش کیا تھا۔ شاہان انگلستان کی اسلحہ آرائیوں سے بحث کرتے ہوئے وہ قانون روا

کے تحریری احکام کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ژاں ایک قیدی تھا، اس لیے ہر وہ چیز جو اس کی ہو وہ تیسرے ایڈورڈ کی ہو جائے گی۔ اور یہ کہ نتیجۃً اسے یہ حق ہے کہ خانوادۂ فرانس کے ہتھیاروں کی فتوحات کو بھی اپنی ہی قرار دے۔ اور اسے اس بات کی کوئی ضرورت نہ ہوگی کہ اپنی ماں کے توسط سے اسے جو حقوق حاصل ہوئے ہیں، ان کا حوالہ دے۔

اسی زمانے کی ایک اور عمدہ فرانسیسی تالیف ملتی ہے جس کا نام "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" ہے[1]۔ مائن کے لاکرُوانے اور لاسرنائم بیان کیا ہے کہ یہ کتاب ژوور ژسنات لیں کی تالیف ہے۔ پوت فیس نے بیان کیا ہے کہ یہ مشہور سیاح، سیاست داں اور واعظ یعنے لانواکے گل بیر کی تصنیف ہے جسے "اچھے فلپ" نے اپنی دوستی کا افتخار بخشا تھا۔ اس کتاب کا مولف چاہے کوئی ہو، بہرحال وہ جنگ کا مخالف ہے اور وہ اپنے پڑھنے والے کو حکم دیتا ہے کہ جنگجویانہ مہموں میں اس وقت تک شریک نہ ہو جب تک کہ انتہائی مجبوری نہ پیش آجائے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "جو حکمران اچھی شہرت، اپنی رعایا کی سچی اور پوری محبت اور ساتھ ہی جنت میں جانے کی عزت حاصل کرنی چاہتے ہوں، انھیں چاہیے کہ تمام چیزوں سے زیادہ اپنے آپ کو جنگ اور عیسائیوں کے خلاف معاملات سے بچائے رکھیں۔ خاص کر ان چیزوں سے جو ان کے ممالک اور رعایا کو تکلیف یا نقصان پہنچائیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کی ذات کو جوکھم یا خطرہ لاحق ہوگا بلکہ صرف ان جذبات رحم و رافت کے باعث جو تمام ممالک کے لوگوں اور قوموں کے متعلق ہونے چاہییں۔"

115

[1] مخطوطۂ کتب خانۂ شاہی بروسیل نشان (۱۰۹۷۲) — پوت فیس کا شائع کردہ فرانسیسی "لانوا کے گل بیر کا مجموعۂ تصانیف"

جنگ کی برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے فیاض مولف نے اس کا جواب بڑے زور سے یوں دیا ہے کہ "معقولیت اور انصاف کے ساتھ حکومت کرو"۔ اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ جس طرح ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ ماں اپنے بچے کو پیار سے لیے پھرتی ہے، اپنی چھاتی سے لگائے رہتی ہے، اسی طرح معقولیت اور انصاف کی گود میں امن و مصالحت کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جنگ، جس سے ہر چیز تباہ و برباد ہو جاتی ہے، تین شیطانی برائیوں سے پرورش پاتی ہے یعنی غرور، تکبر اور لالچ"۔

اس کا مشورہ یہ ہے کہ سفارتی ذرایع سے گفت و شنید اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ تمام حکمرانوں اور ان کے خاص مشیروں کو چاہیے کہ جنگ کے ہولناک اور بے رحمانہ مصائب میں پڑنے سے قبل اپنے معاملے کا خود مطالعہ کریں اور منتد و سفروں اور سفارتوں کے ذریعے سے معقولیت پسند اور ناطرفدار حکام عدالت کی رائے معلوم کریں۔ اور اگر معاملہ اتنا مشکل اور جنگ پر اتنا مائل ہو کہ تم اور تمھارے خاص مشیر اس کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں، اس طور سے کہ معاملات اتنے آگے بڑھ گئے ہوں کہ واقع ہونے ہی والے ہوں تو تمھیں چاہیے کہ اپنی سلطنت اور ملک کے تینوں طبقات کے نمایندوں کو کسی مناسب مقام پر جمع کرو، یعنی تمھارے ہم خون سردار، کلیسا کے لوگ، شہامت باز اور جاگیردار، عوام اور عقلاو اور تمھارے شہروں اور اچھی بستیوں کے معززین [سے مشورہ کرو]"

مولف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جنگ میں گھسنے کے راستے آسانی سے مل جاتے ہیں اور لوگ وہاں جلد پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ راستے اور مخرج جن کے ذریعے سے اس سے باہر نکل سکیں، خطرناک اور مشکل ہوتے ہیں۔ اور اکثر استرے سے زیادہ تیز اور سوئی سے زیادہ

نکیلے ہوتے ہیں۔"

"فرانس اور انگلستان کے جنگی نقیبوں کا جھگڑا" نامی کتاب[1] ۱۴۵۳ء اور ۱۴۶۱ء کے مابین تالیف ہوئی۔ یہ کتاب اور لیباں کے شارل کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن اس خیال کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ قطعیت سے دور ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرانس کی انگلستان پر برتری نمایاں اور واضح کی جائے۔ اس کتاب میں فرانس کا جنگی نقیب اور انگلستان کا جنگی نقیب "عقل بانو" کے سامنے اپنی اپنی تائید میں بحث کرتے ہیں، اور باری باری سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ہی ملک سے دیگر تمام عیسائی ممالک کے مقابلے میں زیادہ "احترام کا برتاؤ کیا جائے۔" برتری کے جو اسباب وہ بیان کرتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔: مسرت، شجاعت اور ثروت۔ مولف کو جنگ سے دلچسپی ہے اس کی رائے میں باوجود اپنے تمام نتائج کے، حالت جنگ بھی ویسی ہی مطابق فطرت ہے جیسی حالت امن۔ خونریز جھگڑے، وقت بہلائی کا ایک جائز طریقہ ہیں بلکہ وہ اس غرض کے لیے ضروری ہیں کہ "ہتیاروں کی اچھی مہارت" کے ذریعے سے جاگیرداروں کو اپنی شجاعت کے ثابت کرنے" اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے، جیسا کہ فرد اسار کی رائے تھی۔ اس کو بہت کم اہمیت حاصل ہے کہ آدمی کو فتح حاصل ہوئی یا شکست۔ دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ وہ بہادر ہے یا نہیں۔ "کسی بادشاہ کے لیے اس دنیا میں یہ کوئی قابل ملامت بات ہرگز نہیں کہ اسے جنگ میں ناکامی ہو بشرطیکہ اس کو یہ بڑی عزت حاصل ہوچکی ہو کہ اس نے اپنے دشمن سے بہادری کے ساتھ جنگ کی تھی۔"

---

[1]۔ اسے لیوپول پانیے نے شائع کیا اور پاول مائیر نے ۱۸۷۷ء میں اس کی تکمیل کی۔

116

ہالینڈ کے ایک مولف نے لاطینی میں "جائز جنگ کے متعلق" ایک رسالہ تالیف کیا جو کافی بڑے مجموعے کا جزو ہے۔ اس کا نام ہنری فان گورکم ہے۔ وہ جامعۂ کولون میں عیسائی دینیات کا پروفیسر تھا۔ شروع میں وہ ایک بہت ہی خصوصی موضوع سے دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ جس مسئلے سے وہ بحث کرتا ہے، وہ یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا کوئی فریق جو شکست کھا کر کسی شہر سے جلاوطن ہو جائے اور دوبارہ فتحمند ہو کر وہاں واپس آجائے تو کیا وہ مفتوحوں کے مال کو کام میں لاسکتا ہے؟ اس بحث کو پھیلاتے ہوئے وہ اکوی ناس کے سینٹ ٹامس کا نظریہ قبول کرلیتا ہے، اور تین شرطوں کے پائے جانے کا مطالبہ کرتا ہے یعنے "باقتدار شخص"، اور منصفانہ وجہ، اور "جنگجوؤں کی درست نیت"[1]

اٹلی کا ایک ماہر قانون پاریس دل پوتؔسو تھا۔ یہ نیپلز کے حکمران فرڈیناند کا مشیر تھا۔ اس نے پندرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں لاطینی میں ایک رسالہ "امور جنگ کے متعلق" لکھا جس میں خاص کر ڈوئل یا مبارزت یعنی دو آدمیوں کی دست بدست لڑائی کا ذکر تھا اور ضمناً اس میں قانون جنگ سے بھی بحث تھی۔ پاریس دل پوتؔسو نے اپنی کتاب کا اطالوی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا تھا۔[2]

---

[1] یہ لاطینی کتاب شہر کولون میں سنہ ۱۵۰۳ء میں اس نام سے شایع ہوئی کہ مشوروں کا رسالہ جو محترم استاد، گوری کم کے ہنری کی تالیف ہے، جو دینیات کا نہایت درخشاں پروفیسر اور جو سابق میں جامعہ کولون کا نائب امیر تھا۔ نیز برسے مونتی کے مدرسے کا صدر

[2] یہ اطالوی تالیف تقریباً ۱۴۷۱ء میں نیپلز میں شایع ہوئی اور اس کا اطالوی نام یہ تھا "کتاب تمہید امور جنگ، جسے فاضل استاد پاریس دے پوتے کو، ماہر قانون، نے مادری زبان میں تالیف کیا" مطبوعہ نیپلز تقریباً ۱۴۷۱ء۔

۱۴۷۵ء میں ایک گمنام مولف نے چوتھے ایڈورڈ کو مخاطب کرکے ایک انگریزی تالیف "شرافت کے متعلق کتاب" شایع کی۔[1] بادشاہ گر یعنی وارک مرچکا تھا اور اقتدار شاہی بے چون و چرا مانا جاتا تھا۔ برگنڈی کا ڈیوک جس نے اپنے برادر نسبتی ایڈورڈ کی مہمان نوازی اس کی جلاوطنی کے زمانے میں کی تھی، اب اسے فرانس کے خلاف بھڑکانے لگا۔ باوجود اپنی کاہلی و بے وقوفی کے، بادشاہ نے یہ مشورہ سن لیا اور ایک مہم اختیار کی۔ اگرچہ اس مہم کو انگلستان میں عام طور سے پسند کیا گیا لیکن گیارھویں لوئی کی چالاکی کے سامنے وہ ناکام رہی۔

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ کو اعلان جنگ پر آمادہ کرے۔ مولف اپنی کتاب کا آغاز خدا سے مدد کی درخواست سے کرتا ہے اور پھر بیان کرتا ہے کہ انگلستان نے بتدریج نارمنڈی، گاس کنی، گوی ین، اور مائن اور پوئی تیو کی کونٹیاں کھودی ہیں وہ انگریز نسل کی بہت تعریف کرتا ہے جو ٹرائے والوں کی اولاد ہیں اور وہ فرانس پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اس نے ۱۴۴۴ء کی صلح توڑ ڈالی ہے۔ جنگ کے جواز کے مسئلے سے تو بحث کی گئی ہے لیکن یہ بحث محدود تر کی گئی ہے اور صرف عیسائیوں کے خلاف جنگ سے بحث کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ یعنی "کیا یہ جائز ہے کہ عیسائی خون کے خلاف جنگ کی جائے؟"۔ اس میں جس خاص سند کا حوالہ دیا گیا ہے وہ "شجرۂ حروب" نامی کتاب ہے جو اس مولف نے کرستین ڈیپیزاں کی طرف منسوب کی ہے۔[2] کتاب کے مختلف باب

[1] ۔ انگریزی تالیف "شرافت کے متعلق کتاب" جو چوتھے ایڈورڈ کو اس کے حملۂ فرانس بابتہ ۱۴۷۵ء کے موقع پر مخاطب کرکے لکھی گئی جس کا دیباچہ جان گف نکلس نے لکھا اور روکس برگ کلب کے لیے ۱۸۶۰ء میں لندن میں چھپی۔

[2] ۔ حالانکہ وہ اونورے بونے کی ہے۔ (مترجم)

قدیم زمانے کے ہیروؤں اور انگلستان کے بادشاہوں کے کارہائے نمایاں سے مختص ہیں۔ ہر لمحہ مولف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فرانسیسیوں نے معاہدات کی ذرا بھی پابندی نہیں کی۔

اسی زمانے میں ایک فرانسیسی کتاب تالیف ہوئی جس میں ان مباحث کی تفصیل ہے جو ثالوا کے فلپ اور تیسرے ایڈورڈ میں پیش آئے تھے۔ کتاب میں یہ یاد دلایا گیا ہے کہ ملک کے تینوں طبقات کے نمایندوں نے اعلان کیا ہے کہ تخت فرانس کا حقدار فلپ ہی ہے۔

فرانسیسی تالیف ہے "جنگوں کا گلستان" اس کا مولف گیارھواں لوئی سمجھا جاتا ہے۔ مولفوں کا خیال ہے کہ اس بادشاہ کے حکم سے یہ کتاب اے ٹی ہیں یورشٹے اور اے ٹی ہین گوزینو نے تالیف کی۔ لیکن حقیقت میں اس کا مولف پی ییرشوانے ہے جو "نجومی طبیبوں" میں سے ایک تھا اور جسے گیارھواں لوئی اپنے ساتھ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔[1] یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں چھپی اور فرانسیسی تالیف "فرانس کا تاریخی گلستان" کا حصہ اول اور حصۂ سوم اسی پر مشتمل ہے۔ اسی کی چند سطروں میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب "ایک گلستان ہے جس میں متعدد خوبصورت گلاب، تعلیمی کلیاں اور بادشاہوں، حکمرانوں، شہامت بازوں، کپتانوں اور سپاہیوں کے لیے عمدہ تعلیم درج ہے جس سے وہ معلوم کر سکتے ہیں کہ انھیں ایثار کیسے رکھنا اور کیسے کرنا چاہیے حکمرانی کیسے کرنی چاہیے، فوجیں جمع کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف خشکی اور تری میں لڑنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے"۔ واقعہ یہ ہے کہ "جنگوں کا گلستان" نامی کتاب کے حصۂ اول کا یہ ایک خلاصہ ہے۔ اس کا آغاز اخلاقی

118

[1] ژاں کالمک کی فرانسیسی کتاب "کیا گیارھواں لوئی جنگوں کا گلستان نامی کتاب کا مولف تھا؟" "تاریخی تبصرہ" جلد (۲۱) صفحہ ۳۱۴۔

مشوروں سے ہوا ہے، پھر سیاسی انتظامات سے بحث ہے اور اس کے بعد ایک اچھے سپاہی کے خصائص پر نظر ڈالی گئی ہے۔ جو چیزیں "کسی حکمران کے لیے انجام دینی اور اپنے علاقے میں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں،" "کتاب گلستان" ان کے متعلق بیان کرتی ہے کہ بادشاہ کو چاہیے کہ گرجا کے پادری کی عزت کرے اور ان چیزوں کی حفاظت و حمایت کرے جو عمومی ملک ہیں۔

"جنگوں کا گلستان" نامی کتاب کے حصۂ دوم میں مختلف تاریخوں کے انتخابات ہیں۔ ان کا بڑا حصہ فرانسیسی کتاب "فرانس کی بڑی تاریخیں" اس کتاب کے کم و بیش لفظی اقتباسات پر مشتمل ہے[1]۔

فرانسیسی کتاب "جنگوں کی ناؤ" ۱۵۰۲ء میں چھپی۔ اس کا مولف رَوبیر دِ بالزاک تھا جو آں ترِیک کا جاگیردار، حاجب شاہی، مشیر شاہی اور آژنے اور گاس کُنی کے علاقوں کا افسر عدالت بھی تھا۔

۱۵۱۴ء میں فرانسیسی زبان میں "جنگ کی چالیں اور چالاکیاں" پاریس میں چھپی۔ اس کے مولف کا نام کم از کم ناشر کے بیان کے مطابق رے اِیں ینیے رَوسُو تھا۔ اس میں زیادہ تر فروں تیں اور دیگر مولفوں کے اقتباسات پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اصل میں اس کا مولف سینٹ رَوس کا ایبری ہو[2]۔

ایسی اور بھی کتابیں ہیں جن میں فن حرب سے بحث کی گئی ہے۔ ایک کتاب میں، جو بارھویں لوئی کے زمانے میں فوجی ضبط و نظم کے متعلق لکھی گئی تھی، خاص کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "سب سے پہلے

---

[1] برٹش میوزیم مخطوطات ہارلے میں سے نشان (۴۴۰۶) ـــ فرانسیسی کتاب "ایک بڑے کتب خانے سے لیے ہوئے اقتباسات کا مجموعہ" جلد ۵ صفحہ ۲۲۔

[2] مذکورۂ بالا فرانسیسی کتاب "مجموعہ" جلد (۲۷) صفحہ (۵)

اور ہر کام سے مقدم حکمران کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس کی جنگ درست اور منصفانہ ہے تاکہ خدا اور معقولیت اس کے ساتھ ہوں۔ پھر اسے خود اپنی حالت کے متعلق دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کے پاس جنگ کے لیے کافی روپیہ اور آدمی ہیں۔ پھر یہ چیز اچھی طرح سے معلوم کر لینی اور اپنے نہایت عقلمند فوجی افسروں سے خوب بحث کر کے دریافت کر لینی چاہیے کہ بالآخر اس کی مہم کا کیا انجام ہوگا۔ "اسی میں یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ "اپنے ساتھ والوں اور مددگاروں کے لیے اچھی خبریں پھیلائے اور پہنچائے۔"

ہم اوپر "خلاصہ" نامی کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں اور ان کی خصوصیات بھی بیان کر چکے ہیں۔ ایسی بکثرت کتابیں شایع ہوئیں اور تقریباً ہر ایک میں یا تو جنگ سے بحث تھی یا مال غنیمت اور اس کے حاصل کرنے کے جواز سے۔ چودھویں صدی کے آغاز میں لاطینی کتاب "آستیانی خلاصہ" تالیف ہوئی تھی۔ اس کا مولف آستی کا ایک فرانسسکانی پادری تھا۔ لاطینی کتاب "پیزانی خلاصہ" پندرھویں صدی کے آغاز میں مرتب ہوا۔ اس کا مولف پیزا کا بارتیلمی تھا۔ اسی زمانے میں انتونیائی خلاصہ فورپی یونی کے انتوان نے تالیف کیا تھا۔ اسی صدی کے اواخر میں باپتستیانی خلاصہ سالیس کے باپتست نے لکھا اور اسی کو نظر ثانی کے بعد وہ "روزے لا" یعنے چھوٹے گلاب کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کیا تاسو کے آن جیلو نے آن جیلیائی خلاصہ مرتب کیا؟ سل فستری خلاصے کا مولف پیرسے ای ریئو کا سل فستر موت سولینی ہے۔ یہ پندرھویں صدی کے اواخر کی تالیف ہے۔ ان تالیفوں میں قانون جنگ کے مختلف مسایل اٹھائے اور حل کیے گئے ہیں اور زیادہ تر عدالت کفارہ و توبہ کی

۱۱۵

سلہ۔ برٹش میوزیم کے اضافہ شدہ مخطوطات میں سے نمبر ۲۰۸۱۳۔

ضرورتیں پیش نظر تھیں۔

گابریل بیل جو استاد گابریل کے نام سے مشہور ہے، جرمنی میں اوکام کی نئی تحریک کا علمبردار تھا۔ یہ ماٹنس میں واعظ اور ٹیوبنگن میں فلسفے اور دینیات کا پروفیسر تھا۔ اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پندرھویں صدی نے جو چند نہایت ٹھوس شخصیتیں پیدا کیں، یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی لاطینی کتاب "اہم فیصلوں کے خلاصوں کا مجموعہ چار جلدوں میں" پی ییر لومبارد کے نام معنون کی جیسا کہ کتاب کا نام بتاتا ہے۔ یہ لومبارد افسر فیصلہ جات تھا۔ مولف نے جنگ کا ذکر ناجائز طور سے چھینی ہوئی چیز کی واپسی کی بحث میں کیا ہے اور اسے سب سے زیادہ اس کی کاوش رہتی ہے کہ جنگ کس کے حکم سے ہوئی۔ یہ بے رحم واقعہ اپنی جگہ موجود تھا کہ مختلف حکمران، شہنشاہ یا پوپ سے پوچھے بغیر جنگ کر لیتے تھے۔ لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس طرح کی جنگ سے گرفتاری اور گرفتاری سے چھٹکارے پر آزادی کے حقوق پیدا ہوتے ہیں یا نہیں؟ بیل کی رائے یہ تھی کہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں جنگ کے جواز کے لیے شہنشاہی اور کلیسائی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان میں سے پہلی صورت یہ تھی کہ ضرر رساں ہی اب ضرر رسانی کا ہدف بنا ہو۔ دوسرے جس شخص پر زیادتی ہوئی ہو وہ ایک مسلح ہاتھ کے حملے کا ہدف بنا ہو۔ اور تیسرے وہ مظلوم جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس سے جو چیز جبراً چھین لی گئی تھی، وہ اسے واپس لینا چاہتا ہے۔

قدیم مولفوں ہی کی نہج پر ژاں لوپیز نے جنگ کی دو قسمیں کی ہیں: ایک وہ جسے جنگ کہنا ٹھیک ہے اور دوسری وہ جسے جنگ کہنا ٹھیک نہیں۔ اس مولف کی رائے میں جس صورت کو جنگ کہنا ٹھیک ہے، صرف اسی کی صورت میں جنگ کے اثرات

مترتّب سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس نے جنگ کی تعریف لاطینی میں یوں کی ہے: "جنگ صرف ایسے حکمران کی اجازت سے ہو سکتی ہے جو اپنے اوپر کسی اور سردار کو تسلیم نہ کرتا ہو۔" لیکن یہ شرط ناکافی ہے اور مولف نے بعض اور شرطیں بھی ضروری قرار دی ہیں اور بیان کیا ہے کہ جنگ ضروری اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "جنگ ضروری ہو گئی ہو اور ہم حقیقت میں جنگ اسی لیے کرتے ہیں کہ امن چین سے زندگی گزاریں۔"[1]

ایک ولندیزی مولف نے اپنی لاطینی تالیف "درست اور جائز جنگ پر کتاب" لکھی جو بہت ترقی یافتہ اور اچھی طرح مرتب شدہ ہے۔ گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ وصلح" میں قانون جنگ پر اپنے پیشرو مولفوں میں وِل ہِل موس ماتے ای کا بھی نام لیا ہے اور اپنی لاطینی تالیف "قانون غنیمت پر یادداشت" کی تعلیقوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ گروتیوس کی کتابوں کا جن لوگوں نے ترجمہ کیا ہے وہ، اور خاص کر باربی راک، صاف طور پر بیان کرتے ہیں کہ "انھیں معلوم نہیں کہ ماتے ای کون تھا! کس قوم کا تھا۔" انھیں مترجموں میں سے ایک اور انتوان دکورتیں کے خیال میں یہ شخص ولیم ماتی سن ہے۔ باربی راک لکھتا ہے کہ "اگر یہ صحیح ہے تو یہ نام انگریزی معلوم ہوتا ہے۔" حقیقت میں گروتیوس کا ذکر کم وبیش بالکل صحیح ہے۔ وِل ہِل موس ماتیے، یا ماتیاس کا بیٹا ولیم ــ ایک لاطینی کتاب کا مولف ہے جس کا نام "درست اور جائز جنگ پر کتاب" ہے اور جو ۱۵۱۴ء میں آں ؤیر میں چھپی ہے۔[2]

120

---

[1] ۔ ژان لوپز (یعنی لوپس) کی لاطینی کتاب "جنگ اور جنگ کرنے والوں کے متعلق رسالہ" رسائل قانون عمومی جلد (۱۶) ورق صفحہ ۳۲۸۔

[2] ۔ (لاطینی میں)، درست اور جائز جنگ پر کتاب ..... انتورپ کے مطبع میں نہایت احتیاط سے

اس تالیف میں مولف نے منطقی استدلال حسن ترتیب اور عمیق معلومات کا خصوصی مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جن مولفوں کا بطور سند حوالہ دیا گیا ہے ان میں اکوئناس کا سینٹ ٹامس، سوسیر کا ہنری، بارتولے، بالدے، تو ڈیس کس کا نکولاس (جو قرون متوسطہ کے بڑے ماہرین قانون مذہبی میں سے ایک تھا) اور گابریل بیل بھی شامل ہیں۔

وِل ہِل مَس ماتیے کی رائے کے مطابق جائز جنگ کی تین شرطیں ہیں۔ پہلے جائز سبب، دوسرے جائز طریقہ اور تیسرے ناگزیر ضرورت۔ جائز سبب یا آخری سبب یا مجبور کرنے والا سبب ۔۔ گانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بارے میں مولف نے بیل کے نظریے کی پیروی کی ہے جو حقیقت میں یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ قوانین الہٰی و انسانی کا احترام کیا جائے، وطن اور اہل وطن کی مدافعت کی جائے۔ مضرتوں کا انسداد کیا جائے، اور ناجائز طور سے چھینی ہوئی چیزیں واپس حاصل کی جائیں۔

جائز ذریعے یا جائز طریقے میں یہ امر مضمر ہے کہ جنگ میں انصاف ملحوظ رکھا جائے۔

اگر صورتہائے ذیل میں سے کوئی ایک بھی پائی جائے تو سمجھا جائے گا کہ جائز طریقہ ملحوظ نہیں رکھا گیا یعنی جب وعدہ خلافی کی جائے، بے قصور پر زیادتی کی جائے، مفتوح پر زیادتی کی جائے جن کو محفوظ و مامون رکھنا ہے ان پر دست درازی کی جائے، مال غنیمت کو غصب کیا جائے، غاصبانہ طور سے کوئی ایسی حیثیت اختیار کی جائے جو حاصل نہ ہو، بدنیتی، متکبرانہ برتاؤ۔ ڈل ہِل مَس ماتیے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نکولاوس نے مریم عذرا کے زیر حمایت ولادت خداوند حضرت مسیح کے ۱۵۱۴ء میں ستمبر کے مہینے میں تحت عنایت و اجازت شائع کی۔

ان خیالات کو جس طور سے پھیلایا ہے، وہ بہت عجیب ہیں۔ سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ دشمن سے کیے ہوئے وعدے کا بھی لحاظ کیا جائے۔ چنانچہ یہ قول یہاں دہرایا گیا ہے۔ اجنبی تاجروں کا اسباب صرف اسی صورت میں ضبط کیا جا سکتا ہے جب ان تاجروں کے پیش نظر فریق ثانی یعنے دشمن کی تائید کرنی ہو، ورنہ اگر صرف کاروبار کا سیدھا سادہ ارادہ ہو تو صرف حمل و نقل کو روکنا ہی روا ہو سکتا ہے۔ دشمن کو وہ نقصان پہنچانا چاہیے جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے وہ سب سے جلد امن پر آمادہ ہو جائے۔

[اشخاص و اشیاء کو] جو حفاظتیں حاصل ہیں وہ یا تو حق قدامت کی بناء پر حاصل ہوتی ہیں، یا رسم و رواج پر مبنی ہوتی ہیں، یا قانون مذہبی پر۔ اور اس کا معیار یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ حفاظتیں عارضی صلح کے باعث حاصل ہوئی ہیں یا عمل درآمد و رواج کی بناء پر یا قانون مذہبی کے باعث۔ مال غنیمت سردار کے حوالے کر دینا چاہیے، جو اسے سب میں تقسیم کرے گا۔ مذہبی خدمات انجام دینے والے ملازمین کو لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہیے بجز اس کے کہ کسی محصور شہر کی مدافعت کرنی ہو۔ ارسطو کے قول کے مطابق جنگ کا مقصد امن حاصل کرنا ہوتا ہے سپاہی اصل میں انصاف کو نافذ کرنے والے ہوتے ہیں اور کبھی مقاتلوں یعنی لڑنے والوں کو صرف تکبر اور خود نمائی کے جذبات کے تحت نہیں لڑنا چاہیے۔

تیسری شرط ناگزیر ضرورت کا ہونا ہے۔ سینٹ آگسٹائن کا (لاطینی میں) یہ قول ہے کہ "جنگ ایک ضرورت کا نام ہے۔" جنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوستانہ دخل دہی یا عدالتی دخل دہی یا کسی برتر شخص کی دخل دہی ناممکن ہو چکی ہو۔

جان مایر نے یکے بعد دیگرے پاریس، گلاسگو، اور سینٹ آندرے میں تدریس کا کام کیا تھا۔ اس نے اپنی فرانسیسی کتاب "پی ییر لون بار کے

فیصلوں کی چوتھی کتاب پر سوالات" میں جائز جنگ کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ حکمران کے حکم سے کی گئی ہو، کسی جائز سبب پر مبنی ہو اور اچھے ارادے سے اور اعتدال کے ساتھ لڑی گئی ہو۔" صرف وہی بادشاہ جو اپنے ملک میں شہنشاہ [مکمل حاکم] ہو، وہی جنگ کا اعلان کر سکتا ہے۔[1]

ہم اوپر ضمناً پیری اے ریلو کے سل قستر موت سولینی کی لاطینی کتاب "سل قستری خلاصے" کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس میں جنگ کے متعلق چند دلچسپ صفحے ہیں۔ وہ خصوصی جنگ کا بھی الگ ذکر کرتا ہے اور اسی میں ڈوئل یعنی دو آدمیوں کے دست بدست مقابلے اور انتقام یا مواخذے کو بھی داخل کرتا ہے۔

سل قستر موت سولینی کی رائے میں بھی جائز جنگ کے لیے وہی تین شرطیں ضروری ہیں جو اکویناس کے سینٹ ٹامس نے ضروری قرار دی تھیں۔ چنانچہ اس کی رائے میں ایک تو ایسا شخص ہونا چاہیے جو جنگ کے اعلان کا مجاز ہو۔ اور وہ اس نکتے پر اصرار کرتا ہے کہ سچ پوچھو تو صرف پوپ ہی ایک ایسا شخص ہے جس کے اوپر کوئی سردار نہیں پایا جاتا۔ لیکن وہ ایک رواج کو تسلیم کر لیتا ہے کہ "واقعے کی حد تک بعض قومیں کسی اور سردار کو نہیں مانتیں۔" اسی لیے ایسی قومیں خود ہی جنگ کرنے کی مجاز ہیں۔

سولھویں صدی کے آغاز میں ایک تالیف لکھی گئی جو ۱۵۵۸ء میں چھپی۔ اس کا عنوان یہ تھا "فن جنگ کے خصوصی نکات کی تعلیم، بحری ہو کہ بری، غرض وہ سب جو لوگوں کو آذوقہ اور اسباب جنگ مہیا کرنے کے لیے ضروری ہو نیز توپ خانے کا خرچ اور اس کی

[1] جان مایر (یعنی مایور) کی لاطینی کتاب "فیصلوں کی چوتھی کتاب پر مفید ترین سوالات" عنوان نمبر ۱۵، سوال نمبر (۲)۔

بارود گولی - اور یہ کتاب اعلیٰ اور معزز حکمران، کلیف کے حضور ڈیوک فلپ نے، جو راقشتائن کے بھی سردار ہیں، تیار اور تالیف کی اور نہایت ممتاز، نہایت اعلیٰ اور نہایت طاقتور حکمران شارل کی (جو اس نام والے پانچویں شخص ہیں، رومیوں کے شہنشاہ ہیں، جرمنی اور اسپین وغیرہ کے بادشاہ ہیں) خدمت میں پیش و حاضر کی گئی - اور آں جلالتمآب نے اس پر تا حال عمل کیا ہے اور وہی اسے اپنے نہایت عزیز نوجوان بھتیجوں اور دیگر شہزادوں کو عطا فرماتے ہیں[1] - معلوم ہوتا ہے کہ لندن کے مخطوطے میں کتاب کا نام ٹھیک نہیں ہے کیونکہ متن کتاب میں مولف نے شہنشاہ کس می لیان کا اس طور سے ذکر کیا ہے کہ گویا وہ زندہ ہو - اس کے معنے یہ ہیں کہ شارل کے شہنشاہ ہونے سے پہلے یہ کتاب تالیف ہوئی - جہاں تک قانون جنگ کا تعلق ہے، کلیف کے فلپ نے اس پر اس طور سے بحث کی ہے کہ آیا جنگ کرنا ضمیر کے مطابق ہے؟ اور وہ یہ ماننے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے کہ جنگ صرف غیر مذہب والوں کے خلاف کی جانی چاہیے - اور ساتھ ہی وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ فتح کے بعد بیرحمی نہیں کرنی چاہیے -

ماہرین قانون ملک، ماہرین قانون مذہبی، اور ماہرین دینیات کے خیالات کا خلاصہ بلجیم کے ایک قابل مولف نے مرتب کیا تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یعنی فلپ ویلانت - دامودیر نے اسی مولف کے بیانات نہایت نامناسب طور سے چرائے تھے[2] - "مجرمانہ طرز عمل" نامی فرانسیسی کتاب کا مولف بیان کرتا ہے کہ جنگ کے جائز ہونے کے لیے چار شرطوں کا جمع ہونا ضروری ہے: پہلے

---

[1] - برٹش میوزیم کے مخطوطات لانس ڈون نمبر ۸۰۴ -

[2] - ڈوبوآ کی فرانسیسی تالیف "فلپ ویلانت، علوم تاریخ کا پیغامبر" مطبوعہ ۱۸۳۱ء -

ایسے لوگ جو جنگ کرنے کے قابل ہوں، دوسرے کوئی جائز سبب، تیسرے نیک نیتی اور چوتھے کسی برتر سردار کی اجازت۔

ویلانت نے خاص کر اطالوی مؤلفوں اور بالخصوص سوسے کے ہنری کے حوالے سے جنگ کی مختلف قسمیں گنائی ہیں۔ چنانچہ رومی جنگ اس کی رائے میں وہ ہوتی ہے جو کلیسا کے مفاد کے لیے کی جائے۔ قانونی جنگ وہ ہے جو باغیوں کے خلاف کی جائے۔ متکبرانہ جنگ وہ ہے جو باغی اپنے مقتدر اعلیٰ کے خلاف کریں۔ حلال جنگ وہ ہے جو شخصی مفاد کے لیے اور جائز بنا پر کی جائے۔ جسارت آمیز جنگ وہ ہے جو حق بجانب لوگوں کے خلاف کی جائے۔ خود پسندانہ جنگ بلا کسی وجہ کے اختیار کی جاتی ہے۔ اور آخر میں، ضروری جنگ وہ ہے جس کے لیے آدمی کو مجبور کر دیا گیا ہو۔

فلانڈرس کا ایک اور مؤلف ہے جو ذکر کیے جانے کے قابل ہے۔ یہ یوسے فان کلشٹ ہوفے ہے جو نیوپورٹ میں پیدا ہوا تھا اور پاریس میں نوار کالج کا پروفیسر تھا۔ یہ امن کے پرجوش حامیوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے خیالات کی سرگرمی اور قابلیت کے ساتھ تبلیغ کی۔ اگرچہ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ ایسی صورتیں پیش آہی جاتی ہیں جن میں جنگ جائز ہو مگر وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی تکرار کم ہو جائے۔ اس کی تالیفوں میں سے ایک، معنے اور اسلوب، دونوں لحاظ سے بڑی دلپذیر ہے[1]۔

اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے امن کا پرچار کیا تھا، یہ کہ امن آسمان سے آتا ہے، یہ کہ جنگ اور خاص کر عیسائیوں کے مابین ہونے والی جنگ جہنم کی پیداوار ہے۔ کلشٹ ہوفے

123

[1] یوسے فان کلشٹ ہوفے کی لاطینی تالیف "رسالۂ جنگ و امن۔ عیسائی حکمرانوں کو جنگ کے جھگڑے کی جگہ امن کا پیام" مطبوعۂ پاریس ۱۵۲۳ء۔

مسلمانوں کا خطرہ دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ جو کسی وقت عیسائی ہو گئے تھے، اب مسلمان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح وہ ترکوں کی یورپ میں حملہ آورانہ پیش قدمی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور عیسائی حکمرانوں کو قسم دیتا ہے کہ اس طاقتور دشمن کے خلاف متحد ہو جائیں۔

لوتھر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ترکوں سے لڑنا حقیقت میں خدا سے مقابلہ کرنا تھا، کیونکہ خدا ہی عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے ان سے کام لے رہا تھا۔ کلشت ہو نے اس رائے کی تردید کرتا ہے اور بعد میں ان مولفوں نے بھی، جو جنگ کے جواز کے مسئلے کی تحقیق کرنے لگے تھے، لوتھر کی اس رائے کو غلط قرار دیا تھا۔

ایک ہولناک زمانہ شروع ہوتا ہے، اور میٹھے اور رواداد نشأۃ ثانیہ کے بعد مذہبی معاملات میں عدم رواداری اور شدید سختیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلشت ہو نے اس کے متعلق ہاں یا نہ کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اور بالآخر وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ملحدوں اور افتراق پسندوں سے جنگ کی جا سکتی ہے بشرطیکہ ایسے لوگ اپنے غلط خیالات کی حمایت کے لیے ہتیار ہاتھ میں لے لیں۔

فرانسوا آریا نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جنگ کا ناگزیر ہو چکا ہونا ضروری ہے۔ یہ امن کا پرجوش حامی تھا اور جنگ کے جواز کا بہت ہی افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اس کی کوشش کرتا تھا کہ اس کو محدود اور کم کر دے۔ جنگ دو قسم کی ہوتی ہے: یا عمومی یا خصوصی۔ آخر الذکر کو جنگ کہنا ٹھیک نہیں۔ صرف پہلی قسم ہی، جو کسی اپنے سے بڑے سردار کو نہ ماننے والے حکمران کی اجازت سے کی گئی ہو، اصل میں جنگ ہے

اس نے (لاطینی میں) لکھا ہے کہ "امن اپنی خواہش پر حاصل کیا جا سکتا ہے اور جنگ اس کے برخلاف صرف ضرورت پر ہی ہونی چاہیے۔" نیز "امن کی تلاش اس لیے نہیں ہونی چاہیے کہ جنگ کی تیاری کی جائے بلکہ جنگ اس لیے کی جانی چاہیے کہ امن حاصل کیا جائے۔"[1] گویا سینٹ آگستائن کا خیال ہی پھر نئے سر سے دُہرایا جاتا ہے۔

ژِرول فیرتی نے (لاطینی میں) "جنگ کے امور اور ضبط و نظم پر زرین رسالہ" تالیف کیا تھا۔ اس نے سپاہیوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ آسمانی فوج، جائز فوج اور مسلح فوج۔ جائز جنگ اس کی رائے میں صرف وہی ہے جس کا اعلان پوپ کی طرف سے کلیسا کو نہ ماننے والوں کے خلاف، کیا جائے خواہ وہ غیر عیسائی ہوں یا عیسائی جمہوریت کے دشمن ہوں۔ اسی طرح جائز جنگ وہ بھی ہے جس کا اعلان شہنشاہ کرے جو کہ پورے عالم کے دنیوی معاملات کا آقا ہے۔ اسی طرح وہ جنگ بھی جس کا اعلان وہ بادشاہ اور حکمران کریں جو اپنے اوپر کسی سردار کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ 124

الفونسو الفارینس خےرسے ای رو کی ولادت پرتگال میں ہوئی تھی۔ نیپلز کی بادشاہت میں اس نے ملازمت اختیار کی اور وہاں کی چانسلری کا صدر اور مونوپولی کا اسقف بھی بن گیا۔ اس نے ۱۵۴۳ء میں ایک لاطینی کتاب "جائز اور ناجائز جنگ کے متعلق رسالہ" شایع کی۔ اس کی رائے میں جنگ یا تو مدافعت کے لیے ہوتی ہے یا اقدام کے لیے یا شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ پہلی صورت قانون بین الممالک اور قانون ملک اور قانون الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق کسی

---

[1] فرانسوا آریا کی لاطینی کتاب "جنگ اور اس کے جواز پر رسالہ"، رسائل قانون عمومی جلد (۶) ورق (۳۲۵) و مابعد۔

قانون سے نہیں لیکن بعض صورتوں میں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ تیسری صورت قانون الہٰی کے تحت جائز ہو سکتی ہے مثال کے طور پر اس صورت میں جب غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کی جائے۔

سولھویں صدی میں اسپین کی حیثیت بہت بلند تھی۔ وہاں آٹھ صدیوں سے جنگ جاری تھی، جس دوران میں (۳۷۰۰) مرتبہ دشمن دین [یعنی مسلمانوں] سے لڑائیاں ہوتی رہی تھیں، اور اب وہ جنگ بالآخر عیسائی بادشاہت کی مکمل فتح پہ ختم ہوئی تھی۔ قومی وحدت ایک عظیم الشان تیزی سے حاصل ہو گئی۔ سنہ ۱۴۷۸ء میں یہاں متعدد خود مختار بادشاہتیں تھیں۔ لیکن سنہ ۱۵۹۰ء سے بھی پہلے ان تمام اجزاء نے مل کر ایک کُل کی حیثیت اختیار کر لی۔ جہاں تک بیرون کا تعلق ہے، ایک ایسی توسیع ہوئی جس کی تاریخ میں کم نظیریں پائی جاتی ہیں۔ اٹلی کا شمال وجنوب، آرتوا، آنداد کونٹی، نشیبی ممالک یعنی ہالینڈ، بالیار اور کناری کے جزائر ایک طرف اور دوسری طرف افریقی ساحل پر اہم مقامات مثلاً سبوطہ، وہران ایشیا میں فلپائن اور ملاقہ۔ نئی دنیا یعنی امریکہ میں نہایت وسیع علاقے یعنی مکسیکو، وسطی امریکہ، تھنز فے لا نیا غرناطہ، پیرو، چلی، کوبا، سینٹ ڈومنگو، جمائیکا ـــ یہ سب کیتھولک بادشاہوں کے مطیع ہو گئے تھے۔

اسپینی قوم بلا خوف تردید دنیا کی سب سے زیادہ جنگجو قوم تھی۔ اسی طرح وہ ان قوموں میں سے ایک تھی جو ذہنی ترقیوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔

وزیگاتھیوں کے عہد میں وہاں ذہنی آبیاری کسی طرح معدوم نہ تھی۔ لیکن وہ اس وقت پھلا پھولا جب عرب عناصر نے سائنس سے مدد لینی اور یہودی قابلیتوں سے کام لینا شروع کیا۔

پھر تو اس سے وہ درخشاں تحریک شروع ہوئی جس کا اثر پورے مغربی یورپ میں محسوس ہونے لگا۔ ممتاز مولف رنان یہ بتانے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کرتا کہ سائنس اور اشیائے جمیل کا ذوق دسویں صدی عیسوی میں دنیا کے اس خوش قسمت کونے یعنی اندلس میں استحکام حاصل کرچکا تھا اور وہاں ایک ایسی رواداری پائی جاتی تھی جس کی نظیر خود حالیہ زمانے میں بھی مشکل سے پیش کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ میں "عیسائی یہودی، مسلمان سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی نظمیں گاتے تھے اور ایک ہی ادبی اور علمی چیزوں کے مطالعے میں شریک رہتے تھے۔ وہ تمام بندشیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، یہاں ٹوٹ گئی تھیں اور سب ہی مل کر متفقہ طور سے مشترکہ تمدن کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ قرطبہ کی مسجدیں، جہاں طلبہ کی تعداد ہزاروں سے ہوتی تھی، فلسفے اور سائنس کے مطالعے کی کارکرد مرکز بن گئی تھیں"[1]۔

قرون متوسط کی ذہنی تحریک میں سامی عنصر کا حصہ بہت قابل لحاظ ہے۔ عرب اور یہودی کچھ نئی چیزوں کے پیدا کرنے والے تو نہ تھے لیکن انھوں نے قدیم علوم کے پھیلانے میں بے انتہا حصہ لیا ہے۔ چنانچہ یہ انھیں کی عنایت سے ممکن ہوا کہ مغرب، یونانی فلسفے سے دوچار ہوا ہے۔ اور انھیں کی وجہ سے مغرب، طب میں بقراط و جالینوس کو، ریاضی میں اقلیدس کو، اور ہیئت میں بطلیموس کو جان سکا۔ انھوں نے ہی علم کلام میں منطق کی روانی کو مستحکم کیا جس کا آغاز بوئے چے کی تالیفوں کے ترجمے سے ہوا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ہی تصوف کی روانی کو

[1] رنان کی فرانسیسی تالیف "ابن رشد اور ابن رشدیت" صفحہ ۲۔

مستحکم کیا جس سے اسکاٹ ایری جنس نے روشناس کرایا تھا۔ اور جو اسکندریہ اور اثینا (ایتھنز) کی نئی فلاطونیت تک جا پہنچتا ہے[1]۔

عربوں نے اپنے وطن میں تو نیم خانہ بدوشانہ زندگی بسر کی تھی لیکن جب وہ وہاں سے نکلے تو وہ یونانی تمدن کے باقیات سے دوچار ہوئے۔

پانچویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں کلیسائے ایران نے کلیسائے روما سے پوری طرح تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اس نے ایشیا میں ایک بار اور تبلیغ شروع کردی تھی۔ یہ عیسائی جن کو ان کے مخالف نسطوری عیسائی کہتے ہیں اور جو خود اپنے آپ کو خالدیہ والے عیسائی کہتے ہیں، انھوں نے اپنے پھلتے پھولتے مدرسوں میں یونانی علم کا خزانہ محفوظ کر لیا تھا۔

دوسری طرف جب ۵۲۹ء میں اثینا کے فلاسفہ نے اپنے مدرسوں کو بند کیا جاتا دیکھا تو وہ ایران میں جا پناہ گزیں ہوئے، جہاں یہ توقع تھی کہ انھیں ایک ایسی رواداری میسر آسکے گی جو کلیسا اُن کو یورپ میں عطا کرنے سے انکار کرتا تھا۔ انھیں مایوس ہونا پڑا اور اگرچہ ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ زیادہ زرخیز زمین نہ مل سکی لیکن پھر بھی وہ پوری طرح ضایع نہیں ہو گئے۔

126 یونانی کتابوں کے ترجمے مشرق کی اکثر زبانوں میں ہو گئے عربی میں بھی، سریانی میں بھی، عبرانی میں بھی، فارسی میں بھی، خالدیائی میں بھی۔

یہودیوں نے اسکندریہ میں اتنی کچھ بڑی خدمتیں انجام دی تھیں۔ اب وہ یہ اہم کام انجام دینے لگے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے

---

[1] ڈنی کی فرانسیسی تالیف "زمانۂ قدیم میں اخلاق کے متعلق نظریات اور تصورات کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۲۱۵ ومابعد۔ شارل ژوردین کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسط سے متعلق تاریخی اور فلسفیانہ سیر" صفحہ ۷۰ ومابعد۔

مابین واسطہ نہیں۔ رَناں اس نکتے پر بہت زور دیتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے جو فریضہ انجام دیا ہے اس کا کافی اعتراف نہیں کیا گیا ہے[1]۔

جو عیسائی۔ بادشاہتیں رفتہ رفتہ نئے سر سے اسپین میں قایم ہونے لگیں، ان میں ترقی چاہے بہت بڑی نہ رہی ہو لیکن بہرحال وہ مسلسل جاری رہی۔ جو ادار[illegible] عربوں نے علوم کی ترقی کے لیے قایم کیے تھے، انھیں عام [illegible] باقی رکھا گیا۔ چنانچہ قرطبہ، اشبیلیہ، بلنسیہ اور مرسیہ کے مدرس[illegible] قایم ر[illegible] اور جلدی ہی ذہنی سرگرمی کے یہ بڑے مرکز "[illegible]" [illegible] فروغ ہونے لگ گئے۔ سالامانکا کا "مدرسۂ عمومی" تیرھویں صدی میں قایم ہو گیا۔

غرناطہ کے سقوط پر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اسپین کا مستقبل درخشاں نظر آنے لگتا ہے۔ نظریہ آنے لگا تھا کہ یہ شریف علاقہ ایک ایسی راہ پر گامزن ہے جو اُسے تباہ نہ ہوسکنے والی قوت اور عظمت تک پہنچا دے گی۔ یہ راہ کیتھولک فردینانڈ نے مقرر کی تھی۔ لیکن عظمت و شہرت کا دور مختصر ہی رہا۔ اور سو سال سے بھی کم عرصے میں ایک زوال کے جراثیم نظر آنے لگ گئے جنھوں نے سترھویں صدی عیسوی میں نہایت شدت اختیار کرلی۔

عیسائی اسپین کی علمی ترقی کا سب سے بڑا دور فردینانڈ اور ایزابیلا کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ تعلیم کی حمایت کی جاتی ہے۔ ہر طرف مدرسے قایم کیے جاتے ہیں۔ جامعات میں سرقسطہ، بلنسیہ، اشبیلیہ، القلعہ اور سَیں تڈاک (سینٹ جیمس) کی جامعات کا اضافہ ہوگیا۔ ایراس مَس نے اسپین کے اساتذہ کی یہ کہہ کر

[1] رَناں کی فرانسیسی تالیف "ابن رشد اور ابن رشدیت" صفحہ ۲۰۲۔ شارل شودویں کی فرانسیسی تالیف "قرونِ متوسط کے متعلق تاریخی و فلسفیانہ سیر" صفحہ ۱۷ و مابعد۔

صحیح صحیح قدر کی ہے کہ آزادانہ علوم کے باعث تھوڑے ہی زمانے میں ایک ایسی بار آور صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ اس سے نہ صرف خراج تحسین وصول کرنے کا موقع پیدا ہو گیا تھا، بلکہ وہ خود ان قوموں کے لیے بھی ایک نمونے کا کام دینے لگی جو نہایت روشن خیال تھیں۔

اگر صرف علم قانون بین الممالک سے ہی ہم محدود رہیں تو بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سولھویں صدی میں اسپین، مغربی یورپ کے دیگر ممالک سے کس قدر آگے نکل چکا تھا۔ اسی صورت حال بے انتہا موافق مرام تھی۔ اور فرانسوا دے وِتوریا اور ڈومی نیک سوتو اور متعدد دیگر ماہرین کی برتری کا راز اس وقت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ شاہیت نے وہاں عظیم الشان ترقی کی تھی، اور وہ یورپی معاملات میں بڑا حصہ لے رہی تھی، اور نیز ایسے اہم معاملات بہ کثرت پیش آرہے تھے جن کو حل کرنا تھا اور نئی دنیا کے مسایل نیز سفارتی جوڑ توڑ سے بھی سابقہ تھا۔

127

قانون جنگ اور قانون سفارت کے قدیم مولفوں میں سے متعدد یا تو فردیناند کے ہاں عہدہ دار تھے یا شارل کیں کے ہاں یا فلپ دوم کے ہاں۔ اور مولفوں نے بھی اپنے خیالات پھیلائے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جامعات میں بہت بڑی آزاد خیالی کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ سیاست حاضرہ کے مسایل پر وہاں بحث ہوتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ خود نظم ونسق کا کشوری ادارہ عقلمند الفونسو کے ان الفاظ سے متاثر ہو چکا تھا جو "سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون کی تمہید میں درج ہیں۔ اس مجموعے کو "مدرسۂ عمومی" کے نام معنون کرتے ہوئے اس نے وہاں کے اساتذہ پر سوائے اس کے اور کوئی فریضہ عاید نہیں کیا کہ

اپنے شاگردوں کو اپنے معلومات سے آگاہ کریں اور ان کے سامنے کتابوں کو دیانتداری کے ساتھ اور علمیت کے ساتھ پڑھیں اور انھیں جہاں تک ممکن ہو اچھی طور سے سمجھائیں۔

امرندیوں یعنے امریکہ کے اصلی باشندوں کے متعلق اسپین میں بحث مباحثے کا ایک بڑا بازار گرم رہا۔ بارتیلمی ڈلاس کازاس، ژاں ڈکو ےتے ڈو، انتوان رامی ریتیس، ژاں خینیس دے سے پلفے دا، فرانسوا دے تی توریا، ملکیور کانو، اور ڈومی نیک سوتو نے اس میں اہم حصہ لیا۔ یہ ناگزیر تھا کہ اس بحث میں قانون جنگ کے مسئلے سے بھی دوچار ہونا پڑے۔

ژاں خینیس دے سے پل تے دا، جو شارل کین کا اپنا پادری اور تاریخ نگار تھا اور شہزادہ ڈون فلپ کا موٗدب تھا، وہ امرندیوں کے حقوق سے سختی اور بے رحمی کے ساتھ انکار کرتا تھا۔ سنہ ۱۵۳۳ء میں اس نے ایک کتاب تالیف کی جو روما میں اس (لاطینی) نام سے شایع ہوئی کہ "فوجی ضبط و نظم اور عیسائی مذہب کے تطابق پر مکالمہ۔ ایک عمومیت پسند کا لکھا ہوا ــــ" اس میں ایک مکالمہ تھا جو تین اشخاص میں ہوتا ہے: ایک جرمن، ایک اسپینی، ایک یونانی۔ اور بحث یہ ہوتی ہے کہ عیسائیت میں جنگ جائز ہے یا نہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے ایک دوسری لاطینی کتاب "جائز جنگ کے اسباب کے متعلق مکالمہ، ایک عمومیت پسند کے مطابق"، لکھی لیکن اسے وہ باوجود کوششوں کے چھپوا نہ سکا کیونکہ حکومت کو خوف تھا کہ اس سے امرندیوں کے دشمنوں کو دلیلیں ہاتھ آئیں گی۔ لیکن اس کتاب کی بشمار قلمی نقلیں مروّج ہوگئیں[1]۔

اسی آخر الذکر کتاب میں ژاں خینیس دے سے پل تے دا نے امن کی بڑی تعریف کی ہے اور اسباب جنگ سے بحث کی ہے

[1] یہ کتاب سے پل تے دا کے مجموعۂ تالیفات میں ۱۷۸۰ء میں بمقام مجریط (میڈرڈ) چھپی ہے۔

لیکن وہ اس ہیبتناک نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بربریت پسندوں اور وحشیوں کو اس بات پر مجبور کیا جانا چاہیے کہ وہ ایک زیادہ انسانیت پرور اور زیادہ متمدن زندگی اختیار کریں اور بہتر اخلاق پیدا کریں۔ اور وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قوت کا استعمال جائز ہے۔ جنگ کے متعلق اس کا بیان تھا کہ جائز اور ناگزیر وجوہ کے بغیر جنگ نہیں کی جانی چاہیے۔ وہ یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ اچھے لوگ جنگ صرف اس لیے اختیار کریں کہ امن کی تلاش کی جائے۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں "محض لوگوں کی پرہیزگاری اور تقویٰ یا مذہب یا خدا ترسی سے جائز اسباب جنگ نہیں پیدا ہو جاتے بلکہ [فریق ثانی کا] جرم اور کردہ لالچ۔ اچھا حکمران نہ تو جسارت آمیز کام کر سکتا ہے اور نہ لالچ کے باعث۔ اسے تو مسالمانہ ذرائع ڈھونڈ ھنے چاہئیں اور کوئی چیز ناتجربہ کاری کے ہاتھوں نہ چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن اگر مسالمت کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو جائیں تو اسے جنگ کرنے سے نہ رکنا چاہیے۔" تراں ثیبنیس دے سے پلیئے دا اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس صورت کو جائز وجہ جنگ قرار دیا جائے گا جب جبر و قوت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو، چھینی ہوئی چیزیں واپس لینی ہوں، مفسدوں کے خلاف اپنے آپ کی حفاظت کرنی ہو، نیز کوئی اور ذریعہ نہ ہونے کی صورت میں ہتھیار کے ذریعے سے ایسے لوگوں کو مطیع کرنا مقصود ہو جو اپنی طبیعی حالت کے باعث اسی لایق ہوں کہ دوسروں کی اطاعت کریں۔

اس زمانے کے بڑے نمایندوں میں سے ایک، بلکہ شاید سب سے بڑا نمایندہ فرانسوا دے فی توریا ہے جو ۱۵۲۶ء سے ۱۵۴۶ء تک جامعۂ سالا مانکا میں دینیات کا پروفیسر تھا۔ یہ بیان کی وضاحت، اور استدلال کی صفائی کا بے نظیر استاد تھا اور ایسے

کم متکلمین ہوں گے جنھوں نے اس کی طرح، غلطیوں اور ثقیل طرز بیان سے بچتے ہیں، کامیابی حاصل کی ہو یا ان ناگزیر فوائد سے استفادہ کیا ہو جو اس طور سے حاصل ہو سکتے ہیں کہ مفکر ہی [اپنے پڑھنے والوں کو] اپنے نظریوں کے متعلق جتنے اعتراضات ہو سکتے ہیں اور ان کے جو جواب دیے جا سکتے ہیں انھیں خود ہی شمار کرائے اور واقفیت کا موقع دے۔

فرانشوا دے ڤیتوریا اپنے جو درس املا کرایا کرتا تھا، وہ اس کے مرنے کے بعد چھپ گئے۔ یہ کتاب مختلف موضوعوں پر دیے ہوئے درسوں پر مشتمل ہے: مثلاً کلیسا کا اقتدار، کشوری اقتدار، پوپ اور مجلس شورائے مذہبی کا اقتدار، امرندی یعنے امریکہ کے اصلی باشندے، امرندیوں کے خلاف جنگ کا قانون، خیرات، شراب نوشی میں اعتدال، قتل انسان، مقدس اشیاء کی تجارت، جادو، عقل سے کام لینا۔ کتاب کا جو عمومی عنوان تھا وہ مختلف طباعتوں میں کچھ کچھ بدلتا رہا ہے۔ کبھی تو اس کا نام "تیرہ درس" نظر آتا ہے تو کبھی "گیارہ درس"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلیسا کے اقتدار اور امرندیوں کے متعلقہ درس کی ذیلی تقسیم بعض کتابوں میں کی گئی ہے اور بعض کتابوں میں نہیں کی گئی ہے۔ جو درس "امرندیوں اور بربریت پسند علاقوں میں اسپینیوں کا قانون جنگ" کے متعلق ہیں وہ حقیقت میں طریقۂ بحث اور علم کے لحاظ سے شاہکار ہیں۔ ایک انگریز مولف نے ایک مرتبہ سکواریتس کی بڑی تالیفوں کا عربوں کے خوبصورت تعمیراتی کارناموں سے مقابلہ کیا ہے۔ حقیقت میں ہم یہاں ڤی توریا کے سلسلے میں بھی ایک یادگار تعمیری کارنامے سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا کام کی پختگی کی زیادہ تعریف کی جائے یا اس حسن و نزاکت کی جو اس کام میں نظر آتی ہے۔ یہ صفحے انسانیت کی محبت میں

ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب ہم انھیں پڑھتے ہیں تو ہمیں ایک حقیقی آزاد ذہنیت دکھائی دیتی ہے جس کی ہر ہر سطر وسیع اور عمیق مطالعے کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اور ہمیں یہ افسوس ہونے لگتا ہے کہ فرانسوا دے ؔفیتوریا اور اس کے ممتاز شاگردوں کا قانون بین الممالک کے علم پر اور زیادہ اثر کیوں نہیں ہوا۔

قانونِ جنگ پر اس کے درس میں چار نکات سے بحث ہوئی ہے: آیا عیسائی جنگ کر سکتے ہیں؟ جنگ کا اعلان کرنے یا جنگ لڑنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ جنگ کے جائز وجوہ کیا کیا ہیں؟ دشمن کے ساتھ کیا کرنا جائز ہے؟ پہلے سوال کا جواب اثبات میں دیا گیا ہے۔ دوسرے سوال کا جو جواب دیا گیا ہے، اسے ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں۔ تیسرے سوال پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور یہ ممتاز ڈومینیکی پادری یہ رائے دیتا ہے کہ مذہب کا اختلاف یا سلطنت کی توسیع کی خواہش یا شہرت حاصل کرنے کا ارادہ ہرگز جنگ کے جائز وجوہ نہیں ہو سکتے۔ جنگ کی صرف ایک ہی جائز وجہ ہو سکتی ہے اور وہ کسی ضرر کا پہنچنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سینٹ آگسٹائن کی بھی یہی رائے تھی۔ اکوینا س کے سینٹ ٹامس نے بھی یہی رائے دی تھی کہ "ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا، جنھوں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو، ہرگز جائز نہیں، کیوں کہ قانونِ قدرت کسی بے گناہ کے قتل سے روکتا ہے۔ لیکن ہر قسم کی مضرت رسیدگی سے جنگ درست نہیں ہو جاتی۔ جنگ سے نازک اور بیرحمانہ نتائج پیدا ہو جاتے ہیں اسی لیے جنگ اس صورت میں نہیں کی جا سکتی جب صرف معمولی قسم کی مضرت پہنچی ہو۔ مضرت کی مقدار کے تناسب ہی سے سزا دی جا سکتی ہے۔"

فرانسوا دے فی توریا کے شاگرد ڈومینیک سوتو نے اپنے استاد

کے ترقی دیے ہوئے قاعدوں کی کوئی تردید نہیں کی۔

بیبیبر ٹی نے اپنے لاطینی رسالے "متعلق بہ امور فوج و جنگ" میں جنگ کی بنیاد، جنگ کے وجوہ، دشمن سے ہمارے اسباب کی بازیابی، قیدیوں، صلح، جنگ سے پیدا ہونے والی بعض صورتوں سپاہیوں، فوجی مضرتوں، اجازت نامۂ سفر، امن، اور یرغمالوں سے بحث کی ہے۔ اس کا ذہن بہت ہی سلجھا ہوا اور باقاعدگی پسند تھا۔ اور اس نے اپنے زمانے میں جو نظریے پائے جاتے تھے اور ان پر جس حد تک عمل ہوتا تھا، ان کا نہایت صحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ خود نفس جنگ کے متعلق اس نے وہی تقسیم نقل کر دی ہے جو سوسے کے ہیزی اور بالدے کے حواشی میں دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "تمام اچھے لوگوں کی رائے ہے کہ کسی نازک وجہ کے بغیر جنگیں نہیں کی جانی چاہئیں اور یہ کہ نازک وجوہ ہی کو جائز اور ضروری وجوہ تصور کیا جا سکتا ہے۔"

130

شاید ایک اور مولف کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے جو انتونیو دے برناردی ہے۔ یہ کاسرتہ کا بشپ تھا اور جنتیلیس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ" میں متعدد موقعوں پر اس کا حوالہ دیا ہے اور اسے وہ لاطینی میں "ہمارا علامہ کا سرتانس" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ اس مولف نے ایک لاطینی کتاب "مبارزت کا خاتمہ" تالیف کی جس میں وہ خاص کر اس امر سے بحث کرتا ہے کہ آیا جنگ کے جواز سے مبارزت (ڈوئل) کے جواز کا قیاس کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کی رائے میں اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ جنگ ہی کی طرح مبارزت بھی اسی صورت میں جائز ہو سکتی ہے جب کہ حق کو تسلیم کروانے کا کوئی اور ذریعہ نہ رہا ہو[1]۔

---

[1] گوی دے نوسی ناتو کا فرانسیسی مضمون "انتوان برناردی، کاسرتہ کا بشپ"

لائیقا کے ژاک دے کو ارو قیاس نے جو ہگوتیا کا بشپ تھا، جنگ کے جائز وجوہ میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا ہے: وطن کی مدافعت، مضرت کا انتقام، باغیوں کی سزادہی، چھینے ہوئے سامان کی بازیابی، بے ضرر آمد و رفت کی اجازت سے انکار۔[1] آیالا اور جنتی لیس بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

اول الذکر نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے کہ آیا جنگ کبھی جائز بھی ہو سکتی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس مسئلے میں اختلاف رائے رہا ہے، لیکن بے وجہ۔ عقلمند شخص جنگ کے ضروری ہونے پر افسوس ہی کرے گا اور وہ بہر صورت عمومی مفاد ہی کے لیے جنگ کرے گا۔ آیالا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے مفتوحوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس طرح غلام بنانا نہ صرف قوم کے لیے مفید ہے، بلکہ خود ان لوگوں کے لیے بھی جنہیں یہ سزا دی جائے اور جو مزید ضرر رسانی سے روک دیے جائیں۔

وجوہ جنگ کے سلسلے میں آیالا، مملکت، اور اس کی رعایا، اور ان کی جائداد، اور ان کے حلیفوں کی مدافعت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح کسی مضرت کے انتقام اور دشمن کے چھینے ہوئے سامان کی بازیابی کو بھی۔ لیکن وہ یہ بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے زیادہ جائز جنگ صرف وہی ہے جو حکمران اپنی باغی رعایا کے خلاف کرے۔ اس کے زمانے کے جو حالات تھے وہ اس کے نظریے کی اس خصوصیت کا اصلی باعث ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۱۶) میں چھپا دیکھو صفحہ ۵۹۹۔

[1] لائیقا کے ژاک دے کو اروتیاس کے لاطینی "مجموعۂ تالیفات" میں اس قاعدے کی تشریح کہ "جرم [یا گناہ] کے چھے قانونی قواعد" ۹۔

آیالا، اسپین کا باشندہ تھا اور شاہ پسند جماعت ہی سے اس کا خاندان اور اس کا مفاد پوری طرح وابستہ تھے۔ یہ الگزانڈر فارنیس کا شخصی دوست تھا۔ سرگرم کیتھولک تھا اور خاص کر علاقۂ آرمینج کے حکمران اور اس کے ساتھیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ روشن خیال بلجیموں کی نظروں میں یہی لوگ مذہبی اور سیاسی آزادی کی مقدس تحریک کے نمایندے تھے۔ اور تاریخ نے بھی اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ لیکن دوسرے فلپ کی فوج کے صدر محاسب کی نظروں میں یہ لوگ باغی تھے۔ چنانچہ جب آخرالذکر شخص نے ان پر حملہ کیا اور قوانین جنگ کے سلسلے میں ان کے لیے کسی بھی قسم کے حق ہونے کی مخالفت کی، تو وہ اسی بناء پر تھا۔ بغاوت ایک سخت اور نازک قسم کی مضرت ہے جو خدا کے خلاف عمل میں لائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر قسم کا اقتدار خدا ہی کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ سینٹ پاول کا قول ہے اس لیے جو مضرت حکمران کو پہنچائی جائے وہ گویا خدا کے خلاف ہوتی ہے۔ باغی کبھی دشمن کے مماثل نہیں ہو سکتا۔ جو بھی باغی سے مقابلہ کرتا ہے وہ جنگ سے کہیں زیادہ عام اختیار سماعت کے حق کو کام میں لاتا ہے۔ باغیوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ حقوق جنگ، گرفتاری، اور بازیابی اسباب کا مطالبہ کر سکیں، جس طرح کہ بحری اور بری ڈاکوؤں کو ان حقوق کے مطالبے کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن باغیوں کے خلاف لڑنے والوں کو یہ حقوق ضرور حاصل رہتے ہیں[۱]۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ کسی شخص کو اُلبین کی بات پہ اعتراض کا حق نہیں کہ خانہ جنگیوں کے

131

[۱] ۔ آیالا کی لاطینی تالیف "حقوق و واجبات جنگ اور فوجی ضبط و نظم" کتاب اول باب دوم فقرہ ۳۔

سلسلے میں فریقین کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں خیال کیا جا سکتا۔ ہسپینی قوانین میں جو احکام ہیں، ان کا اس سلسلے میں استفادہ نہیں کیا جا سکتا کہ خانہ جنگی میں جو مال چھینا جائے اس کا سوگنا واپس دینا پڑے گا کیونکہ اس صورت میں صرف یہی ایک بات صادق نہیں آتی کہ جس وقت شہنشاہیت کا جاہ و جلال خطرے میں ہو اور سلطنت کی تباہی کی سازش ہوئی ہو تو اس زمانے میں جھگڑے کیے جا رہے ہوں۔ رعایا کی نافرمانی یعنی بغاوت ایک نہایت نازک جرم ہے اور اسے الحاد کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔" ان تمہیدوں کا شایان شان نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ "ظالم کو قتل کرنا جائز ہے جب کہ اس نے اقتدار کسی جابرانہ اور ناجائز طریقے سے حاصل کر لیا ہو بشرطیکہ اس ظلم کا انسداد کسی اور طور سے نہ ہو سکتا ہو"۔

اس آخر الذکر جملے کے باعث آیالا کو اس قدیم نظریے کے حامیوں میں شامل کیا جاتا ہے، جو "ظلم کُش" کے نام سے مشہور ہیں؎ لیکن یہ غلطی ہے۔ خود اس نے اپنے خیال کی توضیح کر دی ہے۔ وہ اس مذہبی حکم کا حوالہ دیتا ہے جس کے مطابق شہر کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے ۱۴۱۵ء میں گرسن کی کوشش سے اس مشہور نظریے کو غلط قرار دیا تھا جس کا کوردلی فرقے کا ایک فرانسکالی پادری (ژان پتی) حامی تھا۔ آیالا نے (لاطینی میں) یہ بھی لکھا ہے کہ "کوئی جائز حکمران، چاہے وہ بے رحم اور ظالم ہی کیوں نہ ہو، غاصب نہیں کہلا سکتا"، رعایا پر ہر طرح کی حکمرانی اور ہر طرح کا اختیار فرمانروا کو حاصل

؎ لیکی کی انگریزی تالیف "یورپ میں معقولیت پسندی کے عروج و اثرات کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۱۶۳۔

ہوتا ہے۔ اسی لیے رعایا اپنے فرمانروا کے متعلق حکم لگانے کی مجاز نہیں۔ بے شبہہ پوپ کسی فرمانروا کو اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ انصاف کرے کیونکہ پوپ، زمین پر، خدا کی جگہ ہوتا ہے اور اسے دنیاوی و روحانی دوہری تلوار حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر عیسائیت کے مفاد کا تقاضا ہو تو پوپ بادشاہوں کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ اور اگر اسی قسم کا اختیار رعایا کو عطا کیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے کیا ہے، تو وہ مہمل اور غیر منصفانہ بات ہوگی، اور اس سے مملکت تہ و بالا ہو جائے گی۔

حقیقت میں آیالا ان سیاسی خیال آرائیوں کی مخالفت کرتا ہے جو کالوی نیت اور خاص کر فرانسسی احتجاجیت (پروٹسٹنٹ تحریک) سینٹ بارتیلمی کے زمانے سے اختیار کرنے لگی تھیں۔ اور آیالا نے اوت مان کی تالیف "فرانکو گالیا" کی تنقید کی ہے اور شاہ کشی کو بہت برا فعل بتایا ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس کا مقصد اصل میں یہ ہے کہ بغاوت کو کچلنے کا جواز زیادہ زور کے ساتھ نمایاں ہو جائے کیونکہ آیالا نے جس ظلم کا ذکر کیا ہے اس سے اس کی مراد باغیوں کے سردار سے ہوتی ہے۔ وہ جو نظریے پیش کرتا ہے، ان سے علمی غرض و غایت وابستہ ہوتی ہے۔ ایک فرانسسی رسالہ "جنگ کے حقوق اور واجبات اور فوجی ضبط و نظم" ایک پڑاؤ میں جو تورنے کے سامنے ڈالا گیا تھا، ۳۱ر اکتوبر ۱۵۸۱ء کو لکھا گیا تھا۔ ۱۵ر جون ۱۵۸۰ء کو الگزانڈر فارنیس نے وہ ظالمانہ حکمنامہ شایع کیا تھا جس کی رو سے آرینج کے حکمران کے سر کے لیے قیمت لگادی گئی تھی۔ ۲۶ر جولائی ۱۵۸۱ء کو ملک کے تینوں طبقات کی مجلس نمایندگان نے باضابطہ طور سے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے خراب حکمران سے اقتدارات شاہانہ چھین لیے گئے ہیں۔

جب اس کے خلاف فیصلہ صادر ہو گیا اور اسے باغی قرار دید یا گیا تو اس خاموش حکمران کو ان اصول کے شکنجے میں پھنسنا پڑا جو آیالا نے مرتب کیے تھے۔ اور اس طرح آیالا نے مفت میں یہ شریفیہ انجام دیا کہ ایک بدترین جرم کی تائید کا پیشگی ہی انتظام کر دے چنانچہ اس نے قانون کے متعلق ایک کتاب میں بالتازار ڈیرار کے اس نفرت انگیز فعل کی بڑی ستایش کی ہے۔

البیری کُس جنتی لیس کی مشہور (لاطینی) کتاب "قانون جنگ" اور اس کی دیگر تالیفیں حقیقت میں قانون بین الممالک کی تاریخ میں ایک اہم حصہ رکھتی ہیں اور اگر عام طور پر گروٹیوس کے مقابلے میں وسعت نظری میں جنتی لیس کا درجہ گھٹا ہوا ہے تو ایک اور نقطۂ نظر سے جنتی لیس کا درجہ بڑھا ہوا بھی ہے۔ چنانچہ وہ سیاسی دائرے میں پیدا ہونے والے واقعات کی احتیاط سے تحقیق کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ایک اور تالیف میں[1] اسکلوپس کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ جنتی لیس کی تالیف اصل میں سولھویں صدی عیسوی کے واقعات کی قانونی تشریح ہے۔ یہ قول ٹھیک ہے اور جیسا کہ اسکلوپس نے بیان کیا ہے جنتی لیس کی کتاب میں وہ تمام بڑے بڑے اختلافات جو شارل کیں اور فرانسوا اول میں یا نشیبستان (یعنی ہالینڈ) اور اسپین میں یا آلی اور اس پر ظلم کرنے والوں میں پیش آئے تھے، ان سب کی قانون عمومی کے نقطۂ نظر سے جانچ کی گئی ہے۔[2]

جنتی لیس کی کتاب "قانون جنگ" کے حصۂ اول یعنی

133

---

[1] نیس کی فرانسیسی تالیف "قانون جنگ اور گروتیوس کے پیشرو" صفحہ ۱۸۵۔

[2] پروفیسر ٹامس ارسکن ہالینڈ نے جنتی لیس کے متعلق انگریزی میں جو "افتتاحیہ لکچر" دیا تھا، اس کا ہمارے لیے خاص طور پر ذکر کرنا ضروری ہے۔ نیز جنتی لیس کی

تقریباً چوتھائی کتاب میں وجوہ جنگ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ وجوہ تین اقسام پر مشتمل ہیں یعنی وجوہ ربانی، وجوہ فطری اور وجوہ انسانی۔ جہاں تک ربانی وجوہ کا تعلق ہے، جنتی لیس کے خیالات کا ان کے متعلق ہم آیندہ ذکر کریں گے۔

جہاں تک وجوہ فطری کا تعلق ہے جنتی لیس کی رائے میں ایسی کوئی جنگیں نہیں پائی جاتیں جن کے متعلق فطرت کا تقاضا ہو، سوائے اس کے کہ ایسی جنگ کے شروع کرنے میں آدمی فطرت کی گویا پیروی کرتا ہے اور اس کو اپنا رہنما بناتا ہے۔ اور بعض ایسی صورتیں پیش آتی ہیں جب جنگ اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ فریق مخالف ایک ایسی چیز کے استعمال سے روکتا اور جھگڑتا ہے جو فطری طور سے حاصل ہوتی ہے۔ وجوہ فطری میں اولاً "ضروری مدافعت" اور "مفید مدافعت" نیز "دیانتدارانہ مدافعت" شامل ہیں۔ اس طور سے جنگ یا تو ضرورت کے لیے کی جاتی ہے یا فائدے کے لیے یا نیک نیتی اور دیانتداری سے۔ جہاں تک ضرورت کے تحت جنگ کرنے کا تعلق ہے، اس کا منشا واضح ہے۔ مفید مدافعت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب کسی کو اس کا ڈر ہو کہ خود اسی پر حملہ کر دیا جائے گا۔ دیانتدارانہ مدافعت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب دوسروں کی خاطر جنگ کی جائے اور دوسروں کی حمایت و حفاظت پیش نظر ہو۔ وجوہ فطری کی دوسری قسم میں وہ صورتیں داخل ہوتی ہیں جب جنگ ایک ایسی چیز کے لیے کی جائے جو فطرت نے تو عطا کی ہو اور انسان اس میں آڑے آتے ہوں۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "جب جنگ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ لاطینی کتاب "قانون جنگ" کے اس عمدہ اڈیشن کا بھی جو آکسفورڈ کے اس پروفیسر نے شایع کیا تھا۔

اس لیے پیش آئے کہ فطرت نے تو عطا کیا تھا اور انسانوں نے لینے دینے سے انکار کیا ہو۔" اس سلسلے میں جنتی لیس نے بے ضرر گزر سکنے، بحری سفر کر سکنے اور تجارتی کاروبار کر سکنے کا ذکر کیا ہے۔
وجوہ انسانی اس وقت پیش آتے ہیں جب قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ جنتی لیس کہتا ہے کہ ایسی صورتیں بہت سی ہیں۔
جنتی لیس کے بعد سے ہمارے اس علم نے انگلستان میں ترقی کرنی شروع کی۔ بہت سی کتابیں شایع ہونے لگیں۔ اور اس کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ جو کتابیں صرف قانون جنگ سے متعلق تھیں ان کے علاوہ ایسے رسالے بھی شایع ہونے لگے جو قانون سفارت اور بین الممالک بحری قانون سے متعلق تھے۔
تین کتابیں جو قانون جنگ کے متعلق تھیں، یکے بعد دیگرے ۱۵۸۹ء، ۱۵۹۱ء اور ۱۵۹۳ء میں شایع ہوئیں۔ ان میں سے پہلی دو تو ترجمہ تھیں، اور آخری ایک ذاتی تالیف تھی۔ بے شبہہ اس زمانے میں انگریزی قوم میں جو جذبات سرایت کیے ہوئے تھے وہ ان تالیفوں میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان تالیفوں کا [لاطینی کی جگہ] عوام الناس کی زبان میں لکھا جانا بھی اس کو ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن ان تالیفوں کے وجود میں آنے کی ایک اور مساوی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ جنتی لیس نے ان کے لیے راستہ کھول دیا تھا۔
لحاظ تاریخ، ان تالیفوں میں سے جو سب سے مقدم ہے اس کا انگریزی نام "جنگوں کی ہدایتیں" ہے۔ یہ جس فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے اس کا نام "جنگ کرنے کے متعلق ہدایتیں" تھا۔ یہ سب سے پہلے ۱۵۴۸ء میں شایع ہوئی اور اسے اس کے اصل مولف یعنی پاتیا کے ریموں بیکاری نے جو فرک فو کا باشندہ تھا، مشہور جنگجو اور سیاست داں گیئوم دو بیلے کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس کا ترجمہ ایک انگریز معزز شخص پال آئفٹ نے کیا تھا۔ دیباچے میں مولف نے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ جنگ جائز ہے۔ لیکن اس پر چند پابندیاں عاید کی ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ ان عیسائی قوموں کو جوش و خروش سے ملامت کرتا ہے جنھوں نے اپنے ان مشرقی بھائیوں کو کوئی مدد نہ دی جن پر ترکوں نے حملہ کر دیا تھا۔ مولف غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کو سب سے زیادہ جائز اور منصفانہ قرار دیتا ہے اور وہ عیسائیوں کے خلاف جنگ کو اس بنا پر مردود قرار دیتا ہے کہ اس سے دشمن دین کو خوش ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ ایسی جنگ کو غداری قرار دیتا ہے۔ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کے جائز ہونے کے لیے ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسی جنگ اس لیے ناگزیر ہو گئی ہو کہ مسلمانوں کے حملے کا خطرہ دور کرنا مقصود ہو۔ ایسی جنگ محض مذہب کے پرچار کے مقصد سے کرنی جائز نہیں۔ ایک اور جنگ بھی درست ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ وطن کو بچانے کے لیے جنگ کی جائے۔ اس مولف نے بیان کیا ہے کہ بہر حال وجوہ جنگ کی ہر صورت میں لڑائیاں اس طور سے لڑی جانی چاہییں کہ جہاں تک ہو سکے ان سے تباہی اور خونریزی کم سے کم عمل میں آئے۔

برنارڈ لوک کی فرانسیسی تالیف کا ایک اور ترجمہ جو جان ایلیٹ نے کیا تھا، سنہ ۱۵۹۰ء میں شایع ہوا۔ اس کا انگریزی نام "قانون اور مبارزت یا دست بدست جنگ پر مقالہ" ہے۔ مانوی مذہب اور ڈوناتی مذہب کے مطابق کسی شخص کا محض اس کے عقائد کی بنا پر پیچھا نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان خیالات پر اس کتاب میں تنقید کی گئی ہے اور مولف کی رائے میں حکمران اپنی ملحد رعایا کو سزا دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ

جنگ بھی کرسکتا ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ نازک وجوہ تحریک پیدا ہو گئے ہوں۔ امن کو برقرار رکھنا اصلی مقصد رہے۔ اور بہرصورت اس کی اجازت نہیں کہ دوسروں کا مال چھیننے کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں۔

سٹ کلف کی کتاب جس کا ہم پہلے بھی ذکر کرچکے ہیں، اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ۱۵۹۳ء میں لندن میں چھپی اور اس میں (۳۴۲) صفحے ہیں۔ اس کا پورا انگریزی نام یہ تھے "ہتھیاروں کا چلانا اور استعمال کرنا اور ہتھیاروں کے قوانین جو نہایت بہادر اور ماہر کپتانوں کے طرز عمل سے ماخوذ ہیں اور جن کی قدیم اور جدید ہردو قسم کی مثالوں اور نظریوں سے توثیق ہوتی ہے۔" اس کتاب میں (۲۱) باب ہیں۔

ماتھیو سٹ کلف ایک ممتاز ماہر دینیات اور مناظرہ باز تھا، جس کا ثبوت ہمیں اس کے ان جھگڑوں سے ملتا ہے جو بلارمین اور پارسنس اور گارنٹ سے پیش آئے تھے۔ یہ قانون روما کا بھی ماہر تھا۔ اس کا نام "ڈاکٹرس کامنس" کی کالج کے اساتذہ کی فہرست میں بھی نظر آتا ہے اور وہ اس کالج کے مدرسین میں بھی شامل تھا جو جیمس اول نے قایم کیا تھا[1] اس کی تالیف

[1] جیمس اول نے چیلسی میں ایک کالج قایم کیا تھا جہاں مباحثوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ماہرین دینیات کو یہاں تعلیم پانی پڑتی تھی اور رومن کیتھولک خیالات کے ماہرین دینیات سے جو جھگڑے تھے ان کا مطالعہ کرنا اور ان کا جواب لکھنا پڑتا تھا۔ اس کالج کے قایم کرنے کی ایک بڑی وجہ فلر نے یہ بیان کی ہے کہ جس طرح حضرت سلیمانؑ نے اپنے لوگوں کو کسی ایسے کام میں لگانا پسند نہیں کیا جس کا تعلق عمارات کے بنانے سے ہو اور اس کی وجہ مستند طور سے یہ بیان کیجاتی ہے کہ یہ لوگ حضرت سلیمانؑ کے اہل جنگ تھے [اور سپاہی کا کام معماری نہیں]۔

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا عالم شخص تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- اسی طرح رومن کیتھولک کلیسا اپنے ماننے والوں پر ہرگز یہ بوجھ نہیں لادتا کہ وعظ کریں یا کسی گرجا کے حدود عمل کی فکروں میں مبتلا ہوں بلکہ وہ ان کو صرف مباحثہ بازی کی تعلیم میں لگائے رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں ایک ہی شخص پر یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ سبق بھی پڑھائے، وعظ بھی کرے، عقائد بھی سکھائے، مناظرے بھی کرے مذہبی مراسم تقدیس بھی انجام دے، وغیرہ۔ طلبائے دینیات کے علاوہ چلسی کے کالج میں کم سے کم دو اچھے مورخ بھی ہوتے تھے تاکہ آیندہ نسلوں کے لیے مملکت اور کلیسا ہر دو کے یادگار ترین واقعات کی روایت پہنچا سکیں۔

یہاں کے صدر اور دیگر اساتذہ کی نامزدگی بادشاہ نے ۸ رمئی ۱۶۱۰ء کو کی۔ اور ماتھیو سٹ کلف جو اکزیٹر کا ڈیکن یعنی بڑا پادری تھا، اس کالج کا صدر بنایا گیا۔ ولیم کاڈمن یہاں کے مورخوں میں سے ایک تھا۔ ۱۶۱۱ء میں بادشاہ نے ڈومینیس کے مارک انتوان کو جو سابق میں اسپالاترو کا آرک بشپ اور ونڈسر کا ڈیکن تھا، یہاں کا استاد مقرر کیا۔

یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بادشاہ نے کمزور تائید کی یا بشپوں اور یونیورسٹیوں میں جھگڑے ہوگئے یا اساتذہ کی نااہلی ــــ صرف سٹ کلف ہی لایق تھا۔ یا پارلیمان کے بعض ارکان کا اختلاف جنھیں ڈر ہونے لگا کہ کہیں یہ کالج دربارشاہی اور وہاں کی دینیات کا ضرورت سے زیادہ گرویدہ نہ ہو جائے، اور یہاں کی لکھی ہوئی تاریخ کہیں ضرورت سے زیادہ بادشاہ کے موافق نہ لکھ لی جائے۔

یاد رہے کہ آٹھویں ہنری نے "اِنس آف کورٹ" کے نمونے پر ایک مدرسہ قایم کرنا چاہا تھا جہاں قانون اور صاف و صحیح لاطینی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم دی جا سکے۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ اجنبی ممالک میں بھیجنے کے لیے جو ملازم درکار تھے ان کو یہاں تیار کیا جائے ایک یا دو طلبہ سفیروں کے ساتھ

سٹ کلف جنگ کے جائز ہونے کے مسئلے پر بحث کرنے میں اپنے کو اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ جو لوگ اس کے جواز سے انکار کرتے تھے وہ سٹ کلف کی رائے میں مذہب و سیاست کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ لیکن سٹ کلف جنگ کے وجوہ کے متعلق بڑی خوشی سے تفصیلی بحث کرتا ہے۔ اس نے جو وجوہ گنائے ہیں وہ کافی طویل ہیں۔ وجوہ جنگ میں اس نے حسب ذیل چیزوں کو بھی داخل کیا ہے: ملک کی مدافعت، سچے مذہب کی حمایت، جائداد کی حفاظت، لٹیروں اور بحری ڈاکوؤں کے حملے کا مقابلہ، ناجائز طور سے چھینی ہوئی جائداد پر حق جتانا، ہموطنوں کے خلاف عمل میں لائے ہوئے افعال ناجائز، سفیروں کے حقوق کی خلاف ورزی، حلیفوں کی حفاظت، معاہدہ شکنی، ہمارے دشمن کو مدد دی جانی، نیز ایک اور وجہ جو چند ہی روز سے ظاہر ہوئی تھی یعنی (یورپ کی سلطنتوں کی قوت میں) توازن برقرار رکھنا۔

جہاں تک جائز جنگ کا تعلق ہے سٹ کلف بھی مروجہ نظریہ قبول کر لیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جنگ وہی لوگ شروع کریں جن کو اس کا اختیار حاصل ہو۔ یہ کہ اولاً چھینی ہوئی چیز کی واپسی یا تلافی کا مطالبہ کر لیا گیا ہو اور یہ کہ وحشت و بربریت کام میں نہ لائی جائے۔

جنگ کرنے میں بے رحمی نہیں برتنی چاہیے۔ اور یہ مولف

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: بھیجے جا سکیں۔ وہ طلبا اس بیرونی ملک کی تاریخ یا حالات لکھ سکیں۔ اور واقعات سے باخبر رکھ سکیں۔ نیز بر اعظم یورپ میں اگر کوئی جنگ چھڑے تو ایسے لوگوں کو بھیجنا ہوتا جو رپورٹ کر سکیں۔

یاد دلاتا ہے کہ اسپینی قانون جنگ کے مطابق عورتیں، بچے اور بوڑھے شہروں کی لوٹ کے وقت سپاہی کی تندی سے محفوظ سمجھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سٹ کلف نے چوتھے ہنری کی تعریف کی ہے کیوں کہ اس نے پارلیس سے غریبوں اور بیماروں کو باہر نکل جانے کی اجازت دے دی تھی جب کہ اس کی فوجوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا تھا۔

اس کتاب میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے، جو اُن تصورات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے جن کی ہم تحلیل کر رہے ہیں۔ اور وہ (انگریزی میں) یہ ہے: "وہی جنگیں منصفانہ اور جائز ہیں جو نہ صرف مقتدر اعلیٰ حکمران کی طرف سے کی جائیں بلکہ جائز اور منصفانہ وجوہ کے لیے ہوں۔ اسی طرح مطابق قاعدہ ان کا معینہ صورتوں میں اعلان ہوا ہو اور اعتدال کے ساتھ وہ جنگیں لڑی گئی ہوں اور ان کا منشا یہ ہو کہ انصاف عمل میں لایا جائے اور امن حاصل کیا جائے"۔ غرض مقتدر اعلیٰ کا حکم ہو، جائز وجوہ ہوں، قانون کے مطابق اعلان ہوا ہو، اس کے عمل میں لائے جانے میں اعتدال برتا گیا ہو اور مقصد اعلیٰ امن ہو، یہ وہ شرطیں ہیں جو کسی جنگ کو جائز بنانے کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔

اس تالیف کے دوران میں مولف، مال غنیمت اور قیدیوں کے متعلق تفصیلات میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسپینی قواعد کا ذکر کرتا ہے۔ وہ سپہ سالار کے صفات پر بحث کرتا ہے اور چند ایسے عملی تجاویز پیش کرتا ہے جن کا منشا یہ ہے کہ زنگر ولٹوں کو بھرتی کرنے میں ہم قوموں کو ترجیح دی جانی چاہیے اور سپاہیوں کی تنخواہ باقاعدگی سے دی جانی چاہیے۔ کتاب کے آخر میں وہ فوجی ہدایت ناموں کا

ایک نمونہ دیتا ہے جو بری اور بحری دونوں فوجوں کے لیے حالت امن اور حالت جنگ میں رہنمائی کر سکے۔

تقریباً اسی زمانے میں مشہور سر والٹر رالے نے ایک کافی الجھا ہوا مقالہ مرتب کیا جس میں اس نے خاص کر جنگ سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا نام کافی لمبا ہے اور اس سے کتاب کے موضوع کی وسعت کافی طور سے معلوم ہوسکتی ہے اور وہ (انگریزی) نام یہ ہے: "کسی قدرتی، رواجی، رضاکارانہ، اور ضروری جنگ کی بنیاد اور اساسی وجوہ پر ایک مقالہ۔ کلیسائی افسر ہمیشہ دنیوی حکمرانوں کے ماتحت رہے ہیں اور یہ کہ پوپ کو انگلستان کے کشوری یا کلیسائی معاملات میں کبھی بھی جائز اقتدار اس وقت سے حاصل نہیں رہا جب سے کہ رومی سلطنت سے برطانیہ کو فتح کے ذریعے سے چھین لیا گیا۔"[له] یہ مقالہ لندن میں سر والٹر رالے کے مجموعۂ تالیفات میں ۱۷۵۱ء میں چھپا اور جہاں تک نظریات کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص دلچسپ چیز نہیں ملتی۔

ولیم فل بک، لندن کا ایک وکیل تھا۔ اس نے ۱۶۰۲ء میں (۱۸۰) بڑی تقطیع کے صفحوں کا ایک رسالہ شایع کیا جس کا (انگریزی) نام یہ تھا: "قانون اقوام کا مجموعہ، جس میں قانونی مسائل و نکات و معاملات پر مختلف مقالے ہیں جن کے متعلق دنیا کی قوموں میں اتفاق و رضامندی پائی جاتی ہے اور جن سے بادشاہت، انگلستان کے قانون ملک، اور قانون غیر موضوعہ کے بنیادی مقاصد، مسائل، قواعد اور نظائر کے سمجھنے اور بوجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔" اس تالیف میں تیرہ باب ہیں:

187

له برٹش میوزیم کے مخطوطات ہارلے جلد (۴۲۷۶)

دو میں کسی قدر دلچسپی کا سامان ہے۔ ساتویں باب میں قانون جنگ سے بحث ہے۔ اور اس کا عنوان ہے: "ہتیاروں کے قانون اور ان کے منصفانہ ہونے، نیز حلیفوں، سفارتوں، اعلان جنگ، صلح، اجازت نامہ ہائے سفر، قیدیوں، یرغمالوں، جنگی چالوں اور قانون قدرت کے مطابق فتوحات کا ذکر"۔ فُل بک نے خاص کر جنتی لیس اور آیالا کو سند میں پیش کیا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ جنگ کا باضابطہ طور سے اعلان کیا جانا چاہیے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ قیدیوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ فاتحین کو بہت سے مبالغہ آمیز حقوق حاصل ہونا تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطابق ان حقوق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ شہروں کو تباہ بھی کر دیں۔

سولھویں صدی کے اواخر میں ژاں ژو بیر (؟ جان رابرٹ) نے جو دورا کے شاہی محاصرے میں لفٹنٹ جنرل تھا، ایک فرانسیسی کتاب لکھی جس کا نام "قانون جنگ کی چار کتابیں" تھا۔[1] وہ اطالوی ماہرین قانون سے شروع کرتا ہے اور "ان لوگوں کے خیالات کی، جو یہ کہتے ہیں کہ جنگ خدا ہی کے حکم سے کی جاتی ہے" اور "ان لوگوں کے خیالات کی، جو کہتے ہیں کہ جنگ شیطان کے حکم سے شروع کی جاتی ہے"، ان دونوں خیالات کی تحقیق و تنقیح کرتا ہے" اور ان دونوں خیالات میں تطابق

[1] فرانسیسی تالیف "قانون جنگ پر چار کتابیں" مولفہ استاد ژاں روبیر، جو محافظ فوج کا لفٹنٹ جنرل تھا۔ ان میں سے چوتھی کتاب میں مختصر طور سے ان تعزیزی قواعد کا ذکر ہے جو فوجی قواعد و ضوابط کے باعث فوجوں کے متعلق بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور معمولی عدالتوں میں بھی۔ پارس کے قومی کتب خانے کے مخطوطات فرانسیسی ۱۲۸۴ء۔

پائے جانے" کے نتیجے پر پہنچتا ہے۔

پیئیر دِو فورؤسین ژوری کا حوالہ گروتیوس بھی دیتا ہے۔ اس نے ایک لاطینی کتاب لکھی تھی جس کا نام "چھ مہینے" تھا۔ یہ کتاب ہمارے مبحث کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ گروتیوس نے ایک اور مولف کا بھی حوالہ دیا ہے جو قرطاجنہ کا تھا یہ اس نے خاص کر پوپوں کے دعووں کی حمایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرلیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ پوپوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے غیر مذہب والوں کے ہتیاروں سے مدد لیں۔

جرمنی میں سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں کونارد براؤن نے اپنی لاطینی کتاب "متعلق بہ بغاوت" میں جنگ کا بھی کچھ ذکر کیا تھا۔ پھر ۱۵۹۱ء میں ہائین رِش بوت سہر نے ایک لاطینی کتاب شایع کی جس کا نام یہ تھا: "قانون مخاصمت پر رسالہ، جس میں جنگ اور ڈوئل یعنی دست بدست لڑائی کے طریقے بیان ہوئے ہیں"۔ اور جرمنی ہی میں کرست یبن تال نے سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا نام "قانون جنگ" تھا۔ یہ رسالہ جو اصل میں ان مباحثات میں سے ایک ہے جن کا مجموعہ "سیاسی دروس" کے نام سے موسوم ہے۔ لی بن تال نے ان (اسباب) کی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ہے جو جنگ کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی رائے میں یہ سبب دوگونہ ہوتا ہے: کبھی تو عام وجہ یعنی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی خاص وجہ ہوتی ہے یعنی شخصی مدافعت، حلیف کی حفاظت، چھینی ہوئی چیزوں کی واپسی اور معاہدہ شکنی۔ شی پیو جنتی لیس نے بھی جو البیریکوس جنتی لیس کا بھائی تھا، قانون جنگ کے متعلق ایک لاطینی رسالہ لکھا تھا

جس کا نام "رومی قوم کے قانون عمومی کے مطابق مشہور مباحثات کی کتاب" تھا۔ اس کے ایک باب کا عنوان "قانون جنگ" ہے۔ اس معاملے میں وہ (۱۰۵) منقولوں میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ اس کی رائے میں مدافعت سب سے زیادہ منصفانہ وجہ جنگ ہوتی ہے۔ اور یہ مدافعت یا تو ضروری ہوتی ہے یا مفید یا دیانتدارانہ۔ مدافعت اسی وقت مفید سمجھی جائے گی جب اس کا ڈر ہو کہ دشمن دست درازی کرے گا۔ دیانتدارانہ مدافعت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اس سماج کے ارکان کی مدد کو دوڑیں جس کے ہم بھی ایک فرد ہوتے ہیں، اور اسی سماج کو جو ہم سب کو ملا کر ایک کرتا ہے مدد دیں۔ شی ہیو جینتی لیس ان خصوصی محرکات جنگ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جن کا بعض جنگجو بہانہ کیا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ مضرتیں یا جرم جو بہت پرانے ہوں یا آباد اجداد کے زمانے میں ایسی زمینوں پر قبضہ ہوا ہو جن کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ یہ مولف اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شہنشاہتوں کو بھی حق قدامت حاصل ہوتا ہے۔

فرانسوا سوارینس ان سب سے زیادہ قابل ذکر لوگوں میں سے ہے جو سولھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ اور بلاخوف تردید لکھا جا سکتا ہے کہ وہ سب سے ممتاز یسوعی (جیسوئٹ) پادری تھا۔ اس نے جن لاطینی تالیفوں میں ہمارے موضوع سے بحث کی وہ یہ ہیں: ایک تو "قوانین اور خدائے مقنن کے متعلق رسالہ"۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۶۱۲ء میں کوئمبرا میں شایع ہوا۔ اور دوسرے "تین دینیاتی خوبیوں پر کتاب جو تین رسالوں میں منقسم ہے"۔ سوارینس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہاں ایک ترتیب اور ایک وضاحت پائی جاتی ہے، جن کی

واقعی داد دینی پڑتی ہے۔ اسے مفتی یا ماہر قانون کہنا تو ٹھیک نہ ہوگا لیکن کسی فلسفی کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے وہ اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اسے ہمارے علم کے بانیوں کی صف اول میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ گروشیوس میں قابل تعریف یہ چیز تھی کہ اس کے ہر ہر صفحے میں انسانیت کی محبت بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ سوارینش کی تحریروں میں عیسائی رحم و عفو جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔

سوارینش نے مانوی مذہب اور وائیکلف کے ان خیالات کی تردید کی ہے کہ جنگ بذات خود کوئی برائی نہیں اور یہ کہ جنگ کے لیے رحم و عفو کے خلاف ہی ہونا ضروری نہیں۔ لیکن سوارینش کا مطالبہ ہے کہ کسی دیانتدارانہ جنگ کے لیے متعدد شرطیں بیک وقت پائی جائیں۔ اور یہ شرطیں سہ گانہ نوعیت کی ہیں یعنی ایک جائز اقتدار پایا جائے جو جنگ کرسکے؛ اور کوئی منصفانہ وجہ، اور حق موجود ہو؛ نیز اعتدال ملحوظ رہے۔

139

پہلے نکتے کے متعلق ایک امر قابل لحاظ ہے۔ سوارینش بیان کرتا ہے کہ اگرچہ پوپ کو اس کی اپنی ریاستوں کے باہر دنیاوی معاملات میں کوئی راست اقتدار بالکل حاصل نہیں ہوتا، لیکن اسے ایک بالواسطہ اقتدار ضرور حاصل ہوتا ہے، جس کے ذریعے سے وہ مسائل جنگ کو اپنے سامنے طلب کرسکتا اور جھگڑوں کو چکا سکتا ہے۔ اب فریقین کو چاہیے کہ پوپ کے فیصلے کو تسلیم کریں، بجز اس کے کہ وہ علانیہ غیر منصفانہ ہو۔ سوتو نے پہلے ہی بیان کردیا تھا کہ اس طور سے عیسائیوں کے مابین ہونے والی جنگوں سے کم ہی جائز ہوسکیں گی۔ کیونکہ ان جھگڑوں کی مسالمانہ طور سے یکسوئی ممکن

ہوتی ہے۔ صرف ایک نکتہ ہے جس پر سوارییس زور دیتا ہے کہ اگر پوپ اپنے اقتدار کو نافذ کرنے سے اس ڈر کے باعث باز رہے کہ کہیں اس سے زیادہ بڑی برائیاں نہ پیدا ہو جائیں، تو حکمرانوں کو اس کا اختیار ہو گا کہ اپنے حقوق کے جتانے کے لیے ضروری کارروائی اختیار کریں۔

سوارییس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ایک جائز حقیقت بھی پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ "قدرتی معقولیت" کے مطابق جائز حقیقت کسے کہیں؟ اس کا جواب بھی اس نے دیدیا ہے۔ کوئی جنگ جائز نہیں ہو سکتی جب تک اس کی "وجہ" جائز اور ضروری نہ ہو۔ اس طرح کی جائز اور کافی وجہ میں ہر وہ نازک قسم کی مضرت شامل ہوتی ہے جس کا بدلہ یا جس کی تلافی سوائے جنگ کے کسی اور طور پر نہیں ہو سکتی۔ مضرتوں کی تین قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ پہلے یہ کہ کسی حکمران نے دوسروں کا مال چھین لیا ہو اور واپس نہ کرنا چاہتا ہو؛ دوسرے یہ کہ وہ کسی معقول وجہ تحریک کے بغیر اقوام کے اجتماعی حق سے انکار کرے، جس میں بے ضرر گذرنے کا حق اور کاروبار تجارت کا حق شامل ہیں؛ تیسرے یہ کہ کوئی حکمران اپنے مخالف کی آن کو نقصان پہنچائے۔ یہ مضرتیں، کسی حکمران کو بھی پہنچ سکتی ہیں، اور اس کی رعایا کو بھی۔ ان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ حکمران اپنی مملکت اور اپنی رعایا کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ مضرتیں چاہے ان لوگوں کو پہنچی ہوں جن کی حکمران حفاظت کرتا ہے، یا ان کو جو اس کے دوست ہوں۔ ان میں فرق نہیں کیا سکتا۔ ہر دو صورتوں کا اثر ایک ہی ہے۔

140

غیر مذہب والوں اور ملحدوں کے خلاف جنگ

اس سلسلے میں بعض اہم مسائل پیدا ہوئے تھے، یعنی غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ اور بد عقیدہ ملحدوں کے خلاف جنگ۔

قرون متوسطہ میں اگرچہ کلیسا عیسائیوں کے حق میں امن و سلامتی کا پیام رکھتا تھا، لیکن ان تمام لوگوں کے لیے جو اس کے دین کو قبول نہ کریں یا اس سے ناواقف رہیں تو کلیسا ان کے خلاف کھلم کھلا مخاصمت برتتا تھا۔ یہودیوں پر یہ الزام تھا کہ وہ خدا کشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ بے رحمانہ ظلم وستم کے ہدف بنے۔ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی بپتسمہ لے چکا ہو، اس پر اسے پوری طرح اختیار سماعت حاصل ہے۔

انتراق پسند اور ملحد اسی سے متاثر ہوئے[1]۔ چونکہ غیر مذہب والوں یعنی مسلمانوں نے ان مقاموں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں دنیا کی نجات کا خونین ناٹک کھیلا جا چکا تھا [یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق سولی پر چڑھائے جانے کے عیسائی عقائد کی طرف اشارہ ہے ـــ مترجم]، اسی لیے ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنا روا بن گیا۔

مسلمانوں کے متعلق عیسائیوں کے جو کچھ جذبات تھے، ان کا ذکر بعض تالیفوں اور بعض باضابطہ اعلانوں میں ملتا ہے[2]۔ [کلونی کا مشہور پادری اور مسیحیت میں اصلاح پسند جو ۱۱۵۶ء میں فوت ہوا تھا یعنی] پیئیر "قابل احترام" عربوں کے خلاف ایک کتاب تالیف کرتا ہے جس میں لکھتا ہے کہ اسے الفاظ نہیں ملتے جن میں وہ پیغمبر اسلام کی ......[3] کو اجاگر کر سکے۔ اور وہ یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ شیطان کے سوا کوئی اور ایسی خونی مشورت نہیں دے سکتا تھا۔

اس طرح مسلمانوں کے خلاف جنگ فرض ہو جاتی ہے۔

141

---

[1] ترینتے میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نے اس ادعا کی توثیق کی تھی اور طے کیا تھا کہ (لاطینی میں): "اگر کسی کو باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر کلیسائی طریقے سے اور ارادے کے ساتھ بپتسمہ دیا گیا ہو اور اس کے متعلق کوئی ملحدانہ طور سے یہ بیان کرے کہ وہ صحیح بپتسمہ نہیں ہے، تو وہ ملعون اور جماعت باہر ہوگا۔" (حصہ ۷ فصل ۴ "بپتسمہ")۔ پوپ نوین پائیس نے ۷ اگست ۱۸۷۳ء کو شہنشاہ جرمنی کے نام جو مشہور خط لکھا تھا، اس سے سب واقف ہیں۔ اس میں کیتھلک کلیسا کے صدر یعنی پوپ نے ادعا کیا تھا کہ "جو کوئی بپتسمہ لے چکا ہو، وہ پوپ کا ہونا سمجھا جائے گا۔"

[2] لوران کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد ۱، "جاگیرداری اور کلیسا" ص ۲۴۷

[3] یہاں "بہیمانہ بے رحمی" کے الفاظ تھے ـــ مترجم۔

اور مسالمانہ تبلیغ پر، جو غیر موثر ثابت ہوئی تھی، مسلح تبلیغ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کلیسا کے لیے صلیبی جنگوں کا مقصد غیر مذہب والوں کو عیسائیت کا حلقہ بگوش بنانا تھا۔ اس الجھن کو یوں سلجھایا گیا کہ عیسائی یا تو خود مرجائیں گے یا غیر مذہب والوں کو عیسائی بنائیں گے۔ کلیسیاؤں کی مجلس شورائے مذہبی میں یہ اعلان کیا گیا کہ بیت المقدس کو آزاد کرانے کی مہم میں حصہ لینا ہر قسم کے گناہوں کا مکمل کفارہ ہے۔ صلیبی جنگ میں شریک ہونے والے سپاہیوں کو پوپ نے ان کے تمام گناہوں سے معافی عطا کردی اور ابدی برکت کا وعدہ کیا۔ ربوال داتزیل نے جو خواب دیکھا تھا اس کی روایت ہم تک پہنچی ہے، جو یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے آکر اپنے ایمان والے شہامت بازوں کو یہ کہا تھا کہ جو بہادر جنگجو آپ کی راہ میں موت سے دوچار ہوں گے انھیں خدا کے داہنے ہاتھ پر جگہ ملے گی۔ ایک ڈومینیکی جنگ پرست پادری نے جو رضاکاروں کا سپہ سالار تھا، پوپ دسویں گریگری کے حکم سے ایک لاطینی تالیف بنام "تین حصوں والی کتاب" لکھی جس میں مقدس جنگوں یعنی حروب صلیبیہ کی تائید کے دلایل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ وہ کسی مذہب کے قائم کرنے کے طریقے اور ہوتے ہیں، اور اس کو برقرار رکھنے کے طریقے اور۔ طاقتور ہاتھوں میں ہتیار جو کام انجام دے سکتے ہیں، کمزور ہاتھوں میں مطلق نہیں دے سکتے۔ عیسائیت کا قیام تو کرامتوں اور شہیدوں کے خون سے عمل میں آیا لیکن اب جب کہ اسے دشمن سے بچانے کا سوال ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ تلوار کام میں لائی جائے۔ نوزائیدہ کلیسا کمزور تھا۔ اسی لیے اسے

۵۳۔ داشری کی لاطینی کتاب "منتخبات" جلد (۲) ص ۲۱۵۔

اس پر مجبور ہونا پڑا کہ جبر و ستم گوارا کرتا رہے۔ لیکن جب خدا نے اسے زور عطا کر دیا ہے تو اس سے فایدہ کیوں نہ اٹھایا جائے؟ اب ہمارے پاس کرامتیں باقی نہیں ہیں، لیکن ہمارے پاس طاقت موجود ہے۔ اس لیے اب ہمیں وہی ہتیار استعمال کرنے چاہئیں، جو ہمارے پاس موجود ہیں۔" عربوں کے خلاف قاتلانہ جنگ کی اجازت کے لیے حضرت موسیٰ کا حکم سند میں پیش کیا گیا کہ "جو کوئی موسیٰ کے قانون پر حملہ کرے گا وہ خدا کے نزدیک موت کا مستوجب ہے۔ جو لوگ "خدا کے بیٹے" کو قدموں میں روندیں وہ بدرجۂ اولیٰ موت کے مستحق ہیں۔"

یہ چیز نظر انداز نہ کی جائے کہ بہت دنوں تک بحر متوسط کے ساحلوں کی عیسائی آبادی کے لیے عرب ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔ اور جب چودھویں صدی کے آغاز میں اپنی نوبت پر ترک میدان میں آئے تو یہ یقین کیا جانے لگا کہ عیسائیت کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس زمانے کے مصنفوں کے ہاں جو درشت تعلیم نظر آتی ہے، اس کا ایک سبب یہی تھا۔ اور ان کی اس درشتی اور شدت کو کلیسا نے گھٹایا نہیں بلکہ بڑھا ہی دیا۔ مزید برآں ہم جانتے ہیں کہ عیسائیت اور اسلام کے تماس نے عیسائیت پر ایک غیر صحت بخش اثر ڈالا۔ عیسائیوں میں احساس مذہبی نے اندھے تعصب کی حیثیت اختیار کر لی جو خود مسلمانوں کے تعصب ہی کی توضیح سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ ہم نہ بھلائیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ [صلی اللہ علیہ وسلم] نے ابتدا میں تو امن و سلامتی کی تعلیم دی لیکن جلد ہی یہ اعلان کر دیا کہ دین کے دشمنوں پر حملہ کرنا اور ان سے لڑنا جائز ہے۔ اور قرآن مجید میں بربریت پسندانہ احکام ملتے ہیں چنانچہ "خدا کو اس کے دین کی راہ میں

بہائے ہوئے خون کے ادنیٰ قطرے سے زیادہ کوئی اور چیز عزیز نہیں[1] نیز "جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہوں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ وہ زندہ ہیں"۔ ایک ناگزیر تحریک کے باعث عیسائیت بھی ویسی ہی بے رحم ہوگئی جیسا اسلام[2]۔

عربوں سے عیسائیوں کو جو نفرت تھی، وہ تقریباً ہر ایک مورخ اور ہر ایک شاعر کے ہاں ہویدا ہے[3]۔ شہر صور کے گیوم (ولیم) نے صلیبی جنگوں کی تاریخ لکھی ہے، جس میں وہ عربوں کو ابلیس کی اولاد بتاتا ہے۔ روبیئر راہب انھیں شیطانوں کی ٹولی اور ایک ناپاک قوم اور شریر کتوں کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ فلپ موس کیس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ عربوں کے بادشاہ نے شارلیمان سے پوچھا تھا کہ اس نے کیوں اسپین کی سرزمین مسلمانوں سے چھین لی، جس پر نہ تو اسے اور نہ اس کے آباو اجداد کو کوئی ادنیٰ حق پہنچتا ہے؟ شارلیمان نے جواب دیا کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی تمام دیگر لوگوں سے بہتر ہیں اور انھیں حضرت مسیح کی وجہ سے پوری دنیا کی سرداری حاصل ہے"۔ صور کے گیوم نے بیان کیا ہے کہ "عیسائی اور عربوں میں نفرت کا پایا جانا مطابق فطرت ہے۔ کیا عیسائیوں کو ان لوگوں سے نفرت نہیں کرنی چاہیے جو ان کے آقا یعنی حضرت عیسیٰ سے نفرت کریں[4]؟ بیت المقدس کے بطریرک

---

[1] ایسی کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے — مترجم

[2] مولف نے اسلام کے متعلق اس رائے زنی کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا ہے — مترجم

[3] لوراں کی فرانسیسی کتاب "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۷) "جاگیرداری اور کلیسا" ص ۲۶۶۔

[4] مسلمان حضرت عیسیٰ کو خدا کا ایک سچا اور برگزیدہ نبی سمجھتے ہیں اور ان کی

یعنی پادری اعظم نے بیان کیا تھا کہ: "کسی غیر مذہب والے سے کسی کیے ہوئے عہد کا پورا کرنا، اس سے زیادہ بڑا گناہ ہے جتنا اس عہد کو توڑنا۔"

قرون متوسطہ میں عیسائیوں کے عربوں اور بت پرستوں کے متعلق جو احساسات تھے، ان کا ایک صاف اور واضح مظاہرہ اس امر میں ہوتا ہے کہ راہبوں کے فوجی سلسلے قائم ہوئے جن میں شہامت بازی اور رہبانیت دونوں کا اجتماع عمل میں آگیا تھا؛ اور جن کے لیے اعمال صالحہ میں سب سے بلند مرتبہ یہ کام تھا کہ دین کے دشمنوں سے جنگ کریں۔ ٹمپلر سلسلے کے راہب اور بیت المقدس کے سینٹ جان کے ہاسپٹالر سلسلے کے راہب بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں نمودار ہو گئے۔ پوپوں نے ان کو بڑے بڑے امتیاز عطا کیے، تو بادشاہوں نے ان کو بڑے بڑے مقبوضات دے ڈالے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹمپلر سلسلے کے قواعد سینٹ برنار نے بنائے تھے۔ یہ قواعد سینٹ برنار نے ہرگز نہیں بنائے تھے، لیکن پھر بھی ان قواعد کی دستاویز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی رو سے اس سلسلے کے جنگجو راہبوں پر یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے بے وطن ہونا اور غیر مذہب والوں کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ کرتے رہنا قبول کریں۔ انھیں لڑنے سے انکار کرنے کا کبھی کوئی حق نہ ہوگا حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب انھیں تگنے دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہو۔ انھیں اس کی بھی ممانعت تھی کہ کبھی دشمن سے امن اور پناہ طلب کریں اور اپنے فدیے کے لیے انھیں بالشت بھر دیوار یا بالشت بھر علاقہ تک دینے کی اجازت

143

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ خود اپنے پیغمبر کے برابر عزت کرتے ہیں — مترجم۔

نہ ہوگی۔ ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ "خوش قسمتی اور اطمینان کے ساتھ کوچ کرو، اور مسیح کی صلیب کے سخت ترین دشمنوں کو نکال باہر کرو؛ اور اس کا پورا یقین رکھو کہ چاہے زندہ رہو یا مر جاؤ تم خدا کی اس محبت سے جو اسے حضرت عیسیٰ کے متعلق تھی، باہر نہیں رہو گے؛ اور ہر خطرے کے وقت تم یہ جملہ دہرایا کرو کہ زندہ ہوں کہ مردہ، ہم اپنے آقا کے ہیں۔ خوش قسمت ہیں بہادر اور خوش نصیب ہیں شہید!"

جن راہبانہ فوجی جماعتوں کا ہم نے ابھی ذکر کیا، ان کے علاوہ اور بھی متعدد، نسبتاً کم اہم، فوجی سلسلے اسپین اور پرتگال میں اس غرض کے لیے پیدا ہو گئے کہ عربوں سے مقدس جنگ کریں۔ مشرقی یورپ میں ایک اور ٹولی پیدا ہو گئی۔ یہ بھی اتنی ہی مضبوط تھی۔ یعنی ٹیوٹانی سلسلہ۔

ٹمپلر اور سینٹ جان کے سلسلوں کی طرح ٹیوٹانی سلسلہ بھی صلیبی جنگوں کے باعث پیدا ہوا۔ بیت المقدس کے کلیسائے نوتردام کے یہ جرمن راہب ابتدا میں تو رضاکارانہ خدمت خلق کے کاموں کی خواہش رکھتے تھے لیکن پھر یہ مسیحی زائروں کی حفاظت کے لیے شہامت بازوں کا ایک جتھا بن گئے۔ اس میں داخلے کے وقت ان کا اقرار یہ ہوتا تھا کہ وہ فقیری اور عفت اور اطاعت ملحوظ رکھا کریں گے۔ ۱۲۲۶ء میں جب پروشیا (شمالی جرمنی) کے بت پرست حملہ آوروں نے جرمن آبادیوں پر ہلہ بول دیا، تو اسی سلسلے کے راہبوں کو مدد کے لیے بلایا گیا۔ شہنشاہ دوسرے فریڈرک نے ان کو اجازت دی کہ پروشیا میں گھس جائیں اور جو کچھ جرمن سردار انھیں پیش کریں، یا بعد میں انھیں جو بھی چیز حاصل ہو، وہ اس کو مالکانہ طور سے قبول کر سکتے ہیں۔ پوپ نے بھی ان کو اسی طرح کا ایک حق عطا کیا، البتہ یہ قرار دیا گیا کہ

جس جس علاقے میں وہ پیش قدمی کریں گے وہ سینٹ پیٹر یعنی پوپ کا سمجھا جائے گا۔ پروشیا والوں نے اطاعت کر لی اور پھر ٹیوٹانی راہبوں نے دوسری قوموں کے خلاف اپنے کو جنگ میں الجھا لیا۔ اور اگر ان راہبوں نے اپنے تاریخی فرض کے انجام دینے میں جبر و بے رحمی استعمال کی تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے تہذیب و تمدن کی بھی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں۔

جنگ کے جائز ہونے کا مسئلہ بہت شروع ہی میں ماہرین قانون میں چھڑ گیا تھا اور عرصے تک وہ معرکتہ الآرا چیز بنا رہا۔ عربوں کے خطرے کے زمانے کی طرح یہ مسئلہ دوبارہ پندرھویں صدی کے آغاز میں پیش ہوا جب کہ مشرقی یورپ کے بت پرست قبائل کی لڑائیاں چھڑیں اور نئے سر سے اس سوال پر ان ممالک کے باشندوں کے متعلق غور ہونے لگا جو نئے دریافت ہوئے تھے [یعنی امریکہ] اور یہ دریافت بھی اسی صدی میں پرتگالیوں اور اسپینیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ ہم اس پر کسی قدر غور کریں۔ 144

اس کے متعلق دو رائیں پیش ہوئی تھیں۔ ایک کی نمائندگی سینی بالدے دے فیسکے کرتا تھا۔ یہ "احکامیہ" فرقے کا ایک ممتاز پادری تھا [جو یہ رائے رکھتا تھا کہ پوپ کو اپنے فرامین کے ذریعے سے جھگڑے چکانے کا حق حاصل ہے] اور بعد میں اس نے چوتھے انوسنٹ کے نام سے کلاہ پاپائی زیب سر کی تھی۔ دوسری رائے کی نمائندگی سوسے کا ہنری کرتا ہے۔ یہ بھی قرون متوسط کے قانون مذہبی کے درخشاں و تاباں ماہروں میں سے ایک تھا۔

یہ اختلاف بہت دنوں تک جاری رہا۔ اور کوئی ایسا ماہر قانون مذہبی نہیں بچ رہا جس نے اس بحث میں حصہ نہ لیا ہو۔ قانون روما کے ممتاز ماہروں نے بھی اس بارے میں اپنی قیاس آرائیاں کیں۔ لیکن مؤرخ کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ جو رائے کم خیر اندیشی پر مبنی تھی، اسی کی طرف کثیر غلبۂ آرا ہوا۔

سینی بالدے دے فیسکے نے ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "احکام پاپائی کی پانچ کتابوں کا اشاریہ" تھا۔ اس میں اس نے غیر مذہب والوں کے متعلق ایک ہمدردانہ رائے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ عربوں کے خلاف جنگ اگر صرف اس لیے کی جائے کہ انھیں عیسائی بنائیں تو یہ درست نہ ہوگی۔ لیکن جنگ اس وقت جائز ہوگی جب عرب ان علاقوں پر قبضہ کریں جو عیسائیوں کے تھے، یا وہ عیسائیوں پر حملہ کریں، یا جب معاملہ فلسطین کی ارض مقدس کے متعلق ہو۔ اس آخری صورت میں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ جو مضرت حضرت مسیح کو پہنچائی جائے وہ جملہ عیسائیوں کو پہنچتی ہے۔ اس مؤلف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ چونکہ غیر مذہب والوں کو بھی [اپنے علاقے میں] اختیار ساعت اور حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، اس لیے ان کا علاقہ اور ان کی جائداد بھی اگر عیسائی چھین لیں تو نا انصافی ہوگی۔[1]

یہ رائے جو مقابلۃً نرمی پر مبنی تھی، سخت ترین مخالفت سے دوچار ہوئی۔ سوسے کے ہنری نے اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ کیا اور غیر مذہب والوں کے متعلق اس بات سے

---

[1] پوپ چوتھے انوسنٹ کی لاطینی تالیف "احکام پاپائی کی پانچ کتابوں کا اشاریہ" تیسری جلد جو بپتسمہ اور اس کے اثرات کے متعلق ہے۔

انکار کیا کہ انھیں بادشاہت کرنے یا حکمرانی کرنے یا اختیار سماعت رکھنے کا قطعاً کوئی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ رائے تھی کہ حضرت مسیح کی آمد کے باعث غیر عیسائیوں کے لیے اقتدار اعلیٰ کا ہر حق ختم ہوگیا۔ البتہ اس نے ایک فرق تسلیم کیا۔

سوسے کا ہنری یہ سوال کرتا ہے کہ عیسائیوں کو عربوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ وہ ایک فرق قائم کرتا ہے۔ چنانچہ ان عربوں پر حملہ نہیں کیا جا سکتا جو عیسائی بادشاہ کی اطاعت قبول کریں — (یہاں یہ نہ بھلایا جائے کہ صقلیہ اور جنوبی اٹلی کے ساتھ ساتھ جنوبی فرانس میں بھی بہت سے عرب رہتے تھے)— لیکن ایسے عربوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے جو نہ تو عیسائی کلیسا کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ عیسائی بادشاہت کی۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "ایسے دوسرے لوگ جو کلیسائے روما کا اقتدار بھی تسلیم نہیں کرتے اور شہنشاہ روما کا اقتدار بھی نہیں قبول کرتے، ان سے جنگ کی جا سکتی ہے"[1] غیر مذہب والوں کے خلاف جو جنگ کی جاتی اسے وہ "رومی جنگ" کا نام دیتا ہے۔ اور اسے جائز بتاتا ہے۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ میں "جو جنگ مذہب والوں اور غیر مذہب والوں میں ہو، اسے رومی جنگ کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس کو رومی اس لیے کہتے ہیں کہ روما ہمارے مذہب والوں کا سردار اور مادر وطن ہے"[2]

اولدرادو دے پونتے نے "مشورے" کے نام سے ایک لاطینی کتاب تالیف کی تھی اس میں وہ سوسے کے ہنری کی رائے

---

[1] سوسے کے ہنری (ہوستی نن سس) کی لاطینی کتاب "زرین خلاصہ" کتاب پنجم باب "عرب"

[2] سوسے کے ہنری (ہوستی نن سس) کی مذکورۂ بالا تالیف کتاب اول باب "صلح اور امن"

کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن وہ بظاہر اس رائے کی طرف جھکتا نظر آتا ہے کہ ان عربوں کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی جو پر امن زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ارض مقدس یعنی فلسطین کے متعلق ایک استثنائی صورت پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے "ہم کو جبراً نکال باہر کیا گیا تھا"۔ مزید برآں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وہ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے کہ آیا عیسائیوں کو اس کی اجازت ہے کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ حلیفی پیدا کریں؟[1]

ژاں داندریا پوری وضاحت و صراحت سے بیان کرتا ہے کہ جو غیر مذہب والے پر امن طور سے رہتے ہیں اور وہ جو ہمارے غلام ہیں ان کو زبردستی کرکے عیسائیت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نہ تو جنگ کرکے اور نہ ہی کوئی زبردستی کرکے بلکہ صرف وعظ و نصیحت کرکے یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غیر مذہب والے اپنے پاس مبلغین کو آنے نہ دیں، تو پوپ انھیں سزا دے سکتا ہے۔

[قانون روما؟ بائبل؟ کے] حواشی کے مطابق بارتولے نے تسلیم کیا ہے کہ انسانیت دو حصوں پر منقسم ہے: ایک تو رومی قوم، دوسرے اجنبی اقوام۔ رومی قوم میں وہ ان تمام حکمرانوں اور حکومتوں کو شامل کرتا ہے، جو راست یا بالواسطہ اور واقعے کی حد تک یا قانونی حد تک شہنشاہت کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوں۔ اجنبی اقوام سے اس کی مراد وہ لوگ ہیں جو شہنشاہ کو دنیا کا آقا نہیں ماننا چاہتے۔ بارتولے نے ان اجنبی اقوام کی تفصیل دی ہے۔ چنانچہ یونانی، تاتاری، یہودی

---

[1] اولدرادے دے پونتے کی لاطینی کتاب "مشورے" نمبر ۱۷۲

اور دیگر لوگ۔ لیکن عیسائیوں کے بالمقابل ان سب کی یکساں حیثیت نہیں ہے۔ بعض حلیف ہیں، بعض امن کی زندگی گزارتے ہیں اور بعض بالکلیہ اجنبی ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے جنگ جاری ہے چنانچہ یہ عرب اور ترک ہیں[1]۔

146 اقوام کی یہ تفصیل اور یہ بیان تقریباً لفظ بلفظ لِنّانو کے ژاں نے لاطینی کتاب "متعلق بہ جنگ" میں دہرا دیا ہے۔ اس آخرالذکر مولف نے یہ ثابت کیا ہے کہ کلیسا کو اس بات کا حق ہوتا ہے کہ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کرے، ان کے علاقے پر ہلہ بول دے اور ان عیسائیوں کو مراعات عطا کرے جو مقدس جھنڈے کے نیچے لڑنے کے لیے اپنا نام لکھواتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں "دنیا کا صرف ایک ہی آقا ہے جو پوپ ہے۔ اور اسے غیر مذہب والوں پر بھی، واقعے کی حد تک چاہے نہ ہو قانونی استحقاق کی حد تک، ضرور اختیار سماعت حاصل ہوتا ہے"۔ لِنّانو کے ژاں نے اس کلیے سے ایک قاعدہ استنباط کیا ہے جو خود سوسے کے ہنری کی رائے بھی تھی یعنی وہ غیر مذہب والا جو قانون قدرت کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے یا جو بت پرست ہو، تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے باعث اس کے خلاف جنگ کرنی جائز ہے۔ لِنّانو کے ژاں نے جنگ کے اس حق کے استعمال کا اختیار پوپ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ پوپ کو اس کا بھی اختیار ہے کہ ان غیر مذہب والوں کے خلاف مخاصمانہ کارروائیاں کی جائیں جو ارض مقدس پر قابض ہوں، یا جن کے متعلق حضرت مسیح نے چاہا تھا کہ وہ پیدا ہوں اور مر جائیں۔ ارض مقدس، رومی شہنشاہیت کی تھی جسے چھین لیا گیا ہے اور پوپ کو جو حکومت حاصل ہے، اس کی بنیاد پر وہ اسے واپس لینے کی کوشش

---

[1] ساسو فراتو کے بارتولے کی لاطینی تالیف "ڈائجسٹ کی شرح نوحصوں میں" باب: گرفتاری اور دشمن سے واپس چھیننا۔

کر سکتا ہے۔ بعض اور ممالک بھی ہیں جو غیر مذہب والوں کے قبضے میں ہیں لیکن یہ علاقے کوئی تقدس نہیں رکھتے۔ اور ان کے متعلق شہنشاہت یا کلیسا کو واقعے کی حد تک کوئی اختیار سماعت بھی حاصل نہیں رہا ہے۔ پوپ حکم دے سکتا ہے کہ ان ملکوں کے آقا عیسائیوں کو نہ ستائیں۔ اور نہ ماننے کی صورت میں یہ اعلان کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات حکمرانی سے معزول کر دیے گئے۔[1]

بالدے نے اس سے بھی وسیع تصورات قائم کیے۔ غیر مذہب والوں سے جنگ کے جواز کے مسئلے پر وہ نفی میں جواب دیتا ہے لیکن اگر خود غیر مذہب والے ہی عیسائیوں سے جنگ کریں تو عیسائی اس کا جواب مخاصمانہ کارروائیوں کے ذریعے سے دے سکتے ہیں۔[2] اس مشہور ماہر قانون بالدے نے، واقعہ یہ ہے کہ، اپنی تالیفات کی ایک اور عبارت میں خود اپنی آپ تردید کی ہے اور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مذہب والوں اور بد عقیدہ ملحدوں سے جنگ کی جا سکتی ہے کیونکہ الحاد اور عیسائیت کو قبول نہ کرنا انھیں اختیار حکمرانی حاصل کرنے میں مانع ہے۔

کس قانون یا کس وجہ سے عربوں کے خلاف جنگ چھیڑی جا سکتی ہے؟ یہ سوال اونورے بونے کا پیش کردہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ معلوم کرنا ہے کہ کس قانون کے باعث یا کس وجہ سے عربوں کے خلاف یا دیگر عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف

---

[1] ۔ ہِنّا نو کے تراں کا لاطینی "رسالہ متعلق بہ جنگ" رسائل قانون عمومی جلد (۱۶) ورق ۳۷۱ و مابعد۔

[2] ۔ بالدے کی لاطینی تالیف "پرانی ڈائجسٹ کی شرح ایک حصے میں"۔ دیکھئے قانون (۵)۔

جنگ کی جا سکتی ہے؟ یا، یہ کوئی مناسب امر ہے کہ پوپ جنگ میں حصہ لینے والوں کے متعلق چشم پوشی اور عفو سے کام لے؟ سب سے پہلے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے آقا خدائے تعالیٰ نے زمین کی تمام چیزیں اچھوں کے لیے بھی اسی طرح پیدا کی ہیں جس طرح بروں کے لیے۔ اس مولف کی یہ رائے نہیں ہے کہ خدا اگر کچھ چیزیں غیر عیسائیوں کو عطا کر چکا ہو تو عیسائی وہ ان سے چھیننے کا حق رکھیں۔ اپنے اس نظریے کی تائید کے لیے وہ جو دلیلیں پیش کرتا ہے کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کو جبری طور سے بپتسمہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور چونکہ بپتسمہ دینے کے لیے جبر استعمال نہیں کیا جا سکتا تو مال و دولت چھیننے کے لیے اسی جبر کا استعمال کیسے درست ہو سکتا ہے؟ پوپ کو نہیں چاہیے کہ عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف جو لوگ جنگ کرتے ہوں، ان کے متعلق چشم پوشی کرے۔ کیونکہ خود اس کا بیان ہے کہ "جو لوگ ہمارے دین سے باہر ہوں، ان سے اسے کوئی تعلق نہیں"۔ پھر بھی بوتنے اپنے اس قاعدے کے متعلق بعض مستثنیات کو تسلیم کرتا ہے: "اگر کوئی عرب یا کوئی یہودی قانون فطرت کی خلاف ورزی کرے تو پوپ بے شک اس مجرم کو سزا دے سکتا ہے، کیونکہ خدا نے اس کی نظیر قائم فرمائی ہے۔" یہ امر قابل ذکر ہے کہ دوسرے مولف اس آخر الذکر نظریے کو ماننے سے ہچکچاتے ہیں خاص کر فردیناند ثاسکویس ہن ثاکا جو یہ بیان کرتا ہے کہ ہر گناہ فطرت کے خلاف ہی ہوگا۔ اور بوتنے اس کے بعد یہ بیان کرتا ہے "لیکن اگر یہودی یا عرب انجیلوں کے خلاف جرم کے مرتکب ہوں تو پوپ انھیں سزا نہیں دے سکتا کیونکہ دنیا دار آدمی کو دین کے قبول کرنے پر

147

مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ میں تم سے ایک اور چیز کہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پوپ عیسائیت کو قبول نہ کرنے والوں کے خلاف [جو لوگ جنگ میں حصہ لیں، ان کے متعلق] چشم پوشی سے کام لے سکتا ہے تاکہ بیت المقدس کو واپس حاصل کیا جائے۔ کیونکہ یہ مقام ہمارے آقا حضرت یسوع مسیح کو پیش آئی ہوئی اذیتوں کے باعث فتح کے حق کے ذریعے سے عیسائیوں کا ہو گیا تھا اور اسے حضرت مسیح کو پیش آئی ہوئی مصیبتوں کے بعد روما کے حکمران نے فتح کرلیا تھا لیکن بعد میں اس پر عربوں نے قبضہ کرلیا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مطابق استحقاق تھا۔ اسی بناء پر پوپ ان سب کے متعلق چشم پوشی ملحوظ رکھے گا جو اس علاقے کو واپس حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ پوپ سے اجازت لیے بغیر عربوں کے خلاف عام جنگ کرنا ہو تو میں نہیں جانتا کہ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے.........

اس کے بعد میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پوپ کو کوئی وجہ نہیں کہ عیسائیت کو قبول نہ کرنے والوں کے خلاف ایسے دیگر علاقوں یا بادشاہتوں کے متعلق جو ان کے قبضے میں ہوں جنگ کا اعلان کر سکے۔ سوائے اس صورت کے کہ ایسے علاقے کلیسا یا روما کی شہنشاہت کے واقعی طور پر ماتحت رہ چکے ہوں، لیکن پوپ غیر مذہب والوں کو حکم دے سکتا ہے کہ "وہ عیسائیوں کو کوئی تکلیف نہ دیں"۔ کیونکہ ایسی صورت میں پوپ ان لوگوں کو ان کی حکمرانی کے حق سے محروم کر سکتا ہے۔ اونورے بونے ایک اور استثناء کو بھی تسلیم کرتا ہے وہ یہ کہ بیت المقدس کا بادشاہ تخت کے متعلق اپنا حق جتا سکتا ہے[1]۔

---

[1]۔ اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب دوم۔

148

کتاب "شجرۂ حروب" کا مولف یعنی اونورے بونے ایک اور مماثل معاملے سے ایک اور جگہ بحث کرتا ہے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ "آیا کلیسا یہودیوں کے خلاف جنگ کا حکم دے سکتا ہے؟" اور وہ ان وجوہ کی تحقیق و تنقیح کرتا ہے جو اس کا جواب اثبات یا نفی میں دینے والے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ مانتا ہے کہ یہودی اپنے آپ کو عیسائیوں کے متعلق اس طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ "وہ سب ان [عیسائیوں] کے علانیہ دشمن ہیں" لیکن وہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا کہ ان کے خلاف جنگ کی اجازت ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اگر یہودی ہم کو بہت تکلیف دیتے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرتے"

عقائد کے نقطۂ نظر سے غیر مذہب والوں سے جنگ کرنے کا مسئلہ ایک اور وسیع تر امر سے وابستہ ہے۔ جان وائیکلف نے جو جسارت آمیز خیالات پیش کیے ہیں، ان میں ایک وہ بھی ہے جو اقتدار اعلیٰ کے متعلق اس کی لاطینی کتاب "متعلق بہ اقتدار اعلیٰ" میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶۸ء میں لکھی گئی۔ یہ ممتاز مفکر یہ بیان کرتا ہے کہ اصلی حکومت یا اقتدار اعلیٰ نہ تو کوئی حق ہے اور نہ کوئی بیرونی چیز، بلکہ وہ طبیعی معقولیت کی ایک عادت کا نام ہے جو اپنے بلند ترین مفہوم میں صرف خدا ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس مولف کی رائے میں یہ حکومت یا اقتدار خدا اپنی مخلوقات میں تقسیم کر دیتا ہے[2] اور گویا وہ انھیں ان کے انفرادی

---

[1] ۔ اونورے بونے کی کتاب بالا حصۂ چہارم باب (۶۳)۔

[2] ۔ ممکن ہے کہ "الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ" اور اللّٰھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء" وغیرہ قرآنی آیتیں اور مماثل حدیثیں پیش نظر رہی ہوں (مترجم)

حالات و فرائض کے مطابق یہ چیز عطیہ یا جاگیر میں دیتا ہے۔ لیکن یہ عطا صرف اس شرط پر حاصل ہو سکتی ہے کہ مخلوقات اپنے خالق کے احکام کی اطاعت کریں۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا کی اس عنایت کو برقرار رکھیں۔

بے شبہہ وائیکلف کے خیال میں یہ نظریہ ایک سطحی چیز پر مشتمل ہے۔ اور اس نے خود بھی فوراً بیان کر دیا ہے کہ حالات موجودہ سے یہ مطابقت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کے نتائج بھی کچھ کم دور رس نہ تھے۔ چنانچہ اگر اپنی انتہا کو پہنچا یا جائے تو اس نظریے کی رو سے بادشاہ اپنی بادشاہت سے اور پادری اپنی پادریت سے اسی لمحے محروم ہوتا ہے، جب کہ خدا کی عنایت ہم پر باقی نہ رہے۔ چنانچہ وائیکلف نے یہ تسلیم کرنا ضروری خیال کیا کہ واقعے کی حد تک جس کو اقتدار حاصل ہو اس کا احترام کرنا لازمی ہے اور وہ یہ بیان کرتا ہے کہ خدا کو اپنے ہی مسلّط کردہ شیطان کی [نعوذ باللہ] اطاعت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ جو حکومت قائم ہو اس کی اطاعت کرنی واجب ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حقیقی معنوں میں گنہگار کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ اختیارات کا استعمال خدائی اجازت کی بنا پر کر سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ واقعے کی حد تک جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہو، اسی کی اطاعت عیسائی کے لیے واجب ہوگی۔ چنانچہ خود حضرت یسوع مسیح نے اس کی نظیر پیش کی ہے اور انھوں نے شیطان کی ترغیبوں کو مانا ہے [؟]۔

149

وائیکلف کے نظریے سے پہلا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے چونکہ اقتدار اعلیٰ کبھی صرف ایک شخص کے تفویض نہیں کیا تھا اور اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے بطور الگ الگ جاگیروں کے

148

کتاب "شجرۂ حروب" کا مولف یعنی اونورے بونے[1] ایک اور مماثل معاملے سے ایک اور جگہ بحث کرتا ہے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ "آیا کلیسا یہودیوں کے خلاف جنگ کا حکم دے سکتا ہے؟" اور وہ ان وجوہ کی تحقیق و تنقیح کرتا ہے جو اس کا جواب اثبات یا نفی میں دینے والے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ مانتا ہے کہ یہودی اپنے آپ کو عیسائیوں کے متعلق اس طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ "وہ سب ان [عیسائیوں] کے علانیہ دشمن ہیں" لیکن وہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا کہ ان کے خلاف جنگ کی اجازت ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اگر یہودی ہم کو بہت تکلیف دیتے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرتے۔"

عقائد کے نقطۂ نظر سے غیر مذہب والوں سے جنگ کرنے کا مسئلہ ایک اور وسیع تر امر سے وابستہ ہے۔ جان وائیکلف نے جو جارت آمیز خیالات پیش کیے ہیں، ان میں ایک وہ بھی ہے جو اقتدار اعلیٰ کے متعلق اس کی لاطینی کتاب "متعلق بہ اقتدار اعلیٰ" میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶۸ء میں لکھی گئی۔ یہ ممتاز مفکر یہ بیان کرتا ہے کہ اصلی حکومت یا اقتدار اعلیٰ نہ تو کوئی حق ہے اور نہ کوئی بیرونی چیز، بلکہ وہ طبیعی معقولیت کی ایک عادت کا نام ہے جو اپنے بلند ترین مفہوم میں صرف خدا ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس مولف کی رائے میں یہ حکومت یا اقتدار خدا اپنی مخلوقات میں تقسیم کردیتا ہے[2] اور گویا وہ انھیں ان کے انفرادی

---

[1] اونورے بونے کی کتاب بالا حصۂ چہارم باب (۶۳)۔

[2] ممکن ہے کہ "الارضَ للهِ یُورِثُها مَنْ یَشاءُ مِن عبادِہ" اور "اللّٰھُمَّ مالِکَ المُلکِ تُؤتی المُلکَ مَن تَشاءُ و تَنزِعُ المُلکَ مِمَّن تَشاءُ" وغیرہ قرآنی آیتیں اور مماثل حدیثیں پیش نظر رہی ہوں (مترجم)

حالات و فرائض کے مطابق یہ چیز عطیہ یا جاگیر میں دیتا ہے۔ لیکن یہ عطا صرف اس شرط پر حاصل ہوسکتی ہے کہ مخلوقات اپنے خالق کے احکام کی اطاعت کریں۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا کی اس عنایت کو برقرار رکھیں۔

بے شبہہ وائیکلف کے خیال میں یہ نظریہ ایک سطحی چیز پر مشتمل ہے۔ اور اس نے خود بھی فوراً بیان کردیا ہے کہ حالات موجودہ سے یہ مطابقت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کے نتائج بھی کچھ کم دوررس نہ تھے۔ چنانچہ اگر اپنی انتہا کو پہنچایا جائے تو اس نظریے کی رو سے بادشاہ اپنی بادشاہت سے اور پادری اپنی پادریت سے اسی لمحے محروم ہوتا ہے، جب کہ خدا کی عنایت ہم پر باقی نہ رہے۔ چنانچہ وائیکلف نے یہ تسلیم کرنا ضروری خیال کیا کہ واقعے کی حد تک جس کو اقتدار حاصل ہو اس کا احترام کرنا لازمی ہے اور وہ یہ بیان کرتا ہے کہ خدا کو اپنے ہی مسلّط کردہ شیطان کی [نعوذ باللہ] اطاعت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ جو حکومت قائم ہو اس کی اطاعت کرنی واجب ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حقیقی معنوں میں گنہگار کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن پھر بھی وہ اختیارات کا استعمال خدائی اجازت کی بنا پر کرسکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ واقعے کی حد تک جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہو، اسی کی اطاعت عیسائی کے لیے واجب ہوگی۔ چنانچہ خود حضرت یسوع مسیح نے اس کی نظیر پیش کی ہے اور انھوں نے شیطان کی ترغیبوں کو مانا ہے [؟]۔

149

وائیکلف کے نظریے سے پہلا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے چونکہ اقتدار اعلیٰ کبھی صرف ایک شخص کے تفویض نہیں کیا تھا اور اقتدار اعلیٰ کے ٹکڑے ٹکڑے بطور الگ الگ جاگیروں کے

مختلف لوگوں کو عطا ہوئے تھے، اس لیے اگر کوئی چاہے تو یوں کہہ سکتا ہے کہ پوپ کے نظم و نسق کو جو دعوے ہیں وہ ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ پوپ کبھی حضرت مسیح کا اکیلا نائب نہ رہے گا بلکہ ہر عیسائی براہ راست خدا سے عطیہ حاصل کرے گا۔ اس نظریے کا دوسرا ناگزیر نتیجہ ایسے اثرات پیدا کرنا ہے جو بین الممالک تعلقات کے متعلق ہیں۔ یہ چیزیں خود وائیکلف نے اپنے نظریوں سے استنباط نہیں کی ہیں لیکن وہ ناگزیر ہیں۔ اور ان کے متعلق اسی کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ عنایات ربانی سے محروم ہونے کے باعث غیر مذہب والوں کو کوئی اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے عیسائی ان پر حملہ کرنے اور ان سے ان کی بادشاہتیں اور ان کا مال و دولت چھیننے میں باہم مطابقت دکھا سکتے ہیں۔ یہ نظریہ سترھویں صدی عیسوی تک گونجتا رہا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں شہر کانسٹنس میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نے باضابطہ طور سے اس کو مردود ٹھیرایا اور جب اسپینیوں نے امرندیوں کے حقوق کو بے رحمی سے کے ساتھ اپنے قدموں میں روندنا شروع کیا تو فرانسوا دے ڤی توریا نے وہی رائے دی جو کلیسا کا واقعی نظریہ تھا کہ کسی مہلک گناہ کے باعث نہ تو کشوری اقتدار اعلیٰ زائل ہوتا ہے اور نہ اخلاقی اقتدار اعلیٰ۔ سترھویں صدی کے آغاز میں کامپانلا نے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے حق کی سہ گانہ بنیاد قرار دی، یعنی جسمانی قوت وحشی جانوروں کے لیے عقل و فراست انسانوں اور بعض دیگر جانوروں کے لیے، اور محبت صرف انسانوں کے لیے۔ جہاں تک عقلمندوں اور علم والوں کا تعلق ہے کامپانلا کی رائے میں اوّلیت انھیں کو حاصل ہوگی اور یہی لوگ تسلط کے ذریعے سے، انتخاب کے ذریعے سے، جانشینی کے ذریعے سے، عطا کے ذریعے سے، خریدنے کے

ذریعے سے، اور حق جنگ کے ذریعے سے اقتدار اعلیٰ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہی چیزیں جاہلوں کے لیے خلاف فطرت ہوں گی۔ بے دین شخص خارج رہے گا؛ چاہے وہ دینداروں کے مقابلے میں کتنا ہی زیادہ عقلمند اور عالم کیوں نہ ہو، اسے دینداروں پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس ڈومینیکی پادری نے بیان کیا ہے کہ "حقیقت میں فضل وعنایت کے بغیر اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ بے دینی کے باعث خدا سے دوری اور جدائی پیدا ہو جاتی ہے اور اقتدار اعلیٰ کی بنیاد تو خدا ہی کی عطا ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو بے دین شخص اقتدار اعلیٰ کا استعمال کر سکتا ہے اور خدا اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن بے دین شخص کی صورت میں اس کی حیثیت ایسی ہوگی کہ گویا سزائیں دینے کے لیے کسی جلاد کو ملازم رکھا گیا ہو۔"

غیر مذہب والوں کے حقوق کا مسئلہ عیسائیت کے ان 150 عظیم المرتبت اجلاسوں میں جن کو کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کا نام دیا جاتا ہے، باضابطہ طور پر حل کیا گیا۔ پولینڈ اور لیتھوانیا کے باشندے عام طور پر عیسائیت قبول کر چکے تھے، لیکن آبادی کا ایک حصہ بت پرست ہی رہ گیا تھا۔ ٹیوٹانی سلسلے کے جنگجو راہبوں نے اسے بہانہ بنا کر پوری بے رحمی کے ساتھ پولینڈ کے بادشاہ لادِسلاس اور لیتھوانیا کے ڈیوک وِت ہولڈ سے جنگ کی۔ اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ عیسائی دنیا کی رائے عامہ سے ایک واقعی اپیل کر چکے تھے اور لاطینی رسالہ "صلیبی جنگجوؤں کے عمومی جھگڑے" کے نام سے شایع کر چکے تھے جس کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پیزا کی مجلس شورائے مذہبی کی تائید کا بھی حوالہ دیا تھا۔ ۱۴۱۰ء میں جنگجو راہبوں کے اس سلسلے کو ٹانن برگ میں ایک بڑی سخت شکست اٹھانی پڑی تھی لیکن ۱۴۱۱ء کی

صلح کے باعث ان کو اس کا موقع مل گیا کہ اپنی قوتوں کو نئے سرے سے جمع کریں اور اپنی بے رحمانہ مہموں کو پھر سے شروع کریں۔ پولینڈ اور لیتھوانیا کے نمائندے کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی میں بھیجے گئے تھے اور وہاں ۶ جولائی ۱۴۱۵ء کے اجلاس میں بروڈزے ٹو کے پاؤل و لاڈی میرنے (جو احکامِ مذہبی کا ڈاکٹر اور آگسٹینیوں کا باقاعدہ کیانن یا صدر پادری تھا نیز کراکاؤ کی جامعہ کا ریکٹر یا صدر بھی) نہایت اعلیٰ قابلیت سے اس نظریے کی تائید کی کہ غیر مذہب والوں کو جبر کے ذریعے سے عیسائی نہیں بنایا جا سکتا اور یہ کہ ان کے علاقوں پر حملہ نہیں کیا جا سکتا نیز یہ کہ ان کا مال لوٹا نہیں جا سکتا خواہ شہنشاہ اجازت دے یا پوپ یا کوئی اور بنیاد پر۔

اس کی رایوں میں سے چند کا ذکر کرنا کافی ہوگا، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قدر فیاضانہ طبیعت اور وسعتِ قلبی کے خیالات رکھتا تھا[1]۔ وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اگر غیر مذہب والے "کلیسا کے گلے میں" شامل نہ ہوں تو بھی انھیں حضرت مسیح کی بھیڑیں ہونے کا کچھ کم حق نہیں ہے کیونکہ حضرت مسیح کے لاطینی الفاظ "میری بھیڑوں کو چراؤ" میں غیر عیسائی بھی اسی طرح داخل ہیں جس طرح عیسائی۔ اقتدار اعلیٰ، اختیار سماعت اور اختیارات مالکانہ اس مولف کی رائے میں غیر عیسائیوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں، اور وہ انسانی سماج کے ان حقوق سے مستفید ہوتے ہیں۔ ارضِ مقدس کی صورت حال کے متعلق جو اعتراض کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس پر حق جتایا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے رومی شہنشاہوں کی رہ چکی ہے اور اب حقیقت میں صرف اس چیز کو واپس لینے کا سوال ہے جو چھینی گئی تھی۔ پولینڈ کے اس فصیح البیان مقرر کو تسلیم ہے کہ

[1] فون دیر ہارٹ کی لاطینی کتاب "کانستنس کی مجلس شورائے مذہبی کا بڑا اجتماع عام" جلد (۳) ص ۹۔

ملحدوں اور افتراق پسندوں کو ان کی جائداد سے محروم کیا جا سکتا ہے۔
لیکن اس مولف کے خیال میں اس جائداد پر دیندار عیسائیوں کو
قبضہ کرنے کے لیے قانون یا حاکم عدالت کی اجازت درکار ہوگی۔
وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ پوپ کو، چاہے واقعے کی حد تک نہ ہو
لیکن قانون کی حد تک، یہ استحقاق حاصل ہے کہ غیرمذہب والوں
کے متعلق، جو قانون قدرت کے خلاف گناہ کرتے ہیں یا بتوں کی
پرستش کرتے ہیں یا عیسائی مذہب پر ظلم و تعدی کرتے ہیں، اپنا
اختیار سماعت چلائے۔ چنانچہ پاؤل ولاڈی میر تسلیم کرتا ہے کہ پوپ
ایسے لوگوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ عیسائی مبلغین کو اپنے ہاں آنے دیں۔
لیکن اس مولف کا بیان ہے کہ پوپ انھیں عیسائی مذہب پر
ایمان لانے کے لیے مجبور نہیں کرسکتا کیونکہ اس بارے میں انھیں
پوری آزادی ملنی چاہیئے کہ اپنے متعلق آپ ہی فیصلہ کریں۔ اور
اس بارے میں صرف خدا کی عنایت ہی کا بول بالا ہو سکتا ہے۔
یاد رہے کہ سینٹ آگسٹائن کا بھی یہی نظریہ تھا۔

اس مسئلے کا اس موقعے پر فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اور کانسٹنس کی
مجلس شورائے مذہبی نے ایک اور مرتبہ بھی اسی پر بحث کی۔

ایک ڈومینیکی راہب نے، جو ٹیوٹانی سلسلے کا تنخواہ یاب ملازم
تھا، ایک تحریر میں پولستان (پولینڈ) کے بادشاہ پر شدت سے
حملہ کیا تھا اور اس میں خاص کر اس نے اس خیال کی تائید کی تھی
کہ پولستانیوں اور ان کے بادشاہوں کو قتل کرنا زیادہ بہتر ہے
بہ نسبت بت پرست کافروں کو قتل کرنے کے۔ اس پادری کا نام
یوحان فالکن برگ تھا۔ اس نے اس سے پہلے ہی کانسٹنس میں ظالم کشی
کے نظریے کی، جو فرانسسکانی پادری ژاں پتی نے پیش کیا تھا، تائید
میں تقریر کی تھی اور اس طور سے اورلیاں کے ڈیوک کو برگنڈی کے
ڈیوک نے جو قتل کردیا تھا اسے حق بجانب ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن

مجلس شورائے مذہبی نے اس نظریے کی تردید کردی تھی اور برگنڈی کے ڈیوک کو خوش کرنے کے لیے اس تحریر کو بھی مردود قرار دینے سے انکار کیا تھا۔ ٹیوٹانی سلسلے کے شہامت بازوں کی حمایت کا جو نظریہ تھا، اسے مجلس شورائے مذہبی نے ۲۲ر اپریل ۱۸۱۸ء کو اپنے آخری اجلاس میں مسترد کر دیا تھا۔ برودزسے تو کے پاؤل و لاڈی بیکو پولینڈ اور لیتھوانیا کے نمایندے گھیرے ہوئے تھے اور عدالت مذہبی کا وکیل گاس پارڈ پے روز بھی مدد دے رہا تھا۔ چنانچہ اس پر اس نے پُرزور احتجاج کیا، اور اس کتاب کے مولف کو مردود قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اور جب پوپ اور جلسے نے اس مطالبے کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے اعلان کیا کہ وہ آیندہ اجلاس میں مرافعہ پیش کرے گا۔

پییئر دانکارانو ایک اہم مولف تھا، اور سیینے نے اور بولونیا میں مدرس بھی رہا تھا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں جو کلیسائی مسائل پیش آئے تھے، ان میں اس نے ایک بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ اسی مولف نے وضاحت کے ساتھ سوسنے کے ہنری کے خیال کی تردید کی تھی اور متعدد احمقانہ نتایج نکالے تھے۔

اس کے برخلاف آرنو آلبرتی نو نے جو صقلیہ کے شہر پاکتس کا اسقف تھا، سولھویں صدی کے آغاز میں یہ لکھا تھا کہ غیر عیسائیوں کو نہ تو حکومت کا حق ہے، نہ حکمران بننے کا، اور نہ اختیار سماعت چلانے کا؛ یہ کہ حضرت مسیح کی آمد کے باعث اب ان سے ہر قسم کا اقتدار اعلیٰ چھن چکا ہے؛ اور یہ کہ اگر عیسائی ان کے علاقوں پر ہلہ بول دیں، ان کو پکڑ کر غلام بنالیں، اور ان کا مال چھین لیں تو یہ جائز ہوگا کیونکہ ان چیزوں کا کوئی مالک ہی نہ ہوگا۔[1] اور لیال بن ترال برونو

[1] آرنو البرتی نو (ارنالڈس البرتی نس) کی لاطینی تالیف "ملحدوں کے قانون کا اعادہ"

152

قانون مذہبی کا پروفیسر تھا۔ اس نے بھی اسی زمانے میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو غیر عیسائیوں کے حق میں مضر تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ان سے ہر ایسے علاقے میں جنگ کی جائے جو کسی نہ کسی وقت عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکے ہوں۔ یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ کلیسا کو صرف مغرب ہی میں حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ اگر دنیاوی "تلوار کام نہ دے تو روحانی تلوار اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ مزید برآں اس نے غیر عیسائیوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ وہ ایسے علاقوں پر حملہ کر سکتے ہیں جن پر فی الحال عیسائی قابض ہوں لیکن جو اس سے پہلے انھیں غیر عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکے ہوں۔ وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ پوپ کو جو حضرت مسیح کا نائب عمومی ہے، تمام عیسائیوں اور غیر عیسائیوں پر اختیار سماعت حاصل ہے اور وہ غیر عیسائیوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ دینی مبلغین کو اپنے ہاں آنے دیں۔ آخر میں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ وہ افسوس کے ساتھ یہ رائے بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی اگر چاہیں تو غیر عیسائیوں سے معاہدے کر سکتے اور ان کے ساتھ حلیفی پیدا کر سکتے ہیں جب کہ وطن کی مدافعت پیش نظر ہو۔[1]

ژدل نُرِّقی ان جنگوں کو قابل قدر قرار دیتا ہے جو کلیسا کے دشمنوں، غیر عیسائیوں اور ان لوگوں کے خلاف کی جائیں جو احکام پاپائی سے بغاوت کریں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ لاطینی تالیف "قانون مذہبی کے اعادے پر چھے جلدیں" مطبوعہ کولون ۱۶۱۲ء میں شامل ہے۔ دیکھئے ج ۵ ص ۶۰۰۔

[1] ۔ ژاں برونو (یعنی برونے تس) کی لاطینی تالیف "ایک باب میں اعادہ مختلف انسان کتاب مجموعۂ احکام میں۔ دیکھئے حوالہ بالا ج ۴ ص ۱۱۷ ۔

جو لوگ ایسی جنگ میں مارے جائیں، انھیں ابدی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ خدا کے لیے اور کلیسا کے لیے[1]..... لڑتے ہیں وہ مقدس ترین فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

آمرندیوں کے مسئلے سے وہ بنیادی مسئلہ خود بخود چھڑ گیا کہ غیر عیسائیوں کے خلاف جنگ کا کیا اثر ہے؟ نئی دنیا یعنی امریکہ کی فتح کے آغاز ہی سے کرسٹوفر کولمبس نے مختلف سمتوں میں اسپینی بستیاں قائم کردی تھیں۔ مختلف اراضی نو آباد کاروں میں تقسیم کردی گئی تھیں۔ اور ان لوگوں کے سپرد بظاہر امانتی طور پر امرندیوں کی ایک تعداد کردی جاتی تھی تاکہ وہ انھیں عیسائی مذہب کی تعلیم و تلقین کریں۔ جاگیروں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ مفتوح باشندے بالآخر بانٹ لیے گئے اور ان کی تقسیم کئی کئی سو خاندانوں کے قبائل میں اس طور سے کی گئی کہ ان پر مرکزی حکومت کی طرف سے آقا نامزد کیے جاتے تھے اور ان آقاؤں کا انتخاب فاتحوں میں سے ممتاز خدمات انجام دینے والوں اور شاہی عہدہ داروں میں سے عمل میں آتا تھا۔ اس تقسیم کا اثر یہ ہوا کہ امریکہ کے بدقسمت اصلی باشندے زمینوں سے وابستہ ہو گئے [اور ان زمینوں کا آقا تبدیل ہوتا تو یہ بیگار غلام بھی اس زمین کے ساتھ نئے آقا کی ملکیت میں داخل ہو جاتے۔ اور اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہ تھی]

اب ایک بدترین غلامی نے ترقی شروع کی اور جلدی ہی تلخ شکایتیں سنائی دینے لگیں۔ مبلغ پادری ان خیالات کی پرزور ترجمانی کرتے تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ حصہ ڈومینیکی

---

[1] یہاں اصل میں یہ الفاظ تھے "کلیسا کے لیے جو خدا کی زوجۂ عذرا و بے عیب ہے" (مترجم)

153 پادریوں نے لیا، جو برابر اس بات پر احتجاج کرتے رہے کہ امرندیوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ اس کے بر خلاف فرانسکانی پادری ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی زبان اور اپنے قلم سے ان ظلم کرنے والوں کی تائید کر چکے تھے۔

ملکہ ایزابیلا نے اسپینیوں کے طرز عمل کو ناپسند کیا۔ بادشاہ فردیناند نے ۱۵۰۸ء میں یہ اہم مسئلہ ماہرین قانون اور ماہرین دینیات کے ایک کمیشن کے سپرد کیا۔ لیکن یہ بے رحمانہ ادارہ باقی رکھا گیا۔ اور ۱۵۰۹ء میں اس کے متعلق جو قواعد بنائے گئے تو ان کی تک تعمیل نہیں ہوئی۔ اس کے نتائج ہولناک ہوئے۔ چنانچہ پادری لاس کازاس کے بیان کے مطابق (۳۸) سال کے عرصے میں ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ امرندی اس کے بھینٹ چڑھے۔

بارتیلمی دے لاس کازاس کو اس بات کی عزت حاصل ہے کہ اس نے اس ہولناک برائی کو رکوانے کے لیے تمام ممکنہ کوشش کر ڈالی۔ اس نے قانون اور دینیات کی تعلیم پائی تھی اور ۱۵۱۰ء میں اس کو پادری کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ اس نے ڈومینیکی سلسلے سے تعلق پیدا کر لیا اور اسے کیاپا کی اسقفی کے مرکز پر بلا لیا گیا۔ اس کی عمر بڑی ہوئی۔ چنانچہ ۱۵۶۶ء میں (۹۲) سال کی عمر میں وہ فوت ہوا۔ یہ پوری عمر اس نے امریکہ کے اصلی باشندوں یعنی امرندیوں کی آزادی کی حمایت میں صرف کر دی۔ توجہ دہانی، سفر، وعظ، تحریر، بحث — غرض اس شریف مقابلہ کنندہ نے کوئی چیز بھی نظر انداز نہیں کی۔ دو مباحثے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۵۱۶ء میں نو عمر بادشاہ کارل (شارل) کے، جو نیا نیا تخت شہنشاہی پر بیٹھا تھا، سامنے لاس کازاس نے امرندیوں کے مسئلے پر طویل بحث کی۔ اس کا حریف داریاں کا اسقف (بشپ) ژاں دے کوے تے ڈوتقا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ

امریندی غلام بننے ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ لاس کازاس نے احتجاج کرتے ہوئے خود "مذہب مساوات" کا واسطہ دیا کہ وہ مذہب کسی قوم سے نہ تو اس کی آزادی کو چھینتا ہے، نہ اس کے سرداروں کو۔ اور یہ بہانہ نہیں کرتا کہ قدرت ہی نے اس کو اس حالت کے لیے بنایا ہے۔

لاس کازاس نے پُرزور فیصلوں کا مشورہ دیا لیکن جرمنی کی صورت حال کے باعث بادشاہ شارل کو اس کا موقع نہ ملا کہ اس پر عمل کرتا۔

۱۵۴۲ء میں نو آباد کاروں کے مظالم امریندیوں پر کچھ اتنے زیادہ ہو گئے کہ لاس کازاس نے نئے سر سے شارل کین کو توجہ دلائی۔ اس نے یہ بیان کیا کہ اگر پوپ عیسائی حکمرانوں کو غیر عیسائی علاقے بانٹ سکتا ہے تو وہ صرف اس غرض سے ہو سکتا ہے کہ انجیل کی تبلیغ کی جائے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ غیر عیسائی حکمرانوں کو اپنی مملکتوں میں حکمرانی کا حق ہے اور ان کا یہ حق قانون بین الممالک یا قانونِ الٰہی کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کے بغیر ان سے چھینا نہیں جا سکتا۔

چنانچہ اس نوبت پر سے پُل نے دا کے تژاں خینئیس نے[1] اپنا ظالمانہ لاطینی رسالہ "عمومیت پسند کی رائے کے مطابق" تحریر کیا۔ اور اسی زمانے میں ملکیور کانو میدانِ عمل میں آتا ہے۔ یہ سالامانکا میں پروفیسر تھا اور فرانسوا دے قی توریا اور انتوان رامی ریتش کا شاگرد تھا اور سے گوثیا کا اسقف۔ اور یہ بہادری کے ساتھ یہ کہہ کر لڑتا رہا کہ امریکہ کے بیچارے اصلی باشندوں کے حقوق کسی قانون سازی کے ذریعے سے چھینے نہیں جا سکتے۔

154

[1] جس کا ذکر اوپر ص 127 پر آیا ہے (مترجم)

بارتیلمی دے لاس کازاس نے اپنی کتاب "کیا پا کے اسقف کے خیالات کی تائیدی دلیلیں" ماہرین قانون و ماہرین دینیات کی ایک مجلس کے سامنے پیش کی ۔ یہ مجلس ۔ ۔ ۔ وَلاَّ دولِد میں طلب کی گئی تھی ۔ امرندیوں کا شریف حامی یعنی لاس کازاس اور سے پل تی داکاڑاں خینیس دونوں اس مجلس میں آکر اپنے خیالات کی مدافعت کرنے لگے ۔ ژاں خینیس نے تقریر پہلے کی اس کے بعد لاس کازاس نے مسلسل پانچ نشستوں میں اپنے خیالات کی توضیح کی ۔ ڈومینیک سوتو نے ان دونوں حریفوں کے دلائل کی تحلیل کی ۔ لیور انتے کے بیان کے مطابق مجلس کا فیصلہ لاس کازاس کی رائے کے مطابق ہوا ۔ لیکن امرندیوں کی بدقسمتی تھی کہ امرندیوں کے متعلق دیے ہوئے مشورے کی کبھی تعمیل نہیں کی گئی ۔ فرانسوا دے ڈی توریا نے اپنی لاطینی تالیف "دروس دینیات" میں بیان کیا ہے کہ محض اختلاف مذہب، جنگ کرنے کی جائز وجہ تحریک ہوتی نہیں خیال کی جاسکتی ۔ اسی طرح کسی بے دین قوم کا عیسائیت کو قبول کرنے سے انکار بھی یہی حیثیت رکھتا ہے ۔ پوپ کو عیسائیوں کے متعلق دنیاوی معاملات میں صرف اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے جتنا روحانی معاملات کے انصرام کے لیے درکار ہو ۔ اور چونکہ اسے غیر مذہب والوں کے متعلق دنیاوی اقتدار بالکل حاصل نہیں، اس لیے اگر یہ غیر مذہب والے اس کے کسی بھی اقتدار کو ماننے سے انکار کر دیں تو پوپ نہ تو ان کے خلاف جنگ کا اعلان کرسکتا ہے اور نہ ان کے مال پر قبضہ ۔ اس مولف کی رائے میں اگر پوپ نے اسپینیوں کو نئی دنیا میں انجیل کی تبلیغ کا کام سپرد کیا ہے، تو دیگر اقوام کے مقابلے میں ان کو یہ کام سپرد کرنا زیادہ بہتر تھا ۔ بے شبہہ ناواقفوں کو دین کے متعلق تعلیم دینے کا فریضہ تمام عیسائیوں پر

عائد ہوتا ہے، لیکن کلیسا کے صدر ہی کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مذہب کے مفاد کا لحاظ کرے اور پھر دین کے پھیلانے کا کام سب قوموں کو چھوڑ کر کسی ایک معین قوم کے سپرد کرے۔

فرانسوا دے ڈی توریا کی لاطینی کتاب ''دروس دینیات'' میں کلیسائی اقتدار کے متعلق درس سب سے اول ہے۔ اور اس درس میں مولف نے پوپ کی حیثیت سے بحث کی ہے اور کشوری [یعنی غیر مذہبی] اقتدار کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ اس نے ماہرین قانون اور ماہرین مذہب کے اس خیال کو غلط کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ پوپ دنیاوی معاملات میں بھی دنیا کا آقا ہو اور یہ کہ اسے تمام بادشاہوں کے متعلق اقتدار اور حق سماعت حاصل ہو۔ ڈی توریا نے بیان کیا ہے کہ یہ محض ذلیل خوشامد ہے۔ 155 اس نے لکھا ہے کہ ''پوپ بادشاہوں کو کوئی اقتدار نہیں عطا کرتا کیونکہ کوئی شخص کوئی ایسی چیز دے نہیں سکتا جو خود اسے حاصل نہ ہو۔ پوپ آقا نہیں ہے۔ دنیاوی اقتدار کلیسائی افسروں کے وجود میں آنے کے پہلے سے پایا جاتا ہے اور حضرت مسیحؑ کی آمد سے قبل بھی بادشاہ پائے جاتے تھے۔ حاشیہ نویسوں نے بتایا ہے کہ اسی کے مماثل اختیار پوپ کو ہوتا ہے حالانکہ وہ خود دولت اور علم میں غریب اور فرومایہ تھے۔'' اس نے مزید برآں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ''بادشاہوں کا کشوری اقتدار کسی طرح بھی پوپوں کے دنیاوی اقتدار کے تابع نہیں ہے۔'' اس کے کوئی ساٹھ سال بعد توماس کامپانلا نے نیپلز کے قید خانے میں ''حضرت مسیحؑ کی بادشاہت'' کے نام سے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس میں اس نے تلخ لہجے میں ڈومینیک سوتو کی (جو سالامانکا کے بے مثل استاد یعنی ڈی توریا کا شاگرد تھا) تنقید کی ہے۔ اس نے بھی پوپ کے لیے سوائے روحانی معاملات کے

کوئی اور اقتدار کا ہونا تسلیم نہیں کیا ہے۔ کامپانلاؔ کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ پوپ کو اولیت اور برتری حاصل ہو اور اس کی رائے میں یہ اولیت موجود بھی ہے۔ کیونکہ حضرت مسیحؑ کی آمد اس دنیا میں سنہرا دور قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اور آپ نے اپنا ابدی قانون وضع کر دیا ہے، نیز آپ نے ایک واحد اقتدار قائم فرما دیا ہے۔ اور تمام حکمران قانون الٰہی اور قانون انسانی ہر دو کے باعث دنیاوی اور روحانی سب معاملات میں اسی واحد اقتدار کے ماتحت ہیں۔

ڈومینیک سوتو کا ابھی ہم نے ذکر کیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ غیر مذہب والوں کے خلاف جنگ کرنے کے قانون پر ایک خصوصی تالیف کرے گا جس کا (لاطینی) نام "انجیل سے ماخوذ وجوہ" ہوگا۔ اس نے اپنے خیالات کی جو توضیح اپنی لاطینی تالیف "انصاف اور حق" میں کر دی ہے اس کے باعث ہم مذکورہ کتاب کو بالکلیہ نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اس نے غیر مذہب والوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ اولاً وہ غیر مذہب والے ہیں جو فی الواقعہ بھی اور بالاستحقاق بھی عیسائی حکمرانوں کے تسلط میں زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ اسپین میں عربوں اور یہودیوں کی یہی حالت تھی۔ اور جرمنی اور اٹلی میں یہودیوں کی اب بھی یہی حالت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہوں کو ان کے متعلق کارروائی کا حق

لہ۔ توماس کامپانلاؔ کی لاطینی کتاب "حضرت مسیحؑ کی بادشاہت" مطبوعہ ۱۶۳۳ء۔ اس بالکل غیر معروف کتاب میں اس ممتاز شہید نے اپنے خیال کی مکمل توضیح کی ہے۔ اس بارے میں ہمارا مضمون جو "فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۲۱) میں ہے دیکھئے ص ۳۶۱۔

حاصل ہوتا ہے اور وہ انھیں ان کے مال سے محروم بھی کر سکتے ہیں غیر مذہب والوں کی دوسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو، چاہے واقعے کی حد تک نہ ہوں لیکن، قانونی حد تک عیسائی حکمرانوں کے ماتحت ہیں۔ خسوتو اس سے ایسے لوگ مراد لیتا ہے جو ان علاقوں پر قابض ہوں جو سابق میں عیسائیوں کے تھے۔ اور وہ کہتا ہے کہ "یہ ظاہر ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر سکتے ہیں اور ان کے مقبوضات چھین سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال کسی انفرادی طور سے سفر کرنے والے عیسائی کو جو ان کے ملک میں جائے، یہ اختیار نہ ہوگا کہ ان کی چیزیں چھین سکے۔" تیسری قسم ان غیر مذہب والوں کی ہے جو عیسائی حکمرانوں کی اطاعت نہ تو واقعے کی حد تک کرتے ہیں اور نہ استحقاق کی حد تک۔ اور یہ عیسائیت کے دشمن نہیں ہیں۔ اور یا تو عیسائیوں کو جانتے ہی نہیں یا ان کا نام تک بھول چکے ہیں۔ کیا ایسوں سے جنگ کی جا سکتی ہے؟ خسوتو بیان کرتا ہے کہ سوال یہ نہیں ہے کہ آیا بت پرستی پر سزائے موت دی جانی چاہیے۔ بلکہ اصل میں سوال یہ ہے کہ جو شخص بت پرستوں کے خلاف جنگ کرنے کا دعویٰ کر رہا ہو، آیا اس کو اس بات کی اجازت مل چکی ہے؟ واضح ہو کہ ایسی کوئی اجازت پائی نہیں جاتی۔[1]

آوگس بورگ کا تعصب سے اندھا کپتان یعنی صدر پادری کونارد براؤن رحم و کرم سے یکسر عاری نظر آتا ہے۔ اور اس کی رائے میں دین کے دشمنوں کے خلاف جو بھی جنگ کی جائے وہ جائز ہے۔[2]

156

---

[1] - دومی نیک سوتو کی لاطینی تالیف "انصاف اور حق" کتاب ۵ مسئلہ ۳ بحث ۵۔

[2] - (لاطینی میں) "جو جنگ عیسائی اپنے دین کے دشمنوں سے کریں وہ حقیقت میں

کثارو ثیاس نے بھی وہی رائے ظاہر کی ہے جو سوتو نے۔ اور وہ زور و شور سے سوسے کے ہنری کی اس رائے کی مخالفت کرتا ہے کہ محض غیر مذہب کا ہونا جنگ کی جائز وجہ ہو؛ اور یہ کہ خدا نے غیر عیسائیوں سے شاہانہ اقتدار چھین لیا ہے اور وہ اقتدار عیسائیوں پر منتقل کر دیا ہے۔ اور کثارو ثیاس بیان کرتا ہے کہ نہ تو پوپ اور نہ ہی شہنشاہ اس بات کے مجاز ہیں کہ کسی حکمران کے خلاف محض اس بنا پر جنگ کریں کہ وہ غیر عیسائی ہے۔ گرانیان کے حکمنامے کی رو سے عربوں کے خلاف اس صورت میں جنگ جائز ہے جب کہ وہ عیسائیوں پر ستم ڈھائیں یا ان کو نکال باہر کریں۔ لیکن محض غیر عیسائی ہونے سے وہ حق چھن نہیں جاتا جو قانون انسانی پر مبنی ہے، اور قانون انجیل کے بھی پہلے سے چلا آتا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے بہر حال وائیکلف اور ہَس کی اس رائے کو مردود ٹھیرا دیا ہے کہ مالک ہونے کے متعلق اگر کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوا ہو تو ملکیت ہی کا حق ختم ہو جائے گا۔ بے شبہہ کثارو ثیاس نے غیر مذہب والوں سے اس صورت میں جنگ کو جائز قرار دیا ہے جب وہ عیسائیوں کے قدیم صوبوں پر قابض ہوں یا عیسائیوں پر ستم ڈھائیں یا اس حکمران کی اطاعت سے انکار کریں جس کے وہ ماتحت ہوں یا اپنے ملحدانہ بیانات کے باعث انجیل کے پرچار میں روڑے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حق بجانب ہوتی ہے۔ مزید برآں وہ عیسائیوں کے لیے مفید بھی ہے کیونکہ اس طرح جو جنگ مذہب اور دین کی حمایت اور خدا کا بول بالا کرنے کے لیے کی جائے گی اس کے تحت ان تمام علاقوں اور ملکوں پر حملہ کیا جا سکے گا جو غیر عیسائیوں کے ناجائز قبضے میں ہوں اور جنگ کے زور سے وہ اپنے حقیقی مالکوں یعنی عیسائیوں کو واپس دلائے جا سکیں گے۔"

اٹکا رہے ہوں۔

غیر مذہب والوں سے حلیفی کا مسئلہ ۱۵۶۶ء میں بحث میں آیا جب سلطان سلیمان دوم نے عمانوئیل فلی بیر کو اس شرط سے قبرص کی بادشاہت کا پیشکش کیا کہ وینیس کے خلاف وہ حلیف بن جائے۔

157 ساؤا سے کے ڈیوک کی مجلس مشورت میں جو قانون داں رکن تھے ان میں پیئیری نو بلی اور اکتاثیاں کا شراں بھی شامل تھے۔ بلی نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ غیر مذہب والوں سے حلیفی اس صورت میں جائز ہوگی جب بعض اور غیر عیسائیوں سے لڑنا مقصود ہو۔ کا شراں نے ایک لاطینی رسالہ لکھا جس کا نام یہ ہے: "مقالہ اس امر کے متعلق کہ آیا مسیحی اصول کے تحت یہ امر جائز ہے کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی جائداد کی حفاظت کے لیے غیر مذہب والوں سے حلیفی پیدا کریں اور ان کے دوست بنیں اور دیگر حکمرانوں سے لڑنے کے لیے ان سے مدد لیں؟" اس نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ عیسائی حکمران نہ تو ترکوں سے حلیفی کا معاہدہ کرسکتا ہے اور نہ ہی عیسائیوں کے خلاف ان سے مدد مانگ سکتا ہے، چاہے اپنی ذاتی مدافعت ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

بال تازار دے آیالا نے غیر عیسائیوں کے متعلق کفارؔ و ثیاس کا جو نظریہ تھا، اسی سے اتفاق کیا ہے۔ جہاں تک ملحدوں کا تعلق ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان سے جنگ جائز ہے۔ اور وہ اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جو جنگ کی جائے وہ منصفانہ سمجھی جائے گی جب کہ یہ لوگ انجیل کے پرچار میں آڑے آرہے ہوں[1]۔ جنتی لیس کی رائے ہیں کہ

[1] آیالا کی لاطینی تالیف "جنگ کے قواعد و قوانین اور فوجی ضبط"، کتاب ۱۔

محض مذہب کی بنا پر جنگ کرنا درست وجہ سمجھی جا سکے۔ یہ خود عدم رواداری کا شکار ہو چکا تھا اور اپنے عقائد کی بنا پر اسے مصیبتیں بھگتنی پڑی تھیں۔ اسی لیے اس نے اپنی کتاب کے ایک نہایت ہی عمدہ صفحے میں بڑے شریفانہ خیالات کا پرچار کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ مذہب انسان اور خدا کے رشتے کا نام ہے اور مذہب کو اس کے سوا کسی اور بات کا حق نہیں کہ حقوق انسانی ادا کرے۔[1]

بدقسمتی سے جنتی لیس اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اپنے یہ جذبات ہر جگہ برقرار رکھ سکے۔ چنانچہ اپنی اسی کتاب کی ایک اور جگہ اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ عیسائیوں اور ترکوں میں ایک غیر مصالحت پذیر جنگ پائی جاتی ہے۔ ذرا تکلف سے کام لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس عبارت سے ایک واقعے کا اظہار کرنا مقصود ہے، ایک نظام کی تشریح اتنا زیادہ مقصود نہیں، جسے دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترکوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ باب ۲ ۲۹ و مابعد۔

[1] چنانچہ (لاطینی میں) "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی شخص محض مذہبی وجوہ سے جنگ کا اعلان کر سکتا ہے؟ مجھے اس سے انکار ہے۔ اور اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ مذہب کا فریضہ اور رشتہ انسان اور انسان کے مابین نہیں ہوتا [بلکہ انسان اور خدا کے]۔ اسی لیے مذہب کی خاطر اعلان جنگ جائز نہیں۔ مذہب کا تعلق خدا سے ہے۔ وہ ایک ربانی حق ہے۔ وہ انسان اور خدا کے مابین ہوتا ہے۔ وہ کوئی انسانی حق نہیں جو انسان اور انسان کے مابین ہو۔ اسی لیے مذہب میں اختلاف رکھنا کسی انسانی حق کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جا سکتی" (البیریگس جنتی لیس کی تالیف "قانون جنگ" کتاب اول باب (۹) آیا مذہب کی بنا پر جنگ جائز ہے؟)

سے عیسائی ایک جائز جنگ لڑ رہے ہیں کیونکہ ترک معاندانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔[1] لیکن اور آگے بڑھیں تو شبہہ بالکل باقی نہیں رہتا جب کہ جنتی لیس نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ آیا دوسرے مذہب والوں سے معاہدے کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اس سوال کا تعلق جزءً دینیات سے ہے اور دینیات کے نقطۂ نظر سے عیسائی مملکتوں اور غیر عیسائی مملکتوں میں تجارتی کاروبار جائز ہے۔ جس چیز کی ممانعت ہے وہ ایسی حلیفی ہے جو عیسائی اور غیر عیسائیوں میں اس غرض کے لیے عمل میں لائی جائے کہ غیر عیسائیوں سے جنگ کی جائے، اور اس سے بھی زیادہ اس غرض سے کہ اس حلیفی کے ذریعے سے خود عیسائیوں سے جنگ کی جائے۔[2]

ولیم گل بک ایک انگریز تھا۔ وہ اس نظریے کی مخالفت کرتا رہا کہ غیر عیسائیوں سے صرف ان کے غیر عیسائی ہونے کی بنا پر جنگ کرنی جائز سمجھی جائے۔ بلجیم کے مشہور مولف ژدوستِپ سے بھی اسی نظریے کی تائید کرتا ہے۔ اس زمانے میں دنیائے علم و تصنیف کے مثلث کے تین زاویے ژدوست لپ سے اور یونٹ اسکالی گر

158

[1] (لاطینی میں) "ترک ہمارے دشمن ہیں اور ہماری تاک میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے سخت خطرہ ہیں۔ جب کبھی ان کو موقع ملتا ہے تو وہ ہمیشہ ہماری چیزیں ہر نا جائز وسیلے سے ہم سے لوٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے ترکوں سے لڑنے کی ہمیشہ ایک جائز وجہ موجود ہے۔ کیا ان سے عہد شکنی نہیں کی جا سکتی؟ — نہیں۔ کیا ان لوگوں کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی جو خاموش اور پر امن ہوں اور جو ہمیں بالکل نہیں ستاتے؟ — نہیں۔ لیکن ترک ہمارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں تو؟" ایضاً، کتاب اول، باب ۱۲)

[2] جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب ۱، باب ۱۹۔

اور کاسو بوں سمجھے جاتے تھے۔ فل بک نے اول الذکر کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اس کے جنگجویانہ اور اُبلنے والے مذاق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ سیاست دانی سے بے بہرہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ تو سانپ کے جیسا ہوشیار تھا اور نہ کبوتر کی طرح سادہ اور مسکین۔

سوارینس یہ بیان کرتا ہے کہ عیسائی نہ ہونا جنگ کرنے کی کوئی جائز وجہ نہیں ہوسکتا۔ اور وہ لکھتا ہے کہ "خدا نے آدمیوں کو نہ تو اس کا فریضہ سپرد کیا ہے اور نہ اختیار کہ خود خدا کے اپنے خلاف جن جرائم کا ارتکاب ہوا ہو، ان کا انتقام یہ لوگ لیں۔ بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بربریت پسندوں میں حکمرانی کرنے کی صلاحیت کم پائی جاتی ہے۔ اور یہ دلیل ارسطو سے آڑائی گئی ہے لیکن اس دلیل کا استعمال اس کی عمومی نوعیت میں کرنا خطرناک ہوگا[1]"

فرانسس بیکن اس بات میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا کہ قانون بین الممالک کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دے۔ جان سیلڈن اور ٹامس ہابس کی طرح وہ قانون بین الممالک کی بہت ہی کم مدد کرسکا۔ وہ اپنی تالیفوں کے بعض صفحوں میں جنگ اور اس کے جواز کے مسئلے سے بحث کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ "جنگیں قانون کی اعلیٰ ترین آزمائشیں ہیں اور جو حکمران اور مملکتیں زمین پر اپنے سے برتر کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتیں، وہ جنگ کے ذریعے سے اپنا معاملہ خدا کے انصاف کے بیچ پیش کرتی ہیں تاکہ قادر مطلق کو جس فریق کے حق میں مناسب

---

[1] سوارینس کی لاطینی تالیف "سہ گانہ دینیاتی خوبی یعنی ایمان، امید اور عفو پر کتاب" حصہ سوم "عفو"، بحث ۱۳ "جنگ"، فصل ۵۔

معلوم ہو فیصلہ صادر کرے اور ان کے جھگڑوں کو چکائے۔" مقدس جنگ سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مذہب کی خاطر اقدامی جنگ شاذ ہی صورتوں میں درست قرار دی جاسکتی ہے۔ بلکہ شاید کبھی بھی درست نہ قرار دی جائے۔ بجز اس کے کہ اس کے ساتھ دنیاوی ملحوظات بھی خلط ملط ہوجائیں۔ لیکن ایک عجیب سے مکالمے میں، جو ناتمام ہی رہا، یہ نظر آتا ہے کہ بیکن اس نظریے کی طرف جھک گیا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جنگ کرنی جائز ہے۔ گو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنا صحیح صحیح خیال اس ڈر سے ظاہر نہ کیا ہو کہ کہیں بادشاہ جیمس اول ناراض نہ ہوجائے۔ چنانچہ اس مکالمے میں جیمس اول اور اسپین کی حلیفی کی تجویزوں کو خوب سراہا گیا ہے[1]۔ اس تالیف میں غالباً بیکن نے اس رسالے سے مدد لی ہے جو ۱۶۲۵ء میں شایع ہوا تھا اور جو بادشاہ چارلس اول کی طرف منسوب ہے جس کا انگریزی نام یہ ہے: "جنگ کے متعلق آزاد خیالی کا کتب یا اس امر سے بحث کا رسالہ کہ آیا کسی دوسرے مذہب والے حکمران کی خدمت کے لیے ہتیار اٹھانا جائز ہے؟"

اس اہم مسئلے کے متعلق مولفین کے جذبات یہی رہے یہانتک کہ گروتیوس نے اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ وصلح" تالیف کی۔ جیساکہ اس کے متعلق ٹھیک کہا گیا ہے، اس نے اس خیال کی تائید کی کہ مذہب کے اختلاف کو جنگ کی جائز وجہ تسلیم کیا جائے تو حقیقت میں یہ قانون بین الممالک ہی کی نفی ہوجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس مشہور مولف کے پیشروؤں ہی میں متعدد ایسے لوگ گزر چکے تھے جو اس رائے کے قطعاً مخالف تھے۔

[1] بیکن کی انگریزی تالیف "ایک مقدس جنگ کا اشتہار"۔

یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ خود گروتیوس اس معاملے میں اتنا زیادہ آگے بڑھا ہوا نہیں ہے جتنا متعدد دیگر مولف جن کا ہم اب ذکر کریں گے۔ چنانچہ ایک مشہور جملے میں گروتیوس اپنے اس رجحان کی کم پردہ داری کرتا نظر آتا ہے کہ عیسائیوں کو باہم ان لوگوں کے خلاف عام حلیفی کرلینی چاہیے جن کو گروتیوس نے "مذہب کے دشمنوں" کا نام دیا ہے[1]۔

واقعات سبق آموز ہیں۔ ساتویں سے دسویں صدی عیسوی تک عربوں کی حملہ آوری کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور وہ شمالی افریقہ کے پورے ساحل پر چھا جاتے ہیں۔ کورسیکا، سارڈینیا، صقلیہ اور جزائر بالیار پر قبضہ کرلیتے ہیں اور اسپین اور اٹلی میں گھس کر خود فرانس کو دھمکانے لگتے ہیں جہاں کہ شارل مارٹل نے ان کی پیشقدمی کو روکا تھا۔ عرب عیسائیت کے ساتھ ایک کمل مخاصمت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عیسائیت کو غلبہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ عیسائی ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرلیتے ہیں جن پر ان کے دین کے دشمنوں نے قبضہ کرلیا تھا اور مسلمانوں کے خلاف مہیں روانہ کی جانے لگتی ہیں۔ نارمنوں نے صقلیہ کو فتح کرلیا تو حقیقت میں یہ صلیبی جنگوں کا آغاز تھا۔

اس زمانے میں عیسائیوں اور عربوں کے بعض تعلقات پہلی نظر میں ہمیں حیرت زدہ کردیتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے سلطانوں اور پوپوں میں بے خرخشہ اور دوستانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مثال کے طور پر نویں گرگیری نے مراکش کے

---

[1] ۔ گروتیوس کی تالیف "قانون جنگ و صلح" کا فرانسیسی ترجمہ از باربیراک کتاب ۲ باب ۱۵ ف ۱۲۔

بادشاہ کے پاس شہر فاس کے اسقف کے لیے سفارش کی تھی۔ چوتھا انوسنٹ، تونس اور بوجی (الجزائر) کے حکمرانوں سے پرزور التجاؤں کے ذریعے سے اپنے ان قلیل ہم مذہبوں یعنی عیسائیوں کی حفاظت کی خواہش کرتا ہے جو ان ممالک میں جنگی قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے یا عیسائی گرجاؤں میں خدمت کرنے کے لیے رہتے تھے۔ اسی چوتھے انوسنٹ نے سنہ ۱۲۴۶ء اور سنہ ۱۲۵۱ء میں مراکش کے بادشاہ سے یہانتک خواہش کی تھی کہ ساحلی شہروں کو محفوظ قرار دیا جائے جہاں اس کے افریقی مقبوضات کی عیسائی آبادی امن سے رہ سکے۔ سنہ ۱۲۹۰ء میں پوپ نکولاس نے ان عیسائیوں کے نام ایک فرمان جاری کیا جو مراکش، تونس، اور تلمسان کے سلاطین کی فوجوں میں بطور سپاہی ملازم تھے۔ ان عیسائیوں سے پوپ نے پرزور خواہش کی کہ اجنبیوں میں گھرے ہوئے رہ کر وہ عیسائی اخلاق و آداب کو کبھی مجروح نہ کریں[1]۔ آیندہ ہم ان تجارتی معاہدوں سے بحث کریں گے جو عیسائیوں اور مسلمانوں میں طے ہوئے تھے۔ یہاں صرف اس چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب ضرورت پیش آئی تو عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کی امداد کی ضرورت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ تیسرے فردیناند کے بارہ ہزار قسطیلہ کے سواروں سے مدد لے کر خلیفہ[2] مامون، افریقہ میں داخل ہوتا ہے اور سنہ ۱۲۲۸ء میں

۱۔ ماس لاتری کی فرانسیسی تالیف دو امن اور تجارت کے لیے معاہدے اور دیگر مختلف دستاویزیں جو قرون متوسط میں شمالی افریقہ میں عیسائیوں اور عربوں کے تعلقات سے متعلق ہیں"۔

۲۔ اس سے خانوادہ موحدین کا حکمران مراکش مراد ہے۔
(مترجم)

مراکش پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہ اسپینی سپاہی اس کے بیٹے کے ہاں بھی تنخواہ یاب ملازم رہے اور انھیں کے متعلق پوپ جو تھے انوسنٹ نے سفارش کی تھی۔ عرب مولف ابن خلدون نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مغرب جس میں طرابلس سے مراکش تک کا شمالی افریقہ کا ساحلی علاقہ داخل ہوتا ہے، یہاں کے حکمران "حملہ کرو اور واپس چلے جاؤ" کے اصول پر کاربند رہے۔ انھیں ایک ایسے امدادی سلسلے کی ضرورت تھی کہ مشاق لوگوں کی مدد سے وہ اپنا قبضہ مستحکم رکھ سکیں۔ چنانچہ وہ ان فوجوں میں یورپ والوں کو بھرتی کرتے تھے۔ بلکہ اس حفاظتی دستے کا بھی یہی حال تھا جو کسی لڑائی کے دوران میں ان کو گھیرے رہتا۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ "بے شبہہ اس کے معنے یہ ہیں کہ کافروں سے بدد لی جائے۔ لیکن یہ سلاطین اس کو ذرا بھی برا نہیں سمجھتے تھے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ مزید برآں وہ فرنگیوں کو صرف ان عربوں اور بربروں کے خلاف استعمال کرتے تھے جن کو مطیع بنانا مقصود تھا اور وہ ان یورپیوں کو ان لڑائیوں میں استعمال نہیں کرتے تھے جو عیسائیوں کے خلاف لڑی جاتی تھیں کیونکہ ایسی صورت میں ان امدادی فوجوں کا سازباز کرلینا ممکن ہوگا۔"

دوسرے فریڈرک کو اس کے معصر زمانے میں اس لیے بڑی فضیحت ہوئی تھی کہ اس نے مراکش، تونس اور قاہرہ کے حکمرانوں سے مسلسل اور باضابطہ تعلقات رکھے تھے۔ اس نے افریقہ کے ساحلی علاقوں سے ایسے مہمات پسندوں کو بھرتی کرکے اپنی ان فوجوں کی تکمیل کی جو اس نے اٹلی کے صوبہ کاپی تانات کے شہر لوچیرا میں تیار کی تھیں؛ اور صقلیہ کی بچی کچھی عرب آبادی کو اس نے اسی مقام پر لا منتقل کردیا تھا۔ جب یہ بادشاہ بیت المقدس گیا تو مسلمان سپاہی بھی اس کے ساتھ رہتے

اور نماز وغیرہ عبادتیں اپنے مذہب کے مطابق انجام دیتے رہے۔[1]

تیرھویں صدی کے اواخر سے عثمانی ترکوں کی قوت کا آغاز ہوتا ہے اور عیسائی شام میں اپنا آخری مقبوضہ یعنی عکّہ بھی کھو دیتے ہیں، اور یونانی بھی بحیرۂ بوس فور کے پرے ان کا جو آخری مقبوضہ تھا اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سلجوقی سلطنت ترک یا ترکمان حکمرانوں میں بٹ گئی تھی لیکن سلطان عثمان نے جلدی ہی ان سب کی قوت کو گھن لگا دیا اور عثمانلیوں نے اپنے فتوحات وسیع کرنے شروع کر دیے۔[2] ڈیڑھ صدی بعد مغربی یورپ نے یونانی شہنشاہت کو تباہ ہو جانے دیا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطینیہ پر قبضہ کر لیا۔ پوپ آخری لمحے تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ قسطنطینیہ کی مدد کے لیے اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک کہ وہ روما کی روحانی برتری کو تسلیم نہ کرے۔ کوئی چالیس سال بعد ایک اور پوپ یعنی چھٹے الگزانڈر نے سلطان کے پاس ایک سفیر روانہ کیا تاکہ مشرقی شہنشاہت کے خلاف آٹھواں شارل جو منصوبے سوچ رہا تھا انھیں بے نقاب کرے۔ اور اس نے سلطان سے رقمی مدد طلب کی تاکہ فرانسیسیوں سے لڑ سکے اور ساتھ ہی اس نے یہ توقع ظاہر کی کہ ان مشکل زمانوں میں سلطان اسے اپنی دوستی کا یقین دلائے گا۔ پوپ چوتھے نکولاس نے عیسائی قوموں کو غیر مذہب والوں سے معاہدے تک کرنے سے روک دیا تھا اور ایسے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا تھا۔

---

[1] ہوئیار برسے اول کی لاطینی تالیف "دوسرے فریڈرک کے سفارتی کارنامے" دیباچہ ص ۳۲۷۔

[2] ڈیپنگ کی فرانسیسی تالیف "تاریخ تجارت مابین مشرق و یوروپ از حروب صلیبیہ تا قیام نو آبادی ہائے امریکہ" جلد دوم صفحہ ۲۰۵۔

ان دونوں پوپوں کی راہوں میں کیا کچھ نہ انقلاب ہوگیا تھا۔
فرانسوا اول نے شارل کین سے جو جنگ کی تو اس وقت بین الممالک عمومی سیاسیات میں غیر مذہب والوں سے حلیفی کرنے کا مسئلہ پیش ہوکر آخری طور سے تسویہ پاگیا۔

۲۴ر فبروری ۱۵۲۵ء کو فرانس کا بادشاہ پاڈیا کے مقام پر قید کرلیا گیا تھا۔ دسمبر میں مجریط (میڈرڈ) کے اس قیدی کا ترکی سلطان کے نام ایک خط پہنچا جس میں اس نے "اس سلطان اعظم اور مالک زمانہ سے التجا کی کہ ایک مغرور کو ڈھکیلنے کے لیے مدد دے"۔ سانقاسے کے لوئیس کا بیٹا جب شارل کین کے ہاتھوں قید ہوگیا تو اس نے بھی اسی طرح ایک کوشش سلطان سلیمان ثانی کے ہاں کی تھی۔ اس کا جواب سلطان نے ایک اثر انداز پیام کے ذریعے سے دیا تھا جس میں اس نے لوئیس کو تسلی دی تھی اگر سلطان جلدی ہی ہنگری، شام اور آسٹریا کے آرک ڈیوک کے علاقوں میں منہک ہوگیا۔ ۱۵۳۵ء میں فرانس کے بادشاہ اور "امیرالمومنین" میں ایک معاہدہ طے پایا۔ ۱۵۴۳ء میں یہ بھی دیکھا گیا کہ بار بروسہ کی کپتانی میں ترکی بیڑا آیا اور فرانسوا اول کے بیڑے کے ساتھ مل کر بندرگاہ نیس کا محاصرہ کرلیا۔

اس نہایت راسخ العقیدہ عیسائی حکمران کے طرز عمل کی تائید کرنے والے بھی متعدد پیدا ہوگئے۔ بلیز ڈمونت لوک جو پاڈیا کی جنگ میں بھی موجود تھا اور مذہبی لڑائیوں کے سلسلے میں ہیوگنو فرقے والوں سے ہولناک شدت کے ساتھ جنگ کرچکا تھا، اب وہ اپنے بادشاہ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہر قسم کی لکڑی کے تیر بنائے جاسکتے ہیں۔ رہا میں، اگر میں دوزخ کی تمام پلید روحوں کو بھی بلاسکوں تاکہ میرے دشمن کا

سر کچلیں جو میرا سر کچلنے کے لیے آیا ہو، تو میں ان کو بھی بڑی خوشی سے بلاؤں گا۔ خدا مجھ کو یہ چیز معاف کردے۔" اس کے بھائی کا نام ژاں ڈمونت لوک تھا۔ یہ بلنبیہ اور ویے کا اسقف تھا۔ سچ پوچھو تو یہ ملحدانہ خیالات کی طرف مائل تھا۔ ونیس کی سینیٹ میں اس نے فرانسوا اول کی حمایت کی اور شارل کیس کے طرفداروں کے متعلق، جو اس بادشاہ کے خلاف تنقیدیں کر رہے تھے، اس نے یہ بیان کیا کہ "ان لوگوں کو پتا نہیں کہ اس بادشاہ کو ملامت کرتے ہوئے یہ حضرت داؤدؑ پر بھی الزام عائد کر دیتے ہیں حالانکہ حضرت داؤدؑ ایک قابل قدر بادشاہ اور مقدس نبی تھے لیکن جب ان کا طالوت ساؤل نے، جو ایک بت پرست بادشاہ تھا، پیچھا کیا تو حضرت داؤدؑ بھاگ گئے تھے۔" اس نے پوپ تیسرے پاؤل کے نام جو معذرتی و تائیدی بیان بھیجا تھا، اس میں اس نے بادشاہ فرانسوا اول کے متعلق نہایت اہم امور ملحوظ رکھنے کی ضرورت جتائی ہے چنانچہ اس نے یہ لکھا تھا کہ "ترک انسانی سماج سے اتنا باہر نہیں ہیں کہ ہم وحشی جانوروں سے تو تعلقات رکھ سکیں اور ان غیرمذہب والوں سے نہ رکھ سکیں۔ اگر ایسا ہو تو ہم ان رشتوں کو ماننے سے قاصر رہیں گے، جو خود قدرت نے انسانوں میں قائم کیے ہیں۔ سب انسان ایک ہی آدمؑ و حواؑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ انسانوں میں باہم پوری مشابہت ہے۔ اور ایک انسان میں جو چیزیں ہوتی ہیں وہی دوسرے میں ہوتی ہیں۔ کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اگر قوموں میں تقسیمیں عمل میں آگئی ہیں، تو اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ قدرت نے ان کو جدا کیا ہے، بلکہ مختلف اخلاق و عادات نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی قوم کے افراد میں ناگزیر طور پر زیادہ قریبی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، اور دیگر مملکتوں سے وہ روابط نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ فرق اس حد تک نہیں پہنچتا کہ خود اس اتحاد کو

توڑ دیا جائے جو ہم جدّی کے باعث بنی نوع انسان کے مختلف افراد میں پایا جاتا ہے۔ اگر خون اور وطن کے تعلقات سے نوعِ انسانی کے عمومی سماج اور خصوصی سماجوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے، تو یہ بھلائی کی جگہ ایک برائی ہوگی۔ انسانوں کی غلطیاں اور ان کی خامیاں اِن کے اس بات میں مانع آتی ہیں کہ ایک ہی مذہب اختیار کر کے اتحاد پیدا کر لیں۔ لیکن جس طرح رسم و رواج کے اختلاف سے انسانوں کا قدرتی معاشرہ تباہ نہیں ہو جاتا، اسی طرح اختلافِ مذہب کا بھی حال ہے[1]۔" یہ بڑے شاندار الفاظ ہیں جو دورِ جدید کے آغاز کے شایانِ شان ہیں۔ بے شبہہ ان الفاظ کے کہلوانے کا باعث ایک خاص مفاد تھا، لیکن وہ مفاد ایک نامعلوم طور پر حق اور انصاف کا آلۂ کار بن گیا۔ سولھویں صدی کے نصف اول سے یہ عظیم صداقت مسلمہ طور پر مضمر سمجھی جانے لگی کہ قانون بین الممالک کا دائرہ ایک معینہ مذہب کے حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس طرح سے مملکتوں کے تعلقات کے دائرے میں مذہبی رواداری کا اصول متحقق ہوگیا اور قانون بین الممالک نے ملک کے قانون عمومی سے زیادہ ترقی حاصل کر لی۔

163

یہ ارتقاء صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات ہی کی حد تک نہیں عمل میں آیا۔ قرون متوسط کے ابتدائی زمانے میں الحاد اور بدعقیدگی کم پائی جاتی تھی۔ اسی لیے ملحدوں کے خلاف دنیاوی قوانین نہیں پائے جاتے تھے۔ اور جب شہنشاہیت ختم ہوگئی تو

[1] ۔ ٹیلا کی لاطینی تالیف "شہر ٹرنٹ کی عظیم الشان و ممتاز مجلس شورائے مذہبی کی تاریخ کے متعلق یادگاروں کا مکمل مجموعہ" جلد (۳)، صفحہ (۱۵۹ تا ۹۴) — ریال دکور بان کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد ۳ صفحہ ۶۷۷۔

شہنشاہوں کے دستور بھی ختم ہو گئے۔[1] تقریباً ۱۱۰۰ء میں کتھاریت کی تحریک مغرب میں آموجود ہوئی اور قسم قسم کی صورتیں اختیار کرنے لگی۔ اس کے خلاف بڑی شدید تدابیریں اختیار کی گئیں۔ کلیسا نے بد عقیدہ لوگوں کے خلاف بڑی ہی سخت کارروائی جاری کی اور ان کو غیر عیسائیوں میں شامل قرار دیا گیا۔ اور پوپ کے احکام مذہبی میں یہ کہدیا گیا کہ جو لوگ بد عقیدہ لوگوں کی تباہی کی کوشش کریں گے تو انھیں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والوں کے برابر درگزر اور امتیازات حاصل ہوں گے۔ چنانچہ وہ حکمنامہ (جو لاطینی میں تھا) یہ ہے: "بہر حال وہ کیتھولک عیسائی جو صلیب کے جھنڈے تلے الحاد کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں مصروف ہوں انھیں بھی وہی رعایتیں اور امتیازات حاصل ہوں گے جو ارض مقدس کی بہبودی میں حصہ لینے والوں کے لیے ہیں[2]۔" خود مرتکبین بد عقیدگی کے خلاف موت کی سزا مقرر کی گئی۔ اور رواج یہ ہو گیا کہ انھیں زندہ جلا دیا جائے۔

احتساب اور سزا کا کام صرف کلیسا ہی نہیں انجام دیتا رہا۔ قرون متوسطہ میں ایک غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی۔ یہ شہنشاہ فریڈرک دوم کی ہے۔ اس کے ہمعصر اس پر عیسائیت سے پھر جانے کا الزام لگاتے تھے۔ ایک پوپ نے یہاں تک لکھا تھا کہ یہ بادشاہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کو تین جھوٹوں نے دھوکا دیا ہے جن میں وہ حضرت یسوع مسیحؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کا نام لیتا ہے۔ یہ ایک روشن خیال شہنشاہ تھا۔ اس کی پرورش پلرمو میں ہوئی جہاں عربی یونانی تمدن کے ماحول نے صقلیہ کے

---

[1] ژردلیاں آنشے کی فرانسیسی تالیف "الحاد اور کشوری ہاتھ: قرون متوسطہ میں"۔

[2] لاطینی تالیف "نویں گرگیری کے احکام" کتاب ۵ عنوان ۷، باب ۱۳۔

164

نارمن بادشاہوں کے دربار کو گھیر رکھا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے اس ذہنی و دماغی تہذیب کی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ اسی نے میشل اسکاٹ کی سرپرستی کی جس نے ابن رشد کی شرحوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی نے اٹلی کی جامعات کو منطق اور طبیعیات پر ارسطو کی نیز دیگر یونانی اور عربی مولفوں کی مختلف تالیفوں کے ترجمے بھیجے تھے۔ اسی نے اس اولین نشأۃ ثانیہ کے پھلنے پھولنے میں مدد دی جس کے باعث اس کے دور کو خصوصیت حاصل ہوگئی اور اسی کے باعث وہ زمین تیار ہوئی اور وہ موقع فراہم ہوا جس کی وجہ سے سولھویں صدی عیسوی کی درخشندگی ممکن ہوسکی، جیسا کہ موسیو ہویّار برے اول نے اس قدر عمدگی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اور دوسرے فریڈرک نے ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے کتھاریت اور پتاریت اور دیگر تمام ثنویت پسند فرقوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ ان فرقوں کے مخالفوں کے الفاظ میں یہ فرقے یہ کہتے تھے کہ ہماری یہ نظر آنے والی دنیا ایک برے خدا کی پیدا کی ہوئی ہے [اور نظر نہ آنے والی دنیا ایک دوسرے اور اچھے خدا کی پیدا کردہ ہے]۔ اسی لیے ان کا پرچار یہ تھا کہ زمین کی ہر ایک چیز سے پوری بے تعلقی برتی جائے۔ اور وہ شادی بیاہ کو بھی ملعون ٹھیراتے تھے کیونکہ اسی کے باعث بری چیزوں کی بقا کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ شہنشاہ نے ان کے خلاف نہایت سخت قوانین نافذ کیے، جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیاوی قوت کے ذریعے سے بدعقیدگی کو دبا دیا جائے اور چتا کے شعلوں کے ذریعے سے اس کا خاتمہ کیا جائے[1]۔

---

[1] ہویّار برے اول کی لاطینی تالیف "دوسرے فریڈرک کے سفارتی کارنامے" دیباچہ صفحہ ۴۸۹۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ملکوں میں ہولناک احتساب و سزا کا دور شروع ہوا۔ اور جب سولھویں صدی میں کیتھولک مذہب کے خلاف سب سے بڑی اور خطرناک ترین بدعقیدگیوں میں سے ایک ظاہر ہوئی، تو مذہبی تعصب کے باعث ہولناک جنگیں شروع ہوئیں۔ جلدی ہی ترقی پسندوں کو کامیابی ہوئی اور کلیسا کے بس میں یہ بات نہ رہی کہ اپنے اصول و قواعد کا اطلاق بین الممالک تعلقات میں بھی کرسکے۔ جن حکمرانوں نے بدعقیدگی کے الزام میں اپنی رعایا کا احتساب کرکے ان کو سزا دینی شروع کی تھی، انھیں بھی اب اس میں ہچکچاہٹ نہیں رہی کہ پروٹسٹنٹ ملکتوں سے حلیفی پیدا کریں۔ مذہبی تعصبات کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی پیچیدگیوں میں انہماک تھا اور یورپ میں توازنِ قوت قائم رکھنے کی خواہش تھی۔ اور یہ ایک ستم ظریفی تھی کہ خود پاپائی روما نے ان قواعد کو توڑنا شروع کیا، جن کو خود اسی نے وضع کیا تھا۔

[مولف نے اس بیان کو یہیں ختم کردیا ہے ورنہ یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ قانونِ بین الممالک کی ضرورتوں کے لیے جب عیسائی مذہب کو بالکل چھوڑ دیا گیا تو پھر قدیم رومی قانون کی طرف رجوع کیا جانے لگا تاکہ دنیا کی مختلف مملکتوں کو اپنی باہمی احتیاجوں کے پورا کرنے میں عیسائیت کے باعث کوئی دشواری نہ رہے۔ اس کے بعد سے یورپی ارباب اقتدار کو غیر عیسائی اشخاص اور ممالک سے شدید نفرت تو باقی رہ گئی لیکن خود ان یورپی ارباب اقتدار نے قانونِ بین الممالک کی حد تک عیسائی مذہب کو پوری طرح اور قطعی طور پر بالائے طاق رکھ دیا۔ اور منفعت پرستی واحد رہنما رہ گئی — مترجم]۔

165

باب ہشتم

یورپی توازن قوت

مختلف سلطنتوں میں توازن قوت قائم رکھنے کے نظریے کو جب ترقی ہوئی تو یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ آیا وہ جنگیں نا جائز سمجھی جائیں گی جو اس غرض کے لیے کی جائیں کہ اگر کوئی مملکت عمومی امن اور دیگر قوموں کی خود مختاری کو دھمکی دے تو اس کی کوشش کا سد باب کیا جائے؟

سلطنتوں میں توازن قوت رکھنے کا نظریہ خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس کے متعلق خیال یکساں نہیں رہا۔ گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں کبھی تو وہ اس صورت میں نظر آتا ہے کہ کمزوروں نے طاقتور کے خلاف بہت ہی معمولی قسم کا اتحاد کیا اور کبھی خود قوتوں میں یکساں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس خیال کی تائید نہیں کی جا سکتی کہ قدیم زمانے کے لوگوں کو اس معاملے میں باضابطہ طور سے انتظام کرنے کا احساس نہیں

پیدا ہوا تھا۔ فلسفی مورخ ڈاؤڈ ہیوم نے بتایا ہے کہ اگر یونانیوں کو سلطنتوں میں توازن قوت کا کوئی مکمل اور صحیح تصور نہ بھی تھا، تو وہ بہر حال اسی پر عامل ضرور تھے۔ چنانچہ یہ یاد دلایا جاسکتا ہے کہ اثینا والوں نے اسپارٹا والوں کے خلاف تھیبہ والوں کی طرفداری کی تھی تا آنکہ اے پامی نونڈاس کو لیوک ٹریس میں فتح نہ حاصل ہوگئی۔ اور پھر وہ فاتحین کی طرف ہو گئے۔ یہ بھی یاد دلایا جاسکتا ہے کہ ڈیماس تھینس نے میگا پولس کے رہنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اصول پیش کیا تھا کہ اثینا کے مفاد کا تقاضا ہے کہ اسپارٹا اور تھیبہ دونوں یکساں طور سے کمزور رہیں۔ اسی طرح یہ بھی یاد دلایا جاسکتا ہے کہ پولی بیس مورخ نے سیراقوسا کے بادشاہ ہیئیروں دوم کی اس لیے تعریف کی تھی کہ اس نے یہ بات ذہن نشین کر لی تھی کہ ایک خاص چیز کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ یہ کہ قوت ایک ہی جمہوریت کے ہاتھوں میں رہے، اس طور پر کہ ہمسایہ جمہوریتیں اس کے مقابل اپنے حقوق کی مدافعت میں اپنے کو بے بس پائیں[1]۔ سلطنتوں کے صحیح توازن قوت کا نظریہ، اپنے حقیقی مفہوم میں پندرھویں صدی میں پیدا ہوا۔

166

اس زمانے میں جاگیرداری نظام جو کہیں کم اور کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا، مغربی یورپ کے مختلف ملکوں میں ترمیم کیا جانے لگا۔ اور اس کا رجحان اس مقصد کی طرف تھا کہ بادشاہت کو قوت حاصل ہو اور ملک میں وحدت و یکجہتی کار فرما رہے۔ اسی سادگی پسند تصور کے سامنے مختلف طبقات کے ایک دوسرے کے اوپر پائے جانے کے نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

[1]۔ ہیوم کی فرانسیسی تالیف "سیاسی مقالے" مطبوعہ امسٹرڈام ۱۷۵۴ء، مقالہ ۷ "توازن قوت"۔
وے ٹن کی "تاریخ ارتقائے قانون بین الممالک" جلد ۱، صفحہ ۱۰۔

اٹلی میں ایک نئی قسم کی حکومت وجود میں آئی جسے "استاتو" یعنی "مملکت" کہنے لگے۔ مملکت کی اصطلاح سے اولاً ارباب اقتدار اور ان کے طرفدار مراد ہوتے تھے۔ بعد میں اس سے یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ ایک مستقل سرزمین پائی جاتی ہے۔ تیرھویں صدی کے وسط سے دوسرے فریڈرک نے نارمنوں اور عربوں کے قائم کردہ اداروں پر ایک ایسے نئے نظام کی تعمیر کی جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ شاہی سرپرستی نے اب اسقفوں، بلدیوں، اور جاگیرداروں کی جگہ رہنمائی کے فرایض اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اختیارات سماعت کی ہوشیاری کے ساتھ اس طور سے تنظیم کی گئی کہ پوری قوم کو ایک ایسی جماعت میں مبدل کردیا جائے، جسے نہ تو کوئی کام اپنی صوابدید پر کرنے کا اختیار ہو اور نہ جسے کوئی مخالفت کی قوت۔ مالیات کے ایک فرزانہ نظام نے حکومت کو اسی بات کا موقع دیا کہ آمدنی کی زیادہ سے زیادہ توفیر ہوسکے[1]۔ برک ہارٹ نے لکھا ہے کہ مغرب میں اس وقت تک اس کے مماثل کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دوسرے فریڈرک نے عدل گستری اور نظم و نسق کے اختیارات کچھ اس طور سے ایک مرکز پر جمع کرلیے تھے کہ اس سے پہلے کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ کسی بھی معاملے کو صوابدید و انتخاب پر نہیں چھوڑا گیا تھا، اور اگر کوئی علاقہ ایسا کرتا تو اس علاقے کو تباہ کردیا جاتا اور وہاں کے باشندوں کو بیگار قرار دیا جاتا۔ مالگزاری ایک رجسٹر داخلۂ حقوق اور مسلمانوں کے قائم کردہ ایک طریقے پر مبنی تھی اور اس کو اسی بے رحمی سے وصول کیا جاتا تھا جو مشرق والوں کی طرف منسوب ہے۔ قوم کا کوئی وجود باقی نہیں رکھا گیا، اور صرف رعیت یعنی ماتحتوں کی ایک جماعت رہ گئی۔ اندرونی امن کے لیے

---

[1] برک ہارٹ کی جرمن تالیف "اٹلی کے دور نشأۃ ثانیہ کی تہذیب" صفحہ ۲۔

کوتوالی اور بیرونی حفاظت کے لیے فوج قائمہ کی ایک بنیاد رکھی گئی جس میں عربوں کو ملازم رکھا گیا اور باشندوں کو ہتیار رکھنے کی کوئی اجازت نہ رہی۔[1]

مذکورۂ بالا تصورات میں سے متعدد باقی و برقرار رہے اور اٹلی میں جو مختلف سیاسی وحدتیں یا مملکتیں قائم ہوتی گئیں اِن میں وہ سرایت کرتے چلے گئے۔ ساتھ ہی یہ وحدتیں باہمی تعلقات پیدا کرنے لگیں۔ جیسا کہ برک ہارٹ نے خاصی عمدگی کے ساتھ دکھایا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی ہی میں اٹلی میں شہنشاہوں کی حیثیت حکمرانوں کی نہیں رہی تھی بلکہ وہ مختلف جمہوریتوں کے ایک ممکنہ پشت پناہ بن گئے تھے۔ پوپوں کو اپنی حد تک اتنی قوت حاصل تھی کہ دوسروں کو اتحاد پیدا کرنے سے روک سکیں، لیکن اِن پوپوں میں یہ قوت نہ تھی کہ اپنے شخصی فائدے کے لیے ملک میں وحدت پیدا کرسکیں۔ شہنشاہوں اور پوپوں کے بیچ میں سیاسی اجساد کا ایک سلسلہ پیدا ہوگیا اور مختلف بلدیے اور مطلق العنان علاقے وجود میں آگئے جن میں باہم ہوسناکیوں اور حوصلہ مندیوں کے باعث بہت سے اتحادات اور بکثرت مظاہرات عمل میں آنے لگے۔ آخر کار پانچ بڑی مملکتوں یعنی فلارنس، نیپلز، میلان سینٹ پیٹر کی ذات جاگیر اور وینیس نے سیاسی توازن قوت کا ایک نظام قائم کردیا۔

اس وقت کی صورت حال کا ذکر فرانچسکو گچار دینی نے اپنی کتاب "اٹلی کی تاریخ ۱۴۹۲ء سے ۱۵۳۲ء تک" کے ابتدائی نفیس صفحے میں یوں کیا ہے کہ: "جب اٹلی خوش بختی اور سکون میں مگن تھا تو جنگ نے آکر اس کے آرام میں خلل ڈالا۔

167

[1] برک ہارٹ کی جرمن تالیف "اٹلی کے دور نشاۃ ثانیہ کی تہذیب" صفحہ ۲۔

اس وقت اس کی لطیف صورت حال نے اسے ان مصائب کا زیادہ شدت سے احساس کرا دیا جو اسے ابتدائً برداشت کرنے پڑے تھے۔ حقیقت میں، ایک ہزار سال سے (جب سے کہ رومی شہنشاہیت اس بلند مرتبے سے زوال پذیر ہونے لگی تھی جہاں بیرونی خصال اور بخت و اتفاق نے اسے پہنچا دیا تھا) اٹلی کو وہ سرسبزی اور امن چین کبھی حاصل ہی نہیں ہوئے تھے جن سے وہ ۱۴۹۰ء میں بہرہ ور تھا۔ اس کے تمام صوبوں میں ایک گہرے امن کا دور دورہ تھا۔ اس کے پہاڑ اور اس کے میدان دونوں ہی زرخیز تھے۔ وہ دولتمند اور خوب آباد ہوگیا تھا اور کسی اجنبی تسلط کی اطاعت پر وہ مجبور نہ تھا۔ اس کے طمطراق میں مزید اضافہ یوں ہوگیا تھا کہ اس کے علاقوں میں سے متعدد حکمران خاص امتیازات کے مالک تھے۔ اس کے شہروں میں سے بہ کثرت شہرت اور حسن سے مالا مال تھے؛ اور اس کے مذہب کے مرکز کو خاص جاہ و جلال حاصل تھا۔ علوم و فنون اس کی گود میں پھل پھول رہے تھے۔ بڑے بڑے مدبّر اس کے ہاں تھے۔ اور اس زمانے کے متعدد بہترین سپہ سالار بھی وہیں تھے۔ و اخلی خوش بختی اسے حاصل تھی۔ خارجی امور کی حد تک اجنبی اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں جو امن پایا جاتا تھا، اس کے اسباب مختلف تھے۔ اس سلسلے میں خاص کر (فلارنس کے حکمران) مے دی سیس کے لورانزو کی قابلیت کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ اسی کو اس امن چین کا سب سے مضبوط مددگار خیال کیا جاتا تھا۔ فلارنس کا یہ مشہور باشندہ محض اپنی قابلیت کے باعث، معمولی حالت سے ترقی کرتا ہے، اور اس جمہوریت کا حکمران بن جاتا ہے۔ اس کی قوت کا دارو مدار اس کے علاقے کی وسعت سے زیادہ اس کے محل وقوع، اور اس کے باشندوں کی

دولت و صلاحیت پر تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل اس نے سیاست دانی سے اپنے خاندان کو آٹھویں اِنوسنٹ (پوپ) سے حلیفی پیدا کر کے متحد کر لیا تھا۔ اس پوپ کو مے دی سیس پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اسی کے مشوروں سے حکمرانی کرنے لگا تھا، جس کے باعث مے دی سی کا نام پورے اٹلی میں عزت سے لیا جانے لگا اور عمومی قسم کے مسائل میں جب غور و خوض ہوتا تو اس کی رائے کو بڑی وقعت دی جانے لگی۔ مے دی سیس اور باشندگان فلارنس نے سمجھ لیا تھا کہ اٹلی کی اہم سلطنتوں کو مزید پھیلاؤ سے روکنا چاہیے اور ان کے مابین ایک ٹھیک توازنِ قوت قائم رکھنا چاہیے — مولف کے اپنے (اطالوی) الفاظ ہیں: «تمام وسائل اختیار کر کے اٹلی کی چیزوں میں ایک اس طرح کا توازنِ قوت برقرار رکھنا کہ آیندہ ایک چیز کسی دوسری چیز سے وابستہ نہ ہو جائے» — یہ چیز فلارنس کی حفاظت کے لیے اتنی ہی ضروری تھی، جتنی اس کے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے۔ اس مساوات کو جاری رکھنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ امن کو برقرار رکھا جائے اور ہر اس چیز کو دور رکھا جائے جس سے اس امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔"

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں اٹلی میں چھوٹے پیمانے پر وہی تنظیم پائی جاتی تھی جو بعد میں یورپ میں بڑے پیمانے پر وجود میں آئی۔ فرانسیسی مورخ آں سیوں نے اس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ جالب نظر ہے کہ: "وہاں بکثرت ایسی مملکتیں ایک دوسرے کی ہمسایہ تھیں، جو اپنی بے انتہا عدم مساوات کے باعث ایک دوسرے سے ڈرے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں لیکن ساتھ ہی ان میں اتنی مساوات

168

لہ رشتاری ایمر کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی گفت و شنید مشرق قریبہ سے" جلد ۱ صفحہ ۳۸۔

تھی کہ ہر ایک، دوسرے کے حملے کی مدافعت کر سکتی تھی۔ اور اس امر نے یہ بات سمجھا دی تھی کہ شروع ہی سے احتیاط کے اصول پر کار بند رہیں، جس سے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ اور یہ اصول بعد میں اس چھوٹے دائرے سے نکل کر ایک زیادہ وسیع دائرے میں جاری ہو گئے۔ قدیم یونانی سلطنتوں کے نمونے پر اٹلی کی سلطنتیں ایک دوسرے پر چوکسی اور رشک سے نگاہ رکھتی تھیں۔ اور چاہے اپنے مفادات اور اپنی قوتوں کو متحد کریں یا منقسم، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنا استقلال اور خود مختاری باقی رکھیں۔ چنانچہ، جب جنوبی مملکتوں نے (میلان کے ڈیوک) لوڈوِک لے مورے کے خلاف جتھا بندی کی تو اس کو توقع تھی کہ اسے بھی شمالی مملکتوں کی حلیفی حاصل ہو جائے گی اور فے نیس، فیرارے، بولونیا، مودانیا اور مانتوا کی ریاستوں کے اتحاد نے نیپلز، فلارنس اور کلیسائی ریاست کی مجموعی قوت کو ترازو کے پلڑے میں اپنے ساتھ متوازن کر دیا۔[1]

سولھویں صدی کے آغاز میں توازن قوت کے اصول کا مغربی یورپ پر اطلاق کیا گیا۔ فرانسس بیکن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "آٹھویں ہنری اور پہلے فرانسوا اور شارل کِن کے مثلث کا مقصد یہ تھا کہ ان حکمرانوں میں سے کوئی بھی کسی مٹھی بھر زمین پر قبضہ کر لے تو باقی دونوں حکمران یورپ میں توازن کی بحالی کے لیے کوشش کریں۔[2] اس بڑے انگریز نے اپنی نادر تہ بینی سے اس سہ گانہ سیاست کو اس سیاست کے قائل ٹھیرا دیا ہے جس کی

169

---

[1] - آن سیقون کی فرانسسی کتاب "یورپ کے سیاسی نظام کے انقلابوں کی جدول" جلد ۱ صفحہ ۲۶۲۔

[2] - فرانسس بیکن کی انگریزی کتاب "اسپین سے جنگ ہونے کے متعلق ملحوظات" جلد ۲ صفحہ ۳۰۴۔

(حوالہ اس کے مجموعۂ تالیفات کا دیا گیا ہے۔ یہ ۱۸۲۴ء میں لندن میں چھپا تھا)۔

ستایش گچار دینی نے کی تھی۔

جلدی ہی شارل کین پر زور و شور سے یہ الزام لگایا جانے لگا کہ وہ ایک عالمگیر بادشاہت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک اس کا ذکر کرنے لگے۔ اصلاح پسند تشونگلے نے اس بادشاہ کے ہوسناک ارادوں کو مردود ٹھیرایا، اور [جرمن ریاست] ہیسے کے حکمران کا ہمنوا بن گیا۔ یہ حکمران بادشاہوں کو بھڑکانے لگا۔ اور تشونگلے نے جمہوریتوں کو بھڑکانے کا فریضہ اپنے ذمے لیا۔ ۱۵۲۹ء میں فرانسیسی سفیر روما نے لکھا تھا کہ: "پوپ اور روما کا پورا دربار اس امر کا بڑا شبہہ رکھتے ہیں کہ شہنشاہ ایک مطلق العنان بادشاہت کی طرف میلان رکھتا ہے"۔ خود شارل کین کے حاشیہ نشین اس خواب کے مزے لے رہے تھے۔ اور ہرناندو دے آکونیا نے جو سپاہی بھی تھا شاعر بھی، (اسپینی میں) یہ گیت گانا شروع کیا کہ آسمان نے زمین سے وعدہ کیا ہے کہ:-

"ایک بادشاہ، ایک حکومت اور ایک تلوار"

کسی ایک کے سب پر چھا جانے میں جو خطرہ تھا اس کے باعث ہر قسم کے اتحاد اور ہر قسم کی حلیفیاں مناسب خیال کی گئیں۔ ساتھ ہی ایک نیا واقعہ یعنی مذہبی اصلاح کی تحریک وجود میں آئی، جس کے باعث بکثرت رجحانات حرکت میں آنے لگے۔ جیسا کہ شِلر نے بتایا ہے، کیا مذہبی تصورات نے مختلف ملکوں کے لوگوں اور مختلف حکومتوں کی رعایا میں ربط نہیں پیدا کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھے؟ یہ جھگڑا دو بڑی سلطنتوں میں مستقل طور پر قائم ہوگیا یعنی فرانس کا گھرانا اور آسٹریا کا گھرانا۔ جب شارل کین معزول ہوگیا تو آسٹریا کا گھرانا دو شاخوں میں بٹ گیا۔ ایک اسپینی شاخ تھی جو اسپین، نیپلز، صقلیہ، نشیبستان یعنی ہالینڈ آزاد کونٹی، شرق الہند اور غرب الہند پر حکمران تھی۔ دوسری

آسٹروی شاخ جو موروثی علاقوں، بوہیمیا، ہنگری اور آلزاس پر حکومت کرتی تھی، اور تاج شہنشاہی بھی اسی کے پاس محفوظ تھا۔ فرانس ان دونوں شاخوں سے لڑتا رہا اور اگرچہ نتھے ہنری کے زمانے میں وہ اسپینی شاخ پر غالب آگیا تو، رشلیو کی وزارت کے زمانے میں اسے آسٹروی شاخ پر تفوق حاصل ہوگیا اور مازارین (مازارینی) کی وزارت کے زمانے میں فرانس نے اسپینی اور آسٹروی شاخ ہردو پر بیک وقت حملہ کردیا۔

اس پورے زمانے میں توازن قوت کو برقرار رکھنا سیاسی دنیا کے مسلسل پیش نظر رہا۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مملکت اپنا اپنا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ انگلستان کا جو فریضہ تھا، اس کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب گی نے کے مقام پر آٹھویں ہنری اور پہلے فرانسوا نے باہم ملاقات کی اور ایک انگریز تیر انداز اور کتبۂ ذیل نے اس کی نمایندگی کی:—

"جو عہد کو وفا کرتا ہے، وہ سردار بنتا ہے"

170 جرمنی کے پروٹسٹنٹ حکمران اپنی حد تک کچھ اور ہی فرائض انجام دینے لگے۔ اور صوبہ جات متحدہ نے اپنے برتاؤ کے لیے ایک معقول اصول طے کرلیا تھا۔ مشرق میں تین مملکتیں تھیں جن کو سدِ مشرقی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کی مدد سے فرانس نے آسٹریا کو دو طرف سے گھیر لیا تھا جب کہ وہ خود آسٹریا اور اسپین میں گھرا ہوا تھا۔ اس سے مراد ایک تو سویڈن ہے جو شمال میں واقع ہے دوسرے ترکی جو جنوب میں اور تیسرے پولینڈ جو وسط میں۔

دوسروں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ بھی خصوصیت کے

لہ۔ فرانسیسی کتاب "ان ہدایات کا مجموعہ جو فرانس کے سفیروں اور منتظمین سفارت کو صلحنامہ ہائے ویسٹ فالیا سے انقلاب فرانس تک دیے جاتے رہے"، حصۂ روس مع تمہید وحواشی از راں بو جلد (۱) صفحہ ۱۱۔

حالی اور سبق آموز ہیں۔ انگریز مورخ ولیم کامڈن نے جو تصویر کھینچی ہے اس سے اس حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ فرانس اور اسپین یورپی ترازو کے دو پلڑے ہیں اور انگلستان اس کا کانٹا یا وزن نما۔

۱۶۶۳ء میں جنیوا میں ایک فرانسیسی کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام "مملکت کا پارہ (سیماب) یا مملکت کے متعلق مختلف مقالات کا مجموعہ" تھا۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ "وہ دو بڑی سلطنتیں جو اپنے آپس کے توازن کے لیے عیسائی دنیا کے لیے دیگر حکمرانوں سے کام لے رہی ہیں، وہ فرانس اور آسٹریا کے گھرانے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ تنہا ممالک ہیں جو دوسروں کی مدد کے بغیر جنگ کر سکتے ہیں، اور جتنا چاہیں اس کو جاری رکھ سکتے ہیں اور جس کے لیے ان کو آدمیوں یا روپیوں کی کوئی کمی نہیں" اس زمانے میں ژوآں کے ڈیوک آں ری نے جو کالفی نیوں کا سابق میں سردار تھا اور جس نے ژوشیل پر قبضے کے بعد ثے نیس میں ملازمت اختیار کرلی تھی اور آخر میں تیرھویں لوئی کی طرف سے سوئٹزرلینڈ میں اور علاقۂ گیری زوں میں سفیر مقرر ہوا تھا، اس نے فرانسیسی میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "عالم عیسائیت کے حکمرانوں اور مملکتوں کا مفاد" تھا۔ اس کتاب میں لکھا ہے: یہ امر بطور بنیاد پیش کیا جانا چاہیے کہ عالم عیسائیت میں دو سلطنتیں ہیں جن کو دو قطب قرار دیا جا سکتا ہے اور انھیں سے باقی تمام مملکتوں پر امن یا جنگ کے اثرات نازل ہوتے ہیں یعنی فرانس اور اسپین کے شاہی گھرانے۔ اسپین کا خانوادہ چونکہ یک بیک بام عروج پر پہنچ گیا ہے اس لیے وہ اپنے اس منصوبے کو چھپا نہ سکا کہ وہ اپنے کو آقا بنانا اور مغرب میں ایک نئی بادشاہت کا آفتاب طلوع کروانا چاہتا ہے۔ فرانس کا گھرانا بے اعتدالی کے ساتھ اس کا رد عمل کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ باقی دوسرے حکمران اپنے اپنے مفاد کے مطابق انھیں دونوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔"

"قانونِ بین الممالک کے مولفوں نے فوراً ہی توازنِ قوت کے مسئلے سے بحث شروع کردی۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ وہ سیدھا سادہ سوال تھا کہ اگر کوئی مملکت حد سے زیادہ ترقی کرنے لگے تو اس کا مقابلہ جائز ہے۔

171

جنتی لیس نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اس کی رائے میں چونکہ ترک اور اسپینی عالمگیر تسلط کی دھن میں ہیں، اس لیے اگر دوسری قومیں ان پر حملہ کریں تو وہ بالکل حق بجانب ہوں گی چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں: "ایک طرف ترک اور دوسری طرف اسپینی اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہر جگہ انھیں کا تسلط چھا جائے اور اس کے لیے سخت جد و جہد کر رہے ہیں۔ کیا ان کا مقابلہ کرنا سراسر جائز نہ ہوگا؟... علاوہ برآں یہ بہتر ہے کہ لوگوں کو بے انتہا طاقتور ہونے ہی نہ دیا جائے بجائے اس کے کہ بعد میں کسی طاقتور شدہ قوم کے خلاف تدارک کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔[1]" لہذا یہ امر قابل ترجیح ہے کہ کسی کے حد سے زیادہ قوت حاصل کرنے کا پیشگی ہی سد باب کردیا جائے نہ یہ کہ بعد از وقت اس کا علاج سوچیں۔ اس رائے کا انگلستان میں بڑا غلغلہ رہا۔ اور اسی سے وہ اپنی سیاست میں کام لیتا رہا۔ نبیوسٹ کلف جیسی قابل شخصیت نے، جو دینیات کی بھی ماہر تھی اور قانون کی بھی، اس بات کی تائید کی کہ حکمرانوں کو اس بات کا حق ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بڑھنے کو تاکتے رہیں۔ اس سلسلے میں وہ گیارھویں لوئی کی اور میدی سیس کے لوران کی مثال دیتا ہے "جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اٹلی کی تمام مملکتوں میں توازن قائم کردیا تھا۔" اور اس مولف نے اس طرز عمل کو خوب بجانب قرار دیا ہے جو نشیبستان (ہالینڈ) کے متعلق الزابتھ نے اختیار کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اب

---

[1] جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب اول باب (۱۴)۔

وقت ہے کہ عیسائی حکمران بیدار ہوں۔ اسپین میں جو غصب اور لوٹ مار ہو رہی ہے، اس کا مقابلہ کرنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ اسپین رومن کیتھولک مذہب کو بہانہ بنا کر اپنے ہمسایوں کو اپنے غصب اور لوٹ مار کا شکار بنا رہا ہے، تا آنکہ وہ اسپینی قوم کے ہوسناک ظلم کے نہ بھرنے والے پیٹ میں سما نہ جائیں۔[1]

یہی نظریہ فرانسس بیکن کی تالیف میں نظر آتا ہے جو اسپین کے خلاف جنگ کے جائز ہونے کے متعلق لکھی گئی تھی۔ یہ تالیف سنہ ۱۶۲۴ء میں بادشاہ چارلس کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی۔ بیکن نے اس تالیف میں اس بات کا خلاصہ دیا ہے کہ اسپینی سلطنت کس طرح جزیرہ نمائے اندلس، نیپلز، میلان، اور شرق الہند و غرب الہند پر پھیل گئی اور اس بات کے منصوبے پکانے لگی کہ پیکاردی، بریٹنی، پی اے موں، ڈالٹ لین اور پالاتینا کو فتح کرلے۔ بیکن اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جنگ کا واجبی خطرہ ہو تو وہ جنگ کی جائز وجہ بن سکتا ہے۔ اور انسدادی جنگ، حقیقت میں دفاعی جنگ ہوتی ہے۔

گروٹیوس نے سنہ ۱۶۲۴ء میں جو کتاب لکھی اس میں اس نے توازن قوت کو تسلیم نہیں کیا ہے، یا کم از کم اس نے یہ امر بالکل تسلیم نہیں کیا ہے کہ اگر کوئی سلطنت ترقی کر رہی ہو اور وہ زیادہ پھیل جائے اور اس کے ضرر رساں بن جانے کا اندیشہ ہو تو اس سلطنت کا خاتمہ کر دینے کے لیے ہتیار اٹھانا جائز ہو سکے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: "محض ہم پر حملے کا امکانات ہیں اقدام کرنے کا

172

[1] ماتھیو سٹ کلف کی انگریزی کتاب "ہتیاروں کا چلانا اور استعمال کرنا اور ہتیاروں کے قوانین جو نہایت بہادر اور ماہر کپتانوں کے طرز عمل سے ماخوذ ہیں اور جن کی قدیم اور جدید ہر دو قسم کی مثالوں اور نظریوں سے توثیق ہوتی ہے" مطبوعہ لندن سنہ ۱۵۹۳ء۔

حق دیدے تو یہ ہر اصول انصاف کے خلاف ہوگا۔ انسانی وجود کچھ اس طور سے ہے کہ ہم کبھی بھی اپنے آپ کو مکمل طور سے محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف خدا کا فضل اور غیر اقدامی پیش بندیاں ہیں نہ کہ قوت کا استعمال جس کے ذریعے سے غیر یقینی خطرات کے خلاف اپنی حفاظت کی کوشش کی جانی چاہیے۔"

سترھویں صدی کے آخری حصے میں سامویل پوفندورف[1] نے یہ لکھا تھا کہ: "کسی ہمسایے کی طاقت یا ترقی سے جو خطرہ لاحق ہوتا ہے، وہ جنگ کا اس وقت تک جائز موضوع نہیں بن سکتا جب تک کہ اس بات کا اخلاقی طور سے یقین نہ حاصل ہو جائے کہ وہ ہمسایہ ہمارے خلاف مخفی طور سے برے منصوبے گانٹھ رہا ہے۔" اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مضرت ابھی پہنچائی ہی نہیں گئی ہے اس سے بھی بعض وقت ہتیار اٹھانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے جس طرح کہ اس مضرت کی صورت میں جو پہنچائی جا چکی ہو۔ محض شبہہ بھی پیدا ہو جائے تو ہمیں احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کا حق پیدا ہو جاتا ہے۔"

[1] ۔ پوفندورف کی کتاب "قانون قدرت اور قانون بین الممالک" کا فرانسیسی ترجمہ از باربئی راک کتاب ہشتم، باب (۶)، فصل (۵)۔

باب نہم

جائز جنگ

جو جنگ، جائز وجوہ کی بنا پر کی جائے وہ جائز جنگ ہے۔ اور صرف جائز جنگ ہی سے حقوق حربیت حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا جنگ ہر دو فریق کے لیے جائز ہوسکتی ہے؟ دوسرے الفاظ میں باہم مقابلہ کرنے والے فریق کیا یکساں طور سے حقوق حربیت کا استعمال کرسکتے ہیں؟ عام طور پر مولفوں نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے البتہ رافائل فل گوسے اور آندرے آلسیا نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ جنتی لیس ہر دو فریق کو حقوق حربیت حاصل نہ ہونے کا خیال ظاہر کرتا ہے۔ آیالا کو اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ فل گوسے اور آلسیا کا ہمنوا ہو جائے۔ آیالا نے اس مسئلے کے صحیح صحیح حدود معین کردیے ہیں اور اس نے واضح کیا ہے کہ لفظ "جواز" کے دو معنے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جو چیز باضابطہ طور سے کی جائے۔[1] اسی خیال کی تائید دو صدیوں بعد فاتل نے

---

[1] آیالا کی لاطینی کتاب "حقوق وواجبات جنگ اور فوجی ضبط و نظم" کتاب اول، باب دوم، ۲۵۔

بھی کی اور بیان کیا کہ اگر دونوں فریقوں کے لیے جنگ جائز نہ ہو تو بھی بیرونی اثرات کی حد تک، جنگ کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس وقت تک کہ جنگ کی اصل وجہ کا تسویہ نہ ہو جائے۔

مذہبی قانون نے یہ اصول مقرر کیا تھا کہ جو ناجائز جنگ کا بانی ہوگا، اسے ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ لاطینی قاعدہ یہ ہے: "جو ناجائز جنگ کا محرک ہوگا، اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس چیز کو واپس کردے جس پر اس نے جبر کے ذریعے سے قبضہ کیا ہو۔ اور یہ ان لوگوں کو دلادی جائے جن سے وہ قانونی حقیقت کے بغیر، جبراً لے لی گئی تھی۔"[1] چنانچہ مفتوح [؟ فاتح] اور فوج میں بھرتی ہونے والے سپاہی ہر دو کے متعلق ایک فریضہ یا ذمہ داری عائد ہوگئی۔ چنانچہ ان میں سے ایک کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ اپنی فتح کے ذریعے سے اس نے جو چیز پیدا کی ہو، وہ واپس کردے۔ اور دوسرے کے لیے ضروری ہوگیا کہ اس نے جو وفاداری کا حلف اٹھایا تھا، اس سے وہ بری قرار پا جائے۔ قانون مذہبی کے ماہروں میں سے سب ہی یہ قاعدہ بیان کرتے ہیں۔ سوسے کے ہنری نے ناجائز جنگ کے بانی کو اس تمام مضرت کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو فریق ثانی یا اس کے اپنے آدمیوں کو خود اس بانیٔ جنگ یا اس کے آدمیوں نے پہنچائی ہو۔ اس مولف نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ خود اس کے اپنے آدمیوں کو دشمن سے جو مضرت پہنچے اس کا بھی اسی سے مواخذہ ہوگا۔ فرانسوا آریا یہ بیان کرتا ہے کہ ناجائز جنگ کا بانی اس تمام مضرت کا ذمہ دار ہوگا جو اس نے خود اپنے فعل یا اپنی مدد یا اپنے مشورے سے پہنچائی ہو۔[2]

174

[1] "نویں گریگری کے احکام" جلد (۲) عنوان (۳۴) "حلف اٹھانے والے" باب (۲۹)۔

[2] فرانسوا آریا کی لاطینی تالیف "در جنگ اور اس کے جواز کے متعلق رسالہ"۔ دیکھیے

اسی قسم کے خیالات میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ مختلف مولف اس امر کی بھی تحقیق کرتے ہیں کہ جنگ کے جواز کے متعلق کس درجے کا یقین ان لوگوں کے دلوں میں پایا جائے جو اس جنگ میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتے ہوں۔ سولھویں صدی عیسوی کے، جواز و عدم جواز کی بحثیں کرنے والے مولفوں نے اس نکتے پر طرفدارانہ طور سے بحث کی ہے۔ کلوڈ ژولی ایک فرانسیسی مولف تھا جو پاریس کے کلیسائے نوتردام کا کپتان یا صدر پادری تھا۔ اس نے سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں فرانسیسی میں "بڑوں کی طرف سے مقبوضہ اشیاء کی واپسی کے متعلق رسالہ" تالیف کیا تھا۔ کلوڈ ژولی نے ہمیں بتایا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق جواز و عدم جواز کی بحثیں کرنے والے علماء کا عام خیال کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ جو اجنبی سپاہی تنخواہ دے کر نوکر رکھنے کے لیے کوئی حکمران بلائے تو ان کو اس کی اجازت نہیں کہ جنگ کے جائز یا ناجائز ہونے کی تحقیق کیے بغیر اس کی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ ماتحت حکمران اور رعایا کو اس کی پابندی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی تحقیق کریں بلکہ انھیں صرف یہ چاہیے کہ اپنے آقا کی اطاعت کریں[له]۔ فرانسوا دے ڈی توریا نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ کوئی جنگ ہمیشہ صرف اس بنا پر جائز نہیں ہو جاتی کہ فریق جنگ اس کو جائز خیال کرتا ہے۔ ڈی توریا کے نزدیک یہ مناسب ہے کہ ہر ہر صورت کے متعلق احتیاط کے ساتھ جنگ کے منصفانہ یا غیر منصفانہ ہونے کی تحقیق کی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس کی تجویز تھی کہ ایسے لوگوں کی رائے لی جائے جو عقلمند اور تجربہ کار ہوں اور کسی نفرت، کسی غصے اور کسی لالچ کے بغیر آزادی کے ساتھ بول سکتے ہوں۔ ڈی توریا کا خیال ہے کہ اگر کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ* "رسائل حقوق عمومی" جلد (۱۶) ورق (۳۲۵)۔

له۔ کلوڈ ژولی کی فرانسیسی تالیف "بڑوں کی طرف سے مقبوضہ اشیا کی واپسی کے متعلق رسالہ" ص ۱۱۷۔

جنگ کا غیر منصفانہ ہونا علانیہ طور پر ظاہر ہو تو رعایا اس کے لیے ہتیار اُٹھانے کی مجاز نہیں۔ بادشاہ کو چاہیے کہ ملک کے ممتاز لوگوں کی رائے لے۔ اور جب یہ لوگ اپنا فیصلہ صادر کردیں تو پھر ملک کے وہ چھوٹے افراد جنھیں مقتدر اعلیٰ کے ہاں بار حاصل نہ ہوسکتا ہو، ان معززین کے فیصلے کو جنگ کے جواز کے متعلق تسلیم کریں۔ اور اس بارے میں انھیں ضمیر کی کوئی خلش باقی نہ رہے۔

175

سواریثس نے بھی اسی نظریے کی تائید کی ہے اور وہ تنخواہ یاب اجنبی سپاہیوں پر یہ سخت فیصلہ عاید کرتا ہے کہ وہ جنگ کے منصفانہ ہونے کی اپنے طور پر تحقیق کرلیں۔

جاگیر داریت کے حامی اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ماتحت حکمران کے فوجی واجبات کیا کیا ہیں۔ لاطینی "تالیف" جاگیرداروں کی کتاب" نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ: "جو ماتحت حکمران یہ جانتا ہو کہ اس کا آقا جائز جنگ کر رہا ہے یا اُسے اس جنگ کے متعلق محض ایک شک ہی شک ہو، تو اسے مدد دینی واجب ہے۔ لیکن جب یہ امر ظاہر ہو کہ اس کا آقا بے وجہ جنگ کر رہا ہے تو ماتحت حکمران اس کی حفاظت و مدافعت تو کرسکتا ہے، لیکن دوسروں پر حملہ کرنے کے لیے اس کی مدد نہیں کرسکتا۔[1]"

مولفوں نے عام طور پر یہی رائے تسلیم کی ہے۔ اس طرح ماتحت حکمران پر اپنے مقتدر اعلیٰ کی مدد کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ صرف اس صورت میں باقی نہیں رہتا جب کہ جنگ کا غیر منصفانہ ہونا علانیہ طور پر ظاہر ہو۔ گوڈیئن نامی ایک بلجیمی مولف نے لاطینی میں لکھا ہے کہ "اگر کسی کو اس میں شبہہ ہو تو دوسری بات ہوگی؛ ماتحت کو حجت کرنے کا حق نہیں۔ شبہے کی صورت میں یہ تصور کرلینا چاہیے کہ

[1] لاطینی کتاب "جاگیرداروں کے رواج" جلد (۲) عنوان (۲۸)۔

آقا نے جس جنگ کا اعلان کیا ہے، وہ جائز ہے[1]۔ اونورے بونے کا نظریہ کسی قدر مختلف تھا، لیکن اس کے خیال میں کسی اقدامی جنگ میں خواہ وہ کتنی ہی جائز کیوں نہ ہو، بادشاہ اپنی رعایا سے اس کا مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے مصارف آپ برداشت کر کے اس کی مدد کرے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: "اگر بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ کسی کے خلاف اقدام کرے یا کسی حکمران کے خلاف جنگ کرے، تو چاہے وہ کتنی ہی منصفانہ کیوں نہ ہو اس کے لوگوں پر یہ فریضہ عاید نہیں ہوگا کہ اس کی مدد اپنے مصارف پر کریں۔ کیونکہ اقدام کا محض منصفانہ ہونا کوئی ایسا بڑا حق نہیں پیدا کرتا کہ مصارف کا بار بھی انھیں پر ڈالا جائے"[2]۔ ان الفاظ کے سلسلے میں یہ واقعہ ملحوظ رہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے "خوبصورت فلپ" نے اپنی اس رعایا کے ہرجے کی تلافی کی تھی جن کی جائداد فلانڈرس اور ایسے صوبوں میں واقع تھی جن پر فلانڈریوں نے ہلہ بول دیا تھا۔ اور وہ تلافی یہ تھی کہ شہامت بازوں کو آمدنی کا نصف اور دیگر جاگیرداروں کو تہائی معاوضہ دلایا جائے۔ چند عام شہری بھی ان معاوضوں سے مستفید کیے گئے۔ یہ معاوضے گرفتار شدہ مالِ غنیمت اور فلانڈریوں کی ضبط شدہ جائداد سے دلائے جانے طے ہوئے۔ لیکن انھیں عارضی طور سے سرکاری خزانے ہی سے ادا کر دیا گیا تھا[3]۔

---

[1] پیئیر گودیلیں کا لاطینی رسالہ "جاگیرداروں کے حقوق کی تشریح" حصۂ چہارم باب (۲)۔

[2] اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب (۲)۔

[3] بوتاریک کا فرانسیسی رسالہ "فرانس، خوبصورت فلپ کے زمانے" ص ۳۷۶۔

176

باب دہم

جنگ کا اعلان

رومی نظریے کے مطابق جنگ سے پہلے اس کا مطالبہ ہو چکنا چاہیے کہ تلافی عمل میں لائی جائے۔ نیز جنگ کا اعلان بھی کیا جائے۔ ان دو شرطوں کی موجودگی ہی میں جنگ جائز ہوتی۔

باضابطگی کا یہ تصور، قرون متوسطہ کے تمدن میں بحیثیت مجموعی تو سرایت نہیں کر سکا البتہ اس زمانے میں اس کا ایک جزء قبول کیا گیا۔ چنانچہ مولفوں کی اکثریت یہ رائے رکھتی نظر آتی ہے کہ جنگ کا اعلان کرنا ضروری ہے۔ سسیرو نے رومی نظریے کی اپنے لاطینی رسالے "متعلق بہ واجبات" اور اپنے رسالے "متعلق بہ جمہوریت" میں توضیع و تدوین کی ہے۔ اسی آخر الذکر کتاب کے حوالے سے یہ چیز قرون متوسطہ کے ماہرین قانون کے ہاں چل پڑی، براہ راست نہیں —— رسالہ "متعلق بہ جمہوریت" بارھویں صدی عیسوی کے بعد بالکل ناپید ہو جاتا نظر آتا ہے —— بلکہ اِشبیلیا کے اسی دور کی

لاطینی کتاب "فقہ اللغہ" کے ذریعے سے[1]۔ جنگ کا اعلان کرنے کی ضرورت ایک ایسا قاعدہ تھا جسے ماہرین قانون نے اس لیے بھی رغبت کے ساتھ قبول کیا کہ وہی چیز خانگی جنگوں کے متعلق شہنشاہی احکام میں بھی ضروری قرار دی گئی تھی۔ اِتمامِ حجت کر لینے کو ملکتوں کے مابین ہونے والی جنگوں کی حد تک بھی وسیع کر دیا گیا۔

بالدے کی رائے میں یہ ایک قسم کی غداری ہے کہ دشمن کو پیشگی اطلاع دیے بغیر ہتھیار اُٹھائے جائیں۔

177 کونارد براؤن کو اس امر پر اصرار ہے کہ اطلاع پیشگی طور سے دی جانی چاہیے اور یہ اطلاع اس طلبنامے سے مشابہ ہوتی ہے جو دیوانی مقدمے میں بھیجا جاتا ہے[2]۔

بیئیر بلی اس بارے میں صراحت سے رائے ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں یونانیوں اور رومیوں کا نیز [معاملات خارجہ کے ذمہ دار] فیتیالی پجاریوں اور سسیرو کے قطعی بیان کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جنگ کا اعلان صاف و صریح طور سے کیا جانا چاہیے۔ اس مولف نے یہ سوال کیا ہے کہ جنگ کا اعلان کرنے اور مخاصمانہ کارروائیوں کے شروع ہونے میں کتنا وقفہ گزرنا چاہیے؟۔ وہ کسی معیّن مدت کا حامی نہیں ہے، لیکن اس کی رائے ہے کہ فطری معقولیت کا تقاضا ہے کہ اعلان جنگ اور استعمال قوت کے درمیان ایک وقفہ پایا جائے[3]۔ مزید برآں بلی نے گوی ڈلاپاپ کی رائے بھی نقل کی ہے جو تین دن کی مدت کا طرفدار ہے۔ ہمارا یہ منشا نہیں کہ

---

[1] دیکھیے اوپر اصل کتاب کا ص 99

[2] کونارد براؤن (کونارڈوس برونس) کی لاطینی کتاب "سفیروں کے متعلق" کتاب سوم باب (۸)۔

[3] بلی کی لاطینی کتاب "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصۂ دوم عنوان ۸۔

اس قاعدے میں کوئی استثنا تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس صورت میں اعلان جنگ کی کوئی حاجت نہیں جب یا تو بحری قزاقوں سے سابقہ ہو (جن کو ہمیشہ کے لیے مطرود سمجھا جانا چاہیے) یا ایسے لوگوں سے جن کے متعلق شہنشاہ یا پوپ نے باضابطہ طور سے اعلان کردیا ہو کہ وہ دشمن عمومی ہیں یا ایسے ماتحت لوگوں یا حلیفوں سے سابقہ ہو جو کسی ایسے شخص کو مدد دے رہے ہوں جس کے خلاف اعلان کیا جا چکا ہو۔

البیریکس جنتی لیس نے لنّی سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ رائے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک تیس دن کی مدت گزرنی چاہیے۔ جنگ کا اعلان کرنے کا رواج عملدرآمد سے خارج ہو گیا۔ براؤن نے اس کا پہلے ہی اعتراف کر لیا تھا۔ جنتی لیس نے زور و شور کے ساتھ اس پر احتجاج کیا اور اس بات کی تائید کی کہ جس چیز کو قانون بین الممالک نے قائم کیا تھا اور جس چیز کا خدا نے حکم دیا تھا وہ منسوخ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ لاطینی میں وہ کہتا ہے کہ "اور یہ حق منسوخ نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ہم ان کا لحاظ ہوتا دیکھتے ہیں جیسا کہ ہم تاریخ میں اکثر پڑھ سکتے ہیں۔ پھر وہ حق جو قانون ربانی کے تحت حاصل ہوں کیسے منسوخ ہو سکتے ہیں"[1]۔ جن وجوہ سے جنتی لیس اعلان جنگ کے کیے جانے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس میں یہ امر مضمر ہوتا ہے کہ تلافی کرنے کے لیے ایک مہلت دی جائے اور اس طرح باہمی صفائی اور مصالحت کا ایک آخری اور انتہائی ذریعہ مہیا کیا جائے۔ ماتھیوسٹ کلف کی یہ رائے ہے کہ جو اعلان جنگ کسی چھنے ہوئے اسباب کی واپسی یا تلافی کے مطالبے کی شرط میں مضمر ہو، تو اس کی ضرورت اس صورت میں

[1]۔ جنتی لیس کی لاطینی کتاب "قانون جنگ" کتاب دوم باب اول۔

باقی نہیں رہتی جب کسی پر خود حملہ کر دیا گیا ہو۔ اس زمانے میں اس کے وطن انگلستان کی حالت یہ تھی کہ دوسرے فلپ سے کسی جنگ کا اعلان ہوئے بغیر حالت مخاصمت قائم تھی۔ اور یہی مثال اس کے پیش نظر ہوتی ہے، اور وطن پرستانہ نیز پروٹسٹنٹانہ جوش میں وہ اس پر آمادہ ہوجاتا ہے کہ اسپین کی کارروائیوں کے خلاف پرزور تنقید کرے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اس نے جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اور ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے کہ انگریز ملحد ہیں اور یہ کہ پوپ نے ان کو جات باہر کرنے کا جو حکم دیا وہ دوسرے فلپ کی نظروں میں ایک کافی اعلان جنگ ہے۔" وہ طنز سے پوچھتا ہے کہ "کیا اس کو الفونسو دے کاسترو کی اجازت حاصل نہیں کہ ملحدوں کے خلاف جنگ کرنی درست ہے؟ کیا بلتازار دے آیالا کی، جو اسپینیوں میں ایک بڑا شخص تھا، اور نیز کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کی تائید حاصل نہیں جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ ملحدوں سے وعدہ وفائی ہرگز نہیں کرنی چاہیے؟"

178

جہاں تک عمل کا تعلق ہے بارھویں صدی عیسوی سے جنگ کا اعلان کرنا عام ہوگیا اور یہ یا تو سفیروں کے ذریعے سے عمل میں آتا تھا یا خطوط کے ذریعے سے۔

یہ چیز دیکھنے میں آئی تھی فریڈرک باربروسہ نے سلطان صلاح الدین سے تلافی کا مطالبہ کیا تھا، اور یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ تلافی کرنی نہ چاہے تو وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ چنانچہ مورخ نے لاطینی میں لکھا ہے "چونکہ شہنشاہ اپنی طرف سے کمزوری دکھانا گوارا نہیں کرتا تھا بلکہ ہمیشہ اپنی فوجوں کو جنگ کرنے کا اشارہ کرتا رہتا تھا اس لیے شہنشاہ نے صلاح الدین کے ہاں ایک پیام رساں بھیجا کہ یا تو وہ ان مضرتوں کی پوری تلافی عمل میں لائے جو عیسائیوں کو عام طور پر پہنچائی گئی ہیں یا اگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو جنگ کے لیے تیار ہوجائے۔"

بہر حال فریڈرک باربروسہ نے ۱۱۸۶ء میں نورمبرگ کی مجلس شورائے قومی میں "جو شہنشاہیت کا امن" قایم کیا تھا، اسی سے وہ تصور پیدا ہوا جو ہمیں بعض مولفوں کے ہاں نظر آتا ہے، اور جس کے مطابق دشمن کو تین دن کی مہلت دی جانی چاہیے۔ خانگی جنگ کے متعلق احکام دیتے ہوئے شہنشاہ نے ہر ایک کے لیے یہ حق محفوظ کر دیا تھا کہ اپنا انصاف آپ کرے بشرطیکہ تین دن پہلے اس کی اطلاع کر دی گئی ہو۔

"این بوک" بروسیل کے کتب خانۂ شاہی کے نفیس ترین مخطوطات میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں گل رے نے ہتیاروں کا ذکر کیا ہے اور گلدر کے ڈیوکوں کے ہتیاروں کا اسے نقیب کہا جا سکتا ہے۔ ("گل رے یا گلدرے کا نقیب" کی اصطلاح اسی طرح برتی جاتی تھی جس طرح "صقلیہ کا نقیب" اور "نوار کا نقیب" کی اصطلاحیں)۔ اس کتاب میں خاص کر وہ دلکش نظمیں بھی پائی جاتی ہیں جو "نیچی جرمن بولی" میں لکھی گئی ہیں اور جو پورا علاقہ گل رے اپنی شریف گڑھیوں میں گایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک نظم میں اس اتمام حجت کا ذکر ہے جو ۱۳۳۲ء میں برابان کے ڈیوک تیسرے ژاں سے ان جاگیرداروں نے کر لیا تھا جنھوں نے فالوا کے فلیپ کو خوش کرنے کے لیے اس (ژاں) کے خلاف حلیفی قائم کر لی تھی۔

آرتوا کے تیسرے روبیر نے، جو بوموں کا کونٹ بھی تھا، اپنی چچی ماتلدا سے آرتوا کی ایک کونٹی (جاگیر) کے متعلق جھگڑا مول لیا تھا۔ وہ اپنے مقدمے میں ہار گیا تھا۔ چند سال کے گزرنے کے بعد اس نے ایک نئی کارروائی کا ارادہ کیا۔ اور اس مرتبہ اس نے اپنی تائید میں بعض اہم دستاویزیں بھی فراہم کر لی تھیں۔ ان کو جعلی قرار دیدیا گیا تھا، اور جن اصل لوگوں نے اسے مرتب کیا تھا ان کا پیچھا کیا گیا اور ان کو مطعون قرار دیا گیا تھا۔ روبیر کو عدالت امراء میں

طلب کیا گیا وہ برایان کے ڈیوک کے علاقے میں جا پناہ گزین ہوگیا اور اس نے یہ استدعا کی کہ اس معاملے کو ختم کر دیا جائے۔ آخر کار قصور کے باعث اسے جلاوطنی اور اس کی تمام جائداد اور دیگر حقیتوں کی قرقی اور ضبطی کی سزا دی گئی۔ فرانس کے بادشاہ نے تیسرے ژاں سے جو برابان کا ڈیوک تھا، یہ مطالبہ کیا کہ وہ ڑوبئیر کو اپنے علاقے سے نکال باہر کرے۔ لیکن اس نے اس استدعا کا سختی کے ساتھ انکار میں جواب دیا تھا۔ اس پر ثالوا کے فلپ نے اس بات میں کامیابی حاصل کی تھی کہ برابان کے ڈیوک کے خلاف ایک وسیع جتھا بندی قائم کرے جس میں شریک ہونے والوں نے تیسرے ژاں کو دھمکی دے کر اتمام حجت کیا۔ کتاب "واپن بوک" کا مولف یکے بعد دیگرے ان حلیفوں کو منظر پر لایا ہے۔ کولون کے اسقف نے کہا کہ: اے آقا، اے جنگلی سور! تو اس میدان میں ہار جائے گا کیونکہ تیرے دشمنوں کے دانت بڑے تیز ہیں"۔ اس کے بعد سولہ مرتبہ اور اتمام حجت کی کارروائی کی گئی۔ صرف ایک جاگیردار نے بہادر ڈیوک کی تائید کی اور یہ بار کا کونٹ تھا اس نے تیسرے ژاں کے مخالفوں کو نصیحت کی کہ "جنگلی سور کی راہ پر نہ چلیں"۔ پھر ڈیوک منظر پر آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ "میں برابان کا ڈیوک ہوں لوگ مجھے جنگلی سور کے خطاب سرداری سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار مجھے چھوڑ دیتے ہیں سوائے ایک بار کے شریف کونٹ کے۔ لیکن میرا جواب سنو: یہ دھمکیاں اور یہ غرور نہ تو دیانتداری پر مبنی ہیں اور نہ عقلمندی پر۔ لیکن اگر تم اس پر تلے ہوئے ہو کہ میری ڈھال پھاڑ ہی ڈالو تو اسی میدان جنگ میں کسی معینہ دن تم سب جمع ہو جاؤ اور جنگ کا جوا کھیل دیکھو"۔[1]

---

[1] "واپن بوک" (ہتیاروں کی کتاب) یا ۱۳۳۴ء تا ۱۳۷۲ء کی ڈھالوں پر کے

پانچویں شارل نے تیسرے ایڈورڈ کے خلاف جنگ کا جو اعلان کیا تھا، اور جو خط کے ذریعے سے عمل میں آیا تھا، اس کا فرواسار نے نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ: "جو جوان اتمام حجت کا خط لے گیا تھا وہ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں بادشاہ اور اس کی مجلس شوریٰ موجود تھی۔ اور اس نے بیان کیا کہ وہ فرانس کے بادشاہ کے محل کا ایک جوان ہے۔ اور اسے بادشاہ ہی نے وہاں بھیجا ہے۔ اور وہ انگلستان کے بادشاہ کے نام ایک خط لایا ہے۔ لیکن اس خط میں کیا بیان ہوا ہے، یہ اسے نہیں معلوم، اور نہ ہی اسے اس سے تعلق ہے کہ اس پر گفتگو کرے یا اس کو جانچے۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر وہ خط بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس خط کو کھلواتا اور پڑھواتا ہے۔ جب اس میں لکھی ہوئی چیز کو پڑھکر سنایا گیا تو بادشاہ اور وہ سب لوگ جو وہاں تھے حیران ہو گئے، کیونکہ اس میں اتمام حجت اور دھمکی درج تھی"۔ فرواسار نے اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ: "تمھیں جاننا چاہیے کہ اس وقت انگلستان کے بادشاہ اور اس کی مجلس شوریٰ نے ان دھمکیوں کو بہت برا مانا اور ناراض ہوئے جو ایک لونڈے کے ہاتھ بھیجی گئی تھیں۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی کہ فرانس اور انگلستان میں بادشاہتوں جیسے بڑے سرداروں کی جنگ کی اطلاع اور خبر رسانی ایک لونڈے کے ذریعے سے عمل میں آئے۔ بلکہ چاہیے یہ تھا کہ یہ کام کوئی صدر پادری یا کوئی بہادر شخص، کوئی جاگیردار یا کوئی شہامت باز انجام دیتا۔ لیکن پھر بھی ایسا نہ ہوا"۔[1]

180

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نقش ونگار مولفۂ گلرے ڈیمال والا نقیب، شایع کردۂ موسیو لکنوز بوتوں۔

[1] فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب اول حصۂ دوم ص ۲۶۲۔

چوتھے ایڈورڈ نے گیارھویں لوئی کے خلاف جو اعلان جنگ کیا تھا، اس میں تمام ضوابط و قواعد ملحوظ رکھے گئے تھے۔ چنانچہ مورخ کومین لکھتا ہے کہ "بادشاہ ایڈورڈ نے ڈوفر سے چلنے سے پہلے فرانس کے بادشاہ کے پاس ایک اکیلا نقیب روانہ کیا۔ وہ انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے اتمام حجت اور نہائیے کا ایک خط بادشاہ کے نام لایا جو بڑی اچھی زبان اور خوبصورت اسلوب میں لکھا ہوا تھا۔ اور اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ انگریز نے کبھی اس کے متعلق ہاتھ نہیں ڈالا ہوگا۔ اس نے [فرانس کے] بادشاہ سے خواہش کی کہ وہ اس کو فرانس کی بادشاہت جو اسے حاصل تھی واپس کر دے تاکہ وہ کلیسا اور جاگیرداروں اور قوم کو ان کی قدیم آزادی واپس دے سکے اور ان پر سے عظیم خدمات مالی وجسمی کا بار ہٹا سکے جو ان پر عائد تھا۔ اور اگر اس سے انکار کیا جائے تو اس سے جو برے نتائج نکلیں گے ان سے اس نے اپنی براءت کا اظہار کیا۔ اور یہ چیز اس طور اور اس طریقے سے عمل میں آئی جن کا ایسی صورتوں کے متعلق وہ یعنی بادشاہ انگلستان عادی ہے"[1]۔

نقیبوں کے ذریعے سے باضابطہ اعلان کروانے کا جو رواج تھا اس میں شہامت بازی کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نقیبوں کے سردار اور نقیب ایک طور سے ان فرائض کو انجام دیتے تھے جو رومیوں میں [مجلس خارجہ کے] فیتیالی پجاری[ع]۔

کامبرے کا معاہدۂ حلیفی طے ہونے کے بعد بارھویں لوئی نے تے نیس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ "اس نے مون ژوا کو جو اس کا پہلا صدر نقیب تھا، تے نیس روانہ کیا تاکہ فرانس کے رواج

---

[1] فلیپ دکومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب چہارم باب پنجم۔

[2] سیال دکورباں کی فرانسیسی کتاب "علم حکمرانی" جلد (۵)، ص ۴۹۳۔

کے مطابق تھے نیس والوں کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ چنانچہ اس نے سینیٹ کے بھرے اجلاس میں اور ذو جے [یعنے صدر جمہوریہ تھے نیس] اور ارکان سینیٹ کی موجودگی میں ان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور بادشاہ کی طرف سے انھیں آگ اور خون کی دھمکی سنائی۔ یہ ایک مذہبی رسم تھی جو اس زمانے میں ملحوظ رکھی جاتی تھی، جس کے مطابق جنگ اچانک نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور صاف صاف ہونے کے باعث اس میں زیادہ نامردی بھی سمجھی جاتی تھی"۔ یہ الفاظ ہم نے بیشل نُودیے سے مستعار لیے ہیں۔ یہ شخص تیرھویں لوئی کے زمانے میں فرانس کا تاریخ نگار تھا۔

شہامت بازی کی اس روح کے باعث خود لڑائیوں کا تک پیشگی تعین کر دیا جاتا اور مقابلے کا دن اور مقام مقرر کر دیے جاتے اس میں، اور دو آدمیوں کے تنہا مقابلے میں، محض ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اگرچہ ایسے ڈوئل یا مبارزت کی صورتیں بہت زیادہ پیش نہیں آتی تھیں، لیکن قرون متوسطہ کی آخری صدیوں میں فوجوں کے سپہ سالار اس طرح باہم لڑتے تھے؛ جیسا کہ تاریخ میں محفوظ ہے اور قانون جنگ سے متعلقہ تالیفوں میں اس مبارزت کو ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ مثال کے طور پر پاریس دِل پوت سو نے مبارزت کے قواعد کے متعلق ایک رسالہ بھی لاطینی میں تالیف کیا ہے جس کا نام "فوجی چیزوں کے متعلق رسالہ" ہے اس تالیف کی ساتویں کتاب کے ایک حصے میں ان مسائل سے بحث ہے جو دو دو آدمیوں کی تنہا مبارزت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولف نے پیچھے بعد دیگرے مسائل ذیل سے بحث کی ہے: چنانچہ اس کے لاطینی عنوانات یہ ہیں "کیا دو اہل خصومت کے لیے اس کی اجازت ہے کہ جنگ کریں"، "کیا بادشاہ کے لیے یہ روا ہے کہ بادشاہت کے لیے شہنشاہ سے جنگ کرے"، "کیا متخاصم بادشاہوں کے لیے اس کی اجازت ہے کہ جنگی مہم روانہ کریں"،

181

کیا کسی غیر تاجدار بادشاہ کو تاجدار بادشاہ سے جنگ کرنی جائز ہے؟[1]
پیئیر بَلی نے بھی یہ سوال کیا ہے کہ (لاطینی میں) "کیا ڈیوکوں (قائدوں) کے لیے یہ جائز ہے کہ تنہا مقابلہ کریں"[2]

تیسرے ایڈورڈ نے ڤالوا کے فلپ کے پاس جو تجویز پیش کی تھی کہ یہ اپنے جھگڑے کا فیصلہ یا تو مبارزت کے ذریعے سے کر لے یا اس طور سے کہ ہر فریق کی طرف سے ایک ایک سو سوار مقابلہ کریں ۔ ۔ ۔ اس تجویز سے سب لوگ واقف ہیں۔ اس میں فرانس کے تخت کی بازی لگی ہوئی تھی[3]۔ اسی کا ایک مماثل واقعہ اس سے پہلے پیش آیا تھا۔ اس کا ذکر قرون متوسطہ کے مولفوں کے مقالات میں عام طور سے آتا ہے۔ چنانچہ ۱۲۸۳ء میں آراگون کے بادشاہ نے آن ژو کے شارل کے پاس یہ تجویز پیش کی تھی کہ صقلیہ کے متعلق اپنا جھگڑا ایک ایسے مقابلے کے ذریعے سے طے کر لے جس میں ہر حریف سو سو سواروں کی ایک جماعت ساتھ لائے اور یہ مقابلہ بورڈو میں انگلستان کے بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے ہو جائے۔ یہ پیشکش قبول کر لیا گیا۔ اور نمایندوں کے ذریعے سے مقابلے کی شرطیں بھی طے ہوگئیں اور یکم جون ۱۲۸۳ء کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ بودریں یِی نے لکھا ہے کہ "مقابلے کے لیے جو دن مقرر ہوا تھا اس دن آن ژو کا شارل ایک سو سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہوگیا اور آفتاب

[1] پاریس دل پوتے و (پاریس آپوتے او) کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں کے متعلق نفیس اور بسوط رسالہ" "رسائل حقوق عمومی" جلد (۱۶) ورق ۴۰۲ و مابعد۔

[2] پیئیر بلی کی لاطینی کتاب "فوجی اور جنگی چیزوں کے متعلق رسالہ" حصہ دوم عنوان ۱۵۔

[3] وارڈ کی انگریزی کتاب "یورپ میں قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کے متعلق تحقیقات" جلد (۲) ص ۲۱۳۔

ڈوبنے کے بعد تک انتظار کرتا رہا لیکن آراگوں کا بادشاہ نہیں آیا۔ اور وہ پنچوں کو یہ بتا کر کہ وہ خود تو حاضر ہوگیا لیکن آراگوں کے بادشاہ پیئیر (پیٹر) نے ملنے کے وعدے میں قصور کیا، وہاں سے رخصت ہوگیا۔ آراگوں والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اصل میں ان کے حکمران کو معقول وجوہ کی بنا پر یہ ڈر تھا کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کے خلاف کمین گاہیں تیار نہ کردی ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آراگوں کا بادشاہ پیئیر صرف یہ چاہتا تھا کہ اس بہانے کچھ مہلت حاصل کرلے اور اپنے حریف کو چکمہ دیدے[1]۔

182 جنگ کے اعلان کا قاعدہ رفتہ رفتہ غائب ہوگیا۔ انگلستان میں یہ ایک اور مرتبہ ۱۵۵۷ء میں ملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ جب ملکہ ماری نے اپنے شوہر دوسرے فلیپ کی ترغیب سے وہ مہلک جنگ شروع کی جس میں گوئیز کے ڈیوک نے بندرگاہ کالے پر قبضہ کرلیا تھا تو اس ملکہ نے دوسرے ہنری کے ہاں اپنے نقیب کلارانسیو کو بھیجا اور اسی دن دوسرے نقیبوں نے شہر میں جنگی کارروائیوں کے شروع ہو جانے کا ڈھنڈورہ پیٹ دیا۔ اس کا مقابلہ اس رواج سے کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر گروتیوس نے کیا ہے اور جس کے مطابق فریق ثانی کے نام ایک اعلان شایع کرنا ضروری ہوتا ہے[2]۔ قوم کے نام جنگی کارروائیوں کے شروع ہونے کی اطلاع شایع کرنی اصل میں اس نظریے کے باعث تھی کہ جنگ کا اعلان کیا جائے۔ اس قسم کی ایک نظیر ۱۶۳۵ء میں ملتی ہے۔ چنانچہ تیرھویں لوئی نے ایک نقیب کو بروسیل روانہ کیا تاکہ وہاں اسپین کے بادشاہ کے خلاف

---

[1] بوریس یی کی فرانسیسی کتاب "صقلیہ کی تاریخ عمومی" جلد (۲) ص ۲۰۲

[2] گروتیوس کی کتاب "قانون جنگ و صلح" کا فرانسیسی ترجمہ از باربیراک کتاب سوم باب اول فصل (۵)

جنگ کا اعلان کرے۔ یہ اعلان کارڈینل شہزادے کے پاس کیا گیا جو اسپین کے حکمران کی فوجوں کی تشیبستان (ہالینڈ) میں سپہ سالاری کر رہا تھا۔ فرانس کا نقیب جس کا نام آلاسوں تھا، بروسیل پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک نقارہ تھا۔ اس نے کارڈینل شہزادے کے ہاں باریابی کی خواہش کی۔ اور جب اس کا موقع اسے نہ دیا گیا تو اس نے اس اعلان کا ایک نسخہ جو شہزادے کو پیش کیا جانا چاہیئے تھا، جمع شدہ لوگوں میں پھینک دیا۔ مورخ ریال لکھتا ہے کہ: "پھر وہ شہر سے چلا گیا۔ اور جب سرحد پر ایک گاؤں میں پہنچا تو اس نے عین شاہراہ کے بیچ میں ایک کھونٹا گڑھا سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر گاڑ دیا اور اس پر وہی اعلان لٹکا دیا جو اس نے بروسیل میں کیا تھا۔ اور اس گاؤں کے صدر افسر اور لوگوں کو اس سے آگاہ کر دیا۔ اس اثناء میں بادشاہ کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا وہ فرائض انجام دیتا رہا جو اس کے لیے مقرر تھے۔ نقیب نے واپس آکر اپنی کارگزاری کا ماجرا بادشاہ کو سنایا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اس جنگ کے وجوہ کی اطلاع اس کے تمام صوبوں میں شایع کی جائے اور اس کے ہاں کی تمام پارلیمانوں میں اس کا داخلہ لیا جائے"[1]

باضابطہ طور سے اعلان کرنے کی آخری مثال ہم کو سویڈن کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اور یہ اس وقت ہوا تھا جب سویڈن نے ۱۶۵۷ء میں ڈنمارک کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا۔

نقیبوں کے ذریعے یا حکمران کے نام خطوط کے ذریعے سے باضابطہ اعلان جنگ کی جگہ اب اس بات نے لے لی کہ ایک اعلان شایع کر کے حالت جنگ کے پائے جانے کی اطلاع دی جائے۔ بہت سی صورتوں میں تو فریق ثانی کو کوئی اطلاع دیے بغیر جنگ

---

[1] ریال دیکویلاں کی فرانسیسی کتاب "مسلم حکمرانی" جلد (۵)، ص ۲۹۶

شروع ہوتی۔ اگر اسے ترقی سمجھنے میں کسی کو شبہہ ہو تو یقیناً وہ اس شبہے میں حق بجانب ہوگا۔

بعض وقت عجیب عجیب صورتیں پیش آئیں۔ سنہ ۱۴۲۸ء میں آٹھویں ہنری اور شارل کیں میں جو جنگ ہوئی، اس کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ آیا اس کا اعلان کیا گیا تھا یا نہیں۔ حقیقت میں جب فرانس کا ایک نقیب شہنشاہ کے پاس اعلان جنگ کرنے گیا تو انگلستان کا نقیب جو اس کے ہمراہ تھا، اس نے بھی اول الذکر کے اتمام حجت اور نہائیے پر یہ اضافہ کیا کہ اگر فرانس کے واجبی مطالبے قبول نہ کیے گئے تو انگلستان کا بادشاہ بھی فرانس کے بادشاہ کا حلیف بن جائے گا۔ شارل کیں نے فرانس کے نقیب کو تو حیرت کے ساتھ جواب دیا لیکن انگریزی نقیب سے یہ توقع ظاہر کی کہ ان دونوں ملکوں میں امن برقرار رہے گا۔ فریقین میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان میں سے کس پر اعتماد کریں۔ ابتدائی تدبیریں اختیار کی گئیں، سفیروں پر نگرانی قائم کردی گئی، تاجروں کو گرفتار کرلیا گیا اور آخر کار لندن کے حلقۂ تجارت کے مطالبات کی تکمیل کے لیے آٹھویں ہنری نے نشیبستان (ہالینڈ) کی حکومت سے ایک عارضی صلح کرلی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے دوسرے فلپ اور الزابتھ میں جو طویل جنگ جاری رہی، اس کا کبھی بھی باضابطہ طور سے اعلان نہیں ہوا تھا۔ نازک قسم کے جھگڑے پیدا ہوگئے تھے۔ چنانچہ الزابتھ نے اگر باغی نشیبستان کی مدد اور اعانت کی تھی تو دوسرے فلپ نے آئرلینڈ کے کیتھولکوں کی تائید کی تھی اور ان سب کے باوجود ان کے تعلقات میں کوئی علانیہ طور سے انقطاع نہیں ہوا تھا۔ ڈریک اور دیگر مشہور امیرالبحروں نے اسپینی بیڑے کے خلاف جو مہیں اختیار کی تھیں، ان سے بے تعلقی کا اظہار کردیا گیا تھا۔ اور خود اس وقت جب ملکہ نے صوبجات متحدہ کو

یہ ضمانت دی تھی کہ وہ ان کو اسپین کے خلاف مسلح مدد دے گی، تو اس وقت بھی جنگ کا قطعاً کوئی اعلان نہیں ہوا، بلکہ ایک بحث مباحثے کے بعد یہی طے کیا گیا کہ اس کا اعلان نہ کیا جائے[1]۔

دشمن کے خلاف جو برتاؤ کیا جانا چاہیئے اس کے تعیّن کے لیے بھی خصوصی احکام نافذ ہوتے رہے۔ چنانچہ کبھی تو دشمن کے ساتھ ایسے تجارتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کی جاتی رہی جن سے اسے جنگ میں مدد ملے —— یہ حکم امتناع خارجی ہے۔ اور کبھی ہر قسم کے تعلقات کی ممانعت کی جاتی رہی بجز اس کے کہ صراحت سے اجازت دی جائے —— یہ حکم تعطل ہے۔ اور کبھی اپنی رعایا کے ان افراد کو جو دشمن کے ملازم ہوں، بلکہ خود ان کو جو کسی تیسری سلطنت کے ملازم ہوں، انھیں بھی اپنے وطن کی خدمت کے لیے طلب کرلیا جاتا تھا —— یہ حکم طلبانہ ہے[2]۔

184

ایک خصوصی قسم کے طلبناموں میں یہ امر مضمر ہوتا تھا کہ جنگ کا اعلان ہوچکا ہے۔ اس قسم کے طلبنامے ان طویل سیاسی جھگڑوں کے زمانے میں نمودار ہوئے جو پوپوں اور اٹلی کے حکمرانوں اور جمہوریتوں کے مابین پیش آئے تھے۔ ان میں سے چند نظائر اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں پانچویں کلیمان (پوپ) نے یہ دعویٰ کیا کہ شہر فراآرے پر مقام مقدس یعنی پوپ کو حقوقِ ملکیت حاصل ہیں اور ونیس والوں نے اس پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پوپ نے ونیس کو ایک مذہبی سفیر روانہ کیا تاکہ اپنے مطالبوں کی

---

[1] وارڈ کی انگریزی کتاب "بعض طور پر یورپ میں گذشتہ دو صدیوں میں مختلف جنگیں شروع ہوئیں اس کے متعلق تحقیقات" ص ۸۔

[2] نیکلوبر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا جدید قانون بین الممالک" ف ۱۴۲۔

توضیح کرے لیکن یہ سفیر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اور اب کلیسا کے مقتدر اعلیٰ نے اپنا یہ فریضہ باور کیا کہ روحانی ہتیاروں سے مدد لی جائے۔ چنانچہ ۲۷ مارچ ۱۳۰۹ء کو ایک فرمان پاپائی صادر ہوا جس میں تے نیس والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ قرارے کا ایک مہینے کی مدت میں تخلیہ کردیں۔ ورنہ تے نیس کے دو جے (صدر جمہوریہ) اور گورنر کو جات باہر کیے جانے کی دھمکی دی گئی۔ اور خود جمہوریت کو یہ دھمکی دی گئی کہ اس کی سرزمین میں پادریوں کو فرائض کلیسائی کے انجام دینے سے روک دیا جائے گا۔ اور یہی دھمکیاں ان تمام قوموں کو دی گئیں جو تے نیس کے ساتھ کسی قسم کا بھی کاروبار کریں چنانچہ کوئی تجارتی سامان یا کسی بھی قسم کا کھانے پینے کا سامان نہ تو ان سے خریدا جاسکتا تھا اور نہ ان کو بیچا جا سکتا تھا۔ دوجے اور جمہوریت کو ان تمام مراعات اور جاگیروں سے محروم کردینے کی بھی دھمکی دی گئی جو مقام مقدس کی طرف سے ان کو عطا ہوئی تھیں۔ ان کی تمام رعایا کو حلف وفاداری سے بری بھی کردیا جانے والا تھا۔ تے نیس والوں کے متعلق یہ بھی اعلان کیا جانے والا تھا کہ ان کے نام کو بٹہ لگ چکا ہے، وہ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ خود اپنے گھر میں کوئی سرکاری خدمت انجام دے سکیں یا عدالت میں حاضر ہوسکیں یا گواہی دے سکیں یا کسی کی وراثت میں حصہ پاسکیں۔ اور چار نسلوں تک ان کی اولاد ہر قسم کے کلیسائی اور کشوری اعزازات سے خارج رہے گی —— یہ سب وہ سزائیں تھیں جو ایک ماہ بعد بھی اطاعت نہ کرنے پر دی جانے والی تھیں۔ اگر وہ ایک اور ماہ بعد بھی اپنے اصرار پر قائم رہیں تو پوپ وہاں کے دوجے اور دیگر عہدہ داران جمہوریت کو ان کے عہدوں سے معزول کردے گا، ان کے مقروضوں کو قرضوں سے بری قرار دیدے گا، تمام معاہدوں کو فسخ شدہ قرار دے گا، تمام تے نیس والوں کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد ضبط کرنے کا حکم دے گا

اور تمام سلطنتوں کو ہدایت دے گا کہ ان پر چڑھ دوڑیں اور وہاں کے لوگوں کو غلام بنا ڈالیں[1]۔

حقیقت میں پادریوں نے جمہوریۂ وینیس کے تمام علاقوں میں نماز پڑھانے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ تمام راسخ العقیدہ لوگ اس بات سے محروم کر دیے گئے کہ اپنے لیے مراسم تقدیس (مثلاً نکاح وغیرہ) انجام دلا سکیں بلکہ خود نوزائیدہ بچوں کو بپتسمہ دینے کی بھی بڑی مشکل سے اجازت ملنے لگی۔ ایک صلیبی جنگ کا پرچار کیا جانے لگا اور صلیبی جنگجوؤں کی سرداری کے لیے ایک کارڈینل مامور ہوا۔ تقریباً پورے یورپ میں پوپ کے احکام کی تعمیل ہوئی۔ انگلستان میں وینیس والوں کی تجارتی ایجنسیاں لوٹ لی گئیں۔ فرانس میں ان کی جائداد قرق کر لی گئی۔ اٹلی کے ساحلوں پر تو قتل عام بھی عمل میں آئے اور ان میں سے بہت سے غلام بنا کر عربوں کے ہاتھ بیچ دیے گئے[2]۔

۱۳۰۹ء کے فرمان پاپائی کی ایک اور مثال دستاویز ۱۴۸۳ء کا فرمان پاپائی ہے جس کی رو سے پوپ چوتھے سکست نے وینیس کی حکومت کو حکم دیا کہ پندرہ دن کے اندر وہ تمام علاقہ واپس کر دے جو اس نے فرارے کے ڈیوک سے فتح کیا تھا ورنہ وہ خود معزز بنی، ان کی رعایا اور پوری جمہوریت کو جماعت سے باہر کر دیا جائے گا اور ان تمام علاقوں میں جو وینیس کے تحت تھے، حتیٰ کہ سمندر پار مقبوضات میں بھی پادریوں کو ممانعت کی گئی کہ فرائض کلیسائی جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ ان علاقوں میں پادری نہ تو نمازیں پڑھائیں نہ مراسم تقدیس انجام دیں حتیٰ کہ حالت نزع کی

---

[1] ۔ دارو کی فرانسیسی تالیف وینیس کی تاریخ، کتاب ہشتم

[2] ۔ ایضاً۔

تلقین تک نہ کریں ۔ تمام پادریوں کو یہ حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ حکومت فلورنس سے نکل کھڑے ہوں ۔ تمام فلورنس والوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں ان کے تمام مقروض اپنے قرضوں سے آزاد ہو گئے اور ان کو جات باہر کیا جانے لگا اگر وہ ان قرضوں کا کل یا جزء ادا کردیں۔ جو فلورنس والے قرار دے کے خلاف ہتھیار اٹھائیں تو ان پر چڑھ دوڑنے کی ہر کسی کو اجازت دیدی گئی ۔ اور جو کوئی کسی مستحق کا گلا کاٹے تو اس کارگزاری کے صلے میں وہ اس کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ دوجے اور تمام حکام عدالت اپنے عہدوں سے برطرف کردیے گئے۔ حکومت فلورنس کو ان تمام حقوق سے محروم قرار دیا گیا جو اسے اپنے مقبوضہ ممالک میں حاصل تھے۔ تمام فلورنس والوں کے متعلق یہ اعلان کردیا گیا کہ ان کے نام کو بٹہ لگ چکا ہے، وہ اس بات کے ناقابل ہو چکے ہیں کہ عدالت میں آسکیں یا گواہی دے سکیں یا کسی کے وارث بن سکیں ۔ ان کے بیٹے بھتیجے اور ان کی اولاد پیاری پشت تک کلیسائی عہدوں، منفعتوں اور اعزازوں سے ممنوع قرار دی گئی ۔ تمام اجنبیوں کو حکم دیا گیا کہ کسی توقف کے بغیر فوراً اپنا تجارتی سامان لے کر فلورنس کی سرزمین سے چلے جائیں ۔ اور انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ جمہوریہ فلورنس کی رعایا سے نہ تو کوئی کاروبار کریں اور نہ معاہدہ ۔ اور ان کے ہاتھ نہ تو کوئی غلہ فروخت کریں اور نہ کوئی کھانے پینے کی دوسری چیزیں، ورنہ جات باہر کردیا جائے گا۔ اور معاہدے کالعدم قرار دیدیے جائیں گے ۔ تمام سپاہی پیشہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فلورنس والوں کی طرف سے ہتھیار نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ وہ بھرتی کر لیے جا چکے ہوں ۔ اور فرمان پاپائی نے ان کو اس حلف اطاعت سے بری قرار دیدیا۔ تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کو اس کی ممانعت کردی گئی کہ جمہوریہ فلورنس کے ساتھ کسی حلیفی کا معاہدہ کرسکیں اور خود جو معاہدے موجود ہوں وہ

186

بھی باطل و کالعدم قرار دیدیے گئے۔ آخر میں انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ جمہوریۂ ؤنیس کے لوگوں، تجارتی سامانوں اور رعایا کا تعاقب کریں اور انھیں گرفتار کریں۔[1]

۱۵۰۹ء میں پوپ یولیوس نے ایک گھن گرج فرمان ؤنیس والوں کے لیے صادر کیا۔ اس میں اس نے وہ تمام جرائم شمار کرائے جن کا کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے "مقام مقدس" کے خلاف ارتکاب کیا تھا۔ اور اس نے ان سے مطالبہ کیا کہ چوبیس دن کے اندر وہ اپنے تمام مغصوبہ علاقے واپس کردیں اور وہ آمدنی بھی جو ان سے حاصل ہوئی ہو، ورنہ ان کے خلاف احکام صادر کیے جائیں گے چنانچہ اگر وہ نہ مانیں تو وہ ان کے متعلق یہ اعلان کرے گا کہ انھوں نے خدائی اقتدار کے حامل کے قتل کا ارتکاب کیا ہے۔ اور نہ صرف شہر ؤنیس کے پادریوں کو فرائض کلیسائی کے انجام دینے سے منع کردے گا، بلکہ ان تمام شہروں میں بھی جو ان کے قبضے میں ہوں۔ اور وہ اجنبی مملکتیں جو کسی ؤنیس والے کو پناہ دیں، تو ان کے شہروں کو بھی اسی سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا۔ پوپ نے تمام عیسائیوں کو اس کا بھی مجاز قرار دیا کہ ؤنیس والوں کے ساتھ دشمنان عمومی کا سا برتاؤ کریں اور ان کا مال لوٹ لیں اور ان کو غلام بنا ڈالیں۔[2]

۱۴۸۳ء اور ۱۵۰۹ء کے فرامین پاپائی کے متعلق یہ خیال کرنے میں احتیاط کرنی چاہیئے کہ ان کے وہی معنے ہیں جو ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں اور جیسا کہ دارُو نے بیان کیا ہے یہ تمام

---

[1] فی تورپوسان دی کی اطالوی تالیف "ؤنیس کی کشوری تاریخ" کتاب ۸ باب ۱۰ مقالہ (۲)
دارو کی فرانسیسی تالیف "ؤنیس کی تاریخ" کتاب ۱۸

[2] فرمان جس کو گچار دینی کی فرانسیسی تالیف "اٹلی کی تاریخ" کتاب (۸) باب (۲)۔

دھمکیاں محض گیدڑ بھبکیاں تھیں جن کا خود پادری مضحکہ اڑاتے تھے۔

۱۴۸۳ء میں فے نیس کی حکومت نے پادریوں پر اپنا اقتدار قائم کردیا۔ شاذ ہی کسی راہب نے اس کی تائید کی کہ غیر منصفانہ طور سے جات باہر کرنے کا کوئی اثر ہوسکتا ہے۔ اسقف جمع ہوئے، ماہرین قانون سے مشورہ ہوا اور بالآخر فرمان پاپائی کے خلاف آیندہ ہونے والی مجلس شورائے مذہبی کے ہاں مرافعہ دائر کردیا گیا اور اس مرافعے کی نقل خود شہر روما کے کلیساؤں کے دروازے پر چسپاں کردی گئی۔[1]

۱۵۰۹ء میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ دستاویز کی اشاعت کے چند دن بعد جمہوریۂ فے نیس نے روما کو ایک تحریر بھجوائی جس میں پوپ اور بادشاہ فرانس پر خوب لعن طعن کی گئی تھی۔ آیندہ ہونے والی مجلس شورائے مذہبی کے ہاں مرافعہ دائر کردیا گیا اور اگر انسانی انصاف حاصل نہ ہوسکے تو خود حضرت یسوع مسیح سے اپیل کی گئی جو "برائی سے مبراج اور ہر دو فریقوں کے مقتدر کل آقا" ہیں۔[2]

۱۵۱۰ء میں پوپ دوسرے یولیوس نے فے نیس والوں سے صلح کرلی۔ ان کے سفیر روما آئے تاکہ وہ اپنی جمہوریت کے حق میں براءت اور معافی حاصل کریں۔ اس کے چار مختلف طریقے تھے۔ پوپ کے ہاں کے افسر مراسم پاریس دے گراسس نے اپنی لاطینی کتاب "روزنامچہ" میں سابقہ نظائر کی توضیح کی ہے کہ تمام صورتوں میں ملزموں کو ڈنڈے لگائے گئے، چند کو ننگا کرکے اور چند کو کپڑوں کے اوپر ہی سے اور بعض کو تو خوب اچھی طرح سے، چنانچہ

187

---

[1] دارو کی فرانسیسی تالیف "فے نیس کی تاریخ" کتاب (۱۸)

[2] فران چس کو گچار دینی کی فرانسیسی تالیف "اٹلی کی تاریخ"، کتاب (۸)، باب (۲)

اتنی دیر کہ بائبل کے تین رکوع کی پوری طرح تلاوت کرلی جائے۔ جب پوپ نے مشورہ کیا تو گراسیس نے اسے یہ رائے دی کہ تائبین والوں کو چند بہت ہلکی ضربیں لگائی جائیں لیکن پوپ دوسرے یولیوس نے ان کو معافی کی اس توہین آمیز رسم سے بالکل معاف کردیا اور ان کے لیے کفارہ یہ مقرر کیا کہ ساتوں گرجوں کی زیارت کریں۔

اسی سنہ ۱۵۱۰ء میں فرانس میں ایک واقعہ پیش آیا جو کسی قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام مقدس یا پاپائی کے اقتدار کی نسبت یہ کہنا بہت بعید از حقیقت ہے کہ اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ پوپ دوسرے یولیوس نے ان تمام فرانسیسی جنیوں کو جات باہر قرار دیا جو اٹلی سے جنگ کر رہے تھے۔ اس پر تمام پادری شہر طور واقع فرانس میں اکٹھے کیے گئے اور بارھویں لوئی کے حکم سے ان سے متعدد سوالات کیے گئے۔ چند جواب بڑے زور دار ہیں۔ چنانچہ یہ کہا گیا کہ "پوپ کو جہاں تک ضمیر کے احکام کا تعلق ہے، اس کا کوئی اختیار سماعت نہیں کہ جنگ کا اعلان کرے، کیونکہ نہ تو مذہب کا کوئی معاملہ در پیش ہے اور نہ کلیسا کے اقتدار کا۔ جو حکمران پوپ سے جنگ کر رہا ہو، اسے اس کا حق ہے کہ حملے کی مدافعت ہتھیاروں سے کرے لیکن کلیسا کے جاگیری ممالک کو فتح کرنے کے بعد وہ ان کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔ ہر عیسائی حکمران کو اس کا پورا حق ہے کہ کسی دوسرے عیسائی حکمران کی اس صورت میں حمایت کرے جب وہ پوپ سے کسی منصفانہ وجہ سے لڑ رہا ہو۔ اور آخر میں یہ کہ جات باہر کرنے کا جو حکم جنگ کی حالت میں دیا جائے، اور اس کے سلسلے میں کوئی رسم وضابطہ ملحوظ نہ رکھا گیا ہو، تو وہ کالعدم ہے۔

188

قرون متوسطہ میں جنگ ایک ناقابل بیان بے رحمی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ فریقین جنگ میں سے ہر ایک اس کی کوشش کرتا تھا کہ دوسرے کو جتنا زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہو وہ پہنچائے۔ اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بنیادی مقصد یہ ہوتا تھا کہ دشمن کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بربریت کے ایسے ایسے کام کیے گئے، جن کی نظیر کبھی سننے میں نہیں آئی۔ اسی لیے زہر میں بجھے ہوئے ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے، اور اسی لیے قیدیوں کے ناک کان کاٹ کر مثلہ کیا جاتا تھا، تباہی و بربادی پھیلائی جاتی تھی، آگ لگادی جاتی تھی، اور شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی تھی۔ اور اسی کے باعث غداری اور بے ایمانی کو کام میں لایا جاتا تھا۔ جن جن بے رحمیوں کا ارتکاب ہوا تھا، ان کی ایک مکمل جدول پیش کرنی ممکن نہیں ہے۔ اس زمانے میں

لکھی ہوئی تالیفوں کے کھولنے سے بآسانی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ صورت حال حقیقت میں کتنی زیادہ تاریک اور ہولناک تھی۔ اخلاق آموز شاعر، ماہرین قانون، مدبر، اور سپاہی سچے شاہد سمجھے جاسکتے ہیں۔ اور اس وقت وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتے ہیں۔

رہزنوں کی طرز زندگی کے خلاف اوس تاش دے شان نے ایک نظم میں لکھا ہے کہ:-

کیونکہ لوگ اس طرح قاتل بن جاتے ہیں
ڈاکو بھی۔ زبردستی سے چھین لینا؛
اجازت (؟) سے۔ خانقاہوں کی بے حرمتی کرنے والے۔
عورتوں کی عصمت دری کرنا، بد معاشی سے شدت دکھانا۔
اور اپنے ہمسایوں کو شرارت سے دغا دینا۔
ان کی چیزیں چھین لینا، ان کو تکلیف دینا
بغیر اس کے کہ ذرا بھی اس کا باعث پایا جائے۔

189 پانچواں ہنری جو انگلستان کا بادشاہ تھا، کہا کرتا تھا کہ "جنگ کے تین وفادار نوکر ہیں: آگ، خون اور قحط۔ ان تینوں میں جو سب سے نرم خو ہے میں نے اس کا انتخاب کیا ہے" یعنی قحط۔ بالدے نے لاطینی میں لکھا تھا کہ: "دشمن کو ہر کہیں اچھی طرح قتل کیا جاسکتا ہے۔" سے زار نوتر دام ان ہولناک زیادتیوں کا ذکر کرتا ہے جن کا صوبۂ پروشانس میں ارتکاب عمل میں آیا تھا۔ اور برائیوں کا شمار کراتے ہوئے کہتا ہے کہ: "انسانی خون کا عظیم مقدار میں بہایا جانا، غیر محدود تعداد میں شہروں کا جلایا جانا، قلعوں کا توڑا جانا، مزید برآں محلوں اور گڑھیوں کا بیخ و بن سے اکھاڑا جانا، گرجوں کی بے حرمتی اور ان کا تباہ کیا جانا، گرجوں کی قربان گاہوں کا تہتک کرنا، مقدس مقاموں کو غلیظ کرنا، مقدس چیزوں پر چوری اور ڈاکہ ڈالنا، عورتوں، بیواؤں اور

راہبات کی عصمت دری کرنا، خونین اور شیطانی انتقام لینا، بے رحمی کے ساتھ اپنے کو بے تعلق کرلینا، ہولناک طور سے جان لے لینا، معمولی طور سے قتل کرنا اور ہزاروں دیگر برائیاں جو ہولناک بھی تھیں اور جن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا"۔ سپاہیوں کے متعلق کرسٹین ڈیپزان کہتی ہے کہ: "جب وہ شہروں میں داخل ہوتے ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ گویا وہ فاقہ زدہ ہیں۔ اور عیسائیوں کے متعلق وہ جن ہولناک قتل و خون کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان میں رحم نام کو نہیں ہوتا۔ وہ عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ہر چیز کو تباہ و تاراج کر دیتے ہیں"۔ ژاں ڈولوئن نامی مورخ روایت کرتا ہے کہ: "وہاں کے تمام سپاہی تلوار کی چیر پھاڑ کے لیے ڈال دیے گئے"۔ اور وہ مورخ اس چیز کے متعلق یہ توجیہ کرتا ہے کہ: "حملہ کر کے قبضہ کرنے کے سلسلے میں جو رواج پایا جاتا تھا، اسی کے مطابق سپاہیوں سے برتاؤ کیا گیا"[1]۔

ایک فرانسیسی کتاب پائی جاتی ہے جس کا نام "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" ہے۔ اس کا مولف وہ ذمہ داری یاد دلاتا ہے جو جنگ کی بے شمار برائیوں کے باعث پیدا ہوتی ہے، اور کہتا ہے کہ "افسوس اے میرے بادشاہ اور آقا! ہمیں یہ سمجھ رکھنا چاہیے کہ ہتیاروں اور فیصلے اور تلوار کے زور سے، جس کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں، بادشاہ یا حکمران بہادری اور کردار کے ذریعے سے اپنے دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب سب کچھ جا اور گزر چکا ہو اور جلایا اور ہلاک اور قتل کیا جا چکا ہو۔ لیکن ایک دن وہ آنے والا ہے جب ایسے شخص کو ہمارے

---

[1] مود لا کلاتیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاولی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) ص ۲۰۴۔

آقا خداوند تعالیٰ کے حضور ہیں، جو سب کچھ جانتا اور آگاہی رکھتا ہے ان تمام عظیم الشان بے رحمیوں کا جواب دینا ہوگا کہ اتنے کچھ شہامت باز، سوار، معزز جاگیردار، اہل کلیسا، غریب کسان اور دیگر لوگ مارے پڑے۔ یہ کہ ان بے رحمانہ جنگوں کے موقع پر یہ لوگ رقت آور طور پر قتل کردیے گئے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی ننھے بچوں کو بھوک سے جان دینی پڑی، گرجے اور قلعے ڈھادیے گئے جلا اور تباہ کردیے گئے، اور لوگوں سے کچھ اتنے طور سے استحصال بالجبر ہوتا رہا کہ انسان کی زبان مشکل سے اس کا احاطہ کرسکتی ہے۔ بیشک اس بات کا جان لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ وہی شخص اچھی طرح جوابدہی کرسکتا ہے جس نے احکام خداوندی کو اچھی طور سے ملحوظ رکھا ہو[1]۔

190

دشمن کی تباہ کاریاں خود ملک کی مدافعت کرنے والی فوجوں کی تباہ کاریوں سے زیادہ ہولناک نہیں ہوتی تھیں کیونکہ ان کی لوٹ مار عام ہوتی تھی۔ جو صلحیں ہوتی تھیں، ان سے اس ہولناکی میں اور اضافہ ہوجاتا تھا کیونکہ ان سے فوجوں میں بھرتی ہونے والے کرائے کے ٹٹوؤں کو ایک عارضی چھٹی مل جاتی اور وہ بدقسمت آبادیوں پر ٹوٹ پڑتے اور خود اپنے طور پر اسی جنگ کو جاری رکھتے جو اس سے پہلے ان کو بھرتی کرنے والے سرداروں کے لیے شروع کی گئی تھی[2]۔

شہرلی آیژ کا ایک پادری، آہل گار جو ساتویں شارل اور گیارھویں لوئی کا ہمعصر تھا اور جو اِن بادشاہوں میں سے اول الذکر کو شخصی طور سے

---

[1]۔ فرانسیسی تالیف "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" باب (۶) مخطوطہ کتب خانۂ شاہی بروسیل ۱۰۹۷۶۔

[2]۔ ڈینیٹن کی انگریزی تالیف "انگلستان پندرھویں صدی میں" ص ۷۹۔

جاتا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ نارمنڈی کو آزاد کرانے کے لیے جو جنگیں ہوئیں ان میں فرانس کے بادشاہ کے طرفدار بھی اتنی ہی بے رحمیاں اور لوٹ مار کرتے رہے جتنی خود انگریزی فوجیں۔ یہ پادری یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ساتویں شارل کے ماتحت سپاہی اس بات کو بڑے افسوس کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ نارمنڈی کے شہر اور قلعے اپنی رضامندی سے بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوجائیں کیونکہ اس رضاکارانہ اطاعت سے ان سپاہیوں کو پیسہ کمانے کی توقع اور ذریعے سے محروم ہوجانا پڑتا تھا۔ اور ان کی تجویز یہ ہوتی تھی کہ جب ان علاقوں کو وہ جنگ اور زور کے ذریعے سے حلقہ بگوش بنائیں تو ان پر فاتحانہ قبضہ کریں اور ان کو اچھی طرح لوٹیں۔[1]

تال بو نے جو الفاظ کہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے خاص ہیں یعنی "اگر خدا بھی سپاہی ہوتا تو [نعوذ باللہ] ایک لٹیرا ہوتا"

یہ گمان ہوگا کہ عیسائی احساس اور شہامت بازی کی روح کے باعث مخاصمانہ تعلقات میں ایک حد تک نرمی پیدا ہو۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کی زیادتیوں کا منہ کھول دیا گیا تھا اور اکثر اوقات تو جنگ کرنے میں اتنی زیادہ سختی روا رکھی جاتی جتنی خود رومی شہنشاہت کے زمانے میں بھی نہیں ہوتی تھی۔

شہامت بازی میں دوگونہ عنصر پایا جاتا ہے: ایک عنصر تو اس انفرادیت کی روح کا نتیجہ تھا جو جرمن نسل کی خصوصیت ہے۔

---

[1] فرانسیسی تالیف در کتب خانۂ شاہی سے لیے ہوئے نوٹ اور انتخابات، مخطوطات ۶۲ و ۵ تا ۶۳ کے متعلق نوٹ جن میں کہ ساتویں شارل اور گیارھویں لوئی کے دور حکومت کی تاریخ ہے" مولفہ آرل گار پادری شہرلی ایڈیشن جلد (۵) ص ۴۱۹

اور دوسرے عنصر کے لیے کلیسا کا اثر ذمہ دار تھا۔[1] لیکن اس اثر کے متعلق زیادہ مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اکثر اوقات اس کا تذکرہ بڑے شاندار اور خوشامدانہ الفاظ میں ہوتا ہے۔ تیرھویں صدی کی ایک مشہور فرانسیسی نظم ہے جس کا نام "شہامت بازی کے قواعد" ہے۔ اس میں شہامت بازوں کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ جاگیرداری عہد کے عظیم الشان عدل گستر تھے۔ چنانچہ اس نظم میں لکھا ہے کہ "شہامت بازی کا فریضہ یہ ہے کہ عورتوں بیواؤں، یتیموں اور محتاج و بیکس لوگوں کی حفاظت کرے"۔ جس نظم کا ہم نے ابھی ذکر کیا، اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شہامت باز کو اپنا خون بہانے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے تاکہ ؎

خدا کی خدمت اور تقدیس کی جائے
اور کلیسائے مقدس کی مدافعت کی جائے

[یہ تو نظریہ تھا]، حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ مزید برآں اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیئے کہ اگر کہیں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ ایک حد تک اخلاق کا برتاؤ کیا گیا، یا ایسے کام کیے گئے جو جذبات لطیف میں پلٹے ہوئے نظر آتے ہیں، تو شہامت بازی کے قائم کردہ یہ قاعدے صرف مساوی طاقت والوں میں ملحوظ رہتے ہیں شہامت بازی نے آن اور ناموس کا جو ضابطہ بنایا تھا، اس کا اطلاق کمزوروں پر مطلق نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ بڑی حقیقت شناسی سے بیان کیا گیا ہے کہ شہامت بازی عملی طور سے وہی کرتی تھی، جو جاگیرداری نظام بطور استحقاق کرتا تھا۔ اور اس کے باعث انسان

---

[1] لاکورن ڈسینت پالے کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق یادداشتیں"۔۔۔۔ ملز کی انگریزی تالیف "شہامت بازی کی تاریخ"۔۔۔۔ ڈے کلوز کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق"۔

اور شہری کے واجبات کی جگہ شخصی فرائض لے لیتے ہیں۔ اور جوں ہی کسی جاگیردار یا کسی شہاست باز کے سوا کسی اور شخص کا معاملہ ہو تو اس بڑے فخر سے پیش کی جانے والی وسعت قلبی کی جگہ جذبات بے رحمی براجنے لگتے۔

ایک اور نکتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ شہاست باز، اُن اقراروں کی وفاداری کے ساتھ تعمیل کرنا جن کی اکثر مذہبی مراسم کے ساتھ توثیق ہوتی تھی۔ قدیم رومیوں کے ہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بات کا پاس کیا جائے۔ "دجھیل کے لانس لاٹ" نامی قصے میں بادشاہ آرتھر نے ایک شہامت باز سے اس بات کا وعدہ کرلیا تھا کہ اسے اپنی بیوی یعنی ملکہ کو لیجا لینے دے گا۔ اب بادشاہ نہ تو اس بیچاری کی التجاؤں پر کان دھرتا ہے اور نہ ہی اوروں کی توجہ دہانی کو کچھ سنتا ہے۔ اور اسے صرف ایک رٹ لگی ہوئی ہوتی ہے کہ میں نے اس سے اس کا وعدہ کرلیا تھا۔ اس پر لیونل نے، جس نے بادشاہ کو اس تجویز سے ہٹانا چاہا تھا، یوں مخاطب کیا کہ "تو پھر بادشاہ اوروں سے بھی بڑھ کر بیگار و غلام ہے۔ اور جو بادشاہ ہونا چاہے تو اسے شرمانا چاہیے"۔ شہامت بازی کا واسطہ دے کر جو وعدہ کرلیا جاتا، اس کو سب سے زیادہ اہمیت ہوتی تھی۔ ژاں دبر تائیں نے جب چھٹے شارل سے صلح کی، تو معاہدے کی پابندی کی قسم ان الفاظ میں کھائی کہ: "اپنے جسم اور ایک سچے شہامت باز کی قسم کھا کر"۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" نامی کتاب لکھی گئی تو اس کے مولف نے زمانۂ ماضی کے متعلق ان الفاظ میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ: "اس سلسلے میں قدیم زمانوں میں یہ نظر آتا ہے کہ شہنشاہ، بادشاہ اور بڑے سردار کسی ضمانت کے لیے سوائے حکمران کی زبان کے کسی اور طور سے اپنے کو پابند نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ

192

اس زمانے میں ان کی زبان اور ان کی تحریر کچھ اتنی زیادہ قابل پابندی ہوتی اور ملحوظ رکھی جاتی کہ اس کے متعلق کوئی کوتاہی عمل میں نہیں لائی جاتی تھی[1]۔ وقت بوقت اس کی کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں کہ جنگ کی بے رحمیوں کو کم کیا جائے۔ چنانچہ تیرھویں صدی میں ان ہتیاروں کا استعمال ممنوع قرار دیا جاتا ہے جو ضرورت سے زیادہ مہلک خیال کیے جاتے تھے۔ پوپ تیسرے انوسنٹ نے ایک حکمنامے کے ذریعے سے اس کی ممانعت صادر کی کہ عیسائی باہم ایسے تیروں کا استعمال کریں جو دور سے آلگتے ہیں اور نہ ان پھینکی جانے والی چیزوں کو جن کے لیے کلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس لاطینی حکمنامے کے الفاظ یہ تھے: مزید برآں حریف عیسائی اور کیتھولک فوجوں کے خلاف مہلک اور نفرت انگیز منجنیق سے پتھر پھینکنے کی ہم ممانعت کرتے ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں بطور سزا جات باہر کردیا جائے گا[2]۔

عیسائی قیدیوں کو غلام بنا سکنا اصول کی حد تک ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کلیسا نے اس کی کوشش کی کہ مخاصمانہ کارروائیوں میں ان اشخاص کو محفوظ قرار دیدے جو خانگی جنگوں میں محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ کلیسا نے اس کی کوشش کی کہ بڑی جنگوں میں بھی ان عارضی "حرام دِنوں" کا طریقہ رائج کرے جن کے خانگی جھگڑوں کے سلسلے میں عائد کرنے کی کلیسا نے کوشش کی تھی۔ لیکن یہ تمام ایسی کوششیں ہیں جو نقار خانے میں طوطی کی آواز

[1] ۔ فرانسیسی تالیف "ایک نوجوان شہزادے کی تعلیم" باب دوم مخطوطۂ مکتبِ خانۂ شاہی برسیل ۱۰۹۷۲ ۔

[2] ۔ لاطینی تالیف "نویں گریگری کے احکام" کتاب (۵) عنوان (۱۵) باب "تیر اندازان"۔

کی مصداق تھیں۔ البتہ ان سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برائی نے کتنی نہ گہری جڑ پکڑلی تھی۔ جہاں تک کلیسا کے منشاء کا تعلق تھا، اس اصول کا اطلاق صرف کیتھولکوں پر ہونا چاہیے تھا لیکن عمل کی حد تک یہ سب ہی جگہ نظر انداز رہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پوپ تیسرے انوسنٹ نے ایک قانون نافذ کیا تھا، اور بتایا تھا کہ کونسی جنگ ناجائز ہے؛ اس سے متعلق شارحین نے اور بھی تنگی پیدا کردی۔ چنانچہ پاں آفورت کے ربیوں نے بھی یہ رائے قبول کرلی تھی اور ماہرین کی اکثریت نے بھی اس کو قبول کرلیا تھا کہ جائز جنگ کی صورت میں منجنیق کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور تیر کمان کا بھی۔ کیونکہ راہب گراتیان کی تالیف "پوپوں کے احکام کا مجموعہ" میں اس بات کی اجازت ہے کہ دشمن سے لڑنے میں ہر طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے؛ اور اس کے لیے خود کمین بچھائے جا سکتے ہیں۔ مونالڈ کے چوٹی کے مسائل" نامی کتاب نے بھی وہی رائے دی جو شارحین نے دی تھی۔ اور اس نے تیر اندازوں اور منجنیق چلانے والوں کو اس کی اجازت دی کہ عیسائیوں کے خلاف ناجائز جنگ میں اپنی مہارت کا استعمال کریں لیکن ژاں داندریا نے یہ رائے ظاہر کی کہ لوگ منجنیقوں کا استعمال بھلا نہ کہیں، اگرچہ اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ گڑھیوں اور جہازوں کی مدافعت کے لیے ان کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

جنگوں کے زمانے میں جو عارضی صلح ہوا کرتی تھی، وہ یا تو قانون مذہبی کے تحت ہوتی تھی (جسے شرعی صلح بھی کہا جاتا تھا) یا فریقین آپس میں طے کرکے مقرر کرتے تھے (جسے سادہ فی صلح کا نام دیا جاتا تھا)۔ لیکن شرعی صلح کا کبھی بھی احترام نہیں کیا گیا۔ خود آکویناس کے ٹامس نے یہ رائے دی تھی کہ اگر ضرورت ہو تو

مذہبی عیدوں کے موقع پر بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔ اس کے ڈھائی صدی بعد بلی نے پوپ دوسرے یولیوس کی نظیر کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ ایک حد تک افسوس کے ساتھ اخذ کیا کہ جن دنوں کو کلیسا نے مقدس قرار دیا ہے، ان میں عمل میں لائی جانے والی جنگی کارروائیاں جائز سمجھی جائیں گی۔[1]

کلیساؤں کی مجلس شورائے مذہبی نے اشخاص سے برتاؤ کے متعلق جو احکام دیے تھے، ان کے متعلق قانون مذہبی کے بہترین ماہروں نے جن میں نکولاس دے تودس کس سرفہرست میں ہے، یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رواج مخالفانہ کے باعث وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ گویا اب پادری، راہب، خانقاہوں کے ملازم، زائر، تاجر اور کسان جنگ کی دراز دستیوں سے محفوظ نہ رہے۔ بالآخر راردے آیالا نے پادریوں کی حد تک ایک استثنا ضرور کیا: بجز اس کے کہ خود پادری بھی مخاصمانہ کارروائیوں میں دخل ہی کریں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے موضوع پر لکھنے والے مولف اپنے زمانے کے معیار سے بلند تر رہے۔ چنانچہ انسانیت اور عفو و درگذر کے جذبات ان میں بھرے ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مولف، جو رومی قانون کے نظریوں سے رچے ہوئے تھے، خاصے سخت احکام بیان کرتے تھے۔ لیکن زیادہ کثیر مولف علانیہ طور سے ان ظالمانہ برتاؤوں کو ملعون ٹھیراتے تھے جو ان کے زمانے کی جنگوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ ایک چیز قابل ذکر ہے۔ گروتیوس کے پیشروؤں میں ـــــ سے

---

[1] اکویناس کے سینٹ تاماس کی لاطینی کتاب "دینیات کے چوٹی کے مسائل" حصۂ دوم، مسئلہ (۴۰): جنگ، عنوان (۴): کیا ایام تقریبات میں جنگ کرنی جائز ہے؟" ـــــ بلی کی لاطینی کتاب "فوجی امور اور جنگ کے متعلق رسالہ"، حصۂ دوم۔

کسی مولف کے ہاں بھی اتنے ظالمانہ اور بے رحمانہ صفات نظر نہیں آتے جتنے بنکر شوئیک نے لکھ مارے تھے۔

قرون متوسطہ میں فریقین جنگ میں ہر قسم کے روابط و تعلقات منقطع ہو جاتے تھے۔ قانون روما کا یہ اصول ہے کہ مخاصمانہ کارروائیوں کے شروع ہوتے ہی دشمن اشخاص اور دشمن جائداد گرفتار کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں خانگی اور سرکاری جائداد میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ دوران مخاصمت میں حربیوں کی رعایا میں ہر قسم کا تجارتی کاروبار ممنوع ہوتا ہے۔ دشمن سے متعلق ہونے والی ہر چیز دشمن سمجھی جاسکتی اور مقاتلوں کے رحم و کرم پر رہتی۔ اعلان جنگ حسب ذیل الفاظ میں کیا جاتا جیسا کہ فرانسوا اول کے ایک اعلان میں جو شارل کین کے خلاف تھا، ہمیں نظر آتا ہے کہ: "یہ ہم معلوم کراتے ہیں کہ ہم نے شہنشاہ مذکور اور اس کے ساتھیوں اور طرفداروں نیز ان کے اجملہ موروثی ممالک کی رعایا کو ہمارا اور ہمارے شاہی علاقوں اور جاگیرداریوں اور رعایا کا دشمن قرار دیدیا ہے۔ اور اسی باعث ہم اپنی تمام رعایا کو اجازت دیتے اور مجاز گردانتے ہیں کہ مذکورہ بالا لوگوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے سمندر اور خشکی میں ہتیار استعمال کریں۔"

ان سختیوں میں نرمیاں پیدا ہوئے بغیر نہ رہیں۔ ترقی خاصکر اس معاملے میں عمل میں آئی کہ دشمن کی جو رعایا اعلان جنگ کے وقت فریق ثانی کی سرزمین میں ہو۔

انگلستان کے ۱۲۱۵ء کے منشور اعظم میں بھی بعض انسانیت پرور احکام درج تھے۔ چنانچہ دفعہ (۴۱) میں بیان ہوا تھا کہ تمام تجارت پیشہ لوگوں کو اجازت ہوگی کہ انگلستان سے جائیں، وہاں آئیں رہیں، خشکی یا تری میں سفر کریں تاکہ کاروبار تجارت انجام دیں ان پر کوئی غیر معقول محصول عائد نہیں کیے جائیں گے بلکہ قدیم مطالبات ہی

194

کے مطابق چنگی وصول کی جائے گی۔ دوران جنگ کے لیے اُن لوگوں کی حد تک استثناء کیا جاتا ہے جن کے ملک سے جنگ ہو رہی ہو۔ اگر اُن کے حکمران اور [انگلستان کے] بادشاہ میں جنگ چھڑ جائے تو اُن کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ان کی جائداد قرق کر لی جائے گی، لیکن انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، تا آنکہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ دشمن بادشاہ نے انگریز تاجروں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔

بلاکس ٹن کہتا ہے کہ "منشور اعظم کا یہ حکم تمام شمالی قوموں کے لیے ایک منصفانہ قاعدہ ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اِسٹیرن ہوک نے بیان کیا ہے گاتھوں اور سویڈن کے لوگوں نے بھی یہی قاعدہ اختیار کر لیا ہے۔ لیکن یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ انگلستان کے ماگنا کارٹا (منشور اعظم) میں، جو بادشاہ اور اس کے علاقے میں پیدا شدہ رعایا کے مابین ایک خالص اندرونی انتظام پر مشتمل ہے، اس کا ذکر عمل میں آیا ہے۔ اسی باعث مون تس کیو نے تعریف و توصیف کے الفاظ میں لکھا ہے کہ "اجنبی تاجروں کی حفاظت کرنا انگریزوں نے اپنے قومی قانون کا ایک جزو بنا لیا ہے[1]۔ اور تمام دنیا میں یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ بہتر طور پر یہ معلوم کر لیا ہے کہ ان تینوں بنیادی چیزوں یعنی مذہب، تجارت اور آزادی کو بیک وقت کس طرح برقرار رکھا جائے۔

[1] یہ اصول بہ صدیوں پہلے سے اسلامی قانون میں عہد نبویؐ سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ امام محمد شیبانی لکھتے ہیں کہ "یہ ایک اصولی قاعدہ ہے کہ غیر ملکی مستامنوں کی ہمارے علاقے کے دوران قیام میں حفاظت کرنا اور ان کے ساتھ انصاف کرنا اسلامی حکمران کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خود ذمیوں (غیر مسلم رعایائے اسلام) کے ساتھ۔" دیکھیے شرح سیر کبیر، جلد (۴)، ص۱۰۱۔ (مترجم)۔

یہ قابل ذکر ہے کہ انگلستان کی تجارت یکے بعد دیگرے تین مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ بارھویں صدی میں وہ ایک بلدیاتی چیز تھی۔ پہلے ایڈورڈ کے زمانے میں وہ قومی چیز بن گئی اور تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں وہ بین الاقوامی چیز ہوگئی۔ پہلے دور میں شہر نارچ کا تاجر لندن میں ویسا ہی اجنبی سمجھا جاتا تھا جیسا شہر بروگس (واقع بلجیم) کا۔ پھر ان مقامی اداروں نے ایک قومی نظام معاشیات کے لیے جگہ خالی کردی، اور گاؤں یا شہر سے اس کا دائرہ پھیل کر پورے ملک کو گھیر لیتا ہے۔ ایک سرکاری اور ہر جگہ یکساں، محصول چنگی پورے ملک کے لیے ایڈورڈ اول کے 195 زمانے میں قائم کردیا جاتا ہے۔ اور آخر میں تیسرے ایڈورڈ کے زمانے میں بین الاقوامی بنا دینے کی کارروائی عمل میں آجاتی ہے[1]۔

انگلستان میں "اہم پیداواروں کا نظام" پیشہ ورانہ تنظیموں کے اصول پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے باعث تاجروں کو درآمد و برآمد کا اجارہ حاصل ہوگیا تھا۔ اہم پیداواروں سے مراد اون، کھالیں، چمڑا، ٹن، اور سیسہ تھے۔ بر اعظم یورپ میں ایک شہر دساور کے مرکز کے طور پر انتخاب کیا جاتا تھا۔ عرصے تک بروگس کو یہ حیثیت حاصل رہی پھر (فرانس کے) شہر کالے کا اس غرض کے لیے انتخاب ہوا۔ ۱۳۵۳ء میں تیسرے ایڈورڈ نے "اہم پیداواروں کا قانون" نافذ کیا۔ اس میں اس کی کوشش کی گئی تھی کہ خریداروں کے لیے انگلستان میں کشش پیدا کی جائے۔ چنانچہ مختلف شہروں کو دساور کے مرکز کے طور پر قائم کیا گیا اور کالے کی مرکزیت کو برخاست کردیا گیا لیکن جلدی ہی دوبارہ وہاں پھر مرکز قائم کردینا پڑا۔

دساور کے ہر مرکز کی تنظیم اسی اصول پر ہوتی تھی جس اصول پر

---

[1] کننگ ہام کی انگریزی کتاب "قرون متوسطہ میں انگریزی صنعت اور تجارت کی ترقی" جلد (۱) ص (۳۰۷) و ما بعد۔

ہر ہر پیشے میں کام کرنے والوں کی۔ ہر مرکز کا ایک میر مجلس ہوتا تھا اور چند آلڈرمن یعنی حکام عدالت اور چند کوتوالی کے جوان۔ دساور کا یہ مرکز مقامی اختیار سماعت سے باہر ہوتا تھا۔ اجنبی تاجروں کے ساتھ رعایتیں برتی جاتیں اور جہاں تک مواخذوں اور انتقاموں کا تعلق تھا "اہم پیداواروں کا قانون" حکم دیتا تھا کہ ان کے حکمران اور انگلستان کے بادشاہ میں جنگ چھڑ جائے تو ان کو چالیس دن کی مہلت اس غرض کے لیے دی جائے گی کہ اپنا اسباب لے کر انگلستان سے چلے جائیں۔ اور اگر یہ مہلت کافی نہ ہو تو مزید چالیس دن بلکہ اس سے زیادہ کی مہلت دی جا سکے گی۔ بادشاہ جو نظام قائم کرنا چاہتا تھا وہ بہر حال ۱۳۵۷ء میں ترک کر دینا پڑا۔

شمال مغربی جرمنی کے شہروں میں جو وفاق (ہانزے) قائم ہوا تھا اس کے تحت اسے اکثر ممالک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان حلیف شہروں کے تاجروں کو چالیس دن سے ایک سال تک کی مہلت دی جاتی کہ اپنی کنٹیوں میں واپس ہو جائیں۔ بعض ممالک میں تو اس "ہانز یاتی وفاق" سے بہت زیادہ قابل لحاظ نتیجہ برآمد ہوگیا تھا۔ اور وہ یہ کہ "ہانز یاتی" تاجروں کو کسی صورت میں بھی ستایا نہ جائے گا، اور وہ اپنے تجارتی کاروبار کو جاری رکھ سکتے ہیں[1]۔

فرانس میں بہت دنوں تک ایک تنگ نظرانہ سیاست کار فرما رہی۔ سینٹ لوئی کے دور حکومت میں ان انگریز تاجروں کو جو فرانسیسی سلطنت میں سکونت پذیر تھے، گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس پر انگلستان کے بادشاہ نے بھی جواب میں فرانسیسی رعایا کے متعلق

---

[1] پوتیر کی جرمن کتاب "قانون بین الممالک کی تاریخ اور علم پر اضافے" ص ۱۵۱-۱۴

سخت کارروائیاں اختیار کیں۔ پچھتر سال بعد چوتھے شارل کے زمانے میں ایک مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ اعلان جنگ کے موقع پر ان تمام فرانسیسیوں کا جو انگلستان میں رہتے تھے، قتل عام کردیا گیا۔ اس پر فرانس کے بادشاہ نے تمام انگریزوں کو گرفتار اور ان کی جایداد کو ضبط کرلیا۔ یہ افواہ غلط ثابت ہوئی اسی لیے بادشاہ شارل نے حکم دیا کہ قیدیوں کو تو رہا کردیا جائے مگر ان کی جایداد روک ہی رکھی گئی۔ "خوبصورت فلپ" کے زمانے میں اسی قسم کے واقعات دوبارہ پیش آتے ہیں۔ بہر حال پندرھویں صدی کسے ایک مکمل انقلاب پیدا ہوجاتا ہے چنانچہ ۱۴۸۳ء میں "ہانز یاتی" وفاق اور گیارھویں لوئی کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے مطابق "ہانز یاتی" شہروں کے باشندے اس حق سے مستفید ہونے لگے کہ، وہ جنگ چھڑنے کے ایک سال بعد تک فرانس میں رہ سکتے ہیں سولھویں صدی میں جو معاہدے ہوئے ان میں اس طرح کی دفعہ کا عام رواج ہوگیا۔ اور یہ مہلت مختلف جگہ مختلف تھی۔ اور تین مہینوں سے دو سال تک ہوتی تھی۔ ۱۷۱۳ء میں جو معاہدے اوت ریشت میں ہوئے، ان میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ایسی چارہ جوئیوں، قرضوں اور دیگر غیر مادی قسم کے حقوق کا تعلق ہے، جو دشمن کی رعایا کو کسی حکمران سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے متعلق حاصل ہوں، ان کے متعلق ایک دلچسپ سوال پیدا ہوگیا۔ وہ یہ کہ آیا ان حقوق کو بھی ضبط کیا جاسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں یہ ایک مستقل قاعدہ بن چکا تھا۔[1] چنانچہ پاپواں نے ایک حکمنامے کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم

---

[1] - سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کی تشریحیں" جلد (۳)، ص ۱۳۳۔

ہوتا ہے کہ فرانس میں کیا خیال تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پاپون لکھتا ہے کہ "ایک فلانڈری شخص کسی فرانسیسی کو ایک ہزار ایکو (چاندی کا سکہ جو تین لیرا یا فرانک کے مساوی تھا) قرض دیتا ہے۔ ادائی کا وقت آجاتا ہے اور فلانڈری، عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کر دیتا ہے۔ فرانسیسی ادائی میں کچھ اس طرح دیری کرتا جاتا ہے کہ اس کے باعث اس فلانڈری کا مقدمہ طول پکڑتا ہے اور اسی اثناء میں دونوں قوموں کے حکمرانوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ رقم قرق کرکے خزانۂ شاہی میں جمع کر دی جاتی ہے۔ جس کے بعد صلح ہوجاتی ہے۔ فلانڈری اپنے مدیون کے خلاف دوبارہ چارہ جوئی کرتا ہے۔ وہ جوابدہی میں یہ عذر کرتا ہے کہ رقم وہ ادا کر چکا تھا، جو ضبط کر لی گئی۔ ماہ اگست ۱۳۴۹ء کے حکمنامۂ پاریس کی رو سے فلانڈری کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی فرانسیسی کے متعلق یہ حکم نافذ رہا کہ جو رقم اس کو حاصل ہوئی اور اس کے پاس رہی تھی اس کی وہ ادائی کرے"[1]۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں پیزا اور فلارنس میں جنگ چھڑی۔ پیزا نے اپنے ان افراد رعایا کو جو فلارنس کے باشندوں کے مقروض تھے، اس بات پر مجبور کیا کہ پیزا کے خزانے میں اپنے قرض کی رقم داخل کر دیں۔ صلح ہونے کے بعد فلارنس کے ایک دائن نے اپنے قرض کی ادائی کے لیے نالش دائر کی۔ اس جھگڑے میں فلپ دے دِک پینو کو حکم بنایا گیا۔ اس نے یہ قرار دیا کہ جو ادائی عمل میں آئی تھی، وہ درست تھی۔ بے شبہہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ مدیون نے جبر اور دباؤ کے تحت وہ کام کیا تھا[2]۔

---

[1]۔ پاپون کی فرانسیسی تالیف "فرانس کے دربارہائے شاہی کے قابل ذکر احکام کا مجموعہ" جلد (۵) عنوان (۵) حکمنامہ (۲)۔

[2]۔ سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کی تشریحیں" جلد (۳) ص ۲۰۵۔

197 جنگ کا ہدف سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ بلّی نے اس سے نہ تو عورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور نہ بچوں کو۔ وہ صرف خانگی جنگ اور خدائی صلح کے متعلق قانون مذہبی میں جو احکام تھے، ان پر زور دیتا ہے۔ اور وہ متعدد ماہرین قانون کی رائے نقل کرتا ہے، جو مجالس شورائے مذہبی اور پوپوں کی طرف سے مقرر کی ہوئی امن آرائیوں سے متفق ہیں۔ اور انھیں کی طرح وہ خود بھی تسلیم کرتا ہے کہ جنگ دشمن کی رعایا اور ماتحتوں اور حلیفوں سب کے خلاف عمل میں آتی ہے، بشرطیکہ یہ لوگ دشمن کا اپنی جان و مال سے ہاتھ بٹائیں۔ پھر بھی وہ ہچکچاتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ملاحظہ ہوں کہ "یہ پابندی کیسے عائد کی گئی جب کہ ماتحت (رعایا) اپنے آقا کو عملاً نہیں تو کم از کم عادۃً ضرورت پر اپنی امداد پیش کرتی رہی ہے۔" جنتی لیس بھی عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اور گروتیوس بھی یہی نظریہ بیان کرتا ہے، اگرچہ اس کی کتاب میں جنگ میں اعتدال برتنے کے لیے جو باب ہے اس میں وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس نظریے کے نتائج کی سختی کو کم کیا جائے۔

کتاب "شجرۂ حروب" کا مولف ایک دوسری زبان استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے مولف اونورے بونے نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ جنگ کیسے شروع ہوتی ہے؟ اور بیان کرتا ہے کہ "جنگ میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ جنگ کی نوعیت کے باعث نہیں، بلکہ برے رواج کے باعث"[1] وہ ان برے رواجوں پر شدت سے حملہ کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ جنگ میں وفا شعاری اور اخلاق برتے جائیں۔ اور وہ جذبات انگیز لہجے میں

---

[1] اونورے بونے کی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" حصہ چہارم باب ۱ ل.

اپنے زمانے کے علمدر آمد کو ملعون ٹھیراتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "لیکن ہمارا آقا خدا بہت اچھی طرح یہ دیکھتا ہے کہ سپاہی آج کل کیسی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی رحم و کرم کے وہ قیدیوں کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ بڑی بڑی، طاقت سے زیادہ رقمیں ادا کریں۔ اور خاص کر ان غریب لوگوں سے جو اپنا روزگار کمانے کے لیے زمین جوتتے اور تاکستانوں (انگور کے باغوں) میں کام کرتے ہیں۔ اور خدا کے بعد یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی محنت کے ذریعے سے پوری دنیا کو زندگی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور حقیقت میں مجھے دل میں بڑی تکلیف ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا اور سنتا ہوں کہ ان بیچارے کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جو بُرا کہنے یا بُرا سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور جو ملک کے تمام لوگوں کے لیے محنت میں لگے رہتے ہیں اور خدا کے بعد جن لوگوں ہی کی وجہ سے پوپ اور بادشاہوں اور دنیا کے بڑے بڑے سرداروں کو ان کے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں مہیا ہوتی ہیں، — ایسے لوگوں پر کسی بھی رحم و کرم کے بغیر ظلم ڈھائے جاتے ہیں اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے"[۱]

سلونے کی خانقاہ کا نیک صدر یعنی بونے پھر اس سوال کی تحقیق کرتا ہے کہ آیا "اس جنگ میں جو فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں میں ہو رہی ہو، فرانسیسیوں کو اس کا حق ہے کہ انگریزوں کی سرزمین پر چڑھ دوڑیں اور انگریزوں کو قید کریں اور ان کا مال چھینیں؟" یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کو حل کرنے کی اولین کوشش کا امتیاز انیسویں صدی عیسوی کو حاصل ہوا۔ اور یہ تسلیم کرانے کی کوشش عمل میں آئی کہ، ژاں ژاک روسو کے الفاظ میں، جنگ

198

[۱] ایضاً حصہ چہارم باب (۷۸)۔

آدمی اور آدمی کے تعلقات کا نام ہرگز نہیں ہے، بلکہ مملکت اور مملکت کے تعلقات کا۔ اور ان تعلقات میں عوام الناس محض ضمنی طور پر داخل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو انسان کی حیثیت سے اور نہ ہی شہریوں کی حیثیت سے؛ بلکہ تنخواہ یاب سپاہیوں کی حیثیت سے۔ سلوانے کی خانقاہ کے صدر نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ نقل کیے جانے کے قابل ہے۔ اور یہ جواب جنگ کی نوعیت کے متعلق جو صحیح تصورات ہو سکتے ہیں، ان سے پوری طرح متفق ہے۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: "کوئی شخص دوسرے کے قصور کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ پھر کیوں بیچارے انگریزوں کو ان کے آقا کے قصور کے باعث نقصان اٹھانا چاہیے؟" اسی لیے اچھے تاجر، زمین جوتنے والے کسان، اور میدانوں میں چرانے والے چرواہے اور اسی طرح کے لوگ "جنگ سے باہر سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔" اور بدرجۂ اولیٰ کسی شخص کی طرف اس چیز کو منسوب نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ دخل نہیں دیتا۔ لیکن تمام دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ جنگوں کا فیصلہ کرنے یا حکم دینے یا اختیار کرنے میں غریب لوگوں کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ امن سے رہیں۔ لہٰذا پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ان پر چڑھ دوڑتے ہیں؟ مزید برآں اخلاقی اور قدرتی معقولیت کی بناء پر ہر شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق خدمت انجام دینی چاہیے۔ اور تمام دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ غریب لوگ نہ کھانے کو پاتے ہیں اور نہ ان کو ہتھیار چلانا آتا ہے۔ پھر یہ کیسے معقول سمجھا جاتا ہے کہ کوئی ان کو بوجھل ذمہ داریوں سے لاد دے؟...

اسی طرح اس صدی کے اصول ناموس کے مطابق کونسی جنگ، کونسی بہادری اور کونسی تعریف حاصل ہوتی ہے، جب کسی ایسے شخص کو پکڑا یا قید کیا جائے جس کے پاس نہ تو ہتھیار ہوں، نہ جسے زرہ پہننی تک آتی ہو اور جو نہ پنڈلی کی حفاظتی زرہ باندھ سکتا ہو اور نہ سر کا خود!

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کونسی آن بان اور بہادری ہے کہ ایسے غریب اور بے قصور شخص کو ماریں جو سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا کہ اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ کسی میدان میں یا کسی مرغزار یا جھاڑی میں اپنی سوکھی روٹی کھائے؟ میں ہزار کوشش کے بعد بھی یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں۔" اونور ے بونے کو بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کی مخالف رائے ہی کو غلبہ حاصل ہے۔ چنانچہ اسے قبول کرتے ہوئے وہ افسوس ظاہر کرتا ہے اور مروّجہ نظریے کے نتائج کی سنگینوں کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "باوجود تمام مذکورۂ بالا وجوہ کے پائے جانے کے 'ہمارے اساتذہ کی رائے یہ ہے کہ اگر انگلستان کے بادشاہ کی رعایا حقیقت میں اپنے بادشاہ کی تائید اور اعانت کرتی ہے' تاکہ وہ فرانس کے بادشاہ کے مقابلے میں جنگ کر سکے، تو ایسی صورت میں فرانسیسیوں کو یہ پورا حق حاصل ہوگا کہ انگریزوں سے لڑیں، ان کے مال کو لوٹیں اور ان کے ملک کی کھانے پینے کی چیزیں چھین لیں ..... لیکن اگر رعایا فرانس کے بادشاہ سے لڑنے کے لیے اپنے بادشاہ کو مدد دینی نہیں چاہتی تو فرانسیسیوں کو کسی طرح یہ حق حاصل نہیں ہو' تاکہ ان کو جان یا مال کا نقصان پہنچائیں' ورنہ وہ خدا کے روبرو جوابدہ ٹھیریں گے۔"[1]

199

پر امن لوگوں اور ان کے مال کے محفوظ و مامون ہونے کے متعلق یہی نظریہ کتاب "شجرۂ حروب" کے ہر حصے میں دہرایا گیا ہے اس کا مولف جنگوں میں ان قواعد کا احترام کروانا چاہتا ہے جو خانگی جنگ اور "خدائی امن" کے متعلق مجالس شورائے مذہبی اور پوپوں کی طرف سے نافذ ہوئے ہیں۔ وہ کسانوں کے اس

---

[1] ایضاً حصۂ چہارم باب (۴۸)۔

حق و امتیاز کی حمایت کرتا ہے اور اس بارے میں بہت طویل مباحث پیش کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، وہ اس کی تمناؤں کے مطابق نہیں رہے۔ چنانچہ وہ پرجوش طور سے اس کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "خدا کرے کہ بادشاہوں کے دلوں میں یہ بات آئے کہ وہ اس بات کا حکم دیں کہ تمام جنگوں میں کسان لوگ محفوظ سمجھے جائیں[1]" اس کا یہ اولپسند نظریہ اس کی کتاب کے دلکش ترین صفحوں میں سے ایک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ پوری کتاب اپنے مولف کے دل کی وفا شعاری اور روح کی دیانت پسندی کی آئینہ دار ہے۔

بونے ہم کو ایک بڈھے کا حال سناتا ہے۔ اسے قید کرلیا گیا ہے۔ وہ اس کے خلاف ہر قسم کی مخاصمانہ کارروائی سے باز رہنے کے لیے اس کے بڑھاپے کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ ہم یہ قصہ سنائیں گے:۔
"ایک فرانسیسی شہامت باز اپنی ٹولی کے ساتھ بورڈو جاتا ہے۔ یہاں اس شہر کا ایک باشندہ ملتا ہے، جو ایک گرجا میں جو تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا، نماز اور خطبہ سننے کے لیے آیا تھا، کیونکہ اس گرجا میں ایک بہت نیک راہب رہا کرتا تھا۔ پھر یہ باشندہ لاٹھی ٹیکتا وہاں سے آتا ہے۔ اس کی عمر سو سال کے قریب تھی۔ اس وقت شہامت باز اس سے پوچھتا ہے کہ: بھلے مانس تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا: خدا بھلا کرے، میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ شہامت باز نے کہا کہ میرے رب کی قسم تم میرے قیدی ہو۔ اس نے کہا:

[1] ایضاً حصہ چہارم باب (۱۰۱)۔ [حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے اسی کے متعلق سے احکام دیے تھے جو قانون اسلام کا تا حال جزو ہیں۔ دیکھیے تاریخ طبری سلسلۂ اول صفحہ ۲۰۲۶ و صفحہ ۲۴۷۱ شرح سیر کبیر مولفہ سرخسی جلد (۴) صفحہ ۹ وغیرہ وغیرہ۔(مترجم)]۔

مگر سرکار یہ کیوں؟ اس نے کہا: بات یہ ہے کہ میں فرانس کے بادشاہ سے تعلق رکھتا ہوں جو تمھارے آقا کے شہروں اور سرزمین سے برسرِ جنگ ہے۔ اس نے کہا: سرکار، خدا کی محبت کا واسطہ! براہ کرم مجھے بادشاہ کے سامنے لے چلو۔ اگر وہ فیصلہ کرے کہ مجھے قید کیا جاسکتا ہے تو بہتر، ورنہ میں چھوٹ جاؤں گا۔ شہامت باز نے اسے جواب دیا کہ: بہت بہتر۔ اور وہ بادشاہ کے پاس آتے ہیں۔ شہامت باز نے کہا کہ اس نے کس طرح اس شہری کو گرفتار کیا تھا اور یہ کہ وہ بہ آسانی دس ہزار فرانک ادا کرسکتا ہے۔ اس پر اس نے بادشاہ سے کہا کہ: سرکار! آپ اور انگلستان کے بادشاہ باہم بڑی بڑی لڑائیاں لڑ رہے ہیں۔ اور یہ طویل عرصے تک جاری رہی ہیں۔ کیونکہ ان کا آغاز اس وقت ہوا جب میں بہت نو عمر تھا۔ اب میں بہت بوڑھا ہوچکا ہوں اور پھر بھی یہ جنگیں ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن میں آپ سے اپنے دین کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی تمام عمر میں کبھی فرانسیسیوں کے خلاف ہتیار نہیں اٹھائے، کبھی میرے پاس تلوار رہی، نہ چھرا، اور نہ کوئی دوسرا ہتیار۔ اگر حضور اس کی تحقیقات فرمائیں گے تو یہ صحیح ہی ثابت ہوگا۔ اس سے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس لڑائی سے ذرا بھی خوشی نہیں ہے اور انگلستان کا بادشاہ ہمیشہ یہ پوچھتا اور سوچتا رہتا ہے کہ آپ سے صلح کس طرح ہو؟ اور میں یہ آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں، اگر آپ کی عظمت و جلالت اسے سننے پر آمادہ ہو۔ سرکار! میں آپ سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قوانین موضوعہ کے تحت مجھ جیسے بڈھے شخص کو نہ تو جنگ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ قید کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی لیے قانون کے مطابق آپ نہ تو انگلستان کی بادشاہت میں کسی شخص کو قید کرسکتے ہیں اور نہ اس کا مال لوٹ سکتے ہیں بجز اس کے کہ

200

ایسے لوگ بادشاہ کو اپنی دلی رضامندی سے اس غرض سے مدد دیتے ہیں کہ آپ کے خلاف جنگ لڑی جائے۔ کیونکہ اگر بادشاہ جبراً ایسے لوگوں کا مال لے لیتا ہے تو اس صورت میں قانوناً اسں کو معذور سمجھنا چاہیے۔ اور میں نے تو انگلستان کے بادشاہ کو آپ کے خلاف نہ تو پہلے مدد دی اور نہ اب دے رہا ہوں، سوائے اس کے کہ جبر و قہر سے میرا مال لے لیا گیا ہو۔ بنا برآں آپ مجھے اپنا دشمن نہیں قرار دے سکتے اور اسی لیے مجھے قیدی نہیں قرار دیا جاسکتا" اتنا بیان کر کے بونے یہ اضافہ کرتا ہے کہ" ان باتوں پہ مزید دھیان دیے بغیر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس بارے میں قانون کیا ہے؟ میں حقیقت میں یہ باور کرتا ہوں کہ ایک بڈھا اور خصوصی حقوق سے بہرہ ور شخص، جسے قانوناً جنگ میں جانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اسے قیدی بنانے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ اس جنگ کے لڑائے جانے میں مشورہ اور مدد دیتا ہو۔ اور بارہا ایک بڈھا شخص اپنے مشورے کے ذریعے سے اس سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، جتنا دس ہتیار بند آدمی۔ اور میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اپنی دلی رضامندی سے اپنے آقا کو اس جنگ کے کیے جانے میں مدد دے رہا ہو، تو صرف اسی صورت میں اس کا مال چھیننے کا حق حاصل ہوتا ہے ورنہ دوسری صورت میں اس کی کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی"[1]

مستقل افواج کے قیام سے جنگ کو مہذب بنانے میں مؤثر مدد ملی۔

201

جاگیرداری نظام کے زمانے میں صرف چھوٹی چھوٹی اور عارضی فوجیں بھرتی ہوتی تھیں، اور ان کو کوئی بڑا دلی تعلق بھی نہیں

---

[1] ایضاً حصۂ چہارم باب (۹۴)۔

پیدا ہوتا تھا۔ فوجی خدمت صرف ایک بہت تھوڑے عرصے کے لیے انجام دینی ہوتی تھی اور ضبط و نظم تقریبًا معدوم ہوتا تھا۔ جلدی ہی دور دراز کی مہموں کے باعث شخصی طور سے فوجی خدمت انجام دینے کے بجائے معاوضے میں رقمی چندہ دینے کی اجازت مل گئی جس کے ذریعے سے تنخواہ یاب آدمیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کو ترقی ہونے لگی۔ بلکہ ان سے خطرہ ہی پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ان کی ٹولیاں ڈاکوؤں، رہزنوں اور لٹیروں کی صورت اختیار کرکے عرصے تک مغربی یورپ میں خدا کا ایک "قہر" بنی رہیں۔ لیکن اس سے اس کا موقع مل گیا کہ باقاعدہ فوجیں قائم کی جائیں۔ رفتہ رفتہ جاگیردارانہ فوجیں اور مفت فوجی خدمت، اور صرف بہت محدود عرصے کے لیے خدمت انجام دینے کا وجود اور وہ عدم ارتباط برخاست ہوگئے، جو متقابل عناصر کی بے نیازی اور آزادی کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے، اور جو ایک اچھے ضبط و نظم کے قیام میں روڑے اٹکاتے تھے۔

اس سلسلے میں انگلستان میں ایک دلچسپ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، وہاں پر جاگیر عطیۂ سلطانی ہوتی تھی۔ ولیم فاتح نے اپنی جملہ رعایا سے وفاداری کا حلف لیا تھا۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں فوجی خدمت میں تخفیف ہوکر صرف رقمی چندہ دینے کی ذمہ داری رہ گئی۔ جسے "معاوضۂ خدمت فوجی" کہتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ وہاں خواہشمندان ملازمت کو تنخواہ پر بھرتی کرنے لگا۔ چنانچہ خود ولیم فاتح کے زمانے میں فرانس اور بریٹنی کے لوگ تنخواہ کے معاوضے پر بھرتی ہوکر فوجی خدمات انجام دے چکے تھے۔ فلانڈرس کے تنخواہ یاب سپاہی پہلے پہل ہنری اول کے زمانے میں نظر آئے۔ اس بادشاہ نے ۱۱۰۱ء میں فلانڈرس کے حکمران رابرٹ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا کہ سالانہ چارسو چاندی کے سکوں (مارک) کے

معاوضے میں وہ پانچ سو سوار انگلستان روانہ کیا کرے گا۔ جب ان فلانڈریوں نے زیادتیاں شروع کیں تو ان کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیے جانے لگے۔ اور ان کو بادشاہ اسٹیفن اول کے زمانے میں واپس کردیے جانے کا مطالبہ ہوا۔ منشور اعظم میں ایک حکم اس بارے میں بھی ہے کہ اجنبی سپاہیوں کو نکال باہر کیا جائے۔

اجنبی ممالک اور انگلستان میں کرائے کے ٹٹوؤں کا بھرتی ہونا جاری رہا۔ پھر صرف انگلستان ان کی فراہمی کی جگہ ہوگیا۔ تیسرے ایڈورڈ کے زمانے سے انگلستان کی براعظمی جنگوں میں انگریزی فوجوں کی اکثریت ایسے ہی تنخواہ یاب سپاہیوں پر مشتمل ہونے لگی۔ ان جنگوں کے باعث اس بات کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ "طلبناموں" کے ذریعے سے فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا جائے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے جاگیرداروں میں معاہدے ہونے لگے۔ اور یہ جاگیردار اپنی نوبت پر علدرآمد قدیم کے باعث وہ فوجی جماعت مہیا کرنے لگے جس کی فراہمی کا انھوں نے اقرار کیا تھا۔ فوجی خدمت کی مدت، تنخواہ کی مقدار، مال غنیمت میں حصہ — یہ تمام چیزیں معین کی گئیں۔ بلکہ اس کے بھی انتظامات کیے گئے کہ حالت جنگ کی طرح حالت امن میں بھی بسر برد کا انتظام کیا جائے۔

202

لہ۔ اسٹربس کی انگریزی تالیف "انگلستان کی دستوری تاریخ" جلد (۳) ص ۵۸۳۔ رہمر نے فوجی خدمات کے متعلق متعدد قدیم رواجات مرتب کرکے شایع کئے۔ ان میں سے ایک میں یہ لکھا ہے کہ سالسبری کے کونٹ نے اقرار کیا تھا کہ چھے سو ہتیاربند اور سترہ سو تیر انداز سپاہیوں کی ایک جمیعت بادشاہ کی خدمت میں لا حاضر کرے گا۔ اسی نے یہ بھی اقرار کیا تھا کہ وہ خود بھی خدمت انجام دے گا اور اپنے ساتھ چھے علمبردار مالک جاگیر شہامت بازوں، اور (۴۴) غیر شادی شدہ (نو عمر) شہامت بازوں کو ساتھ لانا بھی اس کے فرایض میں داخل ہوگا۔ تنخواہ مقرر کردی گئی تھی۔ چنانچہ کونٹ کو روزانہ چھے شلنگ آٹھ دینار (پنیں) مقرر کردیے گئے تھے۔ علمبردار اور غیر شادی شدہ شہامت بازوں کو علی الترتیب چار اور

تنخواہ یاب فوجوں کا رواج فرانس میں چودھویں صدی کے آغاز سے عام ہوگیا تھا۔ اور سابق میں جو لازمی شخصی خدمت تھی اس کی جگہ دولت کے تناسب سے ایک محصول عائد کردیا گیا تھا۔ انگریزوں نے بریٹنی کے معاہدے کے ذریعے سے جو صوبے لے لیے تھے، ان کو جب پانچویں شارل نے واپس حاصل کیا اور جنگ کے ذریعے سے فرانسیسی بادشاہت پر آئی ہوئی تباہیوں کی وہ تلافی کرنے لگا، تو دیکھا کہ دوران جنگ میں بنی ہوئی لٹیروں کی ٹولیاں موجود ہیں۔ یہ لوگ سب دلخواہ دیہات پر لوٹ مار کرکے بسر برد کیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اس میں کامیابی حاصل کی کہ ان کا ایک حصہ اٹلی روانہ کردے اور ایک اسپین، اور باقی کا مزاج اس نے درست کردیا۔ ۱۳۷۳ء میں جو حکمنامۂ ونیس سین نافذ ہوا اس کی رو سے افواج ضابطہ یا باقاعدہ فوج قائم ہوئی۔ اور یہی لوگ ایک مستقل فوج کی بنیاد بنے۔ اس کام کی تکمیل ساتویں شارل نے کی۔ چنانچہ ۱۴۳۹ء میں اس نے اورلیاں کے نمایندگان طبقات ثلاثہ سے اس کی اجازت حاصل کرلی کہ ایک مستقل فوج قائم کرنے کے لیے اپنی تجویزیں عمل میں لائے۔ چنانچہ اس نے سو سو ہتیار بندوں کی پندرہ جماعتیں قائم کیں۔ ان میں سے ہر ہتیار بند کے ساتھ تین تیر انداز، ایک سائیس، ایک گھوڑ سوار سپاہی اور ایک نوعمر کار آموز (یا اعسزازی خادم) یا خدمتگار لڑکا ہوتے تھے۔ ان فوجوں کو سلطنت کی سرحد پر مختلف چھاؤنیوں پر متعین کیا گیا۔ "جاگیرداری فوجی نظام" میں ایک بنیادی تبدیلی ہوگئی۔ اس کے نو سال بعد موں تی لے نورؔ کے حکمنامے کے ذریعے سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دو شلنگ، ہتیار بند سپاہیوں کو ایک شلنگ اور تیر اندازوں کو چھے دینار (پنس)۔ فوج پر اپنے ہتیار آپ ہی فراہم کرلینے کی ذمہ داری تھی۔ اس معاہدے میں یہ بھی لکھا تھا کہ کونٹ "فرانس، نارمنڈی، اور دیگر حدود اور سرحدوں میں" جنگی خدمت بجا لائے گا۔

اس کی کوشش کی گئی کہ ایک شاہی پیدل جمعیت قائم کی جائے۔ چنانچہ آزاد[1] تیر اندازوں کی فوجی جمعیت وجود میں لائی گئی۔ اور ہر کلیسائی اختیار سماعت کے لیے ملک کی جو تقسیم ہوتی تھی، اس میں سے ہر ایک علاقے کے لیے ایک ایک مستثنیٰ تیر انداز ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہر اتوار نیز عید کے دنوں میں تیر اندازی کی مشق کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ ان آزاد تیر اندازوں کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔ گیارھویں لوئی نے جنگجو سوئٹزانیوں کو بھرتی کرکے شاہی پیدل فوج کی بنیادیں قائم کیں۔ اور تنخواہ دے کر چھے ہزار چیدہ آدمیوں کی ایک جمعیت قائم کرلی جن کے ساتھ دس ہزار پیدل اور دو ہزار پانسو فرانسیسی تیر انداز بھی تھے۔ آٹھویں شارل نے اپنے زمانے میں پیدل فوج کا ایک حصہ جرمنوں سے بھرتی کیا۔

سسمونڈی[2] نے اپنی فرانسیسی کتاب "اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" میں یہ بتایا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اطالویوں کے فن عسکری کی کیا خصوصیت تھی۔ چنانچہ "وزنی سوارہ جمعیت" ہی فوج کا سب سے اہم حصہ ہوتی تھی۔ اور ہر سوار لوہے سے ڈھکا ہوا ہوتا تھا۔ اسی لیے یہ لوگ صرف اسی صورت میں لڑ سکتے تھے جب کہ گھوڑوں کو بھاگ دوڑ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور اکثر لڑائی شروع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی کہ ہر دو طرف کے سپہ سالار باہم اتفاق کریں اور مقابلے کے لیے ضمانت دیں اور ضمانت قبول کریں۔ چنانچہ ہر کوئی اپنی طرف کے میدان کو ہموار کرلیتا جہاں انھیں لڑنا ہوتا۔ لیکن مبارزے شاذ و نادر ہوتے تھے۔ اور ان تنخواہ یاب سپاہیوں کے افسر جب سوچ بچار کے بعد جنگ کرتے تو جہاں تک ممکن ہوتا اپنے آدمیوں کا خون نہ بہنے دیتے۔

---

[1] ان کو "آزاد" اس لیے کہتے تھے کہ یہ ملکی محاصل کی ادائی سے آزاد تھے (مترجم)۔

[2] یہ بھی دیکھیے کی فرانسیسی کتاب "فرانس کی جو ارضی اور سیاسی تنظیم گیارھویں صدی کے اختتام سے پندرھویں صدی کے اختتام تک تھی، اس کے متعلق مقالہ"۔

اس طرح کی لڑائی پورا دن ہوتی اور ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مقاتلوں کی جان جاتی۔ کبھی کبھی تو ایک بھی نہ مرتا۔ سِسموندی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "جنگ رعایا پر ہوتی، فوج کے خلاف نہیں۔ اور قوم کی پوری جماعت دشمن تصور کی جاتی۔ اور جس مقام پر جنگ ہوتی وہاں کے لوگوں کا پورا مال و جائداد ان سپاہیوں کے نزدیک ایک جائز مال غنیمت ہوتا۔ یہ لوگ جائدادوں کے مالکوں اور گاؤں والوں کو گرفتار کر لیتے اور فدیہ لیے بغیر رہا نہ کرتے ہے[۱]"

ؔفُے نیس کا ایک سفیر جے زار نورحیا کے سپاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ بالکل بے اصول اور شتر بے مہار ہیں۔ ابھی تک انھیں لڑائی کی نوبت نہیں آئی ہے لیکن پھر بھی گذر اوقات صرف چوری اور ڈاکے پر ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ لوگ چاہے فرانسیسی ہوں یا گاسکنی والے یا سوئستانی، سب ہی وحشی ہیں۔ ... اور انھیں نے یہ ملعون عادت اٹلی میں ڈالی ہے۔"

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک جرمنی میں کوئی منتقل فوج وجود میں نہ آسکی تھی۔ کبھی تو براہ راست رعایا کو بھرتی کر لیا جاتا، اور کبھی کرایے کے ٹٹوؤں کو بھرتی کیا جاتا۔ اگر رعایا کو بھرتی کیا جانا ہوتا، تو مختلف جرمن راجدھانیوں کی مجالس شوریٰ اس مدت کا تعین کرتیں جس میں ان لوگوں کو اپنے حکمران کی صوابدید پر کام کرنا ہوتا۔ اور اگر تنخواہ پر نوکر رکھا جانا ہوتا، تو فوجی افسر ٹھیکہ داری کے اصول پر کام کرتے اور ایک معینہ رقم پر سپاہی فراہم کرتے۔

فوجی قواعد اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ انگلستان میں بہت قدیم سے رائج تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی ملک میں

204

---

[۱] سِسموندی کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسط میں اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" جلد (۴) ص ۲۲۳۔

باضابطگی کے ساتھ فوجی نظم و ضبط، دیگر ممالک سے پہلے قائم ہو گیا تھا۔ اور اس کی اس بارے میں عام طور سے مولف تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ کومین لکھتا ہے کہ "جہاں تک مجھے علم ہے، دنیا کی ان تمام سلطنتوں میں، جن سے میں واقف ہوں، ایسی سلطنت جہاں پبلک امور کا سب سے اچھا انتظام ہے اور جہاں رعایا پر سب سے کم زیادتی کی جاتی ہے نیز جہاں جنگ کے لیے کوئی عمارت توڑی اور ڈھائی نہیں جاتی، وہ انگلستان ہے۔ اور جو لوگ [اس سے] جنگ کرتے ہیں ان پر مصیبت اور بدقسمتی ٹوٹ پڑتی ہے"۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ "اس خوبی کے باعث انگلستان کی بادشاہت کو دوسری بادشاہتوں پر یہ فوقیت حاصل ہو گئی ہے کہ اس ملک اور اس قوم کے لوگ نہ تو کوئی چیز تباہ کرتے ہیں، نہ جلاتے ہیں، اور نہ عمارتوں کو ڈھاتے ہیں۔ اور مقابلہ صرف سپاہیوں اور خاص کر جاگیرداروں سے ہوتا ہے جن کے خلاف وہ بہت رشک و حسد رکھتے ہیں[1]"

ایک اور موقع پر انگلستان کی جنگوں ہی کا ذکر کرتے ہوئے کومین بیان کرتا ہے کہ "ان کا انگلستانی رواج یہ ہے کہ اگر انھیں لڑائی میں جیت حاصل ہو تو وہ کسی کو قتل نہیں کرتے اور خاص کر رعایا کو (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر کوئی ان کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہی سب سے زیادہ طاقتور ہیں) اور وہ کسی کو جرمانے دینے پر مجبور نہیں کرتے"۔ روجرس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۴۶۱ء میں جب آن ژرو کی مارگریت کی فوج نے لوٹ مار شروع کی تو لوگوں نے جھٹ پٹ چوتھے ایڈورڈ کو تخت نشین کر دیا[2]۔

---

[1] کومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب چہارم باب (۱۸)۔

[2] جیمس تھارلڈ روجرس کی انگریزی تالیف "تاریخ کی معاشی تعبیر" کا فرانسیسی ترجمہ از کاستلوٹ ص ۳۵۔

جان بے علاقہ کے زمانے میں وہ قاعدے نافذ ہوئے جن کا منشاء فوج میں زندگی پیدا کرنے میں سہولت مہیا کرنا تھا۔ اس سے پہلے رچرڈ اول نے بھی ۱۱۸۹ء میں ان صلیبی جنگجوؤں کے لیے جو ارض مقدس جانے کے لیے جہازوں پر سوار ہوتے تھے ایک ضابطہ نافذ کیا تھا تاکہ جہازوں میں ضبط قائم رہے۔ ۱۳۸۵ء میں دوسرے رچرڈ نے وہ احکام نافذ کیے جن کا انگریزی نام یہ ہے: "قواعد، احکام اور رواج جو فوج میں ملحوظ رہیں۔" ان کی ترتیب خود بادشاہ نے "صدر حاکم عدالت، سرخیل قصر شاہی، سپہ سالار اور دیگر جاگیرداروں، معاشداروں، نوابوں اور عقلمند خطاب یافتوں کے مشورے سے دی تھی۔" اس دستاویز میں (۲۶) دفعات ہیں۔ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ بادشاہ، سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کی اطاعت کی جائے۔ گرجوں کو لوٹنے یا وہاں چوری کرنے اور پادریوں یا عورتوں کو قتل کرنے، عورتوں کی عصمت دری کرنے اور پادریوں اور عورتوں کو قیدی بنانے کی ممانعت کر کے، خلاف ورزی کی سزا پھانسی مقرر کی گئی۔ مذکورہ بالا اشخاص اگر ہتیار اٹھائیں تو پھر یہ ممانعت باقی نہیں رہتی۔ کپتان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ فوج کے لیے لیجائی جانے والی غذا کو چرانے کی ممانعت کی گئی ہے اور خلاف ورزی پر سرقلم کیے جانے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ جھگڑے پیدا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، ورنہ بانی فساد کے گھوڑے اور سازو یراق ضبط کر لیے جائیں گے۔ اور "اگر وہ ملازم، نوکر یا کار آموز ہو تو اس کا بایاں کان کاٹ دیا جائے گا۔" بعض دیگر دفعات میں قیدیوں اور قید کنندوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اور خاص کر ان میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ قیدی کو کپتان کے سامنے لا پیش کیا جائے اور وہی اسے بادشاہ یا سرخیل قصر شاہی یا سپہ سالار کے پاس حاضر کرائے۔ قیدی کو بلا اجازت پروانہ سفر دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس ضابطے کا اسی زمانے میں سرکاری طور سے فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی

205

ایک دفعہ ان الفاظ میں ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی کو قیدی بنائے تو اس سے اقرار لے نیز اس کا خود یا سیدھا دستانہ اتار لے۔ یہ اس بات کی ضمانت اور علامت ہوگا کہ اس نے اسے قید کیا ہے۔ یا اسے حفاظت کے لیے پہرے میں رکھے"۔ حقیقت میں "اس کا وہی اثر ہوگا جو پہلی صورت میں اقرار کا"۔ اگر قیدی کے متعلق کوئی جھگڑا ہو تو دھمکیاں نہیں دی جانی چاہییں ورنہ خلاف ورزی کرنے والے کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اگر یہ آخرالذکر اپنے قیدی کو قتل کر ڈالے تو سپہ سالار اسے قید کرے گا اور اس وقت تک رہا نہیں کرے گا جب تک کہ وہ اپنا حصہ، اپنے گھوڑے، اور اس کا ساز و یراق سرخیل قصر شاہی کی تحویل میں ضبطی کے لیے نہ دیدے"۔ ایک اور دفعے میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ فوج کا ہر شخص "سینٹ جارج کا ایک فوجی نشان نمایاں طور سے اپنے سامنے لگائے اور ایک اپنے پیچھے"۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو ایسے شخص کو زخمی یا قتل کرنے والا ہر قسم کی سزا دہی سے بچ جائے گا۔ اسی دفعے میں اس کی بھی ممانعت ہے کہ "کوئی دشمن سینٹ جارج کا مذکورہ نشان نہ لگائے، خواہ وہ قیدی ہو یا کوئی اور، ورنہ اسے سزائے موت دی جائے گی"۔ اسی طرح اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ "لوٹو" کا نعرہ لگائیں (یہ نعرہ لوٹ مار کی اجازت کا اشارہ ہوتا ہے) "ورنہ سر کاٹ لیا جائے گا اور جس شخص یا اشخاص نے سب سے پہلے مذکورہ نعرہ لگایا ہو تو ان کا بھی سر کاٹ لیا جائے گا اور پھر ان کی لاشیں ہاتھوں کے بل لٹکا دی جائیں گی"۔

206 ایک اور اتنا ہی اہم ضابطہ، جس میں (۴۳) دفعات ہیں ۱۴۱۵ء میں پانچویں ہنری نے نافذ کیا۔[1]

---

[1] ۔ آپٹن نے پانچویں ہنری کے حکمنامے کی ایک لاطینی عبارت نقل کی ہے۔ گروز کی انگریزی تالیف "فوج کے متعلق قدیم باتیں" جلد (۲) ص ۶۴ میں دوسرے رچرڈ کا حکمنامہ

اس لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے ایسی تدبیریں اختیار کر لی گئی تھیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ درج ہے۔ نکولاس کی انگریزی تالیف "آزن کورٹ کی لڑائی کی تاریخ" ضمیمہ ۱۸ میں ان دونوں حکمناموں کا انگریزی متن چھپا ہے۔ سر ٹرزاورس ٹوئس بھی ان دونوں حکمناموں کو نقل کرتا ہے اور اس کا ماخذ کاٹن اور لانس ڈاؤن کے ذخیروں کے مخطوطات ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو اس کی شایع کردہ انگریزی تالیف "امارت یکریہ کی کالی کتاب" جلد (۱) ص ۴۵۹ و مابعد۔ پانچویں ہنری کا حکمنامہ سر ٹرزاورس ٹوئس کے مطابق ۱۴۱۹ء کا ہے لیکن دوسرے مولف اسے ۱۴۱۵ء کا بتاتے ہیں۔

دوسرے رچرڈ کے حکمنامے کے متعدد قلمی نسخے برٹش میوزیم میں پائے جاتے ہیں۔ پانچویں ہنری کے زمانے میں ایک انگریز راہب تھا۔ اس کا نام ایلم ہام کالاس تھا۔ اس نے لاطینی میں "پانچویں ہنری پر منظوم کتاب" لکھی۔ اس میں اس نے اشعار مندرجۂ ذیل میں اس حکمنامے کا خلاصہ درج کیا ہے اور اسے ۱۴۱۵ء کے سفر کے آغاز کا بتایا ہے:—

بادشاہ اپنی فوج کو حکم دیتا ہے
کہ کلیسائی جائداد مامون رہے۔
تمام پادری اور منتظم کلیسا محفوظ رہیں۔
کوئی دست درازی آہنی ہتیار کے ذریعے سے مقدس چیزوں پر نہ کیجائے (؟)۔
اور عورتوں پر ہاتھ ڈالنے کی ممانعت ہے۔
خلاف ورزی کی سزا موت ہے — قانون ایسا ہی تھا۔

سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول کا ایک مولف رابرٹ رڈہین تھا۔ اس نے اپنی لاطینی تالیف "پانچویں ہنری کی تاریخ" میں بھی اس حکمنامے کو مخاصمانہ کارروائیوں کے ابتدائی زمانے کا بتایا ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ہیں:—

"جب ہنری اپنی فوج کے ساتھ صحیح سلامت فرانس پہنچا تو اس نے ایک عام ڈھنڈورا پٹوایا کہ کوئی شخص نہ تو دیوتاؤں کے مندروں کو لوٹے، نہ پادریوں کو نقصان پہنچائے نہ نہتوں کو زخمی کرے نہ

جن سے فتح کا اطمینان ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایسے معاہدے کیے گئے تھے کہ فوج کے لیے بڑھئی، معمار، ہتیار اور گولی بارود فراہم کی جائے گی۔ ہالینڈ اور زے لانڈ سے جہاز کرایے پر لیے گئے تھے۔ بندرگاہوں میں جو انگریزی اور دوسری کشتیاں تھیں ان کو بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس فوج میں نوعمر نوکروں کو چھوڑ کر ساڑھے گیارہ ہزار آدمی تھے۔ تین ماہ کی ملازمت کی تنخواہیں ادا کردی گئی تھیں۔ پارلیمان نے جو رقم منظور کی تھی وہ کچھ زیادہ نہ تھی۔ اور تیاریاں کچھ اتنی مہنگی پڑی تھیں کہ بادشاہ کو تاج کے جواہرات گرو رکھنے پڑے تھے، اور اپنی رعایا سے اسے رقم قرض مانگنی پڑی تھی۔

دوسرے رچرڈ کے حکمنامے کے چند احکام بھی نقل کیے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں اس اصول کی توثیق کی گئی ہے کہ بادشاہ اور سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کی اطاعت کی جائے۔ اس بادشاہ نے (جسے ایک مورخ نے پادریوں کے حکمران کا نام دیا ہے)، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ مقدس روٹی اور شراب، مقدس پیالوں، کلیساؤں اور پادریوں کا احترام کریں بجز اس کے کہ یہ پادری ہتیار لیے ہوئے ہوں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ اور یہی سزا ان لوگوں کے لیے بھی مقرر کی گئی تھی جو عورتوں کو قتل یا ان کی عصمت دری کریں۔ پادریوں اور عورتوں کو قیدی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ چند دفعات میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ بچوں کو ضرر پہنچائے، نہ عورتوں کی عفت میں خلل ڈالے۔
اور جو بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے اس کے لیے
سزائے موت مقرر کی گئی ہے۔"

"منظوم کتاب" اور "تاریخ" دونوں کو کولی نے اپنی انگریزی تالیف "پانچویں ہنری کے متعلق یادداشتیں" میں شامل کیا ہے جو "برطانیہ عظمیٰ اور آئرستان کی تاریخیں اور یادداشتیں" نامی انگریزی سلسلۂ کتب میں شائع ہوئی ہے۔

سپاہیوں کے فرائض، فوجی معائنوں، محافظوں، اور قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ ہر سپاہی کو چاہیے کہ وہ جنگ میں جو کچھ کمائے اس کا ایک تہائی اپنے کپتان کو پیش کر دے۔ اور اگر اس فریضے کی خلاف ورزی کی جائے تو وہ پورے ہی مال غنیمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ قیدی اسی کا ہوگا جس نے اسے گرفتار کیا ہو۔ لیکن گرفتار کنندہ کو چاہیے کہ اپنے قیدی کو اپنے کپتان کے پاس لا حاضر کرے۔ اور اس کپتان کو چاہیے کہ آٹھ دن کے اندر اسے بادشاہ یا سرخیل قصر شاہی یا سپہ سالار کے پاس پیش کر دے۔ کوئی شخص اپنے افسروں کی اجازت کے بغیر فدیہ قبول کرنے کا مجاز نہ تھا۔ ایک دفعے میں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ چودہ سال سے کم عمر بچوں کو قیدی بنایا جائے بجز اس کے کہ وہ کسی سردار، کسی معزز شخص یا کسی کپتان کا بیٹا ہو۔ ایسی صورت میں اسے کپتان کے سامنے لا حاضر کیا جانا چاہیے، جو اسے بادشاہ کے پاس روانہ کر دے گا۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ کسی ایسے کمرے میں داخل ہوں جہاں کوئی عورت وضع حمل کی حالت میں ہو۔ اسی طرح اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ ایسی چیزیں چرائی جائیں جو اس زچہ کی ہوں، یا خود ایسا شور و غوغا کیا جائے جس سے اس کی یا اس کے بچے کی صحت کو نقصان پہنچے۔ اس کی خلاف ورزی کی جائے تو مجرم کے قبضے میں جو بھی چیزیں ہوں ان کا نصف اس زچہ عورت کو دلایا جائے گا اور باقی نصف سرخیل قصر شاہی اور سپہ سالار کو۔ اور خود مجرم کو بادشاہ کی صوابدید پر قید رکھا جائے گا۔ سپاہیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہل جوتنے والے کسانوں کو بے روک ٹوک جانے دیا جائے۔ بادشاہ نے اور بھی احکام اپنے افسروں کو دیے۔ اور کہتے ہیں کہ اس جنگ کے دوران میں فوج میں ضبط قائم رکھنے کے لیے جو ضابطے نافذ کیے گئے ان کی تعداد (۳۷) سے کم نہیں ہے۔ جنرلوں میں سے ایک کا نام تال بو تھا جو شروز بری کا کونٹ بھی تھا۔ اس نے اپنے ماتحت سپاہیوں کے لیے ایک تفصیلی ضابطہ بنایا تھا۔ اس نے

سزائے موت نہ صرف لٹیروں کے لیے مقرر کی تھی، بلکہ ہر اس سپاہی کے لیے بھی جو گھوڑے، بیل یا کسانوں کے کوئی اور جانور لے اڑے۔ اس نے اس کی بھی ممانعت کی کہ انگور کے باغ اور میوہ دار درخت تباہ کیے جائیں۔ ان مختلف حکمناموں میں اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے نظام کی طرف بھی اشارہ نظر آتا ہے۔[1]

ساتویں ہنری کے زمانے میں کچھ نئے حکمنامے نافذ کیے گئے۔ اور آٹھویں ہنری نے خاص کر سنہ ۱۵۴۴ء میں ایک اہم حکمنامہ نافذ کیا جس میں پانچویں ہنری کے حکمنامے کا ایک جزو دہرایا گیا تھا اور کچھ نئے احکام بڑھائے گئے تھے، جو خاص کر قیدیوں کے متعلق تھے، نیز کپتانوں کے اس فریضے کے متعلق کہ جو لوگ ان کے ماتحت ہوں ان کی تنخواہ ادا کرتے ہیں۔ قیدیوں کے متعلق جو احکام دیے گئے تھے وہ بڑے تفصیلی ہیں۔ اگر فرانس کا بادشاہ، بادشاہ کا بیٹا، ڈیوک، لفٹننٹ جنرل، اعلیٰ سرتحصیل یا سپہ سالار سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑے تو وہ براہ راست بادشاہ کے قیدی سمجھے جائیں گے۔ اگر کوئی ان کو چھوڑ دے تو اس کے لیے سزائے موت مقرر کردی گئی تھی۔ اور گرفتار کنندہ کے لیے ایک انعام مقرر کیا گیا تھا۔

الیزابتھ کے زمانے میں بڑی کثرت سے حکمنامے شایع ہوئے۔ بعد میں سنہ ۱۶۴۰ء میں نارد مبرلانڈ کے کونٹ نے ایک فوجی ضابطہ چارلس اول کی فوجوں کے لیے مدوّن کیا۔ اور سنہ ۱۶۴۳ء میں ایسکس کے کونٹ نے انگریزی میں "جنگ کے قوانین اور احکام" نامی ایک ضابطہ جس میں (۹۷) دفعات تھیں، پارلیمانی فوجوں کے لیے نافذ کیا۔

مزید براں انگلستان میں فوجی انصاف کا نظام بہت پہلے ہی

---

[1] مونٹے گوبرنارڈ کی انگریزی تالیف "مضامین آکسفرڈ" بابت سنہ ۱۸۵۶ء مضمون "جنگ کے قانون اور رواج کا ارتقاء" ص ۹۹۔

قائم ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں یہ سرخیل قصر شاہی کے ہاتھ میں تھا جو جنگ کے زمانے میں اہلِ فوج کے تمام جھگڑوں اور ہنگاموں کی تمام خلاف ورزیوں کے متعلق فیصلہ کرتا۔ اعلیٰ سرخیل کو مدد دینے کے لیے سپہ سالار اور چند ماہرینِ قانون، چند اہمیت رکھنے والے لوگ اور ایک کلرک (یا پادری) مامور تھے۔ اس فوجی عدالت کو، جس میں یہ سب شریک ہوتے، اُن معاملات کے تصفیے کا بھی اختیار تھا جو جنگوں میں حاصل ہونے والے خشکی کے مالِ غنیمت کے سلسلے میں پیدا ہوں۔ اسی طرح اس کو قیدیوں اور ان کے فدیے کے متعلق بھی اختیار حاصل تھا۔ جب آٹھویں ہنری کے زمانے میں بکنگھام کے ڈیوک کی سزائے موت کے عواقب کے باعث اعلیٰ سرخیل کا موروثی عہدہ برخاست کردیا گیا، تو اس عدالت کی صدارت سپہ سالار کرنے لگا۔ لیکن فوجی معاملات میں اس کے اقتدارات کے متعلق جھگڑا پیدا ہوگیا۔ اور جلدی ہی فوج کے اعلیٰ افسروں نے اس کے اختیارات خود غصب کرلیے، اور ایک نیا محکمہ قائم ہوا جو "فوجی مجلس شوریٰ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قسم کی ایک مجلس شوریٰ خود ۱۶۴۸ء میں اجلاس کرچکی تھی۔ یہ بیان کیے جانے کے قابل ہے کہ ان اختیاراتِ سماعت [یعنی عدالتوں] کے سامنے جنگ کے رسم و رواج اس حد تک ملحوظ رہتے تھے کہ جب فوجی عدالت کی جگہ مجلس شورائے جنگ قائم ہوکر طویل عرصہ گزر گیا تو بھی بیرونی ممالک کے ضابطوں کو دیکھا جایا کرتا تھا۔

فوجی ضبط کے متعلق دوسرے ملکوں میں بھی ضابطے بننے لگے۔ "سات ارکان" نامی قسطیلہ کے قواعد، سپاہیوں کے متعلق قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔ اور جیسا کہ ہم آیندہ دیکھیں گے، اس میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق بھی احکام تھے۔

109

اس زمانے میں اسپین کو باقی یورپ کے مقابلے میں، جہاں جاگیرداری نظام رائج تھا، ایک عجیب خصوصیت حاصل تھی۔ چنانچہ

دوسرے ملکوں میں انتخاب کا اصول رفتہ رفتہ برخاست ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ وراثت کا اصول قائم ہونے لگا لیکن انتخاب کا اصول قسطیلہ میں برقرار رہا۔ چنانچہ وہاں فوج کے "آدالید" (دلیل) یعنی رہبر اور "الموکادین" (مقدم) یعنی پیدل فوج کے کپتان برابر انتخاب کے ذریعے سے مامور ہوتے رہے۔ اور اگر بادشاہ کو کوئی "دلیل" یا "مقدم" مقرر کرنا ہوتا تو اسے بارہ ماہر ترین لوگوں کو بلانا پڑتا۔ اور یہی لوگ نئے شخص کو چنتے اور قسم کھا کر بیان کرتے کہ اس میں مطلوبہ صفات پائے جاتے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ "اسپین کا عامی، جو سپاہی اور شہری ہوتا، شہری حلقوں میں اگر وہ اپنے مشیروں کا انتخاب کرتا تو میدان جنگ میں اپنے افسروں کا"۔ بحریہ کے متعلق بھی یہی قاعدہ تھا۔ بے شبہ امیر البحر کو تو بادشاہ نامزد کرتا تھا لیکن جہازوں کے کپتانوں کی (جن کو کومیتر کہتے تھے) نامزدگی بارہ ایسے لوگ کرتے تھے "جو سمندر سے واقف" ہوں۔

یہاں ہمیں یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ اسپین کا قانون جنگ بھی، اسپین کے پورے فوجی نظام کی طرح، عربوں کے قانون جنگ سے براہ راست متاثر تھا۔ بلکہ مسلمانوں نے جنگ کے قواعد بہت قدیم زمانے ہی میں مدون کردیے تھے۔

لہ۔ ڈروسیوف سینت ای لیر کی فرانسیسی تالیف "اسپین کی تاریخ" جلد ۳، ص ۴۹۸۔

سہ۔ ریلانڈ کی لاطینی تالیف "جنگ کے متعلق مسلمانوں کے قانون کے احکام" کا فرانسیسی ترجمہ جوسول تھے نے ۱۸۳۰ء میں شایع کیا ــــ سول تھے نے ایک اور کتاب عربی سے ترجمہ کرکے فرانسیسی میں شایع کی جس کا نام "کافروں سے جنگ کے متعلق مسلمانوں کے قانون کے احکام" تھا ــــ نیز دیکھیے ہولت بن دورت اور ری یقیہ کی فرانسیسی تالیف"

[عربوں کا] قانون جنگ مقابلۃً بہت انسانیت لیے ہوئے ہے۔ جنگ کا اعلان کیا جانا لازمی ہے۔ اس کی بھی عادت تھی کہ دشمن کو اسلام لانے یا خلیفہ کو خراج (یعنی جزیہ) دینے کا بھی بدل پیش کیا جاتا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور اور مجنون جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ گفت و شنید کے لیے آنے والے ایلچیوں کا احترام کیا جاتا۔ منبعوں اور چشموں میں زہر ملانے کی ممانعت تھی۔ صرف ایک معاملے میں عرب بڑے سخت تھے۔ وہ یہ کہ جنگی قیدیوں کو اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں یا تو قتل کردیا جاتا یا غلام بنا لیا جاتا اور سیاسی مصلحت کے تحت فدیہ قبول نہیں کیا جاتا[1]۔ ابوالحسین [القدوری] نے، جن کی وفات بغداد میں ۱۰۳۶ء میں ہوئی تھی، غیر مسلموں سے جنگ کے قانون پر ایک رسالہ لکھا تھا[2]۔ ایک اور مولف نے بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دس باب ان قواعد کے متعلق لکھے تھے جو مسلمان اپنے دشمنوں سے ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور آخر میں وقایہ نامی کتاب کا ذکر کرنا چاہیے جو تقریباً ۱۲۸۰ء میں برہان الشریعہ محمود المحبوبی نے لکھی تھی۔

210

مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ مرتدوں، بت پرستوں اور خدا کو نہ ماننے والوں کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ "قانون بین الممالک کی تمہید" ص ۲۰۷۔

[1] معلوم نہیں اس غلط خیال کا ماخذ کیا ہے کیونکہ قرآن مجید (۴/۴۷) کے مطابق نہ صرف فدیہ لینے بلکہ مفت بھی رہا کرنے کا صریح حکم ہے جس پر ہر زمانے میں عمل بھی ہوتا رہا ہے (مترجم)۔

[2] اس سے بہت پہلے امام زید بن علی (فوت ۱۲۲ھ) اور امام ابو حنیفہؒ (فوت ۱۵۰ھ) اور ان کے معصروں نے قانون جنگ پر یا تو اپنے مجموعہ ہائے قانون کے مستقل ابواب میں بحث کی تھی یا اس موضوع پر خود مستقل رسالے تالیف کیے تھے (مترجم)۔

جاری رکھیں۔ چنانچہ یہ جنگ اس وقت تک کی جاتی رہے کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ دینا قبول کریں۔ جزیہ صرف اہل کتاب سے لیا جاتا ہے جو ایک تحریری قانون کو مانتے اور اسے خدا کی وحی سمجھتے اور اسے اپنا دینی قانون قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی چاہیے کہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ کافروں کے خلاف کوئی مہم اختیار کریں[1]۔ اسی سے اسپینیوں کو عربوں کی سرزمین میں گھسا کرنے کا ابتدائً خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کارروائیوں کے متعلق (جن کو کابل گادا یعنی سواروں کا رسالہ کا نام دیا گیا) دسویں الفونسو نے نہایت تفصیل کے ساتھ "سات ارکان" نامی ضابطے میں احکام صادر کیے ہیں۔ غالبًا ٹیوٹانی سلسلے کے راہب شہامت بازوں نے اپنی فلسطینی جنگوں کے سلسلے میں عربوں کے اسی رواج کو دیکھ کر یاد رکھا اور "سفر" کے نام سے اپنی مہیں جاری کیں جن کے متعلق کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی کے بھرے اجلاس میں برادزے ٹو کے پاول ولاڈی میر نے انھیں ملامت کی۔ یہ لوگ سال میں دو مرتبہ غیر عیسائیوں کے علاقوں میں لوٹ مار اور تباہ کاری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ ایک تو مریم عذرا کے تزکیے کی عید کے موقع پر (اور بی بی مریم ہی کو انھوں نے اپنی روحانی سرپرست قرار دیا تھا) اور دوسرے حضرت عیسٰے کے آسمان پر جانے کی عید کے موقع پر۔

فرانس میں دوسرے ژاں نے ۱۳۵۱ء میں جو حکمنامہ نافذ کیا تھا اس میں صرف فوجی یرغمالوں کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں۔ ۱۳۷۴ء میں چھٹے شارل کے زمانے میں ملک کی عام کوتوالی کے متعلق جو حکمنامہ نافذ ہوا، اس میں بھی سپاہیوں کے متعلق چند احکام پائے جاتے ہیں۔ وہ جنگی حکمنامہ جو زمپاخ کی جنگ کے موقع پر صادر ہونے کے باعث

---

[1] ایسا کوئی حکم قرآن یا حدیث میں نہیں ہے چاہے واقعے کی حد تک کہیں ایسا عملدر آمد رہا ہو (مترجم)۔

"زمپاخ نامہ" کہلاتا ہے، وہ بھی فن جنگ کے متعلق کوئی حکمنامہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک معاہدہ تھا جس کی تکمیل کرنے کا سوئستان (سوئٹزرلینڈ) کے تمام صوبوں (کانٹونوں) نے اقرار کیا تھا۔ اس پر ۱۰/ جولائی ۱۳۱۳ء کی تاریخ ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا تھا کہ "کوئی بھی اس وقت تک کوئی عام یا خانگی جنگ شروع نہیں کرسکتا جب تک کہ ہم، جو باہم حلیفی رکھتے ہیں، اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن جب جھنڈے کھول دیے جائیں تو ہم اپنے دشمنوں کے خلاف سب کے سب چڑھ دوڑیں گے اور اسی بہادری سے لڑیں گے جیسے ہمارے آباو اجداد۔ اور ہم متحد اور باہمت اور وفا شعار رہیں گے۔ جو کوئی صفوں کو چھوڑ دے یا اس حکمنامے سے کسی اور طور پر تجاوز کرے تو اسے وہ حکومت گرفتار کرے گی جہاں کا وہ باشندہ ہو اور اس کی ذات اور جائداد کو سزا دے گی تاکہ سب کو تنبیہ ہو اور کوئی خلاف ورزی نہ ہو...... میدان جنگ کی مدافعت کی جائے گی اور خطرہ ختم ہونے تک دشمن کو ہراساں کیا جاتا رہے گا۔ جیسا کہ زمپاخ میں پیش آیا ہے کہ دشمن نے ہمارے لوٹ مار میں مصروف ہونے کے دوران میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا، اور اسے اس سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا اگر ہم مال غنیمت کے پیچھے اتنا زیادہ نہ دوڑتے۔ لہذا آیندہ کوئی شخص غنیمت پر اس وقت تک ٹوٹ نہ پڑے جب تک کہ افسر اس کی اجازت نہ دیں۔ ہر شخص جو کچھ پائے اسے لاکر ان کے سپرد کرے اور یہی افسر اس غنیمت کو فوجی ٹکڑیوں کی قوت کے تناسب سے ان سب لوگوں میں تقسیم کریں گے جنھوں نے لڑائی میں حصہ لیا ہو۔ چونکہ خدائے تعالیٰ نے کلیساؤں کو اپنے گھر قرار دیا ہے اور نوع انسانی کی نجات کے لیے ایک عورت سے خدمت لی ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگوں میں سے کوئی بھی کسی خانقاہ، کلیسا یا گرجا پر نہ تو جبر کرے نہ تباہ، اور نہ آگ لگائے بجز اس کے کہ دشمن ان کے اندر پناہ گزیں ہو

211

اسی طرح وہ کسی عورت یا نوجوان لڑکی پر نہ تو حملہ کرے نہ اسے زخمی کرے۔ اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جب عورتیں اس زور سے چلائیں کہ اس سے ہماری سپاہ کے لیے کوئی نقصان کا خطرہ لاحق ہو[1]۔

۱۴۶۸ء اور ۱۴۷۱ء میں "جارت مند شارل" کے متعدد اہم فوجی حکمنامے شایع ہوئے اور ۱۴۷۳ء میں وہ حکمنامہ نافذ ہوا جو سینٹ ماگزیمن نے تریئٹ کی خانقاہ سے شایع ہوا اور اس کا نام تھا "وہ قواعد و احکام جو ہتیار بند لوگوں اور پیدل اور سوار سپاہیوں کی جماعتوں میں ملحوظ رکھے جائیں۔"

نشیبستان ہالینڈ میں شارل کیں نے ۱۵۴۷ء میں فوجی نظام عدالت کے ایک باقاعدہ ضابطے کا خاکہ مرتب کیا۔

صوبجات متحدہ میں ایک فوجی "حکمنامہ" متعدد ماہرین قانون اور فن داں لوگوں نے مل کر مرتب کیا۔ اور ۱۵۹۰ء میں اسے ہر سہ طبقات رعایا کے نمایندوں کے حکم سے شایع کیا۔

شہنشاہت کی طرف سے دو قانون ۱۵۷۰ء میں بمقام اِشپیی رے صادر ہوئے۔ یہ "سواروں کا حکمنامہ" اور "پیدل فوج کا حکمنامہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

کتاب سات "ارکان" میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "بحری جنگ ایک یاس انگیز چیز ہے۔" قرون متوسط کی ابتدائی صدیوں میں سمندر کی جنگ محض بحری قزاقی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کہ ایران، شام اور مصر کے مالک بن جانے کے بعد عربوں نے اسسس میں ویرنہ کی کہ بحر متوسط کے ساحلوں پر بسنے والی قومیتوں کو دھمکانے لگیں۔ عرب اور عیسائی ایک بہت عظیم الشان لوٹ مار میں مشغول ہوگئے۔ شمالی سمندروں میں بھی ایسی ہی بے امنی تھی۔ مزید برآں اِن مخاصمانہ

212

[1] ملی ہن کی فرانسیسی تالیف "سولہتانی عہد کی تاریخ" جلد (۱) ص ۱۸۵۔

کارروائیوں میں ایک ہولناک بے رحمی بھی برتی جاتی تھی۔ جہاز لوٹ لیے جاتے، ملاحوں کو سمندر میں پھینک دیا جاتا، یا ان کا قتل عام عمل میں آتا، یا ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ سمندر میں کوئی قانون ہی نہ تھا۔ عرصے تک مختلف حکمرانوں میں عارضی امن یا صلح کے لیے جو معاہدے ہوتے رہے، ان سے بحری جنگوں کے جاری رہنے میں کسی طور سے بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی۔ ۱۴۴۲ء میں برٹینی کے ڈیوک کی رعایا انگریزوں کے خلاف بحری قزاقی میں مشغول رہی، حالانکہ ان کے حکمران نے انگریزوں سے ابھی ابھی ایک صلح کی تھی۔ اور جب تک سیں لوئی نے دخل دہی نہیں کی، اس وقت تک برٹینی کے بحری قزاقوں کی طمع آرائیوں کو روکنے پر برٹینی کا ڈیوک مجبور نہ ہوا۔ ۱۴۰۶ء میں غالباً کسی عارضی صلح کے دوران میں اسکاٹ لینڈ کا ولیعہد سمندر پر چوتھے ہنری کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور تقریباً (۱۹) سال تک وہ قید میں رکھا گیا۔ ساحلوں پر جو شہر آباد تھے، وہ ساتھ ہی پناہ گاہوں کا بھی کام دیتے تھے اور یہیں سے جانباز بحری قزاق نکل کر تجارتی جہازوں کو لوٹا کرتے تھے۔ انگلستان اور فرانس کی طویل جنگوں کے دوران میں ایک موقع ایسا بھی پیش آیا کہ بحری قزاق ہی سمندر کے مالک بن گئے تھے۔ انگلستان کے ساحل اور جزائر، فرانسیسی جہازوں کی لوٹ مار کا شکار تھے تو دوسری طرف ڈوفر، رائی، پورٹسمتھ، پلائی متھ اور دوسری بندرگاہوں سے بہت سے قسمت آزما جہازوں پر پردے چڑھاتے تاکہ فرانسیسی ساحلوں کو لوٹیں۔ ایک سرکاری دستاویز میں بحری قزاقوں کا یوں ذکر کیا گیا ہے کہ: "چند لوگ جو سمندری سیاح کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں ڈاکو ہیں جنہیں قانون کی حفاظت کے باہر کردیا گیا ہے، جو بھگوڑے ہیں اور جن کو مختلف مقاموں سے نکالا گیا اور مختلف مملکتوں سے

سلہ۔ ڈرینٹن کی انگریزی تالیف "انگلستان پندرھویں صدی میں" ص ۸۶۔

جلا وطن کیا گیا تھا یا ایسی ہی دیگر مماثل صورتیں ۔ یہ لوگ اپنی لوٹ مار اور سامان اور تجارتی اسباب کی ڈاکہ زنی پر بسر بسر برد کرتے ہیں، چاہے اس مملکت کا ہو یا دیگر ممالک کا۔ یہ بڑی تباہی پھیلاتے ہیں اور مذکورہ مقاموں میں سے متعدد کو انھوں نے نابود کردیا ہے۔[1]"

سمندروں پر جو بے امنی تھی اس کے باعث بحری سفر پر جانے والے اس بات کے معاہدے کرلیتے تھے کہ باہم مل کر سفر کریں اور یہ پہلے ہی طے ہو جاتا تھا کہ بحری قزاقوں اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں جو مال غنیمت حاصل ہو، اسے کس طرح سے بانٹا جائے۔ یہ اتحاد صرف مدافعت ہی کے لیے محدود نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ اتحاد اس خصوصی غرض کے لیے ہوتا تھا کہ دشمن اور بحری قزاقوں کو ضرر پہنچائیں ۔ اور انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی تھی کہ اپنی مہموں کو کوئی قانونی حیثیت عطا کریں۔ اس کے علاوہ محافظانہ اتحاد بھی عمل میں آتے تھے۔ چنانچہ پیزا میں تاجروں کا ایک اتحاد عمل میں آیا جو ایک زمانے میں ایک مستقل 213 قوت بن گیا اور اپنے جنگی جہاز حکمرانوں کو تک مستعار دینے لگا۔

ساحلی شہر بھی باہم اتحاد کرنے لگے۔ چنانچہ اس طرح کی حلیفیاں اٹلی میں اکثر ہوتی رہیں۔

بعض اور کوششیں بھی عمل میں لائی جاتی رہیں۔ چنانچہ صلحناموں اور معاہدوں کے ذریعے سے بیچ بچاؤ کرانے والوں اور امن کی حفاظت کرنے والوں کا تقرر عمل میں آنے لگا جن کا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں۔ جس شخص کو مضرت پہنچتی، اسے اس طرح تلافی حاصل کرنے کا موقع ملتا، اور اگر انصاف سے انکار کیا جاتا یا خود اس صورت میں جب کہ وہ شخص جس کے خلاف فیصلہ صادر ہوتا، اطاعت سے انکار کرتا تو ان افراد کو جنھیں مضرت پہنچی ہوتی اپنے حکمرانوں سے اجازت نامۂ انتقام

[1] انگریزی کتاب "پارلیمان کے اوراق" جلد (۴) ص ۲۲۸۔

حاصل ہو جاتا۔

کچھ اور تدبیریں اختیار کی گئیں جو زیادہ موثر تھیں۔ چنانچہ قزاقوں کے ہر بیڑے کی روانگی کو ایک پیشگی اجازت کا محتاج قرار دیدیا گیا۔ ۱۲۸۸ء میں تیسرے الفونسو نے آراگون کے ساحلی شہروں کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنے ہاں کے بحری قزاقوں کے متعلق یہ اطمینان کرلیں کہ وہ اپنے ہموطنوں ہی کو نہ لوٹ لیں، دشمن پر صلح کے دوران میں یا غیر جانبدار بندرگاہوں میں حملہ نہ کریں، اور انھیں جو کچھ لوٹ حاصل ہو اسے اس بندرگاہ پر لائیں جہاں سے وہ بیڑا لے کر روانہ ہوئے تھے۔ بادشاہ نے ناجائز لوٹ کی پیش بندی کرلی تھی۔ اس لیے اس نے حکم دیا تھا کہ ایسا جہاز یا اس پر لدا ہوا بار واپس کردیا جائے اور سرکاری کارندوں کو حکم دیا گیا کہ لٹیروں کے جہازوں کا بیڑا تیار کرنے یا ان کی مہموں میں حصہ لینے سے اجتناب کریں۔

اس نگرانی کا براہ راست یہ نتیجہ نکلا کہ "اجازت نامہائے سرحد" عطا ہونے لگے۔ اور چودھویں صدی عیسوی میں بحری قزاقی آراگون اور قسطیلہ میں اتنی زیادہ منظم ہوگئی تھی کہ اس کو چلانے کے لیے کمپنیاں تک قائم ہونے لگیں۔ تقریباً اسی زمانے میں آراگون کے تیسرے پیئیر نے ایک حکمنامے کے ذریعے سے یہ ضروری قرار دیا کہ ہر روانہ ہونے والا بیڑا ایک ضمانت دیا کرے۔ اور اس پر یہ حلف لینے کی پابندی عاید کی جانے لگی کہ اس بارے میں جو ہدایتیں ہیں، ان کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اسی کا مماثل ایک ضابطہ اٹلی میں بھی ملحوظ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ وہاں مختلف ساحلی شہروں کے حکام بحری قزاقوں پر ایک نگرانی رکھتے تھے جن کو ایک حلف لینے اور ایک ضمانت دینے کا پابند کیا گیا تھا کہ دوست ممالک کے بیڑوں کے خلاف مخاصمانہ کارروائیاں عمل میں نہیں لائیں گے۔

شمال نے بھی رفتہ رفتہ اسی مثال کی تقلید شروع کی۔ نوو

چودھویں صدی کے آغاز پر فلانڈرس والوں اور فریزہ والوں میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بھی اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ طے یہ ہوا تھا کہ تمام بحری قزاق ایک تقرر نامہ حاصل کریں گے اور ایک امیرالبحر کے اپنے آپ کو ماتحت تسلیم کریں گے۔ اور اگر کسی کو ضرر پہنچنے کی شکایت ہو تو وہ اس امیرالبحر سے شکایت کرسکیں گے۔

214 ایک صدی بعد یورپ کی تمام مملکتوں میں قزاقوں کے بیڑے ایک اجازت نامہ حاصل کرنے کے پابند ہوگئے جو صرف حکمران یا اس کا نائب عطا کرسکتا تھا۔[1]

مرکزی اقتدار ساتھ ہی بحری قزاقی کے خلاف بھی لڑتا رہا۔ ایک قابل توجہ قانون سازانہ تدبیر وہ حکمنامہ ہے جو ۱۴۱۴ء میں انگلستان کے پانچویں ہنری نے نافذ کیا۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کا "قتل، غارتگری، چوری، صلح کا توڑنا اور بادشاہ کے پروانۂ امن کی پروا نہ کرنا" نیز ملزموں کو دی جانے والی ہر مدد یا اعانت "تاج اور مرتبت شاہی کے خلاف کی جانے والی بڑی غداری" کے افعال سمجھے جائیں گے۔ اسی حکمنامے میں یہ بھی بیان ہوا تھا کہ آیندہ سے ہر بندرگاہ میں بادشاہ "ایک وفادار شخص کو، جس کا نام صلح اور شاہی پروانۂ امن کا محافظ ہوگا،" نامزد کیا کرے گا اور اس کا کام یہ ہوگا کہ صلح اور پروانہائے امن کی ان خلاف ورزیوں کی تحقیقات کرے جن کا "سمندر پر، کونٹیوں کے حدود کے باہر اور سینک پورٹس (نامی پانچوں بندرگاہوں) کی گزر کے باہر" ارتکاب عمل میں آئے۔ اور دو اشخاص "جن کا بھی وہی انتخاب کرتا" اس محافظ کے نائب ہوتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہازوں کے

---

[1] ۔ زوتیک اور ولکر دونوں کی اجتماعی جرمن تالیف "مملکتی لغت" باب (۵) مال غنیمت —— کال تن بورن کی جرمن تالیف "بحری جنگ کے مال غنیمت کی تاریخ" (جو تاریخ اور سیاسیات کے نئے سالنامے" نامی سلسلے میں ۱۹۱۳ء میں بطور جلد دوم شایع ہوئی)

تمام مالکوں پر یہ لازمی قرار دیا گیا کہ اس محافظ کے ہاتھ پر حلف لیں کہ وہ صلح اور پروانہائے امن کا احترام کریں گے۔ اگر وہ بادشاہ کے دشمنوں کو لوٹتے تو ان پر واجب تھا کہ لوٹ کو اس محافظ کے پاس بندرگاہ میں لاکر پیش کریں بجز اس کے کہ کوئی ایسی رکاوٹ ہو جس پر قابو حاصل نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس کی خلاف ورزی پر مال کی ضبطی اور قید کی سزا دی جاتی۔

سولھویں صدی میں جب بڑی بڑی بحری مہمیں اختیار کی جانے لگیں تو ایسی بحری قزاقی ترقی کرنے لگی جس کے لیے باقاعدہ ضابطے تیار ہوتے تھے۔ اور سترھویں صدی میں یہ اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ عہد جدید کے آغاز پر جو افسوسناک جنگیں واقع ہوئی تھیں، وہ سب سے زیادہ تجارتی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور چونکہ ہر مملکت کی سیاست کے پیش نظر یہ تھا کہ دوسروں کی تجارت کو کمزور اور برباد کردے، اس لیے ان لوگوں کی مدد بڑی قابل قدر سمجھی گئی جو محض لالچ کے لیے ہر قسم کی زیادتیوں کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہوجاتے تھے۔ اور یہ مدد اتنی زیادہ قابل قدر تھی کہ اس سے دستبردار ہونا ممکن نہ تھا۔ بحری قزاقی شاہی بیڑے کی معاون بن گئی۔ اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ دو صدیوں تک قانونی قزاقی سمندروں پر مسلط رہی اور اس ادارے کو کچھ اتنا زیادہ قبول کرلیا گیا تھا کہ سلطنتیں اپنے معاہدوں میں تک بحری قزاقوں کے حقوق اور واجبات کی تفصیل و تعیین کرنے لگی تھیں۔

جب سترھویں صدی ختم ہونے لگی تو صرف اسی وقت ظلم و زیادتی کی اس سیاست میں کچھ استثنا نظر آنے لگے۔ چنانچہ جب سویڈن اور صوبجات متحدہ میں جنگ چھڑی تو اس کے دوران میں ہر دو حریفوں نے یہ اقرار کیا کہ بحری قزاقوں سے کوئی مدد نہیں لیں گے۔

215

لیکن جب ۱۶۷۹ء میں انھیں دونوں حکومتوں میں صلح نامہ طے ہوا تو یہ نظر آیا کہ ۱۶۷۵ء کا وعدہ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا تھا۔

دشمن سے کیے ہوئے وعدے کا احترام ایک ایسا امر ہے جس پر بکثرت مولفوں نے بحث کی ہے۔

گراتیان نے اپنے (حکمنامے) میں وہ فقرہ داخل کر دیا تھا جس میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی رائے ظاہر کی تھی یعنی (لاطینی میں) "وہ اقرار جو خود دشمن سے کیا گیا ہو اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ اور بدرجۂ اولیٰ اس اقرار کا جو کسی دوست سے کیا گیا ہو اور جس کی خاطر کوئی لڑائی کی گئی ہو"[1] بولونیا کے اس ماہر قانون مذہبی یعنی سینٹ آگسٹائن کی رائے واضح تھی کہ دشمن سے جو معاہدے کیے جائیں ان کی پوری وفادارانہ تعمیل کی جانی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک بالکل دوسرا ہی رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے ذمہ دار سب سے زیادہ پوپ تھے۔ پوپوں کو یہ دعویٰ تھا کہ انھیں اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہے، اور اسی اقتدار کے استعمال میں وہ کسی کیے ہوئے اقرار کی ذمہ داری سے کسی کو بری بھی کر سکتے ہیں کیا خود حضرت مسیحؑ نے سینٹ پیٹر اور اس کے جانشینوں کو حل و عقد (یعنی پابند کرنے اور ذمہ داری سے براءت دینے) کا مکمل اختیار نہیں عطا کر دیا تھا؟ پوپ چھٹے کلیماں نے قبرسے ای کے اسقف کے نام لکھا تھا کہ مقام مقدس یعنی پوپ کے علاقوں کے مفاد کے خلاف جو معاہدے عمل میں لائے گئے ہوں، وہ کالعدم سمجھے جائیں گے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب ان کی حلف کے ذریعے سے توثیق کر دی گئی ہو کیونکہ حلف کو کسی ناانصافی کا رشتہ نہیں بننا چاہیے۔ اسی پوپ نے فرانس کے بادشاہوں کے شخصی پادریوں کو (جن کے سامنے وہ اعتراف گناہ کیا

[1] "پوپوں کے مذہبی احکام" (لاطینی میں) حصۂ دوم بحث (۲۳) مسئلہ (۱) باب (۳)۔

مذہبی فریضہ انجام دیا کرتے تھے) یہ اختیار عطا کیا تھا کہ وہ ان بادشاہوں کو ان تمام معاہدوں کی ذمہ داری سے بری کرسکتے ہیں جن کی تعمیل سے بے آرامی لاحق ہوتی ہو۔ پوپ دوسرے یولیوس نے "راسخ العقیدہ فرڈیننڈ" کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ بارھویں لوئی سے کیے ہوئے اقراروں کو نظر انداز کردے۔

اس سے جو خطرہ پیدا ہوگیا تھا، وہ قابل لحاظ تھا۔ پھر کیا نظر آیا؟ حکمران پیشگی ہی اس کا اعلان کرنے لگے کہ اگر پوپ، تعمیل کی ذمہ داری سے بری کرنے کے متعلق، اپنا مزعومہ حق کام میں لائے تو وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ ایک مثال درج ذیل ہے۔ مجریط (میڈرڈ) کے معاہدے میں طے پایا تھا کہ "شارل کین اور پہلا فرانسوا کسی صورت میں بھی اس کی استدعا نہیں کریں گے کہ انھیں ان کے حلف کی ذمہ داری سے بری کردیا جائے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک اس کی استدعا کرے یا اسے حاصل کرلے تو فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر اسے اس سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے"۔ یہ پیش بندیاں بے سود ثابت ہوئیں جیسا کہ لوراں نے بیان کیا ہے۔ وہ پہلا شخص جس نے فرانس کے بادشاہ سے اس کا اقرار لیا کہ وہ اپنے حلف کی پروا نہیں کرے گا وہ پوپ تھا۔ اس نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا کہ فرانس کے بادشاہ سے شہنشاہ کے خلاف ایک حلیفی کرلی۔[1]

216

یہ صحیح ہے کہ پہلا فرانسوا اپنی پیش بندیاں کرچکا تھا۔ ایک قابل فخر نظارہ ۱۳ جنوری ۱۵۲۶ء کو پیش آتا ہے۔ بادشاہ مجریط کے قلعے میں محصور تھا الغرض اس نے فرانسیسی پارلیمان کے صدر نشین اول یعنی ژاں ڈ سلف اور دوسرے تمام فرانسیسی سفیروں کو وہاں بلایا۔ جس معاہدے کی شرطیں طے ہوئی تھیں، اس پر دوسرے دن دستخط

---

[1] لوراں کی فرانسیسی تالیف "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد "دو متین" ص ۴۳۲۔

کیے جانے والے تھے۔ اور بادشاہ نے کہا کہ اس معاہدے میں "انصاف اور معقولیت کے خلاف چیزیں" پائی جاتی ہیں۔ یہ کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے ہیں۔ یہ کہ اسے ایسی حالت میں حلف لینا پڑ رہا ہے جب کہ وہ قید ہے۔ اور یہ کہ شہنشاہ نے اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا ہے کہ اس وقت تک نہ تو دستخط کرے اور نہ حلف اٹھائے جب تک کہ پہلا فرانسوا اپنی آزادی کے بعد معاہدے کی توثیق کا اطلاع نامہ روانہ کرے۔

قیدی بادشاہ نے ژاں دُسلف کو حکم دیا کہ تمام حاضرین سے حلف لے۔ اور ان پر یہ پابندی تھی کہ وہ راز رکھیں اور جو کچھ کہا جائے وہ کسی کو ظاہر نہ کریں بجز بادشاہ کی ماں اور بادشاہ کی بہن یعنی آلاں سوں کی ڈچیس اور اس شخص کے جس کو یہ ڈچیس نامزد کرے۔ جب اقرار پر حلف لے لیا گیا تو ژاں دُسلف نے ان شکایتوں کی تفصیل بیان کی جو فرانس کے بادشاہ کو شارل کیں کے خلاف پائی جاتی تھیں۔ اور یہ طے ہوا کہ جس معاہدے پر فرانسوا اول کو دستخط کرنے تھے، اسے کالعدم سمجھا جائے کیونکہ وہ "جبر اور دباؤ، نظر بندی اور طویل قید کے ذریعے سے" طے کرایا گیا تھا۔ اور یہ بیان کیا گیا کہ "جو کچھ طے ہوا ہے وہ کالعدم اور بالکل بے اثر رہے گا۔ اور ہم نے بحث کے بعد یہ طے کیا ہے کہ تاج فرانس کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔"

پوپ چوتھے نکولاس نے عیسائی قوموں کو اس کی ممانعت کی تھی کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ کوئی معاہدے کریں۔ پوپ چھٹے اَربان نے باضابطہ طور سے یہ بیان کیا تھا کہ جو معاہدے غیر عیسائی حکمرانوں کے ساتھ کیے جائیں وہ قانوناً ناجائز اور کالعدم ہیں اور یہ کہ تمام عیسائی بادشاہوں کو ان کے اقراروں سے بری کیا جاتا ہے، چاہے انھوں نے ان پر کتنے ہی مقدس حلف کیوں نہ لیے ہوں۔ پوپ

تیسرے پاؤل نے یہ اعلان کیا کہ جو معاہدے ملحدوں سے کیے جائیں وہ پیشگی ہی کالعدم ہوجائیں گے۔

مزید برآں کانسٹنس کی مجلس شورائے مذہبی نے بھی بڑے تقدس کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ کوئی حکمران ایسا پروانۂ امن نہیں عطا کرسکتا جو عیسائی مذہب یا کلیسائی اقتدار کے مفاد کے خلاف ہو اور یہ کہ کلیسا کا حاکم عدالت، ملحدوں کے خلاف کارروائی کرسکتا اور انہیں سزا دے سکتا ہے، اگرچہ وہ عدالت میں صرف اس وجہ سے آئے ہوں کہ انھیں بادشاہوں نے مکمل امن و حفاظت کا یقین دلانے کے لیے جو پروانے عطا کیے تھے ان پر انھیں پورا اطمینان تھا۔ اگرچہ شہنشاہ زیگس مونڈ نے یوحان ہوس کو ایک نہایت مکمل و باقاعدہ پروانۂ امن عطا کیا تھا لیکن اس [مصلح] کو مجلس شورائے مذہبی کے پادریوں کے حکم سے زندہ جلادیا گیا تھا۔ 217

مولفوں میں سے اکثر تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دشمن سے کیے ہوئے وعدے کی تعمیل کی جانی چاہیے۔ لیکن چند نے اس پر کچھ شرطیں لگادی ہیں۔ آیالا نے اگرچہ اس کلیے کو قبول کیا تھا کہ "دشمن سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا جانا چاہیے" لیکن اسے پراٹسٹنٹ مذہب سے جو مخاصمت تھی اور شہزادۂ آرینج سے اس کو جو نفرت تھی، اس کی رو میں وہ بہہ جاتا ہے اور وہ اس کلیے سے باغیوں کو خارج کردیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کوئی شخص اس اقرار کی تعمیل کا پابند نہیں جس سے خدا کی ناراضی لاحق ہوسکے یا جس سے کلیسا کا مفاد متاثر ہو۔[۲]

---

[۱] - لوراں کی کتاب مذکورہ ص ۳۴۴ — گیزےلر کی جرمن تالیف "کلیسائی تاریخ" جلد ۲ حصۂ چہارم ف ۱۵۰ تعلیق ج ج۔

[۲] - آیالا کی لاطینی تالیف "جنگ کے حقوق اور فرایض اور فوجی ضبط و نظم" کتاب اول باب (۶) ف ۱۳ و ۱۴۔

کیا جنگی چالیں درست بھی جا سکتی ہیں ؟ یہ نازک معاملہ ہے۔ ماہرین قانون اور ماہرین دینیات دونوں نے اپنے اپنے علوم کی کتابوں میں ایسے احکام پائے، جن سے جنگ میں چال چلنا درست قرار دیا جا سکتا تھا۔

قانون روما نے دشمن کے خلاف چلی جانے والی چال کو درست قرار دیا تھا۔ اور وہ اسے "جائز دھوکا" کہتے تھے[1]۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے کہا تھا کہ "الحرب خدعة" (جنگ ایک مکر ہے)۔ عربوں کے ہاں ایک ضرب المثل ہے کہ "بعض وقت ایک چال چلنے میں اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جتنا ایک قبیلے کی مدد سے بھی نہیں حاصل ہوتا"۔ عرب مولف ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں بیان کیا ہے کہ "جنگوں میں فتح عام طور سے ایسے اخلاقی اسباب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو روح اور خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لشکروں کا زیادہ ہونا، ہتھیاروں کا عمدہ ہونا، حملہ کرنے میں شجاعت دکھانا بعض وقت فتح حاصل کرنے میں کافی ثابت ہوتے ہیں لیکن یہ ذرایع، بمقابل اخلاقی اثرات کے بہت کم کارگر ہوتے ہیں۔ اسی لیے چال کا چلنا جنگ میں زیادہ مفید ہوتا ہے اور اسی سے اکثر فتح حاصل ہو جاتی ہے[2]۔"

---

[1] کتاب اول ف ۳، (د) "برا دھوکا" یعنی فریب، ۴، ۳۔

[2] مولف نے یہاں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ باوجود تلاش کے مقدمۂ ابن خلدون میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملی جو اس ترجمے کی اصل قرار دی جا سکے۔ البتہ ایک فصل اس موضوع پر ہے جس کی تفصیل دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اسی کا خلاصہ یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔ ہم اس فصل کا اصل عربی سے ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں: —

"جنگ میں فتح کا کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا چاہے اس کے اسباب یعنی سامان اور سپاہی بھی فراہم کیوں نہ ہو جائیں۔ اصل میں فتح بخت و اتفاق پر منحصر ہو۔ ہاں کی

جنگی چالوں اور حربیاتی کارروائیوں کے جواز کے مسئلے میں پوپ گراتیان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جائز ہیں اور اس نے اس بارے میں سینٹ آگسٹائن کے یہ الفاظ بطور سند پیش کیے کہ جنگ کا جواز محض اس لیے ختم نہیں ہوجائے گا کہ کوئی یا تو علانیہ جبرو زور کا استعمال کرے یا چالاکی کو کام میں لائے یا اس حکم سے فائدہ اٹھانا چاہے جو خدا نے حضرت یوشعؑ کو دیا تھا کہ دشمنوں کے لیے کمین گاہیں قایم کریں۔ 218

مذکورۂ بالا حوالہ جس باب میں ہے، اس سے پہلے کے باب میں گراتیان نے حاکم عدالت کا ذکر کیا ہے۔ مذہبی شروح نے عدالتی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ تفصیل یہ ہے کہ غلبے کے اسباب اکثر (دو قسم کے امور میں) مجتمع ہوتے ہیں۔ ایک تو ظاہری امور یعنی لشکروں کی کثرت، ہتھیاروں کا مکمل اور عمدہ ہونا، بہادروں کا زیادہ ہونا، میدانِ جنگ کی ترتیب، نیز لڑائی سچے دل سے لڑنا اور اسی کے مماثل اشیاء۔ دوسرے مخفی امور [جن کی دو صورتیں ہیں] یا تو انسان کا چال چلنا اور حیلہ و مکر کرکے افواہیں پھیلانا اور ایسی دعایہ کاری کرنا کہ [حریف کے] لوگ ساتھ چھوڑ دیں نیز بلند مقاموں پہ پہنچ جانا تاکہ پستی میں ہونے والا وہم اور بد فالی کرنے لگے...... وغیرہ، یا یہ مخفی امور آسمانی اسباب ہوں جن کا حاصل کرنا آدمی کے بس کی چیز نہ ہو۔ یہ اسباب دلوں میں ڈالے جاتے ہیں جن سے ان پر رعب غالب آکر ان کے مرکز میں خلل پیدا ہوجاتا ہے اور شکست ہوجاتی ہے۔ ہزیمتیں اکثر انھیں مخفی امور کے باعث ہوتی ہیں فریقین میں سے ہر ایک چونکہ غالب آنے کی خواہش میں اس کا بکثرت استعمال کرتا ہے اس لیے کسی ایک پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ الحرب خدعة (جنگ ایک مکر ہے) اور ایک عربی مثل ہے کہ رب حیلة انفع من قبیلة (بسا اوقات ایک چال، ایک قبیلے سے زیادہ مفید ہوتی ہے)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جنگوں میں غالب آنا اکثر غیر ظاہر مخفی اسباب کے باعث ہوتا ہے اور بخت کے یہی معنے ہیں۔" (مقدمۂ ابن خلدون کتاب اول فصل سوم باب ۳۸ ذیلی فصل (۲)۔

لہ۔ لاطینی کتاب "پوپوں کے احکام" حصۂ دوم بحث (۲۳) مسئلہ (۲) باب (۲)۔

کارروائی کے ذریعے سے حق کا مطالبہ کرنے اور جنگ کے ذریعے سے حق کا مطالبہ کرنے میں مماثلت قائم کی ہے۔ چنانچہ انھیں شروح نے یہ تسلیم کیا کہ اگر کوئی وکیل کسی بظاہر منصفانہ مقدمے کی پیروی کر رہا ہو تو اسے اجازت ہوگی کہ کوئی چال بھی چلے۔

اکوی ناس کے سینٹ ٹامس نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ (لاطینی میں) "جنگ میں کمین گاہ میں بیٹھنا کس طرح جائز ہے؟" اس کی اپنی رائے میں ایک امتیاز ضروری ہے۔ کمین گاہوں کا مقصد دشمن کو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ غرض کسی کو دو طرح سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ یا تو شروع میں اس سے ایک جھوٹی بات بیان کی جائے اور وعدے کا لحاظ نہ کیا جائے۔ یا اس کو وہ چیز صاف صاف نہ بتائی جائے جس کے اس کے متعلق کیے جانے کی تجویز ہے یا جو اس کے متعلق ذہن میں ہے۔ ان میں سے پہلی قسم بالکل ناجائز ہے اور دوسری جائز۔[1]

اکویناس کے سینٹ ٹامس کے خیالات مختلف مولفوں نے قبول کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ لِنّانو کے ژاں نے اس کی کتاب "چوٹی کے مسائل" سے لفظ بلفظ وہ عبارت نقل کرلی ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ کرسٹین ڈپیزان اپنی فرانسیسی کتاب "ہتیاروں کے کارناموں اور شجاعت بازی پر کتاب" میں اپنے استاد اونورے بونے سے یہ کہلواتی ہے کہ "خدا اور بائبل کے احکام کے تحت دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لیے چالاکی، کلدار ہتیاروں اور مکاری کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ جنگ دو فریقوں میں انصاف کرتی ہے اور اعلان کے ساتھ ہوتی ہے" لیکن مکاری کے ایسے بھی ذریعے پائے جاتے ہیں جن کو لڑائیوں کے موقع پر بھی اسی طرح ناپسندیدہ

[1] اکویناس کے سینٹ ٹامس کی لاطینی تالیف "دینیات کے چوٹی کے مسائل" حصہ دوم مسئلہ (۴۰) مقالہ (۳)۔

اور ممنوع قرار دیا جاتا ہے جس طرح دوسرے موقعوں پر۔" پھر وہ یہاں مختلف مفروضے شمار کراتی ہے مثلاً کوئی عارضی صلح، حریف سے گفت و شنید کے لیے کسی ملاقات کا تعین وغیرہ۔ اس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بہت صاف ہے کہ "کوئی جھوٹی چالبازیاں نہ کی جائیں"۔ اس کے برخلاف لودی کے مارٹن نے فرشتہ خصال ماہر [سینٹ ٹامس] اور قانون مذہبی کے حوالے سے یہ (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ: جائز جنگوں میں کمین گاہوں میں بیٹھنا روا ہے تاکہ فتح حاصل کریں بغیر اس کے کہ ہم بد عہدی کے مرتکب سمجھے جائیں۔" آریا نامی مولف نے صرف اسی پر اکتفا کی ہے کہ سینٹ ٹامس کی کتاب "بیوی کے مسائل" ہی کے الفاظ دہرا دے۔

ژدل نے رتی کا یہاں ذکر کیا جانا چاہیے جس نے قانون روما کے "جائز دھوکے" سے اپنے طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور (لاطینی میں) کہتا ہے کہ "وہ دھوکا جائز ہے جو دشمن کو دیا جائے۔ اس میں بھی کوئی بات نہیں کہ وہ بغیر مذہب والوں، چوروں، بحری قزاقوں، ملحدوں اور اسی قسم کے تمام ناپاک غیر اطاعت شعاروں کے متعلق ہو۔"[1] یہ دلچسپ نتیجہ ایک ایسی تالیف میں بیان کیا گیا ہے جو ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کے لیے لکھی گئی تھی اور جس کا آغاز شارل کیں کو سراہنے سے ہوا تھا۔

آیالا نے سینٹ آگسٹائن کے الفاظ کی تائید میں قدیم تاریخ کے بعض واقعات بطور نظیر پیش کیے ہیں۔

البیریکیس جنتی لیس اس سے بھی زیادہ وضاحت سے خیال آرائی کرتا ہے اور جنگی چالوں اور خلاف عہدیوں میں بہت احتیاط سے فرق کرتا ہے۔ اور اگر وہ اول الذکر کو درست قرار دیتا ہے تو آخر الذکر کو کھلم کھلا مردود ٹھہراتا ہے۔[2]

219

---

[1] ژدل فو رتی کی لاطینی تالیف "قانون اور بحری مسائل کا رسالہ" — "رسائل قانون عومی" جلد (۲) ورق (۳۴۳)۔

[2] البیریکیس جنتی لیس کی تالیف "قانون جنگ" کتاب دوم باب سوم۔

شیپیو جنتی لیس "قانونِ جنگ" کے عنوان کے تحت جو نظریے شمار کراتا ہے، ان میں وہ بیان کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں اور بعض طریقوں سے دشمن سے جھوٹ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہ جائز ہے کہ کوئی ایسی چیز لکھ کر دشمن کی طرف پھینکدی جائے جو اُسے بھٹکا سکے۔

اس سلسلے میں اس واقعے کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس کی گروتیوس نے روایت کی ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جنگی چالوں کے متعلق کیا تصور پایا جاتا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں ناساؤ کے حکمران موریس نے چاہا کہ شہر فن لو پر اچانک قبضہ کرلے۔ اس میں وہ ناکام رہا اور اسپین والوں نے چند ولندیزی سپاہیوں کو جنھیں انھوں نے قید کرلیا تھا، سزائے موت دی۔ گروتیوس کہتا ہے کہ "فریقین کی رضامندی سے قانون کا یہ نیا استعمال رائج ہوگیا تھا تاکہ اس طرح کے خطروں کا سدباب کیا جائے"۔ کوین کی ایک عبارت سے ہمیں ایک مماثل رواج کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ کوین بیان کرتا ہے کہ اٹلی اور اسپین میں ایک رواج پایا جاتا تھا جس کی رو سے "اگر کوئی حکمران کوئی محاصرہ کرتا اور کسی مقام کے سامنے گولہ باری کرتا اور جو کوئی اس مقام پر داخل ہوتا اور محاصرہ کنندہ کے خلاف اُس کو مستحکم بنانے میں مدد دیتا تو قانونِ جنگ کے مطابق وہ سزائے موت کا مستحق سمجھا جاتا۔"

دشمن سے تعلقات کے سلسلے میں سفیروں کی ذات کو قابلِ احترام سمجھنا چاہیے۔

جب کبھی ہتیار روکے جائیں اور عارضی صلح ہو تو اُس کا پورا پورا احترام کیا جانا چاہیے۔ عارضی صلح کو جنگ سے زیادہ قربت ہے یا صلح سے؟ اس مسئلے کی سب سے زیادہ قانونِ مذہبی کے ماہروں نے تحقیق کی ہے کیونکہ "زرین خلاصہ" نامی لاطینی کتاب کی ایک عبارت میں سوسے کے ہنری نے یہ بیان کیا تھا کہ عارضی صلح، امن

ہوتی ہے [جنگ نہیں]۔ اور مولفوں نے اس میں امتیاز پیدا کرنا شروع کیا چنانچہ جو عارضی صلح کسی مختصر مدت کے لیے کی گئی ہو اس کا تعلق جنگ ہی سے زیادہ ہوتا ہے، اور جو صلح چند سالوں کے لیے کیگئی ہو اس کا تعلق امن سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس حل کو عارضی صلح کے اختتام پر ایک عملی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوا کہ عارضی صلح کے اختتام پر آیا کسی نئے اعلان جنگ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ عام طور پر رائے یہ تھی کہ نہیں۔ بالدے نے مختلف اور متضاد رائیں دی ہیں اور اسی بناء پر بلی نے اس پر غیر مستقل مزاجی کا الزام لگایا ہے اور وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ "بالدے تو ہر ایک معاملے میں غیر مستقل مزاج ہی ہوتا ہے......"۔ بلی کی رائے یہ ہے کہ عارضی صلح کے اختتام پر کسی نئے اعلان جنگ کی ضرورت نہیں کیونکہ (لاطینی میں) "عارضی صلح ختم ہو جائے تو ہم مکرر اسی کام میں داخل ہو جاتے ہیں جو ملتوی کر دیا گیا تھا"۔[1]

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ ترک کبھی مستقل صلح نہیں کیا کرتے تھے بلکہ صرف عارضی صلح، جو ایک مولف کی رائے کے مطابق صرف جنگ کی تیاری کہی جا سکتی ہے۔

ہم اوپر ان بربری رواجوں کا ذکر کر چکے ہیں جو جنگ کے متعلق پائے جاتے تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے ہتیاروں کا استعمال شاذ ہی ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ رچرڈ شیر دل کی موت ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر ہی کے باعث ہوئی تھی۔ ۱۵۶۳ء میں وارک کے آل برواز کی موت اس زخم سے ہوئی تھی جو ایک زہر آلود گولی کے لگنے سے پیدا ہوا تھا۔ اور ریال نے ڈتو نامی مورخ کے حوالے سے، بیان کیا ہے کہ جب تک

---

[1] بلی کی لاطینی تالیف "فوجی مسائل اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصہ پنجم عنوان سوم۔

قرابین (بندوق) کا رواج نہیں ہوا تھا اور تیر کمان ہی سب سے اہم ہتیار رہے، تو اسپینیوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ تیروں کو زہر میں بجھا دیا کریں[1]۔

پانی کے کنؤوں میں زہر ملا دینے کا بھی اسی طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ۱۴۱۲ء میں شہر بورگیس کا محاصرہ کیا گیا تھا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے مونسترلے بیان کرتا ہے کہ "جب بڑی پیاس کی وجہ سے ان کنؤوں میں سے پانی کھینچتے جو شہر کے مضافات میں تھے تو اس کا پینے والا فوراً ہی مرجاتا۔ اور معلوم ہوا کہ بدمعاشی اور فریب کیا گیا تھا...... بعد میں حریفوں نے تصدیق کی کہ یہ الزام صحیح تھا کہ مذکورہ کنوؤں میں انھوں نے ایک بوٹی ڈالدی تھی...... اور یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ مرجائیں[2]"

تشقی یوں کے جاگیردار میشل داں بواز نے "خوش قسمت غلام" کے نام سے فرانسسی میں چند کتابیں سولھویں صدی میں تالیف کی تھیں۔ ان میں سے "سپاہیوں کا ہدایت نامہ" نامی فرانسسی رسالے میں اس نے فن جنگ سے بحث کی ہے اور وہ پوری طرح تسلیم کرتا ہے کہ دشمن کے پانیوں کو بند کردیا جاسکتا ہے، ان میں مضر چیزیں ڈالی جاسکتی ہیں، نشہ آور چیزیں ملائی جاسکتی ہیں اور زہر ڈالا جاسکتا ہے[3]۔

البیریکس جنتی لیس یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ بالدے کی اس رائے کی تردید کرے کہ دشمن کو زہر دے کر مارسکنا اور پانیوں میں زہر ملا سکنا جائز ہے۔ خود جنتی لیس نے ناجائز کارروائیوں کی ایک عجیب مثال بیان کی ہے جو اسپینیوں اور فرانسیسوں کی لڑائی کے

221

---

[1] ریال دکورباں کی فرانسسی تالیف "علم حکمرانی" جلد (۵) ص ۴۱۴۔

[2] مونسترلے کی فرانسسی تالیف "تاریخ" کتاب اول باب (۹۹)

[3] میشل داں بواز کی فرانسسی تالیف "سپاہیوں کا ہدایت نامہ" مطبوعہ ۱۵۴۳ء۔

زمانے میں اٹلی میں پیش آئی تھی۔[1]

شہروں کو تباہ کرنے اور جلانے کے متعلق ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں جہاں تک اصول کا تعلق ہے، بلّی نے اسے مردود ٹھیرایا اور نادرست قرار دیا ہے اور وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ: "شہروں کو ہرگز نہیں لوٹنا چاہیے بجز شدید ضرورت کے۔ اور صرف تمام آبادی یا اس کے اکثر حصے کے سازش کرنے پر ہی احترام شکنی کی جاسکتی ہے۔"[2] لیکن پھر بھی یہ تسلیم کیا جاتا رہا جب کسی شہر پر بزور قبضہ کیا جائے تو اسے فاتح سپاہی اپنے سپہ سالار کی مرضی سے چند گھنٹوں تک لوٹ سکتے ہیں۔[3] ایسے شہر کو معاوضہ دیکر لوٹ سے بچایا جاسکتا ہے۔ پندرھویں صدی کی جنگوں میں ہتیار ڈالنے اور اطاعت کرنے کے لیے جو معاہدے ہوتے تھے ان میں عموماً یہ فقرہ ہوتا تھا کہ شہر کی محافظ فوج کی جان بخشی کی جائے گی اور وہ ایک سفید ڈنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں سے چلی جاسکے گی یعنی وہ کوئی اور چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاسکے گی سوائے اس لباس کے جو وہ پہنے ہوئے ہو، یا زاد راہ کے لیے پانچ سے دس "اے کو" (سکوں) کے جو فی کس ساتھ رکھ سکے گا۔ عورتوں کو اپنے لباس اور زیوروں کے ساتھ لے جانے کا حق ہوتا تھا۔[4] ان بربری رواجات سے ہمارے مولف کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ان کے جواز کے لیے صرف یہ چیز پیش کی جاتی تھی کہ انسانیت کے ضمیر نے جنگ کی نوعیت کے متعلق وہی تصورات قائم کرلیے ہیں۔ حقیقت میں کبھی تو اعلان جنگ کے متعلق یہ

---

[1]۔ جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب دوم باب ششم۔

[2]۔ بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی مسائل اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصہ چہارم عنوان (۸)

[3]۔ ریال دِکورباں کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد (۵) ص ۴۲۵

[4]۔ ان دبوے ای کی فرانسیسی تالیف "نو عمر بچے پر کامی نافر کا دیباچہ" ص ۱۶۴۔

تصور کیا جاتا کہ وہ ایک حکمنامۂ موت ہے جو ایک حکمران نے دوسرے حکمران کی پوری رعایا کے خلاف صادر کیا ہے اور کبھی جنگ کو ایک واقعی عدالتی فیصلہ تصور کیا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ مفتوح ہی ملزم تھا۔ ان دونوں تصوروں میں سے اول الذکر کے تحت فریق ثانی کے خلاف ہر ایک چیز جائز تھی حتیٰ کہ دشمن سردار کے سر کے لیے قیمت مقرر کی جاسکتی، اور آخرالذکر کے تحت فاتح کو مفتوح کے متعلق زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہوتا۔

بعض وقت سیاسی الجھنوں کے باعث کسی قدر انسانیت آمیز برتاؤ بھی کیا جاتا، چنانچہ ۱۴۵۱ء میں شہر بورڈو نے ساتویں شارل کے سامنے اپنے دروازے کھول دیے۔ یہ شہر انگریزوں کی وجہ سے دولتمند ہوگیا تھا اور وہاں کے معززین انگلستان کے طرفدار تھے۔ بادشاہ نے اس کا انتظام احتیاط سے کرنا چاہا۔ چنانچہ نہ صرف یہاں بلکہ گاس کنی کے دوسرے شہروں سے بھی کسی محصول کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اور جو لوگ فرانسیسی بن کر رہنا نہیں چاہتے تھے انھیں چلے جانے کی اجازت دی گئی۔ تاجروں کو چھے مہینے کی مہلت دی گئی کہ اپنے معاملات ٹھیک کریں۔ اور جاگیرداروں نے اپنی جاگیریں اپنے بچوں کے نام منتقل کردیں۔ ہمارے اچھے اور بڑے مولف ریش لے نے اس کے متعلق بیان کیا ہے کہ "ایسی نرم اور رحمدلانہ جنگ کی کوئی اور مثال نہیں ملتی"۔

جدید قانون بین الممالک کی ایک نہایت اہم ترقی اس امر پر مشتمل ہے کہ ناطرفداروں کے فرائض معین کیے گئے۔ ہمارے زمانے میں ان پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ اگر حربیوں میں سے کوئی ایک بھی ناطرفدار سرزمین پر دوسرے حربی کے خلاف کسی مخاصمانہ کارروائی کی کوشش کرے تو یہ اس میں آڑے آئیں۔ ان پر یہ فریضہ بھی عاید کیا گیا ہے کہ ہر اس کام سے باز رہیں جس کے باعث

ناطرفدار سرزمین کے باہر کسی بھی حربی کو فوجی کارروائیاں کرنے میں زحمت پیش آئے۔ نیز ان پر یہ بھی فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ ہر دو حربیوں سے اپنے تعلقات میں پوری طرح غیر جنبہ دار رہیں اور ہر ایسے کام سے باز رہیں جس سے کسی ایک حربی کو دوسرے کے خلاف کوئی امداد و اعانت حاصل ہو۔ اور اس کو کوئی اہمیت نہیں کہ انھوں نے فریقین میں سے ایک کو وہی مدد پیش کی ہے جو وہ دوسرے فریق کو دے چکے ہیں۔

قرون متوسطہ میں ناطرفداروں کے واجبات معین نہیں تھے۔ پھر بھی پندرھویں اور سولھویں صدی میں چند نظریے ترقی کرنے لگے۔ چنانچہ پوپ نے اپنے اعلانوں کے ذریعے سے اپنی رعایا کو اس کی ممانعت کی کہ بیرونی ممالک میں جاکر وہ ملازمت اختیار کریں۔ اسی طرح وینیس نے یہ نظیر چھوڑی ہے کہ فرانس کے حکمران کو نہ چھیڑنے کے لیے اپنے جہازوں کے تمام مالکوں کو اس بات کی ممانعت کرے کہ اسپین کے لیے کرایے پر کوئی خدمت بجالائیں[1]۔ اسی اثنا میں ساتھ ہی یہ نظر آتا ہے کہ جنگ میں جو لوگ کسی کا ساتھ نہ دیتے، اور فریقین جنگ میں سے کسی کی بھی جنبہ داری نہیں کرنی چاہتے، ان کو اس کی اجازت ہوتی کہ اپنی مرضی پر اور جنگ میں گھسیٹ لیے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر، فریقین میں سے کسی ایک کو امداد اور افواج مہیا کریں۔ اور یہ چیز دکھائی دیتی ہے کہ ایک ہی قوم فریقین جنگ میں سے ہر ایک کے ساتھ دوستی اور حلیفی رکھتی ہے مگر ساتھ ہی اس کی رعایا فریقین کی فوجوں میں کرایے کے ٹٹوؤں کی طرح بھرتی ہوتی ہے۔

اس کا رواج تھا کہ مختلف حکمران سالانہ کوئی معین رقم کے

---

[1] ہیفتر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا قانون بین الممالک" ف ۱۴۶۔

[2] مود لاکلا ڈیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد ۱، ص ۱۹۷۔

معاوضے میں اس کا اقرار کریں کہ کسی دوسرے حکمران کے لیے فوجوں کی ایک معینہ تعداد تیار رکھیں گے۔ خود اٹھارھویں صدی میں امدادی رقوم کے ایسے معاہدے ہوتے نظر آتے ہیں جن میں یہ امر طے ہوا تھا کہ ابتدائی فوجی بھرتی کے لیے کتنی رقم ادا کی جائے، رنگروٹوں کے لیے کتنی، ہلاک شدہ لوگوں کے لیے کتنی، اور وطن واپسی کے کرایے کے لیے کتنی۔ سوئستان کے خود مختار صوبوں (کانٹونوں) سے جو معاہدے طے ہوئے تھے، وہ کافی معروف ہیں۔ ان نظائر کے علاوہ ایک ملک کی فوجیں بارہا کسی جنگ میں حصہ لیتیں، بغیر اس کے کہ ان کے اپنے ملک اور اس ملک کی جس کے خلاف یہ جنگ میں حصہ لیتی ہیں باہمی حالت صلح ختم ہوجائے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب نشیبستان (ہالینڈ) نے اسپینی تسلط کے خلاف بغاوت کی تھی۔ چنانچہ انگریزی فوج کے دستے صوبجات متحدہ کی نئی جمہوریت کی مدد کرتے رہے۔ چوتھے ہنری نے رجمنٹوں کی رجمنٹیں اس آخرالذکر مملکت کی خدمت کے لیے بھجوادی تھیں۔ تیس برس والی جنگ میں ہامِلٹن کے مارکوئیس نے چھے ہزار اسکاٹ لینڈ والوں کو ساتھ لے کر شہنشاہی فوجوں سے مقابلہ کیا تھا۔ ان مختلف واقعات کی موجودگی میں انگلستان اور فرانس برابر یہ دعویٰ کرتے رہے کہ وہ ان جھگڑوں میں پڑنا بالکل نہیں چاہتے جو رونما تھے۔ ناطرفداری کا تصور کتنا زیادہ غیر ترقی یافتہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ بہت دنوں تک ایسے معاہدے کیے جاتے رہے جن میں دستخط کنندوں نے یہ اقرار کیا تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف نہ تو لڑائیاں کھڑی کریں گے اور نہ کسی تیسرے کو مدد دیں گے اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے جنگ کرے۔ گویا ناطرفدار رہنا اس امر پر منحصر تھا کہ صراحت کے ساتھ اس کا اقرار کیا جائے، ورنہ بطور قاعدہ تو دخل دہی جائز تھی۔

کوئی طاقتور حکمران بعض صورتوں میں اپنے کسی کمزور ہمسایے کو ناطرفداری کے منشور عطا کرتا۔ چنانچہ ۱۵۴۲ء میں فرانسوا نے اس طرح کے منشور کامبرے کو عطا کیے تھے۔ اس دستاویز میں لکھا تھا کہ کامبرے کی اسقفی، وہاں کی کونٹی، اور علاقہ ناطرفدار ہیں اور رہیں گے اور وہ فریقین (جنگ) میں سے کسی کو بھی راست یا بالواسطہ کوئی مدد، رقم، رسد، ہتیار، کوئی اور چیزیں، پناہ، رعایت، مشورہ، سہولت یا امداد نہ تو خود دیں گے نہ دلوائیں گے۔ اس طرح فریق ثانی کے لوگوں کو قلعے میں نہیں رکھ سکیں گے۔"

یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا کوئی ناطرفدار کسی فوجی جماعت یا ہتیاروں کی ارسالی کے لیے اپنی سرزمین سے گزرنے کی اجازت دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب کبھی تو اثبات میں دیا جاتا رہا اور کبھی نفی میں۔ اس معاملے میں کوئی چیز معین نہیں تھی۔ اونورے بونے کا بیان تھا کہ "تحریری قانون کے مطابق" فریقین جنگ میں سے کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ کسی حکمران کی سرزمین پر سے ہتیار یا دیگر سامان لے جائے، جب تک کہ وہ اجازت نہ دے۔ لیکن بہر حال کسی حکمران کو جنگ کرنے کے سلسلے میں یہ حق ہوتا ہے کہ درمیانی علاقوں میں سے گزرنے اور کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے کا مطالبہ کرسکے بشرطیکہ گزر پُر امن ہو، اخراجات ادا کیے جائیں اور جو مفادات متاثر ہوں ان کی تلافی کریں۔ اور وہ یہ کہتا ہے کہ "کسی نقصان رسانی کا ارتکاب کیے بغیر ہر طرح گزر سکنا قانون اور فطری دوستی کا عطیہ ہے۔" 224

اس بارے میں بہت کم چیزیں تالیف ہوئی ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز پر ژاں بوتے رونے اطالوی زبان میں "ناطرفداری پر مقالہ" تالیف کیا جس میں وہ کوئی بارہ صفحوں میں ناطرفداری کے فوائد اور نقصانات کی تفصیل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے اعلان کو

فریقین جنگ میں سے کسی ایک کے لیے کس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔
سنہ ۱۶۲۰ء میں راہس لا کے یوحان وِلہلم نائے مایر نے جرمن زبان میں ایک کتاب شایع کی جس کا نام "ناطرفداری اور اعانت یا اوقاتِ جنگ میں غیر جنبہ داری اور جنبہ داری" تھا۔ بوہیمیا میں جو جنگ چھڑ گئی تھی اور جس کے باعث جرمن حکمرانوں کے لیے ایک دشوار صورت حال پیدا ہوگئی تھی، اس نے اس مولف کو اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ ناطرفداری کی ضرورت اور دخل دہی کے فوائد پر مقالات کا ایک سلسلہ تالیف کرے۔ سنہ ۱۶۲۲ء میں بے زولد نے اسی موضوع پر ایک سطحی بحث ایک لاطینی رسالے میں کی جس کا نام "حلیفیوں کے حقوق پر سیاسی و قانونی بحث اور حمایت و محمیت نیز غیر جنبہ داری کی امتیازی خصوصیت کے متعلق مقالہ" تھا۔

چند خصوصی نظریے ترقی پاتے ہیں۔ ان کا تعلق جنگ کے ممنوعہ اسباب، ناکہ بندی، معائنے اور جھڑتی کے حق اور ناطرفداروں کی تجارت سے تھا۔[1]

ایک حد تک ہم جنگ کے ممنوعہ اسباب کو شہنشاہی قوانین اور قانونِ مذہبی کے احکام کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ متعدد رومی قوانین میں اس کی ممانعت کی گئی تھی کہ بربریوں کو ہتیار اور کھانے پینے کی چیزیں بیچی جائیں۔ سنہ ۸۵۰ء کے ایک مذہبی حکمنامے میں بھی اسی قسم کی ممانعتیں صادر کی گئی تھیں اور کلیسا نے ان عیسائیوں کے خلاف سخت سے سخت سزائیں مقرر کیں جو مسلمانوں کو غلہ، لکڑی، اسباب جنگ اور ہتیار مہیا کریں۔[2]

---

[1] نیس کی فرانسیسی تالیف "بحری جنگ، قانون بین الممالک کے نقطۂ نظر سے تبصرہ" مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ء

[2] ممنوعہ اسباب جنگ کے لیے یورپی زبانوں میں "کونترابانڈ" کی جو اصطلاح برتی جاتی ہے

دسویں صدی میں تفےنیس والے مسلمانوں کے ساتھ اہم تجارتی کاروبار رکھتے تھے اور وہ ان کو ہتیار اور جہازی تعمیر کی لکڑیاں مہیا کرتے تھے ۔ خانوادۂ باسل کے جنگجو شہنشاہ جو ایشیائے کوچک، شام اور اقریطش (کریٹ) میں جانبازی کے ساتھ مسلمانوں کی حملہ آور طاقت سے لڑ رہے تھے، وہ اس پر شکایت کرنے لگے ۔ سنہ ۹۷۱ء میں شہنشاہ ژاں زیمی شیس نے تفےنیس کے دوجے (سردار) کے ہاں سفیر بھیجے اور دھمکی دی کہ جہاں کہیں وہ اس تجارتی کاروبار میں مستعمل ہونے والے جہازوں سے دوچار ہوگا وہ ان کو آگ لگا دے گا ۔ دوجے نے مسلمانوں کے ہاتھ ہتیار بیچنے اور تعمیرات یا جہاز سازی میں کام آنے والی لکڑیوں کی فراہمی کی ممانعت صادر کی اور خلاف ورزی کرنے والے کے لیے ایک سخت جرمانہ مقرر کیا اور جو لوگ یہ جرمانہ ادا نہ کرسکیں ان کے لیے سزائے موت مقرر کی ۔ اس سے صرف کم اور سفیدے کی لکڑی کے ایسے تختے جو پانچ قدم لمبے ہوں نیز لکڑی کے برتن مستثنیٰ رکھے گئے[1]۔

بعد میں صلیبی جنگوں کے زمانے میں کاروبار اور نفع اندوزی کی ذہنیت نے عیسائی تاجروں کو اس پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں کو جہازی تعمیر کی لکڑیاں، قطران (ڈانبر)، دھاتیں اور ہتیار فراہم کیا کریں ۔ تفےنیس، جےنوا اور پیزا کے لوگ صلیب کے دشمنوں کو مدد دینے کے لیے اس بارے میں خوشی خوشی محنت اٹھاتے تھے۔ عمومی مجالس شورائے مذہبی اس پر اظہار غیظ و غضب کرنے لگیں ۔ جو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ وہ غالباً اس کی ممانعت کے سلسلے میں سزا مقرر کرتے ہوئے جو لاطینی جملہ استعمال ہوا تھا اسی سے ماخوذ ہے کہ (کونتراانام مرکیس باتو انترکتا)۔

[1] ۔ ہائیڈ کی کتاب "قرون متوسطہ میں مشرق قریبہ کی تجارت" کا فرانسیسی ترجمہ از رےنو جلد (۱) ص ۱۱۳۔

کوئی مسلمانوں کے ہاتھ لوہا یا ہتھیار، جہازی تعمیر کی لکڑیاں یا مکمل طور سے تعمیر شدہ جہاز بیچے اور اسی طرح جو کوئی غیر مسلموں کے ہاں جہازوں کے کپتان (ربّان) یا رہنما کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرے تو اسے جات باہر کر دیا جاتا اور اس سزا پر اس کی جائداد کی ضبطی اور اس کی آزادی کے خاتمے کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ اس ملزم کو جو کوئی موقع پاتا، گرفتار کر کے غلام بنا لے سکتا۔[1]

پوپوں نے باضابطہ تنبیہیں جاری کیں۔ تیسرے الوسنٹ نے ثقے نیس والوں کو مخاطب کیا۔ دسویں گرے گری نے جے نوا اور موں پے لیے کے شہریوں کو خط لکھا۔ نفع اندوزی کی یہ غیر معتدل چاہت، جو عیسائیوں کی بدنامی کا باعث ہو رہی تھی، وہ مسلمانوں کے لیے ایک طنز کا باعث بن گئی!

اطالوی شہروں نے ان افعال کے خلاف، جن سے عیسائیت کو نقصان پہنچے، تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں۔ چنانچہ جے نوا ثقے نیس اور پیزا میں احکام صادر ہوئے۔ یہ بھی نظر آیا کہ آراگون کے بادشاہ جے نوا اور موں پے لیے کے باشندوں پر ان کا اطلاق کرنے لگے۔ لیکن پھر بھی اس کی تجارت گھٹی نہیں اور پیزا والے مصر کے حکمرانوں سے معاہدے کر کے یہ اقرار کرتے رہے کہ جہازی تعمیر کا سامان اور ہتیار وہ لا پہنچاتے رہیں گے۔

رومی شہنشاہوں اور مجالس شورائے مذہبی کی ممانعتیں شہریوں اور ایمان والوں کو مخاطب کر کے صادر ہوتی رہیں۔ جنگ کے اسباب ممنوعہ کا جو قانون ترقی کرتا رہا، اس میں پابندی صرف ناطرفدار پر عائد کی گئی اور خود ناطرفداری میں یہ پابندی مضمر سمجھی جانے لگی۔ دو مملکتوں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ قومیں جو پر امن

---

[1] ایضاً ص ۳۳۶۔

اور مسالمانہ حالت میں تماشہ بینی کرتی رہیں، ان کو یہ حق ہوگا کہ ہر دو حربیوں سے اپنے ان تجارتی تعلقات کو برقرار رکھیں جو سابق سے چلے آرہے ہوں۔ لیکن اگر ان کی مملکت ناطرفدار ہو تو اس حیثیت ہی کے باعث ان کو ایک بات سے باز رہنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ حربیوں میں سے کسی ایک کو ایسی چیزیں فراہم کریں جن سے وہ اپنے حریف کو نقصان پہنچانے میں مدد لے سکے۔ تیرھویں صدی میں اس کا رواج ہوگیا کہ جنگ کے آغاز پر ایسے اعلانات جاری کردیے جائیں جن میں تمام جہازوں کو اس کی ممانعت کی جائے کہ دشمن کو کھانے پینے کی چیزیں یا کسی بھی قسم کا اسباب جنگ پہنچایا جائے۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں ضبطی کی سزا مقرر کی گئی۔ اس طرح کا ایک اعلان ۱۲۲۳ء میں تیسرے ہنری نے جاری کیا تھا۔ ۱۳۱۵ء اور ۱۳۳۷ء میں جو انگریزی حکمنامے جاری ہوئے تھے ان میں اجنبی تاجروں کو اسکاٹ لینڈ والوں سے تجارت کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کی تمام رعایتیں ختم کرنے کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ یہاں تک نظر آتا ہے کہ کسی ایک حکمران کے دوست اس کے دشمنوں سے دوران جنگ میں ہر قسم کے تجارتی کاروبار سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال اس معاہدے میں ملتی ہے جو ۱۳۷۰ء میں تیسرے ایڈورڈ اور فلانڈرس والوں میں طے ہوا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ نظر آتا ہے کہ مملکتوں نے عام طور سے اس پر اکتفا کی کہ چند قسم کے اشیاء کی حمل و نقل ممنوع قرار دیدیں۔

ایسے بھی معاہدے طے ہونے لگے جن میں خاص کر ممنوعہ اشیاء کی فہرست دی جائے، بجائے اس کے کہ سابق کی طرح ان کو مبہم ممانعت کی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ ایسے معاہدے سترھویں صدی عیسوی میں

ملتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۶۰۴ء میں جو معاہدہ اسپین کے تیسرے فلپ اور آرک ڈیوک البرٹ اور ایزابیلا اور انگلستان کے پہلے جیمس میں طے ہوا تھا، اس میں اور اس معاہدے میں جو تقریباً اسی زمانے میں صوبجات متحدہ اور سوئیڈن میں طے ہوا تھا، ایسی چند چیزوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کے حمل و نقل کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۶۲۵ء میں جنگ کے ممنوعہ اسباب سے متعلق ایک حکمنامے کے اطلاق کے سلسلے میں بیرگ سینٹ وی ٹوک کی امارت بحریہ کی کونسل نے اپنے افسران اعلیٰ سے بعض امور پر استصواب کیا تھا۔ آں برواز اِشپی نولا نے اس کا جواب دیا تھا کہ "تم اپنے صادر کیے جانے والے فیصلے میں ممنوعہ اشیاء کے اندر کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں اور تمباکو شامل کرسکتے اور ان کو قابل ضبطی قرار دے سکتے ہو۔"[1] چارلس اول کا اعلان مورخہ ۴ مارچ سنہ ۱۶۲۶ء معاہدہ سوتھ ہامپٹن کے معاہدے (بابت سنہ ۱۶۲۵ء) کے نتیجے کے طور پر جاری ہوا تھا۔ یہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور ان چیزوں کی فہرست دیتا ہے جو اس نام کے تحت آنے والی سمجھی جائیں گی۔ اس زمانے سے جو جو بین الممالک معاہدے یا خصوصی انتظامات عمل میں آتے رہے، ان میں برابر اس کی کوشش رہی کہ ممنوعہ اسباب جنگ کی فہرست کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں چاہے ان میں اس انتہا پسندانہ امر کی کوشش نہ کی گئی ہو کہ دشمن سے ہر قسم کی تجارت ممنوع قرار دیں۔

جہاں تک نظریے کا تعلق ہے جنٹی لیس نے اس رائے کی تائید کی تھی کہ تجارت کرنے کا حق تو منصفانہ ہے لیکن اس حق کو باقی رکھنے کی مانعت کا حق اس سے بھی زیادہ منصفانہ ہے۔

---

[1] برسیل کے کتب خانۂ شاہی کا مخطوطہ نمبر (۱۷۴۳۱)

یہ گویا ممنوعہ اسباب جنگ کے بارے میں ہر قسم کے مبالغہ آمیز مطالبوں کو جائز قرار دینا تھا۔ گروتیوس نے تو یہ خطرناک امتیاز پیدا کیا کہ بعض چیزیں دہرے استعمال کی ہوتی ہیں اور نہ صرف جنگ میں کام آتی ہیں بلکہ حالت امن میں بھی۔ بے شبہہ اس کی رائے میں وہ چیزیں جو محض فوجی استعمال کی ہوں انھیں ممنوعہ اسباب جنگ قرار دے کر ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ حربیوں کو یہ حق دیدینا خطرناک امر تھا کہ اس امر کا فیصلہ خود وہ کریں کہ اس قسم کی نام نہاد دہرے استعمال کی چیزوں میں سے کونسی ممنوع یا غیر ممنوع قرار دی جائے۔

ممنوعہ اسباب جنگ کے حمل ونقل پر مختلف طور سے سزا دی جانے لگی۔ چند ممالک تو اس پر اکتفا کرنے لگے کہ مالیت ادا کرکے ممنوعہ اسباب ضبط کرلیں۔ بعض دوسری مملکتیں ناجائز اسباب کو سیدھے صاف طور سے ضبط کرنے لگیں۔ اور بعض ایسی بھی مملکتیں تھیں جو بعض صورتوں میں مزید برآں نہ صرف جہاز کو بلکہ جہاز کے باقی بے ضرر وغیر ممنوعہ اسباب کو بھی ضبط کرلیتی تھیں اس بارے میں جس نظریے کا اطلاق ہونے لگا تھا وہ قانون کے شرح نویسوں کا مرہون منت تھا۔

ان ممتاز اساتذہ نے قانون کی ترقی میں عام طور پر اور تصادم قوانین یا خصوصی قانون بین الاقوام میں خاص کر جو اثر ڈالا ہے، اس سے سب لوگ واقف ہیں بحری قانون بین الممالک کے وہ قاعدے جو سزاؤں کے متعلق ہیں ان کے سلسلے میں بھی ان کا حصہ بہت اہم رہا ہے۔ قانون روما اور اپنے شہروں کے مالیاتی ضابطوں کے متعلق ان لوگوں نے جو نتائج استنباط کیے تھے، ان میں سے متعدد کو اطالوی جمہوریتوں کے دائرے کے باہر بھی قبولیت

228

حاصل ہوگئی۔ یہ اس وقت بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے جب یہ سوچا جائے کہ ؔوینس، جےنو، پیزا، فلارنس، ایک طرف تو تجارت کے طاقتور مرکز تھے تو ساتھ ہی پیئنو، بارتولے، بالدے اور ان کے شاگرد عرصۂ دراز تک علم قانون کے اہم منبع بنے رہے۔[1]

جو جہاز دشمن کی بندرگاہوں سے کاروبار کر رہے ہوں ان کو روکنے اور گرفتار کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنا بحری جنگ اور ہر زمانے میں اس کی حاجت اس لیے لاحق ہوتی رہی کہ وہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ لیکن جس طور سے اسے عمل میں لایا جاتا تھا وہ محض زبردستی سمجھی جاتی تھی۔ آخر سولھویں صدی میں کہیں یہ ممکن ہوا کہ اسے قانون بین الممالک کے قاعدے کے طور پر استحکام حاصل ہو۔[2]

جن احکام کے ذریعے سے غیر حربی قوموں کو دشمن کے ساتھ تجارتی کاروبار کی ممانعت کی جاتی تھی ان میں ناکہ بندی کے نظریے کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے بادشاہ تیسرے ایڈورڈ نے فرانس سے جنگ کے وقت ایک فرمان شایع کیا جس میں یہ حکم تھا کہ ہر وہ اجنبی جہاز جو کسی فرانسیسی بندرگاہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے، اسے گرفتار کرلیا اور جلا دیا جائے گا۔ اس کے معنے یہ تھے کہ ایک حکمنامے کے ذریعے سے ایک پوری سلطنت کو ناکہ بندی کی حالت کے تحت لا لیا جائے۔

یہ نظریہ اتنا زیادہ آرام دہ تھا کہ اس کی تقلید ہوئے بغیر

---

[1] فلپس کی ولندیزی کتاب "قانون بین الممالک کا قاعدہ کہ جہاز کی حیثیت سرزمین کی سی ہے" ص ۴۳۔

[2] بارگریٹ ڈین کی انگریزی کتاب "ناکہ بندی کا قانون، اس کی تاریخ حالت موجودہ اور اغلب مستقبل"

نہ رہ سکی ۔ اگرچہ تجارتی شہروں نے احتجاج کیے خاص کر "ہانزیاتی" حلیفی والے شہروں نے ۔ لیکن پھر بھی قریب قریب تمام بحری جنگوں میں اس کا اطلاق کیا گیا ۔ سویڈن نے ۱۵۶۰ء میں اس سے اس وقت استفادہ کیا جب وہ روس سے لڑ رہا تھا ۔ اور جب دوسرے فلپ کے اقتدار کے خلاف بغاوت ہوئی تو ہالینڈ کے ہرسہ طبقات رعایا کے نمایندوں نے اعلان کیا کہ فلانڈرس کی ان تمام بندرگاہوں کی، جن پر اس وقت تک اسپینیوں کا تسلط تھا، ناکہ بندی کردی گئی ہے، اگرچہکہ ان بندرگاہوں کے اطراف کسی طرح کا بھی گھیرا نہیں ڈالا گیا تھا ۔ ایک ابتدائی حکمنامہ ۱۵۸۴ء میں شایع کیا گیا ۔ اور ۱۴ راپریل و ۴ راگست ۱۵۸۶ء نیز ۹ راگست ۱۶۲۲ء اور ۱۲ رمارچ ۱۶۲۴ء کے فرامین کے ذریعے سے اس ممانعت کی تجدید کی گئی ۔ اور ۲۶ رجون ۱۶۳۰ء کے فرمان نے ناکہ بندی کے متعلق جو اصول قرار دیے اور جن افعال کو اس ناکہ بندی کی خلاف ورزی قرار دیا، وہ جہاں صاف اور واضح تھے، وہیں خطرناک بھی تھے ۔

جو فرمان ۱۶۳۰ء میں نافذ ہوا، اس کی ترتیب و تدوین بندرگاہ ایمسٹردام کی عدالت امارت بحریہ اور دیگر ماہر ترین قانون دانوں کے مشورے اور رائے سے عمل میں آئی تھی ۔ ناطرفداروں کے حقوق پر اس نے بھی اتنی ہی زیادہ دست درازی کی جتنی کہ ممکن تھی ۔ چنانچہ اس نے نہ صرف یہ حکم دیا کہ ان جہازوں اور جہازوں پر لدے ہوئے بار کو ضبط کرلیا جائے جن کے متعلق یہ کوشش کی جاچکی ہو کہ انھیں روکیں اور ان پر جاکر تفتیش و تحقیق کریں، بلکہ یہ کافی سمجھا گیا کہ جہاز کے کاغذوں سے اگر اس کا کوئی مماثل ارادہ پایا جائے، حتی کہ اس صورت میں بھی جب کہ یہ امر یکساں ہو کہ وہ جہاز اپنی منزل مقصود سے ابھی اتنا دور ہے یا نہیں کہ جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جہاز اپنی منزل مقصود بدل سکتا ہو ۔۔۔۔۔

بہر صورت اسے ضبط کرلیا جاسکتا۔ اس فرمان نے مزید برآں یہ بھی حکم دیا کہ وہ ناطرفدار جہاز جو کسی ناکہ بندی کی ہوئی بندرگاہ میں داخل ہوجائیں، بغیر اس کے کہ انھیں روکا گیا ہو تو، ا ایسے جہاز بھی واپسی کے وقت گرفتاری کے مستوجب قرار دیے گئے تاآنکہ وہ کسی ناطرفدار بندرگاہ میں داخل نہ ہوگئے ہوں۔ ایک مرتبہ ایسے مامن کو پہنچ جانے کے بعد پھر وہ وہاں سے روانہ ہوتے تو اپنا سفر بے خرخشہ جاری رکھ سکتے بجز اس صورت کے کہ ناکہ بندی کرنے والی سلطنت کا کوئی جنگی جہاز جو اس کا پیچھا کرتا چلا آرہا تھا، وہ اپنی تاک میں لگا رہا ہو اور واپس نہ گیا ہو۔

223

یہ صحیح ہے کہ ان احکام کے ذریعے سے کوئی ایسی نئی چیز وجود میں نہیں لائی گئی جس پر اس وقت تک عمل نہ ہوگیا ہو۔ لیکن ۱۶۳۰ء کے فرمان نے ان رواجات کو مدوّن کردیا جو مسلمہ ہوچکے تھے۔ اسی بناء پر فرضی ناکہ بندی یا کاغذی ناکہ بندی یا رسمی و دفتری ناکہ بندی کا نظریہ اسی زمانے سے ملنے لگتا ہے۔ اس نظریے میں فرض یہ کرلیا جاتا تھا کہ بندرگاہوں پر گھیرا ڈالدیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت حال تو یہ ہوتی کہ ایک سادہ اعلان کے ذریعے سے جملہ تجارتی کاروبار کو ممنوع قرار دیدیا جاتا [اور اس ممانعت کے نفاذ کے لیے کوئی تدبیر نہیں اختیار کی جاتی]۔

ناکہ بندی میں فرضی پن کا جو عنصر تھا، وہ بے انتہا خطرناک تھا۔ اسی لیے سترھویں صدی کے نصف دوم سے بعض تالیفوں میں اس کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ ناکہ بندی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ واقعیت کی حامل ہو۔ ۱۶۹۳ء میں گروے نِنگ نے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا بڑا لمبا نام یہ تھا: "مقالہ اس امر کے متعلق کہ قانوناً مسالم [جنگ میں حصہ نہ لینے والے، ناطرفدار] لوگ حربیوں سے کاروبار کرسکتے ہیں۔ اسی طرح شمالی علاقوں کے لوگ گال (فرانس)

کے ساتھ جب کہ وہ باہم دوست ہوں تو وہ اس وقت آزادی کے ساتھ کاروبار کرسکتے ہیں جب کہ ان [آخرالذکر] اور انگریزوں اور ولندیزیوں میں جنگ ہو۔ اور اس امر کی قانون اقوام کے ذریعے سے توضیح و تائید"۔ اس نے زور و شور کے ساتھ برطانیہ اور صوبجات متحدہ کی سیاست پر تنقید کی کیونکہ اس کی رائے میں ان ممالک نے فرانس کے ساتھ تجارت کی عمومی ممانعت کا اعلان کرکے قانون بین الممالک کی خلاف ورزی کی تھی اور وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ڈنمارک اور سویڈن والوں کو تجارت کا پورا حق حاصل ہے۔

اگر ناکہ بندی کو جنگ کا کوئی جائز ذریعہ قرار دیا جائے تو ہر وہ شخص جو اس ناکہ بندی کو توڑنے کی کوشش کرے اسے ایک مخاصمانہ فعل کا مرتکب سمجھا جائے گا، اور اس کی حیثیت اس حربی ہی کی سی ہوگی جس کی بندرگاہ کی ناکہ بندی کی گئی ہو۔ حربیوں کے اس حق کی وسعت کتنی ہے اور اس حق کی خلاف ورزی سے کیا سزا لاحق ہوتی ہے؟ گروتیوس نے کوشش کی کہ اس کے متعلق ایک قاعدہ بیان کرے۔ چنانچہ اس کے مطابق اگر ناکہ بندی کی خلاف ورزی سے کوئی حقیقی نقصان پہنچا ہو تو خلاف ورزی کرنے والے پر یہ ذمہ داری عاید ہوگی کہ اس نقصان کی تلافی کرے۔ بنا برآں ناکہ بندی کرنے والوں کو یہ حق ہوگا کہ اس نقصان کی تلافی کرانے کی غرض سے جہاز اور اس پر لدے ہوئے بار کو گرفتار کرلیں۔ نقصان کی تلافی کے ساتھ ساتھ گروتیوس نے ایک تعزیری کارروائی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کارروائی اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ سلطنت جس کی ناکہ بندی کی گئی ہو بادی النظر میں غیر منصفانہ جنگ کررہی ہو۔ یہ نظام مبہم ہے۔ بنکر شوئک نے اس کا تکملہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ

سزا کا مستوجب ہونے کے لیے ناکہ بندی کی خلاف ورزی کافی ہے، اور اس سے بحث نہیں کہ نقصان پہنچا ہے یا نہیں۔ اور چونکہ ناکہ بندی کرنے والے کو ناکہ بندی کیے ہوئے مقام کی ضرورتوں کا جاننا نا ممکن ہوتا ہے، اس لیے یہ امر ممنوع قرار دیا گیا کہ کسی بھی قسم کے سامان تجارت کی درآمد کی جائے۔

اگر قانون بین الممالک یہ تسلیم کرتا ہے کہ حربیوں کے جنگی جہاز اپنے دشمن کے جہازوں کو گرفتار کر سکتے ہیں اور اس بات میں آڑے آسکتے ہیں کہ دشمن تک ممنوعہ اسباب جنگ تجارتی حمل ونقل کے ذریعے سے پہنچایا جائے، تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اس حق کے استعمال کی شرط یہ ہو کہ وہ ان تمام جہازوں کا معائنہ کر سکیں جو مختلف مملکتوں سے تعلق رکھتے ہوں بجز سرکاری جنگی جہازوں کے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ معائنے اور تفتیش کا حق خاصا پرانا ہے۔

کتاب "بحری قواعد" میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اور فرانس و انگلستان کے ابتدائی بحری قواعد و ضوابط نے اسی کو اختیار کرلیا تھا۔ پندرھویں صدی کے معاہدوں میں اس کو روا رکھا گیا ہے اور اس کے استعمال پر یہ حد عائد کی گئی ہے کہ زبانی اطلاع دے کر اس کی توثیق کے لیے قسم کھائی جائے۔ جو امیر البحر ۱۵۱۲ء میں گوئی ینن کی مہم پر روانہ ہوا تھا، اس کو ہدایت دیتے ہوئے آٹھویں ہنری نے صراحت کے ساتھ یہ قاعدہ بھی بیان کیا تھا۔ لیکن بہرحال سترھویں صدی میں اسی قاعدے نے ایک معین صورت اختیار کی، اور ترقی کرنے لگا۔ چنانچہ ۱۶۲۵ء میں انگلستان نے ولندیزیوں اور ان کے حلیفوں سے جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ان دیگر سلطنتوں سے جو اسپین کی شان و شوکت کے پرخچے اڑانے سے دلچسپی رکھتی ہوں، یہ استدعا کی جائے گی کہ اسپینیوں کے ساتھ

ہر قسم کی تجارت روکدیں۔ اور اگر وہ انکار کریں تو ان ممالک کے جہازوں کا معائنہ کیا جایا کرے گا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کہیں وہ جنگ کا سازو سامان تو نہیں لے جارہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ معائنے کی اکثر ایک پرجوش مخالفت ہوتی رہی ہے گروشیوس نے لکھا ہے کہ ؔورفیں کی صلح کے بعد ملکہ الزابتھ نے اسپین کے ساتھ اپنی جنگ جاری رکھی اور فرانس کے بادشاہ سے اس نے یہ استدعا کی کہ وہ اسے ان فرانسیسی جہازوں کا معائنہ کروانے کی اجازت دے جو اسپین جاتے ہوں تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کہیں وہ جنگ کا سازو سامان تو چھپا کر نہیں لے جارہے ہیں۔ گروشیوس نے بیان کیا ہے کہ اس درخواست کو قبول نہیں کیا گیا۔ اور وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سے لوٹ مار کی سرپرستی سی ہوگی اور تجارتی کاروبار میں حرج پیدا ہوگا۔ اس روایت کے صحیح ہونے سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ رڈّی نے بیان کیا ہے کہ الزابتھ نے ہرگز یہ خواہش نہیں کی تھی کہ فرانسیسی جہازوں کا معائنہ کراسکنے کی اجازت دی جائے۔ بلکہ چوتھے ہنری کے محض گوارا کرلینے کی بنا پر ملکہ نے فرانسیسی جہازوں کو اس کی اجازت دی تھی کہ اسپین آیا جایا کریں بشرطیکہ وہ یہ اقرار کریں کہ جنگ کا سازو سامان نہیں لیجائیں گے۔ اور جب اس اجازت سے بیجا فائدہ اٹھانے کے بعض واقعات رونما ہوئے تو الزابتھ نے دربار فرانس کو اطلاع دی کہ وہ آیندہ اس طرز عمل کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

معائنے کے باعث خاصے ناگوار نتائج نکلنے لگے۔ ان کے علاج کے لیے یہ کوشش کی گئی کہ ناطرفدار اپنے ملک کے کسی جنگی جہاز کی حفاظت اور بدرقے میں سفر کریں۔ اور اگر جنگی جہاز کا افسر یہ اطمینان دلا دے کہ جملہ تجارتی جہاز ناطرفداروں کے ہیں اور ان پر

231

کسی قسم کا ممنوعہ اسباب جنگ لدا ہوا نہیں ہے تو اس اطمینان دہانی ہی کو معائنہ سمجھ لیا جاتا۔

بدرقے کا رواج خاصا پرانا ہے۔ ۱۳۵۳ء میں تیسرے اڈورڈ نے ایک اہم تدبیر اختیار کی تھی۔ وہ یہ کہ گاس کنی جانے والے جہاز سوتھ ہامپٹن کے قریب چالس فرڈ میں بی بی مریم کی ولادت کے دن جمع ہوا کریں اور پھر وہاں سے وہ سرکاری افسروں کے زیر ہدایت روانہ ہوا کریں۔ نشیبستان ہالینڈ میں تجارتی جہازوں کے لیے بدرقے مہیا کیے جاتے تھے۔ اور اگر بدرقہ ناکافی ہوتا تو بحری شہر بعض محاصل عائد کر کے خود ہی اپنے صرفے سے ضروری ہتیار فراہم کر لیتے۔ چنانچہ اسی طرح سے ۱۵۵۱ء میں شہر برگیس نے ان مختلف جنگی جہازوں کو ہتیار مہیا کیے جو تجارتی بیڑے کے ساتھ جانے والے تھے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں نشیبستان ہالینڈ کی نگران حکومت یعنی آسٹریا کی ماری نے شہر آن ٹیر کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس بندرگاہ سے روانہ ہونے والے جہازوں کی حفاظت کے لیے جو بدرقہ مامور ہو، اس کو مسلح کرنے کے مصارف کا ایک تہائی حصہ حکومت کی طرف سے ادا کروائے۔ جو اجازت نامہائے سفر خود حربیوں سے حاصل کیے جاتے اور جن کی مہنگی قیمتیں تاجر ادا کیا کرتے، ان کا عام طور پر کم احترام ہوتا تھا۔

وِسے ٹن نے بیان کیا ہے کہ قدیم زمانے میں ہر وہ قوم جو حلیف نہ ہوتی، اسے ایک دشمن تصور کر لیا جاتا تھا۔[1] اس کے یہ الفاظ قرون متوسطہ کے اکثر حصے پر بھی اسی طرح صادق آتے ہیں۔ جب صورت حال یہ تھی تو اس سے سب سے زیادہ تجارت ہی متاثر ہوئی۔ بہر حال بحری تعلقات کی ترقی سے کچھ بہتری

---

[1] وِسے ٹن کی انگریزی تالیف "قانون بین الممالک کے عناصر" مع حواشی ولیم بیچ لارنس ص ۱۹۱

پیدا ہوئی۔ یہ ناممکن تھا کہ حربیوں کو ان قوموں کے جہازوں پر حملہ کرنے یا ان کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے جو جنگ سے بے تعلق ہوں۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں تجارت کے جو سب سے اہم مرکز تھے وہ تھے ٹیس، جے نوا، پیزا، فلارنس، مارسیلیا اور برشلونہ تھے۔ اور دیگر مقاموں کو چھوڑ کر صرف ان اہم مرکزوں کی تجارت نے رواجات میں یکسانی پیدا کردی۔ جو جنگیں ان شہروں میں آپس میں ہوتیں یا ان شہروں یا دیگر قوموں میں تو ان سے بھی ایسے قواعد پیدا ہونے لگے، جن کا عمومی اطلاق ہونے لگا۔ حربیوں کو اپنے دشمن کے متعلق جو حقوق تھے، انھیں وضاحت کے ساتھ معین کیا گیا۔ بحری رواجات کی اصطلاح میں "دوست" کے متعلق باضابطہ طور سے کلیے بننے لگے، جن سے حفاظت حاصل ہونے لگی[1]۔ کتاب "بحری قواعد" میں بھی بیان ہوا ہے کہ یہ قواعد مسلمہ ہیں۔

232

کتاب "بحری قواعد" بحری قوانین کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے کسی ایک یا زیادہ مملکتوں کی مجلس قانون ساز نے مرتب اور شایع کیا ہو[2] بلکہ یہ ایسے بحری رواجات کا مجموعہ ہے جو برشلونہ کی قنصلی عدالت نافذ کیا کرتی تھی۔ اور یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان مسلمہ بحری رواجات کا خلاصہ ہے جن کو بحر متوسط کے مختلف ساحلی شہروں میں قبول کیا جاتا تھا۔ بحری قنصل برشلونہ میں ۱۲۷۹ء سے مامور ہونے لگے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] کاچے نوشکی کی انگریزی تالیف "بحری غنیمت کا قانون، خاص کر حربیوں اور ناطرفداروں کے فرائض و رواجات کے حوالے سے" ص ۲۰۔

[2] پارڈیسو کی فرانسیسی تالیف "اٹھارھویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" جلد (۲)، باب (۱۲)۔

یہ مجموعۂ قواعد بڑا پرانا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۴۹۴ء میں چھپی چنانچہ اس کا پہلا اڈیشن برشلونہ میں کتلونی زبان میں شایع ہوا۔ بعد میں مختلف زبانوں میں ترجمے ہوتے گئے۔ اس کا ایک اطالوی متن تے نیس میں ۱۵۳۹ء میں شایع ہوا۔ اور ایک فرانسیسی متن مارسیلیا میں ۱۵۷۷ء میں۔ سب سے زیادہ اطالوی اڈیشن ہی نے اس کو اسپین کے باہر روشناس کرایا۔ اس مجموعۂ قواعد کے پیش نظر خاص کر یہ امر تھا کہ ایسے قاعدے بیان کرے جن کا اطلاق ان خانگی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے کیا جائے جو تجارت اور ملاحی کے سلسلے میں رونما ہوں۔ ضمناً اس میں ایسے اصول اور کلیات کو بھی جمع کیا گیا ہے جن کا اطلاق حالت جنگ میں محارب قوموں کے تجارتی جہازوں پر ہوتا ہو نیز ان قوموں کے جہازوں پر جو مخاصمانہ کارروائیوں میں کوئی حصہ نہ لے رہے ہوں۔

اس کا باب (۲۳۱) اولاً اس صورت سے بحث کرتا ہے جب کوئی جہاز جاتے ہوئے یا آتے ہوئے یا بحری قزاقی کے دوران میں کسی تجارتی جہاز سے دو چار ہو۔

چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ: "اگر یہ آخرالذکر تجارتی جہاز اور اس پر لدا ہوا اسباب دونوں دشمنوں کے ہوں تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ ہر کوئی اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسی لیے اس صورت کے متعلق کسی قاعدے کا بیان کرنا ضروری نہیں ہے"۔ اسی کے ایک گزشتہ باب یعنی باب (۱۸۷) میں وہ قواعد بیان ہو چکے ہیں جن کا ایسی صورت میں اطلاق ہوتا ہے۔

لہ۔ انگریزی تالیف "امارت بحریہ کی کالی کتاب" پر ٹرا ورس ٹوس نے جو عالمانہ دیباچہ لکھا ہے، اس کا بحری تنضیلیہ کی تاریخ کے سلسلے میں حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

233

لیکن اگر جہاز دوستوں کا ہو تو اس مجموعۂ قواعد کے مطابق جہاز پر کا وہ سامان ضبط کرلیا جاسکتا ہے جو دشمنوں کا ہو۔ اس دوست جہاز کے کپتان کو ضبط کردہ سامان کے حمل و نقل کا کرایہ ادا کردیا جانا چاہیے گویا کہ اس نے اسے منزل مقصود کو پہنچادیا ہو۔

آخری صورت وہ ہے جب دوستوں کا اسباب کسی دشمن جہاز پر حمل و نقل پا رہا ہو۔ ایسا اسباب ضبط نہیں ہوسکتا لیکن اس غانم (گرفتار کنندہ) کو جو اس جہاز کو اپنے وطن کی بندرگاہ میں پہنچائے، یہ مطالبہ کرنے کا حق ہوگا کہ دوستوں کے اسباب کو لانے کا کرایہ اسے ادا کیا جائے گویا کہ اس نے اسے منزل مقصود پر پہنچا دیا ہو۔[1]

دوسرے الفاظ میں برشلونہ کی قنصلی عدالت کے رواجات کے مطابق دشمن کی جائداد کو تو چھین لینے کا حق ہے لیکن ناطرفدار جائداد کا احترام کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بیان کردینا چاہیے کہ ان قواعد میں باقاعدہ حربیوں اور بحری قزاقوں میں کوئی فرق کیا جاتا نظر نہیں آتا۔

گروتیوس بیان کرتا ہے کہ ۱۴۳۸ء میں ہالینڈ نے اسی کتاب "بحری قواعد" کے اصول کا اطلاق اس جنگ میں کیا جو "ہانزیاتی" شہروں کے خلاف پیش آئی تھی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس پر انگلستان میں بھی عمل ہوتا تھا، فرانس میں بھی اور شمالی یورپ میں بھی۔ ۱۲۲۱ء میں پیزا اور آرل میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی

[1] پارڈیسو کی فرانسیسی تالیف "اٹھارھویں صدی سے پہلے کے بحری قوانین کا مجموعہ" ج ۲ باب ۱۲ ص ۳۰۳۔

[2] رتّی کی انگریزی تالیف "بحری قانون بین الممالک پر تاریخی و تنقیدی تحقیقات" ج ۱ ص ۵۶۔

رو سے یہ طے ہوا تھا کہ اگر کسی دوست جہاز پر دشمن اسباب پایا جائے تو اسے ضبط کرلیا جاسکے گا لیکن دوست جہاز پر جو دشمن اشخاص موجود ہوں انھیں قیدی نہیں بنایا جاسکے گا۔[1] بعد میں جو معاہدے ہوئے، وہ "بحری قواعد" کے بیان کردہ اصول کلیہ کے اندر ہی رہے۔

ناطرفداروں کو جو تکلیفیں ہوتی تھیں ان کے باعث بارہا احتجاج کیے جاتے رہے۔ ۱۴۳۴ء میں ہانزیاتی شہروں کے نمایندے لوبک میں جمع ہوئے۔ اور ان شہروں کے امتیازات کی جو خلاف ورزی ہورہی تھی، اس پر غور کیا۔ ۱۴۹۳ء میں انھیں شہروں نے ان نقصانوں کے خلاف زور وشور سے شکایت کی جو ڈنمارک کے بادشاہ اور اس کے حلیف اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کی کارروائیوں کی وجہ سے بھگتنے پڑے تھے۔ اس وقت یہ دونوں ملک سویڈن سے جنگ کررہے تھے۔ ان حکمرانوں نے دشمن سے ہر طرح کا تجارتی کاروبار ممنوع قرار دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جس زمانے میں ہانزیاتی حلیفی اوج عروج پر پہنچی ہوئی تھی، یعنی ۱۳۷۳ء سے ۱۴۹۴ء تک تو اس دوران میں خود اس حلیفی نے اسی نظریے پر عمل کیا تھا جس پر دوسرے عمل کرنے لگے تو اس نے اس نظریے کو مردود قرار دیا۔ چنانچہ جب کبھی یہ حلیفی خود کسی جنگ میں حصہ لیتی تو ناطرفداروں کو اپنے حریف سے ہر طرح کی تجارت سے روک دیتی۔

سولھویں صدی میں فرانس نے منظم طور پر اس "بحری قواعد" کے احکام کو ٹھکرانا شروع کیا۔ چنانچہ فرانسوا اول نے جو احکام ۱۵۳۳ء اور ۱۵۴۳ء میں دیے اور تیسرے ہنری نے ۱۵۸۴ء میں تو ان کے

234

---

[1] دے پوک کی فرانسیسی تالیف "دشمن جھنڈے تلے دشمن کی خانگی جائداد" ص ۲۳۔

مطابق کسی حلیف کا وہ اسباب ضبطی کے قابل قرار دیا گیا جو کسی دشمن جہاز پر لدا ہوا ہو۔ اور ۱۵۴۳ء اور ۱۵۸۴ء کے حکمناموں کے لحاظ سے حلیفوں کے ان جہازوں کو جائز مال غنیمت قرار دیا گیا جن پر دشمنوں کا اسباب لدا ہوا پایا جائے۔ اس وقت ایک نیا قانونی کلیہ وجود میں آیا کہ "دشمن کے سامان کے باعث دوست کا سامان تجارت بھی ضبط ہو جاتا ہے"[1]۔

اس وجہ سے انحراف کا باعث سیاسی ضرورت تھی۔ ۱۵۴۳ء کے حکمنامے میں عذر یہ بیان کیا گیا تھا کہ حلیف اور ناطرفدار بکثرت فریبوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت میں فرانسوا اول نے جب انگلستان کے خلاف وہ بحری مہم تیار کی جس کے نتیجے کے طور پر ۱۵۴۵ء کا بحری اعلان شایع کیا گیا، تو اصل میں اس کی خواہش یہ تھی کہ بحری قزاقی کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور اسی کی ترغیب دینے کے لیے اس نے قزاقی بیڑوں کو ایک وافر اور کثیر شکار کا پیشکش کیا تھا۔ اس نے جو بھولا بھالا عذر پیش کیا ہے، اس کا ذکر خود حکمنامے میں بھی ہے۔

مزید برآں یہ بیان کرنا بے سود نہ ہوگا کہ اس ناطرفدار جہاز کو ضبط کر لینا جس پر دشمن اسباب لدا ہوا ہو، اس نظریے کی بنا پر بھی حق بجانب قرار دیا جاتا تھا جسے بعض شرح نویسوں نے زور و شور سے پیش کیا تھا یعنی "قوت کشش" کا نظریہ، جس کی رو سے ممنوعہ اسباب ایک طرح سے جائز اسباب کو بھی اپنی ممنوعیت سے متاثر کر دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق حمل و نقل کے لیے جو چیز کام میں لائی جا رہی ہو، اس کا بھی وہی

---

[1] "روبا" کی اصطلاح سے عام طور پر جبہ اور عبا مراد ہوتی ہے لیکن کتاب "بحری قواعد" میں اس سے سامان اور اسباب تجارت مراد لیا گیا ہے۔

انجام ہوگا۔ جو اس پر لدے ہوئے ممنوعہ اسباب کا۔ یہ ضبطی "بر بنائے اشیاء" ہے۔

بارتولے نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ممنوعہ اسباب کے حمل ونقل پر صرف "بر بنائے جرم" سزا دی جائے گی۔[1] "قوت کشش" کا نظریہ فرانس میں چل پڑا اور پہلے فرانسوا اور تیسرے آں ری (ہنری) کے سخت حکمنامے اس کی تعمیل کرانے لگے۔ اور انطوان مورناک نے اس کی حمایت بھی کی تھی۔[2] لیکن متعدد مولف اس کی تردید میں لگے رہے خاص کر یوحان مرکار نے جو ایک جرمن مولف تھا، اپنی فیاض طبیعت کے تحت اس پر ایک اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی۔[3]

285

فرانس نے جو قواعد نافذ کیے ان پر ہر طرف زور و شور سے احتجاج کیے گئے۔ انگلستان نے اپنے حقوق جتائے۔ "ہانزیاتی" "شہر" کہنے لگے کہ انھیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور ملحوظات متعددہ اس کے جواب میں انتقامی کارروائیاں اختیار کرنے لگے۔ اور یہ یقین کرنا چاہیے کہ ان حکمناموں کے نفاذ میں کچھ بہت زیادہ سختی نہیں برتی گئی ہوگی، کیونکہ پارلیمان شاہی کے اجلاس منعقدہ طور کی ایک قرار داد بابت ۱۵۹۲ء میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ ان کے ہدایات پر عملدرآمد نہیں ہورہا تھا۔[4] ۲ فروری ۱۶۵۰ء کے اعلان کے

---

[1] ۔ ملیسن کی ولندیزی تالیف "قانون بین الممالک کا قاعدہ کہ جہاز کی حیثیت سرزمین کی سی ہے" ص ۱۴۔

[2] ۔ مورناک کا مجموعۂ تالیفات، ج ۱، ص ۱۱۳۵، نیز ج ۳، ص ۹۴۳۔

[3] ۔ برڈی کی انگریزی تالیف "بحری قانون بین الممالک پر تنقیدی اور تاریخی تحقیقاتیں" ج ۱، ص ۶۲۔

[4] ۔ مرکار کی لاطینی تالیف "تاجروں اور انفرادی تجارت کے حقوق کے متعلق سیاسی وقانونی رسالہ" مطبوعۂ ۱۶۶۲ء ص ۲۱۷۔

ذریعے سے نرم تر قواعد نافذ کیے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۶۸۱ء میں ایک اور نظر ثانی عمل میں آئی۔

سولھویں صدی کے نصف دوم میں جو عظیم الشان لڑائیاں ہوتی رہیں، ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ناطرفداروں کے حقوق کو پامال کیا جاتا رہا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بعض لڑائیوں میں یہاں تک ہونے لگا کہ ناطرفداروں کے ان حقوق میں سے سب سے اہم یعنی حق تجارت کو تک ممنوع قرار دیا گیا۔

اس کے بعد کی صدی میں ایک مناسب تر رائے قائم ہونے لگی۔ اس کی نمایندگی اور حمایت خاص کر صوبجات متحدہ نے کی۔ چنانچہ انھوں نے کتاب "بحری قواعد" کے احکام کو تو ٹھکرا دیا، لیکن سترھویں صدی کے وسط سے جب ان کی تجارت انگلستان کے قانون سلاحی کے باعث خطرے میں پڑنے لگی تو ان کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ ایک دوسرا طرز عمل اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس اصول کے منوانے کی کوشش کی کہ ناطرفدار جھنڈے کے سایے میں جو دشمن اسباب ہو وہ بھی آزاد سمجھا جائے۔ اس کے پہلے بھی ۱۶۰۴ء میں ترکی کے باب عالی نے [فرانس کے] چوتھے آں ری (ہنری) کے متعلق مجبوراً یہ قبول کر لیا تھا کہ دشمن جھنڈے تلے جو ناطرفدار اسباب ہو، اسے آزاد قرار دیں، نیز اس دشمن اسباب کو بھی جو ناطرفدار جھنڈے تلے پایا جائے۔ ۱۶۱۲ء میں باب عالی نے اسی طرح کا ایک معاہدہ صوبجات متحدہ سے بھی کیا تھا۔

یہ ذمہ داری پہلے اور دوسرے ہر دو معاہدوں میں یک طرفہ تھی۔ لیکن جب ۱۸ اپریل ۱۶۴۶ء کو فرانس اور صوبجات متحدہ میں ایک معاہدہ ہوا تو اس قاعدے کو اس میں جگہ دی گئی۔ یہ طے ہوا کہ چار سال تک وہ جہاز جو صوبجات متحدہ کی امارت بحریہ میں رجسٹر ہو کر تجارت کریں وہ "آزاد" رہیں گے اور اپنے پر

236

لدا ہوا اسباب آزادی کے ساتھ اتار سکیں گے۔ خواہ اس اسباب کے اندر ایسا غلہ اور ترکاری ہی کیوں نہ پائی جاتی ہو جو دشمنوں کی ہو۔ صوبجات متحدہ نے یہی قاعدہ اس معاہدے میں بھی شامل کردیا جو سنہ ۱۶۵۰ء میں انھوں نے اسپین کے ساتھ کیا تھا۔ انگلستان نے بھی اس کی مختلف موقعوں پر توثیق کی، خاص کر ان معاہدوں میں جو سنہ ۱۶۵۴ء اور سنہ ۱۶۵۵ء میں علی الترتیب پرتگال اور فرانس کے ساتھ طے ہوئے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تمام معاہدے جو اس تاریخ سے سنہ ۱۸۴۲ء تک انگلستان اور فرانس میں ہوتے رہے، ان میں اسی اصول کلیہ کو تسلیم کیا جاتا رہا۔

یہ قاعدہ عالمگیر قبولیت حاصل کرنے لگا ہی تھا کہ فرانس نے پہلے فرانسوا اور تیسرے آں ری (ہنری) کی روایتوں کو زندہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۸۱ء کے حکمنامے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ وہ تمام جہاز جائز مال غنیمت سمجھے جائیں گے جن پر کسی دشمن کا اسباب لدا ہوا ہو، نیز بادشاہ کی رعایا اور حلیفوں کا وہ اسباب بھی جو دشمن جہاز پر پایا جائے۔

قدیم زمانے میں یہ امر مسلمہ تھا کہ جنگی قیدی غلام بن جاتا ہے قانون روما کا حکم تھا کہ جو شہری جنگی قیدی بن جائے، اسے اپنے وطن کے حقوق شہریت و انسانیت باقی نہیں رہتے، اور وطن اسے ایک دشمن خیال کرنے لگتا۔ اس اصول کی حمایت متعدد شرح نویسوں نے بھی کی۔ بالدے بھی اسی کو تسلیم کرتا نظر آتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ "اصل میں تمام حیوانات ناطق یعنی انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور طبعاً سب مساوی ہیں۔ خدا نے کسی کو کسی کا غلام نہیں بنایا بلکہ سب کو یکساں آزادی عطا کی ہے۔ بعد میں میرا اور تیرا کے ضمائر اضافی پیدا ہوئے تو جنگیں چھڑیں۔ اور انھیں جنگوں سے غلامی

پیدا ہوئی۔[1] اس کی رائے میں غلامی جنگ کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ ایک اور عبارت میں وہ اس صورت سے بحث کرتا ہے جب شہنشاہ یا پوپ کے حکم سے جنگ کی گئی ہو۔ اور سوال کرتا ہے کہ شہنشاہ دوسرے فرڈیرک کے صلبی بیٹے اینٹ سیو نے بولونیا والوں کے قیدی کی حیثیت سے جان دیتے وقت جو وصیت کی تھی، آیا وہ درست سمجھی جائے گی یا نہیں؟ سوال کا جواب وہ نفی میں دیتا ہے، اور وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ (لاطینی میں) "اس طرح کے قیدی بھیڑ بکریوں یا دیگر مماثل مال منقولہ کی طرح کے ہوتے ہیں جو کہ طبعی ایک شئے ہوتا ہے۔"

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، اگر واقعات اس تصور کے مطابق تھے تو نظریے زیادہ نرم اور زیادہ انسانیت پرور تھے۔ قدیم تصور، کلیسائی نظریے کے خلاف تھا۔ کیونکہ خود تیسرے الگزانڈر کے زمانے میں لاتران کی تیسری مجلس شورائے مذہبی نے صراحت کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ تمام عیسائی غلام بننے سے محفوظ سمجھے جائیں۔ اور یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ جو مسلمان قیدی جنگ میں ہاتھ آئیں اگر وہ بپتسمہ لینا قبول کریں، تو انھیں یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ اپنی جائداد اپنے بچوں کے نام منتقل کر سکیں، نیز وصیت کر سکیں چونکہ قانون کے الفاظ کا احترام مبالغہ آمیز طور سے کیا جاتا تھا اس لیے اس کے بھی مخالف پیدا ہو گئے۔ چنانچہ بالدے سے پہلے کی قانونی تالیفوں میں ایک رائے ظاہر کی گئی تھی جسے بارتولے نے اپنی ذاتی شہرت و استناد کے ذریعے سے مستند قرار دیدیا۔

287

بارتولے تسلیم کرتا ہے کہ قدیم قانون بین الممالک کے مطابق قید ہونے کا قانون اور قیدی کے بھاگ کر اپنے مامن کو پہنچنے پر دوبارہ آزاد ہو جانے کا قاعدہ مسلمہ امور تھے۔ لیکن بارتولے زور و شور سے بیان کرتا ہے کہ نئے نئے اخلاق اور ایک پرانے

[1] بالدے کی لاطینی تالیف "پرانی ڈائجسٹ کے حصۂ اول کی شرح" متعلقۂ قانون (۲)۔

رواج کے باعث عیسائیوں نے اس دہرے حق پر عملدرآمد ترک کردیا ہے جو اشخاص کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ (لاطینی میں) بیان کرتا ہے کہ یہ رواج تھا کہ "پرانے اخلاق کے قانون اقوام کے تحت حق اسیری و حق بازگشت قائم ہو...... لیکن نئے زمانے کے اخلاق اور عیسائیوں میں برتے جانے والے قدیم رواج کے تحت، حق اسیری و بازگشت کو جہاں تک آدمیوں کی ذات کا تعلق ہے، ہم ملحوظ نہیں رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو قیدیوں کو غلام بنا سکتے ہیں اور نہ [ایسا ہوتا] نظر آتا ہے (؟) لیکن جہاں تک اشیاء و اسباب کا تعلق ہے، قانوناً اس کی ملکیت حاصل ہوجاتی ہے اس کے متعلق [پرانا] رواج برقرار ہے"[1] (؟) عربوں کی حد تک وہ ایک استثناء قائم کرتا ہے۔

شہنشاہت کا تصور بھی یہاں اپنا کچھ اثر دکھاتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شہنشاہ کارا کلا نے اپنے ہاں کے دستور کے تحت رومی شہنشاہت کے تمام آزاد باشندوں کو حقوق شہریت عطا کردیے تھے۔ اس تدبیر کو زیادہ تر ایک مالی اہمیت حاصل تھی، اور وہ چند دن ہی نافذ رہ سکی۔ پھر بھی یوستی نیان (جسٹی نین) کی تالیف میں یہ (لاطینی) الفاظ ملتے ہیں کہ "رومی سرزمین میں، شہنشاہ انٹونیوس کے دستور کے تحت، جو لوگ رومی شہری قرار دیے گئے تھے، ان کی وہ حیثیت برقرار رہے گی"۔ ان الفاظ سے ایک ایسا نظریہ پیدا ہوگیا جو قرون متوسطہ کے ماہرین کا بڑا دلپسند تھا۔ رومی آبادی اور اجنبی آبادی میں ایک اختلاف قائم کیا گیا تھا، جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ عیسائیوں کو

---

[1] ۔ ساسوفراتو کے بارتولے کی لاطینی تالیف "نئی ڈائجسٹ کے حصۂ دوم کی شرح"، باب جنگی قیدی اور ان کی بازگشت اور دشمن کے پاس سے رہائی۔

"رومی" آبادی قرار دیا گیا۔ اور بارٹولے مختلف قوموں کی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے "رومی" آبادی کے متعلق یوں خامہ فرسائی کرتا ہے کہ: "بعض ایسی قومیں بھی پائی جاتی ہیں جو شہنشاہ کی اطاعت کرتی ہیں گو ہر ایک امر میں نہیں بلکہ چند باتوں میں۔ مثلاً ٹسکنی اور لومبارڈی کے شہر۔ یہ رومی قوم ہی سے ہیں کیونکہ جب شہنشاہ ایک معاملے میں اپنا اختیار سماعت استعمال کرتا ہے تو وہ اس اختیار سماعت کو سب ہی کے لیے ملحوظ رکھتا ہے۔ کچھ اور قومیں ایسی ہیں جو شہنشاہ کی کسی طور سے بھی اطاعت نہیں کرتیں لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس طرح کا برتاؤ اپنے ایک امتیاز کے باعث کرتی ہیں۔ ونیس والے ایسے ہی ہیں۔ ان کو بھی رومی قوم ہی سے قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کی آزادی ایک عطیہ اور غیر مستقل ہے۔ بعض ایسی قومیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی اطاعت نہیں کرتیں لیکن انھیں جن صوبوں پر قبضہ حاصل ہے ان پر وہ ایک معاہدے کے تحت تسلط رکھتی ہیں۔ کلیسا کو جو صوبے شہنشاہ قسطنطین نے عطا کیے تھے، ان کی یہی حالت ہے، بشرطیکہ یہ فرض کیا جائے کہ وہ عطا درست تھی اور اسے واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ آخر میں کچھ ایسے حکمران اور بادشاہ بھی ہیں جو اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ رومیوں کے بادشاہ کے ماتحت ہوں جیسے فرانس اور انگلستان کے بادشاہ۔ یہ بھی رومی قوم سے ہی ہیں۔ ان کو "رومی" شہری ہونے سے محض اس لیے منقطع نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عالمگیر اقتدار سے کسی امتیاز، کسی حق قدامت، یا کسی اور وجہ سے اپنے کو باہر رکھتے ہوں۔" اس مولف نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ (لاطینی میں): "اس اصول کی بنا پر وہ تمام لوگ جو کلیسائے مادر مقدس کی اطاعت کرتے ہوں وہ سب رومی قوم ہی سے سمجھے جائیں گے۔"

236

لہ۔ بارٹولے کی لاطینی تالیف و باب مذکور۔

یہ صفحہ بھر عبارت بارتولے نے لکھی ہے جو شاید کسی قدیم نثر مولف سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرون متوسطہ کے مولف دوسروں کے خیالات اور عبارات کو بے انتہا چرایا کرتے تھے۔ بارتولے کی یہی عبارت اس زمانے کے بے شمار مولفوں کے ہاں دہرائی جاتی نظر آتی ہے۔ لنّالو کے ژان نے اسے لفظ بلفظ نقل کردیا ہے۔ اونورے بونے اس کو اپنی فرانسیسی کتاب "شجرۂ حروب" میں ترجمہ کرکے پیش کردیتا ہے، اور فرق صرف اتنا کرتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ کے حقوق کی تائید میں ایک تیر مار دیتا ہے کہ وہ شہنشاہ کے بالکل ماتحت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "شارلیمان، فرانس کا بادشاہ تھا جسے روما کا شہنشاہ بنایا گیا اور کوئی نہیں کہتا کہ اس نے یہ اعلان کیا ہو کہ فرانس کی بادشاہت کسی طرح بھی شہنشاہت کے ماتحت ہوگئی۔ اور اسی بناء پر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ فرانس میں شہنشاہی قواعد بنائے جایا کریں[1]"

بہر حال جو بھی ہو، جب یہ استدلال ایک مرتبہ قبول کرلیا گیا تو اس سے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ ان نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ عیسائیوں کا آپس میں ایک دوسرے کو غلام بنا سکنا ایک ایسی چیز ہوگئی جسے حق بجانب قرار دیا جانا یا روا رکھا جانا ناممکن ہوگیا۔ کیونکہ سب کے سب رومی شہری تھے۔ سب ہی آزاد اشخاص تھے۔ اور جنگی قیدی کو اس کے بعد پھر غلام نہیں بنایا جاسکا۔ یہ خیال جلدی ہی ماہرین قانون نے متفقہ طور سے قبول کرلیا۔ ایک اور نتیجہ جو ایک نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہم تھا، یہ نکلا کہ وہ تمام جنگیں جو عیسائیوں میں آپس میں لڑی جائیں، انھیں سب خانہ جنگیاں سمجھا جائے۔ اس سے یک بیک مال غنیمت کا

---

[1] اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حروب" حصہ ۴ باب ۳۔

حق ساقط ہوگیا۔ یہ نہایت ذہین نظریہ تھا جسے آلچیات نے سولھویں صدی کے لیے قابل اعزاز چیز قرار دیا ہے[۱]۔

اپنے نظریے کی توضیح کے سلسلے میں آلچیات نے ماہرین دینیات کا احترام ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اور وہ ان پر الزام لگاتا ہے کہ وہ محض فضول اور بیکار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بلّی نے اس ممتاز رومانی مولف کے نظریے پر اس قدر جوش و خروش سے حملہ کیا اور اسے الحاد و بے دینی قرار دیا۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "ایک جدّت [؟ بدعت] جو الحاد کی طرف لے جاتی ہے"[۲]۔ ۵۹۷

لہٰذا عیسائی آپس میں ایک دوسرے کو غلام نہیں بنا سکتے بلکہ صرف قید میں رکھ سکتے ہیں تا آنکہ کوئی فدیہ ادا نہ ہو جائے۔ بلّی کی یہی رائے ہے اور اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "ہم بکثرت یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے قیدی آزاد رہتے ہیں۔ مگر بہر حال ایک مناسب فدیہ ان لوگوں پر مقرر کیا جاتا ہے جو ادا کر سکتے ہوں۔ اور اسی اثناء میں وہ اس شخص کے قبضے میں بطور کفالت رہتے ہیں جس نے ان کو گرفتار کیا ہو"۔ پھر بھی وہ (لاطینی میں) بیان کرتا ہے: "لیکن کیا بے رحمی ہے کہ اگر وہ اپنے کو رہا کرا لینے سے انکار کریں تو ان کو تکلیفیں پہنچا کر اس پر مجبور کیا جاتا ہے"۔ ایالدی کا آنجیلو اس سے زیادہ انسانیت نواز تھا۔ چنانچہ اس کی رائے میں عیسائی اگر آپس میں ایک دوسرے کو قیدی بنائیں تو نہ تو حقوق قیدی

۱۔ آلچیات کی لاطینی تالیف "معانی و الفاظ"، کتاب چہارم قاعدہ (۸ ۱ ا؛ "دشمن یہ ہیں"

۲۔ بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصۂ دوم عنوان ۱۸۔

پیدا ہوتے ہیں، نہ حقوق بازگشت بلکہ اطاعت شعاری یا جاگیردارانہ ماتحتی کی سی کوئی چیز سمجھی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عیسائیوں سے یہ سلوک ہو تو غیر عیسائیوں کے ساتھ بھی، کیا وہی سلوک ہوگا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان کے مقابل قانون رومانظر انداز ہوگا اور جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جاسکے گا اور وہ تمام قواعد جو غلاموں سے متعلق ہیں، ان کا ان پر اطلاق ہوگا۔ جو عیسائی، غیر عیسائیوں کے ساتھ ہوکر لڑتے ہیں، وہ انھیں میں سے سمجھے جائیں گے۔ البتہ اگر یہ عیسائی قید ہوں تو انھیں صرف کسی عیسائی کے ہاتھ فروخت کیا جاسکے گا۔

بالدے کی یہ رائے ہے کہ اگر عرب اور بربری اور دیگر تمام اجنبی قومیں آپس میں لڑیں تو نہ تو حقوق قیدی پیدا ہوتے ہیں اور نہ حقوق بازگشت۔ بلّی نے بالدے کی رائے کا حوالہ دیا ہے اور اس کی تردید ان لاطینی الفاظ میں کی ہے کہ: "مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ آزاد ہیں، انھیں اس بین الاقوامی اور عالمگیر حق سے، جو مدامی اور ابدی ہے، استفادہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟"

تقریباً تین صدیاں گزر جاتی ہیں۔ سوارینش مرتدوں اور ملحدوں کے سلسلے میں پھر یہی سوال اٹھاتا ہے۔ جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ غلام ہوجاتے ہیں، کم از کم قاعدے کی حد تک، کیونکہ بعض صورتوں میں فاتح، مجرم مفتوحوں کو سزائے موت دے سکتا ہے۔ اور اسی طرح وہ ان کو قید کرسکتا ہے۔ اس ممتاز یسوعی (جے سوئیٹ) پادری نے سوال کیا ہے کہ جو امتیازی حق عیسائیوں کی حد تک قبول کیا گیا ہے، کیا وہ مرتدوں کی حد تک بھی قابل اطلاق ہوگا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ حضرت مسیح سے

انکار کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر انھیں ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہونا چاہیے، جو عیسائیوں سے مخصوص ہیں۔ اس نے دوسرا سوال کیا ہے کہ ان رعایتوں کا اطلاق ملحدوں پر ہوگا؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، کیونکہ یہ کم از کم حضرت مسیح کا اقرار تو کرتے ہیں۔ گوشالف و ثیاس نے اس کے خلاف رائے دی ہے اور اس کی رائے میں جو رعایا مرتد ہوگئی ہو، اگر اس سے جنگ کی جائے تو حقوق اسیری نہیں پیدا ہوتے کیونکہ یہ حقیقت میں کوئی جنگ نہیں ہوتی بلکہ معمولی تعزیری کارروائی اور اختیار سماعت کا استعمال ہوتا ہے۔ سواریتس نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور غرناطہ کی جنگ میں جو برتاؤ کیا گیا تھا اس کا حوالہ دیتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آیالا کی رائے کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ باغیوں سے جو جنگ کی جائے وہ جائز ترین جنگ ہی سمجھی جائے گی۔[1] 240

جہاں تک تعمیل کا تعلق ہے، وہ ان انسانیت پرور نظریوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ عرصۂ دراز تک فاتح، قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں انتہائی مطلق العنانی سے جو چاہے طے کرتے رہے۔ کبھی تو ان کو میدانِ جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، کبھی ان سے فدیہ قبول کیا جاتا، کبھی انھیں بیچ ڈالا جاتا اور کبھی انھیں سخت محنت و مشقت کی بیگاری کی سزا دی جاتی۔

آزن کورٹ میں پانچویں ہنری نے چار ہزار قیدیوں کے گلے کٹوا دیے کیونکہ وہ اس کے لیے دوبھر ہو گئے تھے۔ بارہ سو

---

[1] ۔ سواریتس کی لاطینی تالیف "سہ گانہ الہیاتی نیکی: ایمان، آس اور عفو پر تالیف جو ان تینوں نیکیوں کے متعلق تین رسالوں پر منقسم ہے۔ حصۂ عفو۔ مبحث ۱۳: جنگ، فصل ۷"

تیر اندازوں نے اجتماعی نشانہ اندازی سے بارہ سو قیدیوں کو مار ڈالا اور صرف افسروں کو فدیہ لے کر رہا کیا گیا۔[1] انگریزوں اور پرتگالیوں میں ایک مرتبہ لڑائی ہوئی تو یہ ڈر ہوا کہ کہیں ان کے قیدی خود انھیں کے خلاف نہ کارروائی کرنے لگ جائیں۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ ان قیدیوں کو مار ڈالا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "ایک قابل رحم حکم دیا گیا۔ کیونکہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس کسی کے ہاتھ یہ قیدی ہو تو وہ اسے قتل کردے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو اور اس کا مطلق لحاظ نہ کیا جائے کہ وہ کوئی بہادر سورما ہے یا طاقتور شخص یا معزز جاگیردار یا شریف یا مالدار۔ چنانچہ جاگیردار بیرن بھی قید ہوئے، شہامت باز بھی اور شہامت بازوں کے ڈھال بردار (اسکوائر) بھی۔ ان کی حالت سخت تھی اور کوئی التجا بھی ان کو موت سے بچانے کے لیے کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ لوگ ادھر اُدھر مختلف مقاموں پر بٹے ہوئے تھے اور سب نہتے تھے۔ وہ یقین کرتے تھے کہ ان کی جان بچ جائے گی لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ یہ ایک بڑا قابل رحم نظارہ تھا کیونکہ ہر کوئی اپنے پاس والوں یعنی قیدیوں کو قتل کرتا۔ اور جو قتل کرتا وہ چاہتا تھا کہ کوئی خود اسے قتل نہ کردے اور پرتگالی اور انگریز، جنھوں نے یہ مشورہ دیا، کہنے لگے کہ: خود مارے پڑنے سے مار ڈالنا بہتر ہے۔ اگر ہم انھیں قتل نہ کریں تو وہ اپنے کو چھڑا کر ہمیں قتل کرنے لگیں گے، کیونکہ کسی کو دشمن پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔" اور فرواسار کے یہ الفاظ پورے غور کے مستحق ہیں کہ "بھلا اس بڑی بد اتفاقی کو تو دیکھو کہ وہ اپنے قیدیوں کو سنیچر کے دن شام کو قتل کر ڈالتے حالانکہ ان سے چار لاکھ فرانک وصول ہوسکتے۔"

[1] ۔ مود لا کلاڤیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاڤیلی کے زمانے کی سیاست کاری" ج ۱، ص ۲۰۷

فریقین میں سے ہر ایک نے یہی کیا[1] جب ساتویں شارل نے پوں تواز پر قبضہ کرلیا تو انگریز قیدی بیڑیاں پہنا کر نکالے گئے۔ اور جو فدیہ ادا نہیں کرسکتا تھا، اسے دریائے سین میں پھینک دیا گیا۔ اس طرح کی بے رحمیوں کے واقعات بکثرت ہیں۔ سنہ ۱۴۴۳ء میں سین پی کے کونٹ نے شہر لاں کے محافظ دستے پر حملہ کیا۔ تقریباً سو آدمیوں کو قید کرلیا اور حکم دیا کہ وہ سب کے سب مار ڈالے جائیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کونٹ کا نو عمر بھتیجا جنگ کا عادی بنے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھتیجے کو حکم دیا کہ متعدد قیدیوں کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ مونس ترلے لکھتا ہے کہ "اس چھوکرے نے اس کو بڑی خوشی خوشی انجام دیا"[2]

گیارھویں لوئی کا ایک بڑا ملعون خط ہے جس میں وہ اس پر اتراتا ہے کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ جنگی قیدیوں کو مال غنیمت کے سرکاری حصے میں شمار کیا جائے "تاکہ آئندہ مرتبہ وہ کسی کو قیدی نہ بنائیں بلکہ سب کو قتل ہی کرڈالیں" اور انھیں قیدیوں کے متعلق کوئی راست دلچسپی باقی ہی نہ رہے[3]۔

قیدیوں کو غلام بنا لینا کوئی نادر واقعہ نہیں تھا۔

ایسے بھی واقعات پیش آتے رہے کہ جن قیدیوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوتی انھیں محنت و مشقت کے کاموں پر لگادیا جاتا[4]۔ سنہ ۱۳۷۰ء میں تیسرے ایڈورڈ کو جو درخواست دی گئی تھی اس سے

---

[1] - فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب سوم باب ۲۰۔

[2] - مونس ترلے کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" حالات سنہ ۱۴۴۱ء۔

[3] - مودلا کلاتیئیر کی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سیاست کاری" ج(۱) ص ۲۰۶۔

[4] - ایضاً ص ۲۰۶ —— نیز ریال ڈکوربال کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" ج(۵) ص ۴۲۵۔

اس واقعے کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس درخواست میں بادشاہ سے التجا کی گئی تھی کہ ایک قانون کے ذریعے سے فرانسیسی فوج کے متعدد خدمتگاروں کی حالت کے متعلق وضاحت فرمادے جن کو قید کرکے انگلستان لایا گیا ہے اور جن کے متعلق معلوم نہیں کہ آیا انھیں معمولی کسان سمجھا جائے، یا ان کے ساتھ جنگی قیدیوں کا برتاؤ کیا جائے؟

"سپاہیوں کا ہدایت نامہ" نامی تالیف میں میشل داں بوازیہ مشورہ دیتا ہے کہ جو دشمن قیدی ہاتھ آئیں انھیں زمین جوتنے کے کام پر لگایا جائے۔ کیونکہ وہ بیان کرتا ہے کہ: "اگر ان کو روک رکھا جائے اور کھیتوں کی نگہداشت پر مجبور کیا جائے، تو ان کی مسلسل محنت سے کثیر اور بے شمار مقدار میں غلہ جمع اور حاصل کیا جا سکے گا۔ کافی تعداد میں بادشاہ اس پر عمل کرتے ہیں اور خود ترکوں کا مسلمان حکمران بھی۔" خود سترھویں صدی میں یہ چیز معاہدوں کے ذریعے سے طے کرنی پڑتی تھی کہ جنگ کی صورت میں قیدیوں کو جنگی جہازوں کے کھینے اور چپو چلانے کے کام پر نہیں لگایا جائے گا۔

مزید برآں قرون متوسطہ کی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ فریقین مخاصمت یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ مطلق جان بخشی نہ کریں۔ چنانچہ ڈُرنے ای کی جنگ سے پہلے، جو فرانس اور اس کے حلیفوں یعنی اسکاٹ لینڈ والوں کے لیے اتنی ہولناک ثابت ہوئی، فرانس کے نائب السلطنت ڈیوک آف بڈفرڈ نے ایک فوجی نقیب کونٹ آف ڈگلس کے پاس روانہ کیا جو فرانسیسیوں اور اسکاٹ لینڈ والوں کا سردار تھا کہ یہ معلوم کرے کہ لڑائی کی کیا شرطیں ہیں۔ آخر الذکر نے

سنہ ۱۴۲۴ء

لہ۔ ہارنگٹن کی انگریزی تالیف "قدیم ترین قوانین موضوعہ پر تبصرے" ص (۱۳۹)۔

جواب دیا کہ وہ نہ تو کسی کو پناہ دے گا نہ پناہ چاہے گا۔ اس کے قریب قریب تمام لوگ مارے گئے[1]۔

زمانۂ حال کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص جنگ میں گرفتار ہو وہ سرکاری قیدی سمجھا جائے گا۔ قرونِ متوسطہ میں مختلف خیالات پائے جاتے تھے۔ ابتدائی خیال یہ تھا کہ جو شخص کسی کو قید کرے تو وہ قیدی اسی کا سمجھا جائے گا اور اسے اس قیدی کے متعلق ہر قسم کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ جو معزز اور ممتاز اشخاص قید ہوں تو وہ بادشاہ کی جائداد سمجھے جائیں گے۔ صرف یہ ہوگا کہ بادشاہ، اصل گرفتار کنندہ کو معاوضہ دلائے گا۔ لیکن جو قیدی غیر اہم ہوں تو وہ اسی شخص کی جائداد سمجھے جائیں جس نے ان کو گرفتار کیا ہو۔ اور سب سے آخر میں یہ تصور پیدا ہوا کہ تمام قیدیوں کے متعلق بادشاہ ہی کو حقوق حاصل ہوں گے اور بادشاہ ہی کے توسط سے اصل گرفتار کنندہ کوئی حق حاصل کرسکے گا۔ یکے بعد دیگرے جو نظریے پیدا ہوتے گئے، ان میں کبھی تو ترقی نظر آتی ہے اور کبھی حالت میں کچھ ابتری ہی پیدا ہوجاتی ہے۔

مولف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قانونِ بین الممالک کے مطابق ہر شخص کو قید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہی مولف ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نصفت [اور استحسان و رعایت] نے اس میں کچھ نرمیاں ضرور پیدا کی ہیں۔

بارہ برس سے کم عمر بچے مستثنیٰ ہیں۔ قانونِ موضوعہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ فوجی ضوابط نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ یہ بھی پیش آتا رہا ہے کہ حربیوں کے آپس کے معاہدوں کے ذریعے سے

---

[1]۔ فرانسسک میشل کی فرانسیسی تالیف "اسکاٹ لینڈ والے فرانس میں" دیکھئے ۱۴۲۳ء کے حالات۔

اس بارے میں کوئی انتظام عمل میں آتا تھا۔ بڈھے، عورتیں، اور (جہاں تک کیتھولکوں کا تعلق ہے) راہب اور پادری بھی محفوظ قرار دیے گئے تھے۔ مولفوں کی اکثریت نے طالب علم کو بھی جنگی اثرات سے بَری قرار دیا ہے۔ مولف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مصلحت عامہ کے تحت تاجروں، کسانوں اور ترنجیبوں کو بھی محفوظ قرار دیا گیا ہے۔

فدیے کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ قیدی بطور حق اس سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ مختلف بادشاہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وہ اپنے قیدیوں سے کوئی فدیہ قبول کریں۔ چنانچہ اورلیاں کے شارل کو جب آزِن کورٹ میں گرفتار کیا گیا تو وہ پچیس سال تک قید رہا۔ اسے لندن لایا گیا۔ وہ اپنی رہائی کے لیے اچھی وکالت کرتا رہا لیکن انگلستان کی حکومتیں ذرا بھی متاثر نہیں ہوئیں۔ اسے قید خانے کے ملازموں کو خود ہی تنخواہ دینی پڑی اور انگلستان کے بادشاہ نے اس کے محافظوں کا اس طور سے انتظام کیا کہ گویا وہ کوئی کفالت ہو یا کوئی حقیقت اور آمدنی۔ آخر کار ۱۴۴۰ء[۱] میں اورلیاں کے لوئی اور میلان کی ثالن تین کے بیٹے نے رہائی حاصل کی، جس کے لیے اسے اسّی ہزار ایکو (سکے) یکمشت اور فوراً ادا کرنے پڑے اور اس کی ضمانت دینی پڑی کہ ایک لاکھ بیس ہزار ایکو کی دوسری قسط چھے مہینوں کے بعد ادا کردی جائے گی۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ ایک سال اور چالیس دن تک وہ انگریزوں کے خلاف ہتیار نہیں اٹھائے گا۔ یہ کہ وہ صلح کرانے کی کوشش کرے گا اور اگر اس میں وہ ناکام ہو تو دوبارہ اپنے آپ کو بطور قیدی کے حوالے کردے گا، جس صورت میں اس کی ادا کی ہوئی رقمیں اسے واپس کردی جائیں گی۔

جب چوتھے ہنری نے اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف ایک

---

[۱] مورلاکلاڈیئر کی فرانسیسی تالیف "بارھویں لوئی کی تاریخ" ج (۱) ص (۳۴) و مابعد

مہم شروع کی تو اس نے ۱۴۰۲ء میں ایک حکمنامہ جاری کر کے انگریزوں کو اس بات کی ممانعت کی کہ تا حکم ثانی اپنے قیدیوں کو رہا کرسکیں۔ اس حکمنامے میں احتیاطاً یہ بھی بیان کردیا گیا ہے کہ اس سے قید کنندوں کے حقوق ذرا بھی جوکھم میں پڑتے نہ سمجھے جائیں۔[1]

قسطیلہ کے "سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون کے رکن دوم عنوان (۲۶) میں مال غنیمت کی تقسیم کے (۳۴) قاعدے بیان کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کے لیے ⅕ حصہ مقرر کیا گیا ہے جو خمس شاہی کہلاتا تھا۔ اور اس خمس کے علاوہ مال غنیمت میں سے بادشاہوں کو حسب ذیل چیزیں بھی حاصل ہوتیں:—

۱۔ دشمن سردار، اس کی بیوی یا بیویاں، اس کے بچے، اس کے نوکر اور اس کا مال منقولہ۔

۲۔ دشمن کے شہر قلعے اور محل۔

۳۔ دشمن سے چھینے ہوئے جہاز۔

اگر کسی جنگی قیدی کو بیچنے پر ایک ہزار "مراقے دی" (مرابطی سکے) یا اس سے زیادہ قیمت آئے تو بادشاہ صرف سو "مراقے دی" ادا کرکے اس قیدی کو حاصل کرلے سکتا۔

ان احکام میں سے چند، عربوں کے قانون جنگ سے ماخوذ ہیں۔

عربوں کے قانون جنگ کے مطابق مال غنیمت کے تین حصے ہوتے ہیں: جائداد منقولہ، جائداد غیر منقولہ اور قیدی یعنی مرد، عورتیں اور بچے۔

سَلَب یعنی دشمن کا لباس، کمربند، ہتیار اور جنگی گھوڑا گرفتار کنندہ کا حق سمجھا جاتا۔ مال غنیمت کو امام (بادشاہ) یا اس کا

[1] ۔ ریمر کی لاطینی تالیف "حلیفیاں" ج(۴) حصۂ اول ص ۳۵۔

نائب تقسیم کرتا۔ اولاً مال غنیمت کے حمل و نقل کے مصارف اور ممتاز خدمات انجام دینے والوں کے غیر معمولی انعامات، مال غنیمت میں سے وضع کر لیے جاتے ہیں۔ پھر باقی کے پانچ حصے کرتے ہیں، جن میں سے ایک حکمران کو ملتا ہے یعنی حکومت کے مرکزی خزانے میں ضروریات عامہ کے لیے داخل کر دیا جاتا ہے، اور اسی کو حکمران کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک فرقے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس خمس شاہی کے بھی مزید پانچ حصے کیے جائیں جن پر غریب اہل بیت نبوی، مسکینوں، یتیموں، محتاجوں، اور وطن سے دور مسافروں کو حقوق حاصل ہوتے ہیں[1]۔

244 جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، ۱۵۴۴ء میں آٹھویں ہنری نے جو فوجی حکمنامہ نافذ کیا تھا اس میں قیدیوں کے متعلق بھی احکام ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی قیدی اس کے سپاہیوں کے ہاتھ آئیں تو ان قیدیوں میں سے فرانس کا بادشاہ، شہزادہ، ڈیوک، ڈیوک کا بڑا بیٹا، نفٹننٹ جنرل، کانسٹبل (یعنی سرخیل قصر شاہی) یا پھر بادشاہ انگلستان کے اپنے قیدی سمجھے جائیں گے۔ البتہ اصل قید کنندہ کو ایک معاوضہ دلایا جائے گا۔ اگر کوئی شخص ان کو رہا کر دیتا تو اس کے لیے سزائے موت مقرر کی گئی تھی۔ دوسرے قیدیوں کی حد تک جو فدیہ ملتا، وہ قید کنندہ کا حق سمجھا جاتا۔ البتہ جس طرح جنگ کے دیگر مال غنیمت پر بادشاہ کا حصہ ادا کرنا پڑتا، اسی طرح اس فدیے میں سے بھی دینا پڑتا۔

اس سے پہلے عرصے تک سالاران فوج اور بادشاہ میں جو

---

[1] قرآن مجید سورہ (۸) آیت (۴۱) یہ ہے: "جان لو کہ جو کچھ تمھیں مال غنیمت حاصل ہو تو اللہ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے نیز رسول کے لیے اور قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہروؤں کے لیے ہے" (مترجم)

عہد و پیمان ہوتے تھے، ان میں عام طور پر یہ طے ہوتا تھا کہ سپہ سالار خود، اور اپنے آدمیوں کی مدد سے جتنے قیدی گرفتار کرے، وہ سب سپہ سالار ہی کے سمجھے جائیں گے" بجز بادشاہوں، شاہی نسل کے بڑے سرداروں، جنرلوں سرخیلوں اور سپہ سالاروں کے، جن کے متعلق آقائے نامدار بادشاہ سلامت ان لوگوں سے ایک مناسب و معقول راضی نامہ طے کریں گے جنھوں نے فی الواقع ان لوگوں کو گرفتار کیا ہو[1]"

اگر پاسکئے کی بات پر اعتبار کیا جائے تو فرانس میں یہ رواج تھا کہ "ہر دفعہ اور ہر مرتبہ جب کوئی جنگی فدیہ دس ہزار لیرا [یعنی فرانک فرانسیسی سکے[2]] سے زیادہ ہوتا، تو قیدی بادشاہ کا سمجھا جاتا۔ اور بادشاہ قیدی کے اصل مالک کو دس ہزار لیرا [فرانک] ادا کرکے قیدی کو حاصل کرلیتا[3]"

وارڈ نے پاسکئے کی یہ عبارت نقل کرکے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ

---

[1] ۔ شیکس پیر کا انگریزی ناٹک "بادشاہ ہنری چہارم" پہلا ایکٹ، پہلا منظر:۔

کاز، تم کیا خیال کرتے ہو
اس نوجوان پرسی کے غرور کے متعلق؟ وہ قیدی
جو اس نے اس مہم میں پکڑے ہیں
وہ انھیں اپنی ہی منفعت کے لیے رکھتا ہے۔ مجھے بول بھیجتا ہے،
مجھے صرف مورڈیک: ارل آف فائف ملے گا۔"

ہنری پرسی نے جنگی رواجات پر عمل کیا تھا۔ مورڈیک شاہی نسل سے ہونے کے باعث بادشاہ کے حصے میں آیا تھا اور باقی قیدیوں کے متعلق گرفتار کنندہ نے اپنی صوابدید پر عمل کیا تھا

[2] ۔ قدیم زمانے میں فرانسیسی سکہ بھی لیفر (لیرا) یعنی پونڈ کہلاتا ہے پھر فرانک رائج ہوا (مترجم)

[3] ۔ پاسکئے کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی تحقیقات" ۲ ۔ باب ۱۲

کافی عجیب بات ہے کہ دس ہزار لیرا کی یہ رقم وہی ہے جو تیسرے ایڈورڈ نے ویےنیس ڈئور بک کو ژان، بادشاہ فرانس کے متعلق ادا کی تھی۔ اور اس کا فدیہ تیس لاکھ ایکو (سکے) دینا پڑا تھا۔ فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت کے متعلق کتاب"[1] میں اس کی مولفہ اس کی تصدیق کرتی اور بیان کرتی ہے کہ "سابق ہیں پورا مال غنیمت بادشاہ کا ہوتا تھا۔ اب صرف وہی چیز جس کی قیمت دس ہزار فرانک سے زیادہ ہو، بادشاہ کی ہوتی ہے۔"

245 اونورے بونے نرمی کی تعلیم دیتا اور کہتا ہے کہ "قیدی کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اس کے آقا کو چاہیے کہ اس کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کرے اور اس کا لحاظ رکھے کہ اس کے ساتھ بد اخلاقی کا سلوک محض اس لیے نہ ہونے پائے کہ وہ اسی کے اقتدار میں پھنسا ہوا ہے۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اسے مناسب غذا دیا کرے اور ہمارے خداوند [حضرت مسیح] کی راہ میں اس کے ساتھ اچھی رفاقت اور عفو اور نیکی کا سلوک کرے۔ اور اگر وہ اسے مفت رہا کرنا نہ چاہے، تو وہ اس سے مناسب مقدار میں اور اخلاقاً سے اتنی رقم کا مطالبہ کرے جو قیدی کے لیے، فوجی رواج یا اس کے اپنے ملک کے رواج کے مطابق، ادا کرنا ممکن ہو۔ نہ یہ کہ وہ اپنی بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو توقع وراثت سے محروم کردینے پر مجبور ہو۔ کیونکہ قانون کی خواہش ہے کہ اس کے پاس فدیہ ادا کردینے کے بعد بھی اتنی جائداد بچ رہے جس سے مذکورہ رشتہ داروں کی پرورش ہوسکے۔"[2]

---

[1] کرستین دپیزاں کی فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت کے متعلق کتاب" حصہ سوم باب ۱۵۔

[2] اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حروب" حصہ چہارم باب ۸۴۔

شہامت بازی کے دور میں فدیے کا اندازہ اکثر قیدی کی سالانہ آمدنی کے مطابق کیا جاتا تھا، اور اس سالانہ آمدنی کے لیے اسے سالیانے پر جو حق ہوتا یا اچھی زمینوں کے معاوضے کو دیکھا جاتا۔[1] لیکن کوئی مستقل قاعدہ نہیں پایا جاتا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بوربوں کے ڈیوک مارشل لوسی کو اور دیگر قیدیوں کے لیے کچھ اتنے بڑے بڑے فدیے مانگے گئے کہ وہ ادا نہ کرسکے اور قید خانے ہی میں مرگئے۔ ۱۴۱۳ء میں ژوژیر ڈیل نور کو جو پوپ گیارھویں گرے گری کا بھائی تھا علاقہ بوخ کے سردار یوحان نون گرے لی نے قید کرلیا تھا۔ پوپ نے انگلستان کے بادشاہ کو مخاطب کیا اور اس سے خواہش کی کہ وہ بیچ بچاؤ کرے اور قیدی سے اس کے ذرائع کے مطابق ایک معقول و مناسب فدیہ لے کر اس کی رہائی کے لیے کوشش کرے۔

سولھویں صدی میں بھی بلیز ڈموں لوک یہ سوچتا ہے کہ وہ نو عمر رومی سردار مارک انطوان کو گرفتار کرے جسے اسّی ہزار ایکو (سکوں) کا لگان وصول ہوا کرتا ہے، تاکہ اس سے اتنی ہی رقم وصول کرسکے۔ موں لوک کی تجویز تھی کہ اس متوقعہ فدیے سے آدھی رقم موسیو ڈلا ہوت کو اور اپنے دیگر کپتانوں اور سپاہیوں کو دے دے اور باقی خود رکھ لے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: میری دانست میں میں آسانی کے ساتھ اس سردار کو قیدی بنا لے سکتا ہوں۔ اور اگر میں اسے پھانس سکوں تو میں خوب مالدار ہوجاؤں گا کیونکہ میں اس سے کم سے کم اسّی ہزار ایکو بطور فدیہ حاصل کرسکوں گا۔ یہ رقم اس کی ایک سال کی آمدنی ہے، اور فدیے کے لیے بہت زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔[2]"

بعض دوسری مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوجی افسر اپنے

---

[1] لاکورن ڈ سینت پلے کی فرانسیسی تالیف "شہامت بازی کے متعلق یادداشتیں" جلد (۱)، ص ۲۶۳۔

[2] موں لوک کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" حالات ۱۵۵۳ء

فدیے کے لیے اپنی آدھی تنخواہ ادا کرتے ہیں۔

۱۸۱۵ء میں ٹامس اِسٹیورڈ نے ایک انگریزی کتاب شائع کی جس کا نام "فوجی ضبط ونظم کا طریقہ" تھا۔ اس میں یہ نظر آتا ہے کہ انگلستان میں ان تمام لوگوں کا فدیہ جو کپتان سے کم درجے کے ہوں، ان کی ایک ماہ کی تنخواہ ہوتی ہے۔ براعظم یورپ پر بھی یہی رواج پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں ساکسنی کے موریس نے جب ماگ دے بورگ کا محاصرہ کیا تو اس نے محصوروں سے یہ طے کیا کہ ان میں سے کوئی قید ہو تو اس کی رہائی کے لیے اس کی ایک ماہ کی تنخواہ کافی ہوگی۔

سولھویں صدی کے آخر میں نظام تبادلہ رائج ہوگیا جس کے تحت قیدیوں کا کسی معینہ مدت میں تبادلہ کرنے کے لیے شرطیں طے ہونے لگیں، نیز وہ رقمیں معین ہونے لگیں جو تبادلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں بطور فدیہ طلب کی جائیں۔ اسٹیورڈ کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ جو سپاہی اپنا فدیہ ادا نہیں کرسکتے اور اقرار اور بچن لے کر رہا کردے جائیں تو ان کو دشمن کے پاس واپس روانہ کردینے میں غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ عزت اور آن کا یہی تقاضا ہے۔

سترھویں صدی کے وسط سے رواج یہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر فدیہ مانگے بغیر تمام قیدیوں کو رہا کردیا جائے۔

ہم بیان کرچکے ہیں کہ اگر فاتح چاہتا تو اپنے قیدی کو رہا کرنے سے انکار کرسکتا۔ اس سلسلے میں اِنت سِیو کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ یہ شہنشاہ دوسرے فریڈرک کا صلبی بیٹا تھا جسے وہ خاص طور پر چاہتا تھا اور جس کو اس نے ۱۲۳۹ء میں اٹلی میں اپنا عمومی سفیر مقرر کیا تھا۔ یہ بولونیا والوں کے ہاتھوں میں پھنس گیا۔ انھوں نے اسے رہا کرنے سے انکار کیا۔ اگرچہ وہ اس کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ کرتے رہے

لیکن (۲۳) سال یعنی اس کے مرنے تک اس کو قید رکھا۔ اس وقت اس علاقے میں اس کی تجہیز و تکفین اور مراسم موت کے لیے بڑے شاندار انتظامات کروائے اور اس کی ایک نفیس یادگار تعمیر کروائی اور لیاں کے ڈیوک کو جتنے طویل عرصے تک قید رکھا گیا تھا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ فرواسار بیان کرتا ہے کہ علاقہ بُوخ کا سردار پارلیس لایا گیا اور " تاں پل کے برج میں قید کر دیا گیا اور وہاں اس کی خوب حفاظت کی جانے لگی"۔ مختلف موقعوں پر انگلستان کے بادشاہ نے دیگر قیدیوں کا تو تبادلہ کرنا منظور کیا لیکن " فرانس کے بادشاہ نے ایسا کرنا بالکل نہیں چاہا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ علاقہ بُوخ کا سردار، جو ایک عمدہ فوجی افسر اور ایک اچھا ماہر جنگ شخص ہے [جس کا رہا کرنا] سخت خطرے کا باعث ہوگا۔"[1] پانچ سال کی شدید نگرانی کے بعد یہ قیدی آخر مرگیا۔

ان افسوسناک واقعات سے قطع نظر بعض ایسے امور بھی ہیں جو شہامت کے مطابق کہے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ قرون متوسطہ کی تاریخوں کے ایک سے زیادہ اوراق میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بڑے عمدہ اور مکمل اخلاق کا برتاؤ کیا گیا اور واقعی انسانیت کے جذبات ظاہر کیے گئے تھے۔ فرواسار نے سَیں پول کے نوجوان کونٹ کا قصہ بیان کیا ہے جسے قید کرکے تیسرے ایڈورڈ کے " حوالے کردیا گیا تھا" اور اسے " یہ اجازت دی گئی کہ اپنا بچن دے کر ونڈسر کے قلعے کے اندر جہاں چاہے آیا جایا کرے،" جہاں اس زمانے میں بادشاہ رچرڈ کی ماں اور اس کی بیٹی مادام ماہو، جو انگلستان کی سب سے خوبصورت عورت سمجھی جاتی تھی، ٹھیری ہوئی تھیں۔ مورخ نے بیان کیا ہے کہ سَیں پول کے کونٹ اور مادام ماہو باہم ایک دوسرے کے ساتھ سچی محبت اور

247

[1] فرواسار کی فرانسیسی تالیف " تاریخ " کتاب اول حصۂ دوم باب ۳۸۸

اور عشق کرنے لگ گئے چنانچہ جہاں تک نظر آتا وہ ناچ کھیل اور تفریح میں ساتھ ہی رہتے۔ اور اس لڑکی نے جو سیں پول کے کونٹ سے پرجوش محبت کرنے لگی تھی، اس کا ذکر اپنی ماں سے بھی کردیا۔ چنانچہ سیں پول کے کونٹ اور مادام ماہو کی شادی رچادی گئی اور کونٹ کو ایک لاکھ بیس ہزار فرانک کا فدیہ مقرر کیا گیا اور مادام ماہو سے شادی کرلینے پر اسے ساٹھ ہزار معاف کردیے گئے۔[1]

قرون متوسط میں ایک خصوصی طریقہ رائج ہوگیا۔ وہ یہ تھا کہ اگر اثنائے جنگ میں کسی کو یہ ڈر پیدا ہو کہ کسی قیدی کو اس کے ساتھی چھڑالیں گے، تو وہ قیدی سے اس قسم کا اقرار لینے لگا کہ چاہے وہ چھڑا لیا جائے یا نہ چھڑا لیا جائے، وہ بہرحال اس گرفتار کنندہ کا قیدی ہی رہے گا۔[2]

ایک اور رواج یہ تھا کہ اپنا زبانی بچن دے کر یا کسی کو اپنا ضامن بنا کر یا کوئی معاہداتی اقرار کرکے رہائی حاصل کرے۔ وہ شخص جو اس طرح اپنی رہائی حاصل کرلے، کیا اسے واقعی آزاد سمجھا جائے گا؟ مختلف مولفوں نے اس سوال سے بحث کی ہے۔ بالدے تسلیم کرتا ہے کہ قیدی اپنے کو آزاد سمجھ لے گا اگر وعدے یا اقرار کی تعمیل سے ایک سخت خطرہ لاحق ہوتا ہو۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں: "اور مزید برآں جان کی خاطر دھوکا دینا جائز ہے"۔ پاریس دل پوت سو کی رائے یہ ہے کہ حکمران کسی کو اس وعدے سے بری نہیں کرسکتا کہ وہ دوبارہ قیدی بن جائے گا۔ چنانچہ اس مولف کے لاطینی الفاظ میں "خود قانون اقوام و قانون جنگ کے تحت حقوق جنگ کا تحفظ کیا جاتا ہے

[1] فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب دوم باب ۴۶

[2] وارڈ کی انگریزی تالیف "یورپ میں قانون بین الممالک کی بنیاد اور تاریخ کے متعلق تحقیقات" کتاب اول حصہ دوم باب ۲۸۸۔

اور جو حکمران جنگ میں حصہ لیتا ہے وہ اپنوں کو بھی اس کا اتنا ہی پابند کرتا ہے۔" بلّی، اس کے بالکل برخلاف خیالات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی رائے میں وہ وعدے جو مملکت کے مفاد کے خلاف ہوں، واجب التعمیل نہیں۔ وہ اس کی ایک مثال دیتا ہے کہ جب فرانسیسیوں نے کارین یان پر قبضہ کیا تو انھوں نے کولونا سے اور جرمن اور ہسپانی سپاہیوں سے، جنھوں نے اطاعت قبول کی تھی، یہ وعدہ کرنے کا مطالبہ کیا کہ وہ اب اس جنگ کے دوران میں آیندہ شہنشاہ کی طرف سے خدمت نہیں بجالائیں گے۔ اس کا ذکر کرکے بلّی کہتا ہے کہ: "یہ حلف کالعدم ہے کیونکہ حکمران سے وفاداری کا حلف، دیگر تمام قسم کے اقراروں سے کہیں زیادہ اولیت رکھتا ہے۔"[1] آلبیری کُس جنتی لیس بھی بالکل اسی کے مماثل نظریہ پیش کرتا ہے۔ اور اس کے لاطینی الفاظ ہیں: "لیکن میرے نزدیک یہ یقینی ہے کہ جس صورت میں اقرار، قانون عمومی یا قانون رواجی کے خلاف ہو، تو اقرار کی تعمیل ضروری نہ ہوگی۔"[2] کچھ عرصہ بعد عام طور سے یہ خیال کیا جانے لگا کہ جو بچن دیا جائے اس سے قانونی حلف کا اثر حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو شخص ایسے اقرار کی تعمیل نہ کرے اسے بدعہد تو کہا جائے گا لیکن حلف شکن نہیں۔

شہامتی دور کی صدیوں میں جو بچن اس طور سے دیا جاتا تھا، اس کا عام طور سے لحاظ کیا جاتا تھا۔ فرواسار نے بیان کیا ہے کہ گلدرے کے ڈیوک کو جب گرفتار کیا گیا اور بعد میں ٹیوٹانی شہامت بازوں نے اسے چھوڑ دیا تو اس کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ وہاں سے چلے جانے کے باوجود اس اسکوائر کے قبضے ہی میں اپنے کو تصور کرتا تھا جس نے اسے گرفتار کیا تھا اور جس کا وہ "ایک اقرار اور ذمہ داری اور

---

[1] بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" حصۂ چہارم عنوان ۸
[2] جنتی لیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ" کتاب سوم باب ۱۱

حلف کے ذریعے سے قیدی ہی تھا۔"[1]

اسی مولف نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عہد شکنی کی گئی تھی۔ یہ واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ مشہور لڑائیاں، جنھوں نے عرصۂ دراز تک فرانس اور جنوبی یورپ کو ویران رکھا ان میں مختلف شہامت بازوں کو اس اقرار پر رہا کردیا گیا کہ وہ فدیہ ادا کریں گے۔ پوپ پانچویں آربان نے فدیہ ادا کرنے کی مخالفت کی اور اس کے اقرار سے بری الذمہ کردیا کیونکہ پوپ" اس قسم کے لوگوں سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ اس سے زیادہ نفرت ممکن نہیں۔ اور ان لوگوں کو اس نے عرصۂ دراز سے ان کی بدمعاشانہ کارروائیوں کی وجہ سے جات باہر کر رکھا تھا۔"[2]

اس کا بکثرت رواج تھا کہ کسی اقرار کی ضمانت کے لیے یرغمال دیے جایا کریں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو یرغمال دیے جائیں آیا ان کی جان بطور ضمانت پیش کی جاتی ہے یا صرف ان کی آزادی؟ دوسرے الفاظ میں اگر اقرار کی تعمیل نہ ہو تو کیا یرغمال کو قتل کردیا جا سکے گا؟ جہاں تک واقعے کا تعلق ہے، کسی اقرار کی خلاف ورزی پر یرغمال کو اکثر اپنی جان فدا کرنی پڑتی تھی۔[3] لیکن جہاں تک نظریے کا تعلق ہے،

---

[1]۔ فرواسار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ" کتاب سوم باب (۱۳۳)

[2]۔ ایضاً کتاب اول حصۂ اول باب (۲۱۰)

[3]۔ جہاں تک اسلامی قانون کا تعلق ہے خلیفہ معاویہؓ اور خلیفہ منصور کے زمانے میں مسلمانوں کے یرغمالوں کو قتل کر دینے کے باوجود فقہاء نے باتفاق آراء طے کیا تھا کہ قصور رومی حکومت کا ہے، شخصی طور سے رومی یرغمالوں کا نہیں۔ اس لیے انتقاماً یرغمالوں کو قتل کرسکنے کا معاہدہ ہونے کے باوجود اسلامی قانون کے تحت ان رومی یرغمالوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ان یرغمالوں کی واپسی چونکہ مسلمان یرغمالوں کی واپسی پر منحصر تھی، جو اب ناممکن ہوگئی تھی، اس لیے ان رومی یرغمالوں کو جبراً اسلامی ذمّی رعایا بنادیا جائے۔ (مترجم)

عام طور سے رائے یہ تھی کہ یرغمال کی صرف آزادی بطور ضمانت پیش کی جاتی ہے۔

اگر یرغمال مرجائے تو کیا اس کا بدل پیش کیا جانا چاہیے؟ (لاطینی میں) "یرغمالوں کے متعلق قانون میں یہ ٹھیک حکم ہے کہ اگر کوئی یرغمال مرجائے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا بدلی میں دیا جانا چاہیے"

کیا یرغمال غلام بن جاتا ہے؟ بعض شرح نویسوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ ژبالدی کے آنجیلو نے یہ امتیاز پیدا کیا ہے کہ "اگر یرغمال ایسے لوگوں کا پیش کیا ہوا ہو جو حقیقی دشمن ہوں، جیسے ترک، تو یرغمال غلام بن جائے گا۔ لیکن اگر یرغمال ایسے لوگوں کا پیش کیا ہوا ہو جنھیں نا مناسب طور سے دشمن سمجھا جاتا ہے، جیسے کہ عیسائی باہم، تو ایسی صورت میں یرغمال غلام نہیں بن جاتا"[1]

عیسائیوں کی آپس کی صورت میں یرغمالوں کو قیدیوں کے مماثل سمجھا جاتا ہے۔

مولفوں کی اکثریت نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ اگر کسی مملکت کے صدر کو قیدی بنالیا جائے، تو کیا اسے موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں کونارڈین کی نظیر عام طور پر پیش کی جاتی ہے۔ ہوہن اشتاؤفن کی ہیرودئی نسل کا آخری نمایندہ اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ آں ژو کے شارل کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اس شارل کو پوپ نے لاپوی (اپولی) اور صقلیہ کا حکمران نامزد کیا تھا۔ ایک مورخ بیان کرتا ہے کہ شارل ان قیدیوں کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کی موت سے جو ذمہ داری پیدا ہوتی وہ اپنے سر نہ لینے کے لیے اس نے چاہا کہ چند رسمی کارروائیاں ملحوظ رکھے۔ چنانچہ اس نے نیپلز میں علاقۂ لابور اور علاقۂ اپولی کے

249

[1] بلّی کی لاطینی تالیف "فوجی چیزوں اور جنگ کے متعلق رسالہ" گیارھواں حصہ۔

ہر شہر سے دو دو نمایندے بلائے۔ ان سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ ان تبدیلیوں کے متعلق قانون جنگ نے کیا اجازت دے رکھی ہے؟ جلسے میں اختلاف رائے ہوا۔ لیکن بہت بڑی اکثریت نے بادشاہ کی رضا جوئی کے لیے طے کیا کہ کونار دین اور اس کے شریک کار بغاوت کے مجرم، کلیسا کے دشمن اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والے سمجھے جائیں۔[1] حقیقت یہ ہے کہ رسمی کارروائیاں ذرا بھی نہیں ملحوظ رکھی گئیں۔ پوپ اور پوپ پرستوں کی نظروں میں کونار دین اور اس کے ساتھی دشمن عامہ تھے، اور انھیں قانون سے باہر قرار دے دیا گیا تھا۔ ۱۲۴۸ء میں کیا پوپ نے یہ اعلان نہیں کر دیا تھا کہ وہ دوسرے فریڈرک اور اس کی سانپوں کی نسل (لاطینی میں: اس کی نسل کے سانپوں) سے کبھی بھی صلح نہیں کرے گا؟ چنانچہ جس جگہ کونار دین کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو اس جگہ اسے جو سزائے موت سنائی گئی اس میں پوپ کی عدالت کے افسر تصدیق و تعمیل یعنی باری کے روبیر نے یہ بیان کیا تھا کہ اسے (لاطینی میں): "گویا حملہ آوری اور دوسروں کے حقوق پر لوٹ مار" کے الزام میں سزا دی گئی ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے اگرچہ واضح نہیں ہے، کہ بادشاہ شارل نے پوپ چوتھے کلیمان سے مشورہ طلب کیا تھا اور پوپ چونکہ کونار دین کا جانی دشمن تھا، اس لیے اس نے ان ہولناک اور مختصر (لاطینی) الفاظ میں جواب دیا تھا کہ "کونار دین کی زندگی شارل کی موت ہے۔ کونار دین کی موت شارل کی زندگی ہے"۔[2]

سزائے موت کی تعمیل تو ہو گئی لیکن ایک احتجاج بھی سنائی دیا۔ چنانچہ گوئیدو دے سوزانت سارا ایک ممتاز ماہر قانون تھا، جس سے آن ژو کے

250

---

[1] پیرین پی کی فرانسیسی تالیف "صقلیہ کی عام تاریخ" جلد (۲) ص ۱۷۳۔

[2] جنّونے کی فرانسیسی تالیف "نیپلز کی بادشاہت کی کشوری تاریخ" جلد (۲) ص ۲۰۰۔

شارل نے مشورہ کیا تھا۔ وہ اس رائے کی تائید کرتا ہے کہ کونار دیں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا جاسکتا تھا کیونکہ اس کے لیے ایسے بنیادی وجوہ تحریک کی کمی نہ تھی جن کے ذریعے سے وہ صقلیہ اور لاپوی (اپولی) کی بادشاہت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یہ وہی علاقے تھے جن کو اس کے آبا و اجداد نے عربوں اور یونانیوں سے چھین لینے میں کامیابی حاصل کی تھی، اور اس نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا جس کے باعث اسے ان سے محروم کردیا جائے۔ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ کونار دیں کی فوج نے کلیساؤں اور خانقاہوں کو آگ لگادی تھی۔ لیکن اسے کوئی ثابت نہیں کرسکا کہ یہ تباہ کاری کونار دیں کے حکم سے ہوئی ہو۔ مزید براں کیا خود شارل کی فوج نے اس سے بھی بدتر جرائم کا اور اس قدر کثیر مقدار میں ارتکاب نہیں کیا ہے؟

اونورے بونے اس سوال پر عمومی طور سے بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: "اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر کسی اتفاق سے کسی فوج کے قائد کو اس کے دشمن نے لڑائی میں گرفتار کرلیا ہو تو پوری معقولیت اور پورے انصاف کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جس نے اسے گرفتار کیا ہے وہی اسے معاف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اولاً میں یہ ثابت کروں گا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فطری معقولیت ہمیں بتاتی ہے کہ کسی طرح اگر ایک چیز کی کوئی دوسری مخالف چیز پائی جائے تو وہ اپنی مخالف چیز کو اپنے بس میں آنے پر قتل کرڈالے گی۔ مثلاً پانی ہے، جو کبھی آگ کو معاف نہیں کرے گا، نہ گرمی سردی کو، نہ بھیڑیا کتے کو، نہ بلی چوہے کو، نہ لومڑی مرغیوں کو، اور نہ شکرا سلوئی (بٹیر) کو۔ اور چونکہ فطرت کا یہی تقاضا ہے، اس لیے انسان جو زیادہ معقولیت رکھتا ہے کیوں ایسے شخص سے انتقام نہ لے جو اس کا مخالف اور جانی دشمن ہو؟ قانون ملک کے تحت تو اسے اس کا بدرجۂ اولیٰ حق ہے۔ جو کوئی لڑائی میں گرفتار ہو

وہ اپنے گرفتار کنندہ کا بیگار یا غلام بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنی مرضی پر کیوں ایسا نہ کرے؟ لیکن حکم اس استدلال کے خلاف دیا جاتا ہے۔ کیونکہ کہا یہ جاتا ہے کہ جب کوئی شخص قید میں ہو تو اس پر رحم کیا جانا چاہیے اور جب قانون کا یہ تقاضا ہے تو پھر کس طرح کوئی شخص اپنے قیدی کو قتل کرسکے گا جب کہ اسے اس کی اجازت نہ ہو کہ اس قیدی کو نقصان پہنچا سکے؟ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایک اور حکم میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو گرفتار کرے اور شکست دیدے تو اس کا فریضہ ہے کہ اس شکست خوردہ کی تمام نا انصافیاں معاف کردے۔ اگر وہ اس کا پابند ہے تو پھر وہ کس بنا پر اسے قتل کرنے کا حق رکھے گا؟ بہر حال اس مسئلے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص لڑائی میں اپنے دشمن کو قید کرے، خاص کر فوج کے قائد یا سپہ سالار کو، تو حقیقت میں خدا کے احکام اور دینیات اور قانونِ مذہبی کے مطابق اسے اس پر رحم کرنا چاہیے، بجز اس کے کہ اس کی رہائی سے یہ خوف ہو کہ عظیم تر جنگیں پیش آئیں گی۔ مذکورۂ بالا حکمنامے سے بھی اسی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھیں وجوہ سے نیپلز کے اچھے بادشاہ نے کونارڈین کے مروانے کا فیصلہ صادر کیا۔ کیونکہ اسے اس معاملے کا فیصلہ کرنا تھا۔ اور اس کے مشیروں نے کہا تھا کہ اگر وہ رہا کردیا جائے تو نہ تو جنگ ختم ہوسکے گی اور نہ ملک میں امن کبھی بحال ہوسکے گا، جب تک کہ یہ کونارڈین جیتا رہے۔ بہر حال قوانین کے مطابق اگر کوئی شخص قید کرلیا جائے تو اس کے گرفتار کرنے والے کو یہ اختیار ہوگا کہ مذکورۂ بالا قوانین کے مطابق اس کے متعلق اپنی مرضی چلائے۔[1]

مارتین گارا اور بلی نے کونارڈین کی موت کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اس پر کوئی اور بحث نہیں کرتے۔ البیری کس جنتی لیس کا فیصلہ یہ ہے کہ

[1] اونورے بونے کی فرانسیسی تالیف "شجرۂ حرب" حصۂ چہارم باب (۱۳)۔

خصوصی وجوہ کے بغیر دشمن سردار کو موت کے گھاٹ اتارنا درست نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے (لاطینی) الفاظ یں: "اور ہم کہتے ہیں کہ یہ امر درست نہ ہوگا کہ دشمن کی فوج کے قائد کا سر اڑا دیا جائے بجز اس کے کہ خصوصی اسباب اس کی اجازت دیں۔" جنتی لیس نے ایسی متعدد مثالوں کا ذکر کیا ہے جن میں فیاضی دکھائی گئی تھی اور جو تاریخ میں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد وہ (لاطینی الفاظ میں) یہ اضافہ کرتا ہے کہ: "اگر فاتح اپنی فتح کو مستحکم بنانے کے دوسرے ذریعے رکھتا ہے تو عمر بھر قید رکھنا پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ فتح کا مقصد یہی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکے۔ عمر بھر قید میں رکھنا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب کسی کو ناقابل برداشت فدیہ وصول کرکے یا کسی اور غیر منصفانہ شرط کے تحت رہا کیا جانا ہو۔" جنتی لیس کے ہموطنوں نے مصلحت ملکی کا اپنے آپ کو پُرجوش اور لائق محافظ بنادیا تھا۔ اور جنتی لیس کی رائے میں مصلحت ملکی ہی اس معاملے میں فیصلہ کن عنصر ہوگی۔ کونارڈین کے لیے جو فیصلہ کیا گیا تھا اس سلسلے میں نفس فیصلے سے زیادہ وہ اس کے ضابطے اور طریقۂ کار پر تنقید کرتا ہے۔ چنانچہ اسے جو چیز ناپسند ہے وہ صرف یہ ہے کہ باوجود جنگی قیدی ہونے کے اس نوجوان بادشاہ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا گیا گویا کہ وہ کوئی مجرم ہو۔ رہا نفس سزا اس کو جنتی لیس نے سیاسی لحوظات کے تحت حق بجانب قرار دیا ہے اور وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ: "اس میں شبہہ نہیں کیا جاسکتا کہ بے بس کارل (شارل) کامیاب ہوجاتا اگر کونارڈ زندہ ہوتا۔ تمام اٹلی والوں میں سب سے زیادہ نیپلز والے جدتوں کے دلدادہ اور تبدیلیوں کے خواہاں ہیں جیسا کہ عقلمند مورخوں نے بیان کیا ہے۔"[1] یہاں یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ

---

[1] جنتی لیس کی کتاب "قانون جنگ" کتاب سوم باب (۸) "گرفتار شدہ قائدین جنگ"۔

ایک اور مشہور مقدمے کا اس سے کچھ ہی پہلے انگلستان میں فیصلہ ہوا تھا اور جنٹی لیس نے یہ سطریں انگلستان ہی میں تحریر کی تھیں۔ چنانچہ ناری اسٹیوارٹ کو موت کی سزا سنائی گئی تھی اور کارروائی کے دوران میں اس بدنصیب ملکہ کے دشمنوں نے کونارڈیں کے مقدمے ہی کا حوالہ دے کر ناری اسٹیوارٹ کے لیے سزائے موت کو حق بجانب قرار دیا تھا۔

مال غنیمت کے نظریے کی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں خشکی کی جنگ کے مال غنیمت کو حصول جائداد کا ایک باضابطہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں وہ منقولہ اور مادی چیزیں شامل سمجھی جاتی ہیں 252 جو یا تو دشمن فوج سے چھینی جائیں یا ایسے اشخاص سے جنھیں اس فوج کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہو یا مستثنیٰ صورت میں ایسے افراد سے جو فوج کے لیے اجنبی ہوں۔ بحری جنگ میں مال غنیمت سے مراد حربی سلطنتوں کے مسلح جنگی جہاز اور رعایا کے خانگی جہاز ہوتے ہیں[1] یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے جب دشمن کی خانگی جائداد کا سمندر میں بھی اسی طرح احترام کیا جائے گا جس طرح خشکی میں اسے [چھین سکنے سے محفوظ قرار دیا گیا ہے]۔ ورنہ قدیم زمانے میں اور قرون متوسطہ میں مال غنیمت کا تصور بہت وسیع تھا۔ جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ویسے ان چیزوں کی فہرست گھٹتی جاتی ہے جنھیں چھینا جاسکتا ہو۔

ابتداءً رومیوں کا تصور یہ تھا کہ اجنبیوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا لیکن رومیوں کا قانون جنگ جلدی ہی ترقی کرنے لگا۔ اس کا باعث رومیوں کی قانونی ذہنیت اور سیاسی مہارت کہے جاسکتے ہیں۔ بلونچ لی نے اسے خوب اچھی طرح سے نمایاں کیا ہے۔ ایک طرف رومیوں کی قانونی ذہنیت تھی جس کے باعث انھوں نے اپنے قانون کو ایک واضح اور معین شکل دینے میں

---

[1] ہفٹر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا قانون بین الممالک" ف ۱۳۵ و ۱۳۷۔

کامیابی حاصل کرلی۔ چنانچہ جنگ شروع کرنے سے پہلے چند ضوابط کی انجام دہی ضروری ہوتی تھی۔ دوسری طرف ان کی سیاسی مہارت نے انھیں اس امر پر آمادہ کیا کہ جنگ کے ان قدیم بربری رواجوں میں ترمیم کریں جو ان کی تجویز کے بروئے کار لائے جانے سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ رومیوں کی خواہش یہ تھی کہ ایسے ممالک پر حکومت کریں جو آباد اور متمول ہوں نہ کہ تباہ اور ویران[1]۔

قدیم قانون کو اصول کی حد تک تو ترک نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ بے تعلقی کے اظہار کے لیے جو ضابطہ تھا، اس سے اس کا پتہ چل سکتا ہے: اگر شکست خوردہ مملکت زیادہ مناسب شرطیں حاصل نہ کرسکے تو اسے یہ وعدہ کرنا پڑتا کہ "وہ خود کو، اپنے شہر کو، اپنے میدانوں کو، اپنے پانیوں کو، اپنی سرحدوں کو، اپنے معبدوں کو، اپنی منقولہ جائدادوں کو، غرض ان تمام خدائی یا انسانی چیزوں کو جو اس کے قبضے میں ہوں، رومی قوم کے اقتدار میں دیدے گی[2]۔" لیکن جہاں تک تعمیل کا تعلق ہے، اس نظام پر شاذ ہی صورتوں میں عمل ہوتا تھا۔ ورنہ عام طور پر کسی ملک کی آبادی اپنی سیاسی آزادی سے محروم نہیں کی جاتی تھی۔

جہاں تک قانون کے ظاہری احکام کا تعلق ہے، زمین کی ملکیت رومی مملکت پر منتقل ہوجاتی تھی۔ لیکن رومی مملکت پرانے مالکوں ہی کو زمین واپس دیدیتی تھی اور پوری طرح نہیں تو ایک حد تک اس سے استفادے کا حق بھی۔ جائدادِ منقولہ، باشندوں ہی کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی۔ عام قاعدے کے طور پر رومی فوجوں کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی کہ

253

[1] بلونچ لی کا مضمون فرانسیسی "رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۹) میں بعنوان "مال غنیمت کے متعلق عام طور پر اور بحری مال غنیمت کے متعلق خاص طور پر قاعدہ"۔ دیکھیے ص ۱۷۔

[2] تیت لیف (ٹائیٹس لائیفی) کی تالیف "تاریخ روما" کا فرانسیسی ترجمہ کتاب اول باب (۳۸)

دشمن اشخاص یا ان کی مقبوضہ چیزیں چھین سکے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ مالِ غنیمت مملکت کے سپرد کردیا جائے۔ اور یا تو اسے پبلک طور سے فروخت کیا جائے اور اس کی قیمت تقسیم کی جائے یا اس کا ایک جزو خزانۂ سرکاری میں داخل کردیا جائے اور ایک جزو افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے۔

اس طرح "غنیمت" کی اصطلاح سے ایک محدود معنے مراد لیے جانے لگے۔ اور اس میں دشمن اشخاص اور صرف وہ منقولہ چیزیں شامل سمجھی جانے لگیں، جنھیں واقعی طور پر سپاہیوں نے چھینا اور مملکت کے حوالے کیا ہو۔ حکومت اس کا ایک بڑا حصہ سپاہیوں ہی کو عطا کردیتی تھی[1]۔ یہ صحیح ہے کہ باقاعدہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوٹ گھسوٹ کی صورت بھی پیش آتی تھی، جس کی فوجی جنرل اجازت دے سکتے تھے اور جس سے صرف اہلِ فوج فائدہ اٹھا سکتے تھے [حکومت نہیں]۔

جب علاقۂ گال میں برگنڈی اور وِیزیگاتھ والوں نے بربری سلطنتیں قائم کیں، تو زمینوں کو بھی بانٹ دیا جانے لگا۔ شہنشاہ کا صرفِ خاص بڑے وسیع رقبوں پر مشتمل تھا۔ اور محض فتح کے واقعے ہی سے صرفِ خاص کے یہ علاقے بربری بادشاہوں کے حق میں منتقل ہوگئے اور انھوں نے ان کو حسبِ دلخواہ بانٹ دیا۔ اس چھینا جھپٹی کو [رعایا رنے] بغیر کسی زیادہ رنج و افسوس کے قبول کرلیا۔ کیونکہ بربریوں کے برسرِ اقتدار آجانے سے رومی دور کے ہولناک نظامِ مالگزاری سے نجات مل گئی۔ اس کے علاوہ رومی دور میں سپاہیوں کو عام باشندوں کے گھروں میں ٹھیرانے کے لیے جو قواعد تھے، ان کے ایک جزو پر عمل باقی رہا۔ اور فرق یہ کیا گیا کہ بربروں کی چھاؤنیاں ایک مستقل حیثیت اختیار کرگئیں[2]۔

اس کے بعد بیان کیا جاتا ہے کہ مالِ غنیمت سے مراد صرف

---

[1] بلونچ لی کا مذکورہ بالا مضمون ص ۵۲۱

[2] ایس مَن کی فرانسیسی تالیف "فرانسیسی قانون کی تاریخ پر ابتدائی درس" ص ۵۰

مال منقولہ ہونے لگا۔ اس میں کچھ اعتدال پیدا کرنے والی چیزیں بھی قائم کی گئیں [جن کو لوٹا نہ جاسکتا تھا] یعنی مقدس اشیاء، کلیسا، اور مذہبی ادارے جنھیں محفوظ قرار دیا گیا تھا۔

نظریوں کے سلسلے میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا نظر آتا ہے کہ جو چیز چھینی جائے، وہ چھیننے والے کی قرار پائے۔ اس کے بعد یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ وہ چیزیں ہوں گی تو سپاہیوں ہی کی، لیکن انھیں چاہیے کہ ان چیزوں کو سردار کے ملاحظے میں پیش کردیں اور وہی ہر ایک کی محنت اور کارگزاری کے مطابق ان کی تقسیم عمل میں لائے۔ اور سب سے آخر میں یہ خیال قائم ہوا کہ جو چیزیں چھینی جائیں، وہ حکمران کی سمجھی جائیں گی۔ اور اگر وہ چاہے تو ہی ان کو سپاہیوں میں بانٹا جائے گا۔

کتاب "نوعمر بچہ" کا مولف بیان کرتا ہے کہ پندرھویں صدی میں انگریزوں کے خلاف جو جنگیں ہوئیں، ان میں سے ہر ایک مہم میں اس کا پیشگی معاہدہ ہونے لگا کہ جو چیزیں چھینی جائیں انھیں "مال غنیمت" سمجھا جائے یا "دست خود دہان خود" پر عمل ہو یا "انعام میں اصول مساوات" پر عمل کیا جائے۔ پہلی صورت میں جملہ لوٹ اور فدیے کا مال سب سپاہیوں میں بانٹ دیا جاتا۔ البتہ غالباً تقسیم میں پوری مساوات نہیں ہوتی بلکہ جو شخص کوئی چیز خود حاصل کرتا وہ اس کا مالک سمجھا جاتا۔ دوسری صورت میں ہر شخص جو کچھ حاصل کرسکتا، خود ہی لے لیتا۔ اور تیسری صورت میں مال غنیمت کو انتہائی احتیاط کے ساتھ ان تمام لوگوں میں تقسیم کیا جاتا جنھوں نے اس مہم میں حصہ لیا ہو[1]۔

254

جنگی کلیں، رسد اور اسباب جنگ البتہ حکمران کے ہوتے تھے۔

قرون متوسط میں مال غنیمت کو بے انتہا اہمیت حاصل تھی کیونکہ

[1] ۔ یوے ای کے ژاں کی فرانسیسی تالیف "نوعمر بچہ" کا دیباچہ از کامی فافر (متن جسے لیوں لے ستر نے مرتب کرکے شرح لکھی) جلد (۱)، ص ۶۵ کے حاشیے کی تعلیق۔

جنگ کو منفعت بخش ہونا اور اپنا خرچہ آپ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ کسی جنگ میں مالِ غنیمت اور قیدیوں سے وہی شخص تمول حاصل کرتا جو زیادہ عمدگی، زیادہ چوکسی اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ جنگ کا انتظام کرے۔ ہولن شیڈ نامی ایک انگریز مورخ نے بیان کیا ہے کہ دوسرے رچرڈ کے زمانے میں صلح کرنے کا خیال کسی کو آ نہ سکا کیونکہ اس زمانے میں براعظم یورپ پر بھیجی جانے والی مہیں منفعت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھیں[۱]۔ دور شہامت میں سونا، چاندی، گھوڑے، حکمرانوں کی پریڈ کے گھوڑے اور خچر گرفتار ہوتے تو شہامت بازوں میں بانٹ لیے جاتے۔ اور اکثر شہامت بازی کی کہانی میں ذکر آتا ہے کہ شہامت باز گایوں اور بکریوں کو نہیں چھینتے بلکہ انھیں اپنے نوکروں اور خادموں کے لیے چھوڑ دیتے۔

ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ "سات ارکان" نامی مجموعۂ قواعد میں کیا احکام ہیں۔ اس میں ایک رواج کا ذکر کیا گیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ اور وہ ہرجے کا معاوضہ ہے۔ ہر سپاہی کو دشمن سے چھینے ہوئے مالِ غنیمت سے اپنی تمام جسمانی مشقتوں اور مادی نقصانوں کا معاوضہ پانے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ اگر اسے زخم لگتے تو پانچ سے ایک سو "مراقیدی" (مرابطی سکے) تک معاوضہ دلایا جاتا۔ اگر سپاہی جنگ میں مارا جاتا تو پچھتر یا ڈیڑھ سو مرابطی معاوضہ دلایا جاتا اور اس بارے میں یہ دیکھا جاتا کہ وہ پیدل ہے یا سوار۔ اس رقم کو متوفیٰ کی وصیت کے مطابق اس کے روحانی آرام کے لیے خرچ کیا جاتا۔ اور اگر اس نے کوئی وصیت نہ

255

[۱] والزنگ ہام نے ۱۳۴۸ء کے حالات میں لاطینی میں لکھا ہے کہ "کیونکہ نامردوں میں کوئی بھی زنانہ نہ تھا (؟)۔ چنانچہ کادومی، کالیسیا، اور دیگر سمندر پار شہروں میں کسی کے پاس کپڑے، سموری لباس، بستر اور برتن باقی نہ رہے۔ میزوں کے نقشے، گلے کے ہار، خوشبوئی کے سفوف، چاندی کی چیزیں وغیرہ، یہاں وہاں انگریز افراد کے گھروں میں نظر آتی ہیں۔"

چھوڑی ہو تو اس کے لیے جو معاوضہ مقرر ہوتا، اس کا ایک تہائی خیراتی کاموں کے لیے لگادیا جاتا اور باقی دو تہائی اس کے وارثوں کو ملتا۔ فوج کے کوچ کرنے سے پہلے اس کی گنتی کرلی جاتی کہ کتنے جانور، کتنے ہتھیار اور کتنی چیزیں ہر سپاہی کے ساتھ ہیں۔ منشا یہ تھا کہ اگر آیندہ کسی سپاہی کو لڑائی کے دوران میں کچھ نقصان برداشت کرنے پڑیں، تو اس کے معاوضے کی تشخیص میں یہ گنتی بنیاد کا کام دے سکے۔

اکثر ان حقوق کا صراحت سے تعین ہوجاتا جو علی الترتیب حکمران اور سپاہیوں کے لیے مقرر ہوتے۔ انگریزی رواج کے مطابق بادشاہ کو یہ حق ہوتا کہ ہر کمانڈر نے جنگ میں جو کچھ کمایا ہے اس کا ایک تہائی خود لے لے۔ نیز عام طور پر سپاہیوں کو جو حکم تھا کہ اپنی کمائی کا ایک تہائی اپنے کمانڈر کو دیدیں تو اس تہائی کا بھی ایک تہائی بادشاہ کو مل جاتا۔ جنگ میں جو کچھ غنیمت حاصل ہو، تو سپہ سالار کو اس کا آدھا لینے کا حق اس وقت پیدا ہوتا جب کہ اس نے فوج کا سامان خود ہی فراہم کیا ہو۔ مختلف سپہ سالاروں نے جو معاہدے کیے تھے کہ وہ ایک معینہ تعداد میں سپاہی فراہم کریں گے، ان معاہدوں میں مذکورۂ بالا شرط بھی ملتی ہے [کہ آدھا مال غنیمت سپہ سالار کو ملے گا]۔

مختلف ملکوں کے فوجی ضوابط نے مال غنیمت کے حق کو محدود کرنے میں بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ سپاہیوں کو اس کی ممانعت کی گئی تھی کہ پیشگی اجازت لیے بغیر مال غنیمت کی تلاش میں نکلیں یا لڑائی کا فیصلہ ہونے سے پہلے لوٹ پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ سوئستان (سوئٹزرلینڈ) والوں نے ایک وفاق قائم کیا تو ۱۳۹۳ء میں انھوں نے ضابطۂ جنگ میں اسی کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح ۱۵۰۸ء میں شہنشاہت کی طرف سے سوار فوج کے قواعد اور پیدل فوج کے قواعد نافذ ہوئے تو ان میں بھی یہی ہدایت تھی جب ۱۵۹۰ء میں صوبجات متحدہ نے ایک حکمنامہ جاری کیا تو اس کی دفعہ (۶۳) میں یہ حکم دیا گیا کہ جس کسی کے پاس کچھ مال غنیمت آئے تو

اسے چاہیے کہ تین دن کے اندر اسے کمانڈر کے پاس لا حاضر کرے ورنہ ضبطی کے علاوہ جسمانی سزا بھی دی جائے گی۔ پورے مال غنیمت کو بیچ کر اسے سپاہیوں میں ان کی تنخواہ کے تناسب سے تقسیم کیا جانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۶۷۰ء میں جب اس حکمنامے کی پائیس فان تراتش برگ نے شرح لکھی تو اس نے یہ بیان کیا کہ یہ دفعہ ان امور میں سے ایک ہے جن کا اب کوئی مزید لحاظ نہیں کیا جاتا۔"

چوتھے انوسینٹ کی رائے تھی کہ جو مال منقولہ کسی منصفانہ جنگ میں حاصل ہو، وہ اس کے حاصل کرنے والے ہی کا ہو جاتا ہے، اگرچہ بعض لوگ یہ رائے دیتے ہیں کہ ایسی چیزیں سردار کی ملکیت ہو جاتی ہیں جو ان کو اپنے آدمیوں میں ان کی کارگزاری کے مطابق تقسیم کر دے گا۔ البیریکس دے رُوزانتے بھی مال غنیمت کے مسئلے سے بحث کرتا ہے اور اسے اس نکتے پر اصرار ہے کسی منصفانہ جنگ میں یہ ضروری ہے کہ جو چیزیں گرفتار ہوں وہ حکمران کے پاس لا حاضر کی جائیں اور وہی ان کو بانٹے گا۔ یہ مولف یاد دلاتا ہے کہ یہ رواج اس کے زمانے میں عام طور سے پھیلا ہوا تھا اگرچہ اس زمانے کی جنگیں عام طور پر غیر منصفانہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد وہ (لاطینی میں) یہ بھی کہتا ہے کہ "اور ایسی چیزوں ہی کو مال غنیمت کہا جاتا ہے۔"[1]

بارتولے کا بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "سامان کو لاکر پیش کر دینا ضروری ہے۔ وہ اسی کا ہوتا ہے جو اسے گرفتار کرے لیکن پھر بھی اسے قائد جنگ کے پاس لانا چاہیے جو اسے سپاہیوں میں حسب کارگزاری بانٹے گا ..... جوں ہی فتح حاصل ہو جائے تو تمام سامان لا حاضر کر دینا چاہیے۔ اسی کو مال غنیمت کہتے ہیں۔ پھر اسے بیچ کر [حصے] تقسیم کرتے ہیں۔"

256

[1] البیریکس دے رُوزانتے کی لاطینی تالیف "دو پرانی ڈائجسٹ کے حصہ اول پر حیثیت انسانی"

بالدے اور لنانو کے تژاں کی بھی وہی رائے ہے جو روزاتے اور بارتولے کی تھی۔ ایک اور مولف، جس کا نام بارتیل می ڈسالس تو تھا، ان میں ایک امتیاز قائم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو مال غنیمت بغیر لڑے بھڑے حاصل ہو، وہ غانم یعنی گرفتار کنندہ کا ہوگا۔ اور جو مال غنیمت کسی لڑائی کے بعد حاصل کیا جائے، اسے بانٹ دینا چاہیئے۔

اونورے بونے کی رائے ہے کہ جو مال "لڑائی کے ذریعے سے حاصل ہو" اس کا معاملہ نازک ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "اس کے متعلق قواعد— یعنی قانونی احکام — مذبذب ہیں۔ ان میں وضاحت نہیں ہے اور وہ شک و شبہے کے حامل ہیں۔ کیونکہ ایک قانون کے مطابق یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو مال منقولہ کوئی شخص حاصل کرے وہ اسی کا ہوجائے گا۔ لیکن ایک اور قانون کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص مال منقولہ جنگ میں حاصل کرے، تو اسے چاہیے کہ اس مال کو قائد فوج کے حوالے کردے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں کہتا ہوں کہ جو مال کوئی شخص اپنے دشمنوں سے چھینے، وہ اسی کا ہوگا۔ اور یہ ملحوظ رہے کہ وہ مال سابق میں اس کے دشمنوں کا تھا جو اب اس کی ملکیت سے محروم ہوگئے ہیں۔ لیکن اس کا اثر یہ نہیں ہوتا کہ جن لوگوں نے ان چیزوں کو حاصل کیا ہے، وہ اس بات کے پابند نہ ہوں کہ ان کو قائد جنگ کے پاس لا حاضر کریں۔ بلکہ قائد ہی ان چیزوں کو اپنے لوگوں میں ہر ایک کی بہادری کے تناسب سے بانٹے گا۔"[1]

ایک اور مقام پر اونورے بونے بیان کرتا ہے کہ "تنخواہ یاب" یعنی وہ شخص جسے نوکر رکھا جاتا ہے، وہ اپنے لیے مال غنیمت حاصل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ "وہ بادشاہ کے خرچ پر خود کوئی علاقہ [؟ مال غنیمت] حاصل کرے۔ اور ایسا شخص

---

[1] اونورے بونے کی "شجرۂ حروب" حصۂ چہارم باب (۴۴)۔

257

جو کچھ کرتا ہے وہ بادشاہ یا اس شخص کے نام سے حاصل کنندہ کے طور پر کرتا ہے جو اسے تنخواہ دے کر نوکر رکھے[1]، سولھویں صدی کے مولف آریا نے واضح الفاظ میں (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ " اگر گرفتار شدہ چیزیں سامان ہیں تو وہ گرفتار کرنے والے کی ہوجاتی ہیں۔ دوسری چیزیں لا حاضر کرنی چاہئیں . . . اور یہ عام طور سے ہوسکتا ہے کہ سامان سردار کے پاس لا حاضر کرنا ضروری قرار دیا جائے جو اسے حسب کارگزاری بانٹے گا۔"

روس ڈوداں آودیر نے سنہ۱۵۸۲ء میں یہ لکھا تھا کہ رواج کے تحت مال غنیمت سپاہیوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے[2]۔ شرح نویسوں کا جو نظریہ تھا، آیالا اسی سے جیتا ہنتا ہے، اور سند کے طور پر اسپین کی نظیر پیش کرتا ہے۔ آلبیری کش جنتی لیس کی رائے ہے کہ قانون جنگ کے تحت، فاتح اس بات کا مجاز ہوتا ہے کہ دشمن رعایا کی جائداد غیر منقولہ چھین لے۔ لیکن یہ مولف سفارش کرتا ہے کہ ایک نرم تر سیاست پر عمل کرکے ان مفتوحوں پر باج و خراج عائد کردیا جائے۔ آیالا کو تسلیم ہے کہ فاتح فنون لطیفہ کی چیزوں پر قبضہ کرسکتا ہے۔ لیکن مولف کا مشورہ ہے کہ اس بارے میں زیادتی سے بچنا چاہیے۔

فنون لطیفہ کے نمونوں اور ادبی خزانوں کو آج کل مال غنیمت نہیں بنایا جاسکتا۔ سنہ۱۸۱۳ء میں ایک انگریز حاکم عدالت نے جس کا نام سر الگزینڈر کرڈک تھا اور جس کا تعلق ہالی فاکس کی عدالت نیابت وزارت بحریہ سے تھا، یہ اعلان کیا تھا کہ " فنون لطیفہ اور علوم کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی خاص قوم کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ پوری نوع انسانی کی وہ جائداد ہیں اور تمام بنی نوع انسان کے

---

[1] - لوفوس دے ودستے کی تبصرہ صدرہ بے ؟ منشور چہارم باب ہ (۱۲)۔

[2] - تدنس ڈوداں اودیر کی لاطینی تالیف عدالتی معاملات کے متعلق طریقۂ کار، باب ۸۲ سنہ۔

مشترکہ مفاد سے ان کو وابستہ سمجھا جائے گا۔"

ایک زمانے میں فاتح، فن کاری کے نمونوں اور خزانوں پر قبضہ جمالیا کرتا تھا۔ ایک مشہور نظیر ۱۶۲۲ء کی ملتی ہے۔ تیس سالہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں دوسرے فردیناند نے متعدد ایسے پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو شہنشاہت کی طرف سے جلاوطن باہر کردیا جو ۱۶۰۸ء کے قائم شدہ "انجیلی اتحاد" کے رکن تھے اور جس کے جواب میں ۱۶۰۹ء میں "مقدس اتحاد" قائم کیا گیا تھا۔ ان حکمرانوں میں پانچواں فریڈرک بھی تھا جو پالاتینا کا سردار تھا، جسے شہنشاہوں کے انتخاب کے وقت رائے دینے کا بھی حق حاصل تھا اور جو "جاڑوں کا بادشاہ" کے نام سے مشہور ہے اور جسے چند ماہ کے لیے بوہیمیا کا تاج شہریاری بھی حاصل ہوا تھا۔ اس پانچویں فریڈرک پر اسی کے اپنے علاقے میں دھاوا بول دیا گیا۔ باویریا کے ڈیوک اور "مقدس اتحاد" کی طرف سے مقرر کردہ سپہ سالار ٹلی نے ہائیڈل برگ پر قبضہ کرلیا اور اسے تباہ وتاراج کردیا۔ یہ واقعہ ۱۵ ستمبر ۱۶۲۲ء کو پیش آیا تھا۔

پالاتینا کے حکمرانوں کا کتب خانہ بہت شہرت رکھتا تھا۔ دربار روما کو تک اس سے رشک تھا۔ پوپ پندرھویں گریگری نے اپنے ایک نمایندے کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ "مقدس اتحاد" کی روح رواں یعنی باویریا کے حکمران ماکس می لین کو اس پر آمادہ کرے کہ اگر یہ کتب خانہ اس کے ہاتھ میں آئے تو وہ اسے مقام مقدس یعنی پوپ کی نذر کردے۔ ۸ دسمبر ۱۶۲۱ء کو جو ہدایتیں شہنشاہ نے اپنی پالاتینا میں معرکہ آرا فوج کے سپہ سالار اِنشپی نولا کو دی تھیں، ان میں یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ اس قیمتی خزانے کو بچانے کی جانب وہ متوجہ رہے تاآنکہ اسے نئے احکام نہ دیے جائیں۔

ماکس می لین نے یہ کتب خانہ پوپ کی نذر کردیا۔ پوپ نے ۱۵ اکتوبر ۱۶۲۲ء کو اس تحفے کا شکریہ ادا کیا، اور ۲۵ نومبر کو

258

ممتاز عالم لیو نے آلاتی شہر میونک میں اس غرض کے لیے آگیا کہ [پوپ کی طرف سے] ان قیمتی کتابوں کو اپنی تحویل میں لے۔ ۱۵ فروری ۱۶۲۳ء کو پوپ کا یہ کارندہ پچاس گاڑیاں بھری ہوئی قلمی کتابیں لے کر ہائیڈلبرگ سے روانہ ہوا۔ اس کی حفاظت کے لیے ساٹھ بندوقچیوں کا پہرہ بھی ساتھ تھا۔ پالاتینا کے اس کتب خانے میں جو فاتیکان پہنچایا گیا، چار سو سے زیادہ یونانی، انیس سو سے زیادہ لاطینی اور آٹھ سو سے زیادہ جرمن قلمی کتابیں تھیں[1]۔

اس کے بعد کی صدی میں جب کبھی کوئی شہر اطاعت قبول کرتا تو عام طور سے یہ اقرار کیا جاتا کہ سندوں، حقیت ناموں اور دستاویزوں پر فاتح اپنا قبضہ نہیں جمائے گا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ اس قابل ہے کہ اس کا ذکر کرنے کی زحمت برداشت کی جائے۔ ۱۲ مارچ ۱۶۷۸ء کو فرانسیسی فوج شہر گاں میں داخل ہوئی جس کی سرداری خود بادشاہ یعنی چودھواں لوئی کر رہا تھا۔ اس سے تین دن پہلے جو اطاعت نامہ طے ہوا تھا، اور جس پر خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے دستخط کیے تھے، اس میں خاص کر یہ مذکور تھا کہ "سندیں، حقیت نامے، حسابات اور معلومات جو شہر، صرفخاص شاہی، مجلس حکومت (کونسل) اور فلانڈرس کی مملکتوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں، وہ اپنے محافظ خانوں ہی میں رہنے دیے جائیں گے اور انھیں شہر گاں کے باہر کہیں اور نہیں لے جایا جائے گا۔" ۱۵۹۴ء سے فلانڈرس کی سندوں کے خزانوں کی اس شہر کے قلعے میں حفاظت و نگہداشت ہو رہی تھی۔ اور اسی خزانے میں وہ حقیت نامے بھی تھے جو فلانڈرس کی کونٹ یعنی جاگیر سے

---

[1] ۔ وِیر کی جرمن تالیف "کتب خانۂ ہائیڈلبرگ کی روما روانگی کی تاریخ"، "ہائیڈلبرگ کے سالنامہ ہائے ادبیات" بابت ۱۸۱۶ء صفحہ ۱ نیز ایضاً بابت ۱۸۱۷ء صفحہ ۲ میں۔

تعلق رکھتے تھے؛ وہ عہد و پیمان بھی تھے جو حکمرانوں کے خاندان سے ہوئے تھے؛ اور گفت و شنید کی وہ یادداشتیں اور معاہدے بھی جو اجنبی سلطنتوں سے طے ہوئے تھے۔ (وزیر) کول بیر کو مخطوطات کا عشق تھا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ شہر گاں میں جو دستاویزیں محفوظ ہیں، انھیں کتنی زیادہ قدر و قیمت حاصل ہے تو اس نے کوشش کی کہ اس خداداد موقع سے فائدہ اٹھائے۔ چونکہ اطاعت نامے کی شرطیں نہایت واضح تھیں، اس لیے اس نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے دینی گودفرائے کو لکھا کہ "بادشاہ علانیہ طور سے تو وہ حقیت نامے منتقل نہیں کرسکتا جو گاں کے قلعے میں محفوظ ہیں، کیونکہ اس شہر کے اطاعت نامے میں اس کے خلاف حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ احتیاط اور چالاکی سے جتنی زیادہ تعداد میں ممکن ہو ان کو وہاں سے نکلوالیا جائے۔"

فلانڈرس کی مجلس حکومت کا صدر کوئی اِزال تو تھا جو دو وزے لے کا جاگیردار تھا۔ اسے فلانڈرس کی سندوں کا خازن اور محافظ مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اجازت دی کہ وہ دستاویزیں نکال لی جائیں جن کا وزیر (کول بیر) خواہشمند تھا۔ اس کے بعد دینی گودفرائے نے جو اس وقت فلانڈرس کے پرانے محکمۂ حسابات کے دفتر کا شہر لیل میں محافظ تھا، ان دستاویزوں کا انتخاب کروایا۔ ان میں ایک ترتیب پیدا کی اور تین مرتبہ کرکے وہ کول بیر کے ہاں روانہ کردیں۔ یہ دستاویزیں کئی صندوقوں میں بھر کر گئیں۔

اسی ۱۶۷۸ء میں نی میگ کا جو معاہدہ طے ہوا تھا، اس میں بیان ہوا ہے کہ "وہ تمام کاغذات، خطوط اور دستاویزیں جو دونوں [معاہدہ کنندہ] بادشاہوں کی اطاعت کرنے یا ان کو واپس ملنے والے علاقوں سے تعلق رکھیں ان کو فریقین میں سے ہر ایک پوری نیک نیتی کے ساتھ [فریق متعلقہ کے] سپرد کردے گا۔ اس معاہدے کی توثیق شدہ نقلوں کا تبادلہ عمل میں آنے کے بعد تین مہینوں کے اندر ایسی

259

دستاویزوں کی سپردگی عمل میں آجائے گی خواہ کسی مقام ہی پر یہ کاغذات اور دستاویزیں کیوں نہ ملی ہوں حتیٰ کہ وہ دستاویزیں بھی جو شہر گاں کے قلعے سے حاصل کی گئی ہوں۔^۱ ۱۲۹۶ء میں رسوک کا جو معاہدہ ہوا اس میں بھی یہی دفعہ دہرائی گئی تھی۔ اس کی کبھی تعمیل نہیں ہوئی۔

بعض ممالک میں مال غنیمت کی ملکیت اور اس ملکیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے جھگڑوں کے لیے ایک خصوصی عدالت پائی جاتی تھی۔ اس کا تعلق اس مال غنیمت سے تھا جو خشکی پر ہاتھ آئے۔ بحری مال غنیمت کے متعلق اختیار سماعت، امیرالبحر کو حاصل ہوتا تھا۔

ابتداءً بحری مال غنیمت کے جائز ہونے کا فیصلہ سرسری تحقیقات کے بعد کردیا جاتا تھا۔ غانم شخص، گرفتار شدہ جہاز کو اس افسر کے سامنے لا حاضر کرتا جو اس بحری مہم پر مامور کیا گیا ہو۔ اور وہی اس کے متعلق فیصلہ کرتا۔ بیڑے کے سردار کو اختیار سماعت کا جو حق حاصل تھا، اس کی جلدی ہی بادشاہ تائید کرنے لگے۔ اور جب بحری قزاقی کے پروانے اور اجازت نامہ ہائے سرحد عطا ہونے لگے، تو نتیجۃً عدالتیں قائم کی جانے لگیں جو جہازوں اور جہازوں کے گرفتار شدہ سامان کے متعلق جھگڑے چکانے لگیں۔ اس سلسلے میں ایک اصول پھیل گیا۔ وہ یہ تھا کہ مال غنیمت کو غانم اب اپنی ملکیت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ عدالت مجاز نے اس کی ملکیت اسے عطا نہ کی ہو۔

امیرالبحر کے لیے جو لفظ فرانسیسی زبان میں پایا جاتا ہے۔ یعنی "امیرال" وہ عربی ہی سے ماخوذ ہے۔ شہنشاہ چھٹے ہنری کے زمانے میں اصطلاح امیرال کی ابتدائی شکلیں یعنی آمیرالیوس اور آمیراتس دکھائی دینے لگیں۔

---

[۱] گاشار کی فرانسیسی تالیف "تاریخ بلجیم سے متعلق مخطوطات کے حالات اور اقتباسات" (کتب خانۂ عام) جلد (۱) دیباچہ ص۹ — ڈلیل کی فرانسیسی تالیف "کتب خانۂ شہنشاہی کے مخطوطات کا دفتر" جلد (۱) ص۴۶۸۔

"سات ارکان" نامی مجموعۂ قوانین میں امیرالبحر کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ "وہ سردار ہے جو جنگ کے لیے مسلح کیے ہوئے جہازوں کے تمام آدمیوں کا افسر ہو"۔ اور اسی مجموعۂ قانون میں تسلیم کیا گیا ہے کہ امیرالبحر کو "جہازی بیڑے پر جو اصل فوج کا گویا جسد ہوگا، نیز اس ٹکڑی پر جو اس بیڑے سے الگ کرکے روانہ کی جائے، وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو خود بادشاہ کو حاصل ہوتے اگر وہ وہاں شخصی طور سے موجود ہوتا"۔ یہ لفظ انگلستان میں تیرھویں صدی کی تیسری تہائی میں برتا جاتا نظر آتا ہے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں اس سے ہم فرانس میں دو چار ہوتے ہیں۔ 200

عدالت امارت بحریہ، انگلستان میں تیسرے ایڈورڈ کے زمانے ہی سے پائی جاتی ہے۔ دوسرے رچرڈ کے زمانے میں پارلیمان نے ۱۳۸۹ء میں قانون منظور کرکے اس عدالت کے اختیار سماعت کے حدود معین کیے۔ پانچویں ہنری کے زمانے میں ۱۴۱۴ء میں ایک قانون نے ان خانگی جہازوں کو، جنھوں نے بحری گرفتاریاں کی ہوں، اس بات پر مجبور کیا کہ اپنی غنیمت انگلستان کی کسی بندرگاہ میں پہنچائیں۔ اور اس غنیمت کو ٹھکانے لگانے سے پہلے اس کے متعلق بیان داخل کریں، ورنہ بطور سزا اس غنیمت کو ضبط کر لیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتے کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ وہ یہ کہ ابتدا ہی سے انگلستان کی عدالت امارت بحریہ ایک مستقل اور آزاد عدالت رہی۔ اس کا اجلاس یا تو انگلستان کے وزیر بحریہ کی موجودگی میں ہوتا یا اس کے نائب کی، جسے حاکم عدالت امارت بحریہ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس ملک میں بحری قانون کی ترقی بڑی دلچسپ رہی ہے۔ ان عدالتوں میں، جو بحری قضیے چکانے کے لیے مامور ہوئیں، کلیسائی عنصر بڑی جلدی ہی سرایت کر گیا۔ جس طرح اسقفوں نے بادشاہ رچرڈ کے بیڑے کی افسری کے فرائض انجام دیے، اسی طرح یہ بھی نظر آتا ہے کہ کلیسا والے

بحری قانون کے حقیقی ماہر بھی بن گئے۔ اور جب تیسرے ایڈورڈ کے دور حکومت کے بارھویں سال اس مسئلے کا مشہور فیصلہ عمل میں آیا کہ بحری معاملات میں کونسے قواعد ملحوظ رہیں، تو شہرۂ آفاق فہرست میں کلیسا والوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک تو ہیوری مَنت کا آدم تھا جو کنٹربری کی آرک بشپی کا ایک عہدہ دار تھا۔ دوسرا نام چاڈر لے کے رچرڈ کا تھا جو کنٹربری کی آرک بشپی کی "کمانوں والی عدالت" کا حاکم[1] تھا اور تیسرے اڈِس ورتھ کا ہنری جو کلیسائے سینٹ پال کا صدر پادری تھا[2]۔

عدالت امارت بحریہ، قانون روما کے مطابق کارروائی کرتی تھی اور اس کے اجلاس لندن میں قانون روما کے ڈاکٹروں کے کالج میں ہوتے تھے[3]۔

---

[1] ۔ ڈین آف آرچیس قدیم زمانے میں کنٹربری کی آرک بشپی کا حاکم عدالت ہوا کرتا تھا عدالت کی عمارت کی شکل کے باعث اسے کمانوں والی عدالت کہنے لگے (مترجم)۔

[2] ۔ سرٹرادرس ٹوِس کی انگریزی کتاب "امارت بحریہ کی کالی کتاب" جلد (۲) کا دیباچہ صفحہ ۴۴ ومابعد۔

[3] ۔ اس کالج کو ڈاکٹرس کامنس کا کالج بھی کہتے ہیں۔ یہ باقاعدہ طور سے سنہ ۱۵۱۱ء میں قائم ہوا اگرچہ اس کا آغاز بارھویں صدی ہی سے ہوچکا تھا۔ اس انجمن میں وہ قانونی لوگ شریک ہوتے تھے، جو قانون مذہبی اور قانون روما کے مطابق وکالت کرتے یا ان عدالتوں کے حاکم ہوتے جہاں ان دونوں قسم کے قانونوں میں سے کسی ایک کا نفاذ عمل میں آتا۔ اس کالج کا تعلق کنٹربری کے آرک بشپ سے تھا۔ ڈاکٹرس کامنس میں خاص کر تین کلیسائی عدالتوں کے اجلاس ہوتے تھے۔ ایک وہ عدالت جس کا تعلق کنٹربری کی اسقفی سے تھا۔ نیز اس کلیسائی عدالت کا بھی جس کا تعلق لندن کی اسقفی سے تھا۔ اور اسی طرح عدالت امارت بحریہ کا بھی۔ انگلستان کا صدر امیرالبحر عدالتی کام انجام دینے کے لیے، اسی کالج کے وکیلوں میں سے کسی ایک کا بطور حاکم عدالت

261

بہت سے ملکوں میں مجالس شورائے غنیمت اکثر صرف انتظامی مجلسیں ہوتی تھیں جو ملک کی تنفیذیہ کے ماتحت ہوتی تھیں۔ اسی لیے ان مجلسوں میں بلند بانگ دعووں اور خود پسندی کے انھیں نظریوں کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی تھی جو تنفیذیہ میں پائے جاتے تھے۔ ممتاز لارڈ اسٹاویل امارت بحریہ میں حاکم عدالت کے طور پر اجلاس کرتے ہوئے زور کے ساتھ اور ٹھیک کہتا تھا کہ اس کی عدالت قانون بین الممالک کی عدالت ہے، اگرچہ اس کا اجلاس برطانیہ عظمیٰ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ انتخاب کرتا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں اس کالج میں قانون کے سولہ یا سترہ ڈاکٹر تھے۔ ۱۷۹۴ء میں ان کی تعداد (۴۴) تک پہنچ گئی اور ہر زمانے میں ان لوگوں نے انمول خدمتیں انجام دی ہیں۔ الزابتھ کے زمانے سے اہم بین الممالک معاملوں میں بھی ان سے مشورہ کیا جانے لگا تھا۔ اس کالج کے ارکان میں سے متعدد ایسے گزرے ہیں جو ہمارے فن کے بڑے بڑے مولفوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف سر ولیم اسکاٹ (جو بعد میں لارڈ اسٹاویل کہلایا)، نیز سر رابرٹ فلی مور اور محترم سر ٹراورس ٹوس کے نام لے لینے کافی ہوں گے۔ جب ۱۸۵۸ء میں آرک بشپوں اور بشپوں کا اختیار سماعت، جو نکاح اور وصیت کے قضیوں کے متعلق تھا، ملک کی معمولی عدالتوں پر منتقل کردیا گیا، اور امارت بحریہ کے حاکم عدالت کی نامزدگی براہ راست تاج کے وزیر اعظم کی طرف سے عمل میں آنے لگی، تو پھر ڈاکٹرس کامنس کے کالج کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ۱۸۳۸ء میں لندن میں ایک انگریزی رسالہ شایع ہوا جس کا نام "ممتاز انگریزی ماہرین قانون روما کے سوانح اور کردار کے خاکے نیز ایک تاریخی تمہید متعلق بہ کالج وکلا" تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کا مولف کوٹ تھا جو اسی انجمن کے ارکان میں سے ایک تھا۔ اس ادارے کے متعلق کچھ معلومات سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کی تشریحیں" کے دیباچے میں ملتے ہیں نیز اس جذبات انگیز نوٹ میں جو سر ٹراورس ٹوس نے اس فاضل مولف کے متعلق لکھا ہے۔

بادشاہ کی اجازت کے تحت ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ جنہوں کو اس عدالت سے یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ خالص اور سادہ قانون بین الممالک کا اطلاق کیا جائے اور انگریزی قانون سے ماخوذ اصول وکلیات خارج رکھے جائیں۔

فرانس میں ۱۳۷۳ء میں ایک امیرالبحر [عدالت امارت بحریہ] کا قیام عمل میں آیا۔

نشیبستان ہالینڈ میں آرک ڈیوک ماکس می لین نے ۱۴۸۸ء میں ایک عدالت امارت بحریہ قائم کی۔ شارل کین نے ۲۷ر دسمبر ۱۵۴۰ء کو مقام نامور سے ایک حکمنامہ نافذ کیا تھا، جس میں تقریباً لفظ بلفظ وہی احکام نقل کردیے گئے ہیں جو ماکس می لین نے جاری کیے تھے۔ ان احکام کے مطابق امیرالبحر کی حیثیت سمندر میں لفٹننٹ جنرل اور مقتدر اعلیٰ کی قرار دی گئی تھی اور اسے جنگی جہازوں پر جو کچھ پیش آتا، اس کے متعلق اختیار سماعت حاصل تھا، نیز سمندر پر جنگ کی صورت میں یا" اسی طرح کے نازک مسائل" میں کوئی شخص اس کا مجاز نہ تھا کہ امیرالبحر کے پروانے کے بغیر کوئی جنگی جہاز سمندر میں ڈالے۔ اور جو کچھ سامان اور قیدی اور تجارتی اسباب پکڑے جائیں وہ سب کے سب امیرالبحر یا اس کے نائب کے پاس لاحاضر کیے جائیں۔

"سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون میں بحری غنیمتوں کے متعلق نہایت تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں۔ اگر بیڑے کو ہتیار بادشاہ خود مہیا کرے اور کشتیاں، رسد، اسلحہ، آدمی بھی وہی فراہم کرے تو جو کچھ مال غنیمت حاصل ہو وہ سب کا سب اسی کا ہوگا۔ اگر بادشاہ کے سوائے کوئی اور شخص جہاز کے آدمی فراہم کرے، تو بادشاہ کو تین چوتھائی مال غنیمت

262

ملے گا ۔ اگر بادشاہ کی طرف سے سوائے جہاز اور ہتیاروں کے کوئی اور چیز فراہم نہ ہو تو اسے مال غنیمت کا صرف آدھا ملے گا ۔ اور اگر وہ جہاز کے سوائے اور کوئی چیز فراہم نہ کرے تو اسے صرف چوتھائی حصہ ملے گا ۔ ان کے سوا باقی تمام صورتوں میں اسے مال غنیمت کا خمس یعنی پانچواں حصہ پانے کا حق ہوگا ۔ جہازی بیڑے کے امیرالبحر کو ہمیشہ مال غنیمت کا ساتواں حصہ پانے کا حق ہوگا ۔ اور غنیمت کا باقی حصہ غانموں میں بانٹ دیا جائے گا ۔ اور ان عہد و پیمان کا لحاظ کیا جائے گا جو اس بارے میں کیے گئے ہوں ۔

اگر دشمن سے وہ مال واپس حاصل کیا جائے جو اس نے پہلے ہم سے ہی چھینا تھا، تو کیا وہ پرانے مالک کو واپس دیدیا جائے ؟ یہ سوال اگرچہ بحری جنگ کے سلسلے میں پیدا ہوا، لیکن وہ اس امر پر مبنی ہے کہ آیا مال غنیمت کو پانے والا اس کا مالک بھی ہوجاتا ہے اور پرانے مالک کے تمام حقوق ختم بھی ہوجاتے ہیں یا نہیں ؟

اس سلسلے میں تین خیالات پائے جاتے ہیں[1] ۔

ایک گروہ کے خیال کے مطابق جوں ہی کوئی مال غنیمت حاصل کیا جائے اور کسی محفوظ و مامون مقام تک بھی نہ پہنچایا گیا ہو تو بھی غانم فوراً اس کا پورا مالک ہو جاتا ہے ۔

دوسرے گروہ کے مطابق قبضہ کمل کرنے اور ملکیت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مال غنیمت "کسی امن (محفوظ مقام) بہ

---

[1] ۔ مارتاں کی فرانسیسی تالیف "جہازی بیڑوں، غنیمتوں اور خاص کر غنیمت کی بازیابیوں کے متعلق رسالہ" ص ۱۱۹ ۔

پہنچا دیا جائے۔

تیسرے اور آخری گروہ کے مطابق پرانے مالک کا حق ختم ہوکر غانم کی ملکیت اس وقت شروع ہوجاتی ہے، جب وہ اس کے ہاتھ میں چوبیس گھنٹے رہ چکی ہو۔

چوبیس گھنٹوں کا قانون پھیل گیا۔ وہ مولف جو دوسرے دو خیالوں میں سے کسی ایک کے حامی تھے، عام طور پر یہ تسلیم کرنے لگے کہ رواج ان کی رائے کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اور الفونسو الماریقس خیمرسے دانشو جس نے یہ بیان کیا تھا کہ غنیمت اور اسیری کا قانون خدائی قانون ہے اور جس نے اس پر زور دیا تھا کہ مال غنیمت کو کسی محفوظ و مامون مقام پر پہنچا دینے کی ضرورت ہے، اس نے بھی بالآخر یہ تسلیم کرلیا کہ "ایک دن کے لیے قبضے میں ہونا" رواج کے باعث کافی سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ (لاطینی میں) کہتا ہے کہ: "معقولیت کے نزدیک یہ کافی ہے کہ عموماً ایک دن کے گزر جانے کے بعد واپس لینے کا ارادہ ختم ہوجائے۔" البتہ وہ اس کا اضافہ کرتا ہے کہ یہ تصور کرلینا کہ چوبیس گھنٹوں کا گزرنا پرانے مالک کو اس کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال منقطع کرادے گا، تو ایسا تصور نہ تو حق بجانب ہوگا اور نہ مطابق قانون۔ اس کے برخلاف کتاب "سات ارکان" میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ مال غنیمت کی ملکیت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ (لاطینی میں) "ایک رات نہ گزر جائے" یا وہ "کسی مامن کو نہ پہنچا دیا جائے۔"

263 جس قاعدے کے مطابق یہ ضروری ہے کہ مال غنیمت چوبیس گھنٹے ہاتھ میں رہے، وہ حقیقت میں لومبارڈیوں کے قانون سے ماخوذ ہے، جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی جانور کو زخمی کرے تو اتنی مدت گزر جانے کے بعد اگر کوئی دوسرا شخص اس پر خود قبضہ کرلے تو وہ کسی قصور کا مرتکب نہیں سمجھا جائے گا۔ حقیقت میں بادشاہ روتاریس نے

جو "لومبارڈیوں کا ضابطہ" نافذ کیا تھا اس کے باب (۳۱۴) میں حسب ذیل لاطینی الفاظ میں حکم دیا گیا تھا کہ "کتنے عرصے تک شکار، شکار کنندہ کا سمجھا جائے گا؟ ـــــ اگر ہرن یا کسی اور جانور کو کسی اور شخص نے تیر سے زخمی کیا ہو تو وہ اسی تیر چلانے والے کا سمجھا جائے گا تا آنکہ اس کے اسے چھوڑ کر واپس جانے کے بعد سے ایک دن اور رات گزر کر وہی گھنٹہ دوبارہ نہ شروع ہوجائے یعنی (۲۴) گھنٹوں تک ۔ اور جو کوئی اسے اتنی مدت کے گزر جانے کے بعد پائے تو اس کا لے لینا جرم نہ ہوگا بلکہ اس کا اپنا شکار سمجھا جائے گا۔"

جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، یہی قاعدہ چل پڑا ۔ اور یہ عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۵۹۵ء میں لیئیر کے شہر پر ولندیزیوں نے قبضہ کیا اور اسی دن اسپینیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا تو وہ مال غنیمت جو وہاں کے باشندوں سے چھینا گیا تھا پھر انھیں کو واپس دیدیا گیا، کیونکہ وہ دشمن کے ہاتھ میں چوبیس گھنٹے تک نہیں رہا تھا۔

264

باب دوازدہم

صلح اور صلح کے معاہدے

جنگ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے، اور صلح و امن ہی عادتی اور معمولی حالت ہے۔ قرون متوسط کے مولف برابر یہی کہے جاتے ہیں۔ ہر ایک کے پاس چند ایسے کلیہ قاعدے بیان ہوئے ہیں جو نسلہا نسل تک اس کو اسی طرح دہرائے چلے جاتے ہیں گویا کہ وہ کوئی مذہبی صداقت ہو۔ اور ہر زمانے میں ایک ہی خیال پیش ہوتا رہا ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ "امن ایک ایسا قاعدہ ہے جس پر سب کا اجماع ہے"۔ (—— یہی نشاء مکرر لاطینی میں ——) قرون متوسط کے بے شمار مولف اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ اسی بابائے کلیسا نے یہ بھی کہا تھا کہ: "نوع انسانی کی نظری خواہش یہی ہے کہ دولت امن حاصل کرے کیونکہ اس فانی زندگی میں اس سے زیادہ خوشگوار اور اس سے زیادہ مفید کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی"۔ (—— یہی چیز مکرر، لاطینی الفاظ میں ——)۔ امن و صلح اصولاً ایک قانونی تصور ہے، اور قانونی کارروائی کی تکمیل کا نام ہے۔ چنانچہ اسی کو ہم آہنگی، باضابطگی اور حقوق کا تحقق کہا جاسکتا ہے۔

ماہرینِ قانونِ مذہبی اس مسئلے کا زیادہ تر اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے تھے

کہ خانگی جنگ رک جائے۔ لیکن قرون متوسط کے اواخر میں ان کے نظریوں کو جو ترقیاں حاصل ہوئیں، تو ان کا اطلاق ان صورتوں پر بھی کیا جانے لگا جن کو صحیح معنوں میں جنگ کہا جاسکتا ہے۔ نویں گرے گری کے "مجموعۂ احکام" میں عارضی صلح اور امن کا جو باب ہے اور جس میں انھیں احکام کو دہرایا گیا ہے جو ۱۱۷۹ء کی مجلس شورائے مذہبی منعقدۂ شہر لاتران نے "خدائی صلح" کے متعلق صادر کیے تھے، اسی پر اس مسئلے کا دار و مدار ہے۔ اور مختلف مولف اسی کی توضیح اور تشریح کرکے معاہدات صلح کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے تقریباً وسط میں ترانی کے، گوف فرے دو نے ایک لاطینی کتاب "احکام پاپائی کے عنوانوں کا خلاصہ" کے نام سے لکھی۔ یہ قرون متوسط کی ان اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے جس نے کلیسا والوں میں قانونیات کے متعلق معلومات پھیلائے۔ اس میں صلح کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ جھگڑے کے اختتام کا نام ہے (— مکرر یہی مفہوم لاطینی الفاظ میں —[1])۔ یہ تعریف مقبولیت بالکل حاصل نہ کرسکی۔ چنانچہ اوک تارقیاں بیل پلی نے اسے ناکافی قرار دیا اور کہا کہ "اگر صلح اسی چیز کا نام ہے جو ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے، تو وہ اس موجودہ زندگی کے ختم ہونے سے پہلے نہیں آسکتی کیونکہ موجودہ زندگی تو جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے" اس نے بار تولے کی تعریف کو ترجیح دی جس نے یہ کہا تھا کہ صلح اس پیمان کا نام ہے جس سے جھگڑے اور لڑائی کو ختم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اپنے لاطینی الفاظ میں "ایسا پیمان جو جھگڑے اور لڑائی کو ختم کردیتا ہے"۔ نیز رے نو کور شو کی تعریف کو بھی ترجیح دی جس نے یہ کہا تھا کہ صلح کی بحالی دونوں جھگڑنے والے فریقوں کو ملا دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے اپنے لاطینی الفاظ میں: "صلح کی بحالی یہ ہے کہ دونوں جھگڑنے والے

[1] لاطینی تالیف جو یوحان گولڈن شائف کی طرف منسوب ہے ۱۴۸۵ء سے ۱۴۹۰ء تک کولون میں چھپی تھی "احکام پاپائی کے عنوان کا خلاصہ ترانی کے استاد گوفرے دو کی تالیف۔ . . .

باب عارضی صلح اور صلح"

فریق مل جائیں"۔[1]

صلح اور عارضی صلح میں ہمارے مولف ایک امتیاز قائم کرتے ہیں ۔ شرح نویسوں نے یہ لکھا تھا کہ عارضی صلح وہ اطمینان دہانی ہے جو اشیاء اور اشخاص کو اسی وقت عطا کی جاتی ہے جب کہ ابھی جھگڑے کا فیصلہ نہ ہوا ہو۔ (—— یہی مفہوم مکرر اصل لاطینی میں ——) اس کے برخلاف صلح کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ دوامی ہو اور اس سے مراد یہ لیجاتی تھی کہ وہ اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ کئے ہوئے اقرار کی پابندی ہوتی رہے ۔ یہی تصور کتاب "سات ارکان" میں بھی سرایت کر گیا' جسے اگرچہ ابتداءً قانون سازانہ حیثیت تو حاصل نہ تھی لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جلدی ہی اس تالیف نے قانونی حیثیت حاصل کر لی[2] نزانی کے گوف وژے وتو کا ابھی ہم نے ذکر کیا تھا۔ یہ بھی اپنے ہمعصروں کی طرح ان عارضی صلحوں میں امتیاز کرتا ہے جو عہد و پیمان اور قانون مذہبی کے باعث عمل میں لائی جائیں۔ قانون مذہبی کی عارضی صلح سے مراد خدائی صلح ہے جس کے ملحوظ رکھے جانے کی نگرانی اسقف کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "قانون مذہبی کی عارضی صلح کے ملحوظ رکھنے کے لیے تین اسباب کی ضرورت ہے ..... کلیسائی حدود سے جات باہر کرنا' ہمسایہ اسقفوں کا مقدس مراسم کو انجام دینا' اور شریک اسقف خطرے میں ہو تو اسے مدد دینا۔" غرض جات باہر کرنا' مقدم مراسم کو انجام دینا' اور ہمسایہ اسقفوں کا مدد دینا' یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے سے' ان احکام کی تعمیل کرائی جاتی تھی جو مجالس شورائے مذہبی کی عطا کردہ حفاظت کے متعلق صادر ہوئے تھے۔

جو عارضی صلح' عہد و پیمان کے ذریعے سے کی جاتی تھی اس کی تعمیل کے لیے مختلف قسم کی ضمانتیں حاصل ہوتی تھیں جیسے یرغمال' ضامن وغیرہ۔

---

[1] ۔ اوکتاقیانوس فیل بلس کی لاطینی تالیف "عارضی صلح اور صلح" جو رسائل قانون عمومی میں شامل ہے جلد (۱۱) حصۂ اول' ورق (۴۰۶)۔

[2] ۔ "سات ارکان" نامی مجموعۂ قانون قسطیلہ' حصۂ سوم' عنوان (۱۳)" عارضی صلح' امن اور صلح"۔

صلح سے مراد پرامن طور پر اپنی آزادی سے استفادہ کرنا ہے۔ وہ جنگ کے برخلاف ایک چیز ہے۔ وہ جنگ کا اختتام اور جنگ کی موت ہے۔ (لاطینی میں): "صلح سے مراد کسی کی آزادی کا امن سے رہنا ہے۔ وہ جنگ کے خلاف ایک چیز ہے۔ اور وہ جنگ کو ختم کرنا اور دفن کر دینا ہے۔" تُوڑال دِوک کے مصدر پادری دِیلمُس ماتیے نے کہا تھا کہ: "جنگ کا مقصد اس چیز کو دور کرنا ہے جو صلح میں خلل انداز ہو۔"

صلح کی حیثیت ایک مدامی چیز کی ہے۔ (لاطینی میں) "صلح کی حیثیت یہ ہے کہ وہ مدامی ہو۔" دوسرے الفاظ میں یہ ممکن ہے کہ صلح ٹوٹ جائے، لیکن صلح کرنے والوں کے ذہن یا نیت میں یہ احتمال موجود نہیں رہتا۔ ۱۶۶۹ء میں جامعہ لائپزگ میں ایک لاطینی مقالہ لکھا گیا جس کا عنوان "مدامی صلح" تھا۔ اسے ماہر دینیات ثَالَنتِین البرتی کی جو جدلیات اور ماوراء الطبیعیات کا پروفیسر تھا، نگرانی میں، گوٹ لیب بلی شیوس نے تحریر کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ صلح کے مدامی ہونے سے منشاء یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جاری رہنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ مقالہ نگار اُن مولفوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جو کبھی تو کسی فرضی نام کے پردے میں، اور کبھی اپنا منہ چھپائے ہوئے، یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ ۱۶۴۸ء میں جو معاہدے طے ہوئے، اور جن میں پراٹسٹنٹوں کے لیے مذہبی آزادی تسلیم کی گئی تھی، وہ محض عارضی تھے۔

"عام معافی" کی شرط کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ دوران جنگ میں جو جو دعوے پیش کیے گئے تھے، ان سے فریقین دستبردار ہو جائیں۔ معافی کی شرط (نیم لاطینی نیم یونانی میں) "قانون عفو" یا (لاطینی میں) "بھلا دینے کے قانون" کا ذکر کرتے ہوئے پیئیر گودلیِن نے بیان کیا ہے کہ وہ صلح کی اصل اور نچوڑ ہے۔ اور اگر کبھی نام لے کر اس شرط کا ذکر نہ بھی کیا جائے تو مضمر سمجھی جائے گی۔ چنانچہ اس کے اپنے لاطینی الفاظ میں "اس پر صلح کا اصل اصول مشتمل ہے اور اس کے بغیر صلح ہو نہیں سکتی۔ مزید برآں صلح کرنے میں یہ قانون مضمر ہی رہا کرتا ہے۔ چاہے تم صراحت کے ساتھ اس کا

ذکر نہ کرو۔"[1]

جنگ کی وجہ سے بار ہا اس کی ضرورت پیش آتی تھی کہ حسن خدمات پیش کر کے بیچ بچاؤ کیا جائے۔ قرون متوسطہ میں پوپ اکثر بیچ میں پڑ جاتے تھے اور ان کی کوششوں کو اکثر تاج کامرانی ہی حاصل ہو جاتا تھا۔ ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ انگلستان اور فرانس کی طویل اور ہولناک جنگوں میں مقام مقدس پاپائی کی گفت و شنید کے نتیجے کے طور پر عارضی صلحیں بکثرت طے ہوتی رہیں۔ آرنیں یوں میں قیام کے دوران میں پوپ زیادہ تر فرانس کی تائید میں دخل دہی کرتے رہے۔ مزید برآں عظیم ترکی خطرے کے باعث بھی پوپوں کی توجہ منعطف ہوتی رہی۔ اور وہ عیسائیت کے اندر صلح بحال کرنے کی جو ترغیب و تحریص دلاتے رہے اس میں (عیسائیوں کی باہمی لڑائی سے) سخت ترین اور پرجوش نفرت کے اظہار کے ساتھ ہی ساتھ ایک صلیبی جنگ کی دعوت دی جاتی رہی۔

۱۳۶۰ء میں بیرے تیں یی کا معاہدہ طے ہوا، جو بڑی حد تک پوپ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ پوپ نے فرانس کے بادشاہ یعنی دوسرے ژاں کو اپنا فدیہ ادا کرنے میں تک مدد کی۔ اور اس نے اس کے لیے اپنے خزانے کھول دیے، جس طرح اس کے پیشروؤں میں سے ایک سے زیادہ نے کیا تھا۔

اس کے بعد کی صدی میں پوپ پانچویں مارٹن نے فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں کو مسلسل اس کی نصیحت کی کہ اپنا ہولناک جھگڑا ختم کر دیں۔ اگر ۱۴۳۵ء میں فرانس کے بادشاہ ساتویں شارل نے اس میں کامیابی حاصل کی کہ "اچھے فلپ" کو انگریزی حلیفی سے جدا کر لے اور فرانس کی بادشاہت کو تباہی سے بچا لے، تو یہ پوپ جو تھے یوجین اور شہر بال (بازل) کی مجلس شورائے مذہبی کی عنایت سے ممکن ہوا تھا۔ اگرچہ ان میں آپس میں بہت سے نکات کے متعلق باہم اختلاف تھا، لیکن وہ اس بات پر متفق تھے کہ

---

[1] پیئیر گو دلیس کی لاطینی تالیف "قانون جنگ کی شرح" باب (۳)۔

عیسائیت کے اندر صلح بحال کرانے کی کوشش کریں۔" جسارت مند شارل کے محافظ دستے کا کپتان اولی وی اے ڈلا مارش اپنی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" میں بیان کرتا ہے کہ: "پوپ چوتھے یوجین نے اپنے نمایندے اور سفیر فرانس روانہ کئے، خاص کر مقدس صلیب کے کارڈنل (پادری) کو۔ ان لوگوں نے اس معاملے میں کچھ اتنی محنت اور مشقت کی کہ علاقۂ آرتوا میں آراس کے مقام پر ایک اجتماع کو منظور کر لیا گیا جہاں خدا کی عنایت سے صلح، پیمان اور باہمی صفائی وجود میں آگئی۔"[1]

۱۴۳۵ء میں آراس میں جو صلح ہوئی وہ بڑی دلچسپی کی حامل ہے۔ پوپ اور مجلس شورائے مذہبی کے پادریوں کی تحریک سے فرانس کے بادشاہ اور برگنڈی کے ڈیوک میں، جو انگریزوں کا سب سے طاقتور حلیف تھا، ایک عارضی سمجھوتہ ہو گیا۔ اس میں قرار پایا تھا کہ:۔ (۱) آراس میں گفت وشنید کے انتظامات عمل میں لائے جائیں تاکہ چھٹے ہنری کے ساتھ عام صلح کا معاہدہ طے ہو۔ (۲) وہاں ساتواں شارل، انگلستان کے بادشاہ کو مناسب تجویزیں پیش کرے۔ اور اگر ہنری ان کو قبول نہ کرے تو ڈیوک اپنی پوری کوشش کرے گا کہ (فرانس کی) بادشاہت کو صلح حاصل ہو۔ (۳) اگر ڈیوک، بادشاہ ہنری کا ساتھ چھوڑ دے تو ساتواں شارل اسے چند معینہ شہر دیدے گا۔ (۴) فلپ اس کی کوشش کرے گا کہ انگلستان کا بادشاہ اپنے مختار کل نمایندے آراس سے روانہ کرے اور پوپ اور مجلس شورائے مذہبی اور تمام عیسائی حکمرانوں کو دعوت دی جائے گی کہ اس اجتماع میں اپنے نمایندے روانہ کریں۔[2]

اس کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اور آں ری مارتین کے بیان کے مطابق

---

[1] اولی وی اے ڈلا مارش کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" (انجمن تاریخ فرانس کا نشریہ) جلد (۱) ص ۲۰۳۔

[2] آں ری مارتین کی فرانسیسی تالیف "تاریخ فرانس" جلد (۶) ص ۲۳۰۔

263

وہ پوری عیسائیت کا حقیقت میں ایک عمومی اجتماع تھا۔ قریب قریب تمام حکمرانوں نے وہاں نمایندے بھیجے۔ حاضرین میں لوزِیں یاں کا اِوگ، قبرص کا کارڈینل، مجلس شورائے مذہبی کا سفیر، نکولاس آلبرگافی، مقدس صلیب کا نگران کارڈینل، پوپ کا نمایندہ، شہنشاہ کے ایلچی، قسطنطلہ، آراگون، ناوار، پرتگال، نیپلز، صقلیہ، پولینڈ، قبرص اور ڈنمارک کے بادشاہوں اور میلان، برے تانیں، دبرٹینی اور آلانسوں کے ڈیوکوں کے سفیر اور جامعۂ پارس اور شہر پارس کے نمایندے، نیز فرانس، برگنڈی اور نشیبستان ہالینڈ کے علاقوں اور بڑے شہروں کے نمایندے بھی شامل تھے۔ انگلستان اور فرانس کے بادشاہوں نے اپنے مختار کل بھیجے۔ "اچھا فلپ" بذات خود شریک رہا۔

قبرص کے کارڈینل اور صلیب مقدس کے کارڈینل ہر دو نے بیچ بچاؤ کے لیے اپنے خدمات پیش کیے۔ اور فریقین مخاصمت میں سے ہر ایک کے سامنے یہ پیشکش کیا کہ وہ ان کے توسط سے اپنی تحریکیں، اور فریق ثانی کی تحریکوں کے جواب، بھیج سکتے ہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح نہیں ہوسکی۔ پھر اس کی کوشش کی گئی کہ برگنڈی کے ڈیوک اور فرانس کے بادشاہ ساتویں شارل میں صفائی کرادی جائے۔ ۱۴۲۰ء میں تروا میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی شرطیں فلپ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ ماہرین قانون اور ماہرین دینیات میں مشورے عمل میں آئے۔ اور ایک باضابطہ بحث کے بعد مجلس شورائے مذہبی اور پوپ ہردو کے نمایندوں نے "ہمارے آقا حضرت یسوع مسیح کے جذبات رحم اور ہمارے مقدس باپ پوپ اور شہر بال میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نیز عالمگیر کلیسا کے اقتدار کے واسطے سے" ڈیوک کو قسم دی کہ وہ صلح کرلے۔ یہ صلح نامہ ۲۱ ستمبر ۱۴۳۵ء کو سینٹ واسٹ کے کلیسا میں پیش ہوا اور باضابطہ طور سے اس پر حلف اٹھایا گیا اور اس سے سب کو واقف کرانے کے لیے اس کی نقلیں ہر طرف بھیجدی گئیں اولی ڈی لا مارش نے لکھا ہے کہ "تب

صلح نامے پر حلف اٹھایا گیا، اس کی تکمیل ہوئی اور تمام فریقوں نے اس پر مہریں لگائیں اور اسے فرانس کی بادشاہت اور برگنڈی کے سردار کے علاقے اور دیگر مقاموں پر شائع کیا گیا۔ چنانچہ مذکورہ معاہدہ پورتالی کے مقام پر بھی آیا جہاں میں گیا تھا۔ اور اس کی ایک نقل بینیر دسیں موٹرس نے، جو وہاں کا اسکوائر تھا، حاصل کی اور اسے میرے باپ کے ہاں روانہ کیا۔"[1]

فرانس کے بادشاہ نے بڑی بڑی رعایتیں منظور کی تھیں۔ اور اس کے بدلے میں برگنڈی کے ڈیوک نے منظور کیا تھا کہ ماضی کو بالکل بھلا دے اور بادشاہ کی رضامندی کے بغیر انگریزوں کے ساتھ کبھی معاہدہ نہ کرے۔ ہر دو فریقوں نے پیشگی ہی اپنی رعایا کو اس فریق کے متعلق حلف وفاداری سے بری الذمہ کر دیا جو اس اقرار کی خلاف ورزی کرے۔ اور فریقین نے یہ بھی قبول کیا کہ اگر وہ عہد شکنی کریں تو انھیں جات باہر کر دیا جائے۔ اس معاہدے پر تمام شاہی نسل کے شہزادوں، صدر پادریوں، جاگیرداروں اور ملک کے بڑے شہروں کی طرف سے مہریں کی گئیں اور ان سبھوں نے اپنے کو اس کا ضامن قرار دیا۔ پوپ کے دونوں نمایندوں نے فلپ کو اس حلف سے بری الذمہ قرار دے دیا جو اس نے انگریزوں کے لیے اٹھایا تھا۔[2]

قرون متوسطہ میں معاہدوں کی تعمیل کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے بعض اور ذیلی ذریعے بھی اختیار کئے جاتے تھے۔ ان ذریعوں میں حسب ذیل چیزیں داخل تھیں:

حلف، روٹی اور شراب کی مقدس رسم، صلیب کو بوسہ دینا، زبانی اطمینان دہانی یا دوسرے الفاظ میں وعدہ، حقیقی اطمینان دہانی یعنی چند ضامنوں کی حوالگی، شخصی اطمینان،

---

[1] اولی ڈی لا مارش کی مذکورہ تالیف جلد (۱) صفحہ ۲۰۵۔

[2] آں ری مارتیں کی مذکورہ تالیف "تاریخ فرانس" جلد (۶) صفحہ ۲۳۲ و مابعد۔

جس کی دو قسمیں ہوتیں: کبھی تو اختیاری ہوتی، جب کہ اطمینان
دلانے والے اپنی ہی رضامندی اور اختیار سے اطمینان دلائیں۔
دوسرے جبری، جب کہ یرغمال دیے جائیں۔

یہ نظر آتا ہے کہ مقبوضات اور صوبجات کو بھی عمومی رہن کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کی اور نظیروں میں فرانس کے پانچویں فلپ نے بھی فلانڈرس کے کونٹ کے متعلق ایسا ہی کیا تھا۔ شہنشاہ لوئی نے جو "باویریا والے" کے نام سے مشہور ہے، اپنی پوری شہنشاہت رہن میں پیش کر دی تھی۔

قانونِ روما کے قاعدے اب قانونِ عمومی میں برتے جانے لگے۔ چنانچہ نائیزوں نے لکھا ہے کہ: "کبھی تو قرار ناموں کی شکل پر اعتراض کیا جاتا، کبھی کوئی عظیم الشان خلاف ورزی قرار دی جاتی۔ اور کبھی یہ رائے دی جاتی کہ نابالغی، خوف یا فریب پایا گیا جس کے باعث واپسی عمل میں لائی جائے"۔[۱] اسی باعث باضابطہ طور سے بے تعلقی کے اظہار کیے جاتے رہے۔ چنانچہ فالوا کے فلپ نے بوہیمیا کے ژاں کے ساتھ ۱۳۳۴ء میں جو معاہدہ کیا تھا، اس سے یہ کہہ کر اپنی بے تعلقی ظاہر کی کہ: "قانون اور واقعات کی غلطی کے باعث، نیز اس قانون کی بناء پر جو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ لوگ جنھیں حقیقی قیمت سے نصف سے زیادہ کی بابت دھوکا ہوا ہو، وہ چار مہینوں کے اندر واپسی کے حقدار ہیں۔" حسب کتاب دوم، باب خرید و فروخت"۔

اس معاہدے پر جو حلف لیا جاتا وہ لازمی طور پر ایک مذہبی حیثیت

---

[۱] نائیزوں کی فرانسیسی تالیف "تاریخی اور سیاسی مقالہ ضمانتوں کے متعلق خاص کر قدیم لوگوں اور یورپ کی جدید قوموں کے ان مختلف طریقوں کے متعلق جو پبلک معاہدات کی تعمیل کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں" مطبوعہ گوٹنگن ۱۸۷۱ء صفحہ ۷۰۔

اختیار کرلیتا ہے۔ اسی باعث پوپوں کو یہ موقع ملا کہ ہر صلح شکنی کی اطلاع پیشگی دیے جانے کا مطالبہ کریں۔

مولفوں نے پوپوں کے دعووں کو تسلیم کرلیا۔ چنانچہ لودی کے مارتن نے بیان کیا ہے کہ "پوپ حکمرانوں کو اس پر مجبور کرسکتا ہے کہ جو صلح کی گئی ہو، اس کا وہ احترام کریں...... [1] صلح شکنی کا جرم، جو مختلف حکمرانوں کے مابین عمل میں آئے، اس کا تعلق کلیسائی عدالت سے ہے"۔ [2]

270

حکمران اس مطالبے کے سامنے جھک گئے جو پوپ اپنے اختیار سماعت کے متعلق کر رہے تھے۔ ۱۴۳۵ء میں آراس کا معاہدہ ہوا تو ساتویں شارل نے یہ قبول کیا کہ، اگر وہ صلح کی خلاف ورزی کرے تو وہ "ہمارے مقدس باپ، مقدس مجلس شورائے مذہبی اور کارڈینلوں نیز تمام دیگر کلیسائی و کشوری عدالتوں کی ملامت اور ان کی طرف سے جبر و اکراہ اور تشدد کیے جانے کا" متوجب ہوگا۔

دشمن سے کیے ہوئے عہد کی پابندی کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ پوپ، حکمرانوں کو ان کے حلف سے، برائت عطا کرسکنے کے حق کے دعویدار تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرون متوسطہ میں کسی حلف کو جو قوت حاصل ہوتی ہے، اس کا بڑا حصہ برباد ہوگیا۔ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بادشاہ اور بعض پوپ کیا کارستانیاں کرتے رہے؟ جب وارک کے کونٹ نے چوتھے ایڈورڈ کو تخت چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا اور اسی تخت سے ایڈورڈ نے چھٹے ہنری کو اتار ڈالا تھا تو ایڈورڈ اس پر مجبور ہوا کہ براعظم یورپ میں

---

[1]۔ مارتینس لودینسس (لودی کے مارتن) کی لاطینی تالیف "حلیفان، صلح اور حکمرانوں کے معاہدے" مسئلہ (۱۹)۔

[2]۔ ایضاً مسئلہ (۲۲)۔

جا پناہ لے۔ لیکن چونکہ "جسارت مند شارل" اس کا برادر نسبتی تھا، اس لیے اس کی امداد کے باعث وہ اس بات میں کامیاب ہوا کہ دوبارہ انگلستان میں داخل ہو اور اپنا تاج دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسے یہ ضرورت پیش آئی کہ اپنی تجویزیں چھپائے رکھے۔ چنانچہ اس نے شہر یارک میں روٹی اور شراب کی مقدس رسم میں شرکت کر کے باشندوں کے سامنے باضابطہ طور سے قسم کھائی کہ وہ صرف یارک کی ڈیوکی کا مطالبہ کرنے کے لیے آیا ہے جو اس کا موروثی علاقہ ہے اور یہ کہ وہ خانوادۂ لنکاسٹر کے نمایندے یعنی چھٹے ہنری کی وفاداری کے ساتھ اطاعت کرے گا۔ بارنٹ کی لڑائی میں چوتھے ایڈورڈ کو فتح ہوئی اور وہیں وارک مارا پڑا۔ پھر چھٹے ہنری کے طرفدار ہنری کے بیٹے یعنی نوجوان شہزادہ ایڈورڈ اور اس کی ملکہ یعنی آں ژو کی مارگریٹ کی قیادت میں بڑھے۔ لیکن ٹیوکس بری میں انھیں شکست ہوگئی۔ ولی عہد میدان جنگ ہی میں کھیت رہا۔ ملکہ مارگریٹ قید ہوگئی اور جب چوتھا ایڈورڈ، لندن میں فاتحانہ داخل ہوا تو وہ اس کے جلوس کی آرایش کا ایک ذریعہ بنائی گئی۔ چھٹا ہنری مرگیا۔ اور غالباً اسے لندن کے برج میں مار ڈالا گیا۔ چوتھے ایڈورڈ کی فتح تکمل تھی۔ اب اس نے پوپ سے یہ استدعاء کی کہ وہ اسے اس کے حلف سے بری الذمہ قرار دے، کیونکہ اس نے وہ حلف "بے اختیاطی کے باعث" اٹھایا تھا۔

جب ضرورت ہوتی تو بادشاہ ضروری احتیاطیں بھی اختیار کر لیتے۔ لندن کے محافظ خانے میں پوپوں کے فرامین کی ایک بڑی تعداد محفوظ ہے جو انگلستان کے مختلف بادشاہوں کے نام بھیجے جاتے رہے۔ ان میں بعض سبق آموز چیزیں بھی ہیں۔ پوپ تیسرے انوسنٹ نے "جان بے علاقہ" کو یہ امتیاز عطا کیا کہ اس کو نہ تو کبھی جات باہر کیا جائے گا اور نہ اس کے گرجا میں پادریوں کو مذہبی مراسم کی انجام دہی چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے گا، بجز اس کے کہ پوپ کوئی خصوصی حکم نامہ جاری کرے۔ ۱۲۳۱ء میں پوپ نویں گرے گری

27

نے تیسرے ہنری کی ذات کو جات باہر کیے جا سکنے سے، اور اس کے گرجا کے پادریوں کو مذہبی مراسم کی انجام دہی سے باز رہنے کا حکم دیا جا سکنے سے، مستثنیٰ قرار دیا۔ پوپ چوتھے انوسنٹ نے بھی اسی بادشاہ کو مذکورۂ بالا دونوں امتیاز عطا کیے بجز اس کے کہ مقام مقدس پاپائی سے کوئی اور خصوصی حکم صادر ہو۔ ۱۳۰۰ء میں پوپ پانچویں کلیمان نے پہلے ایڈورڈ کو جات باہر کیے جانے، عارضی معطلی اور گرجا کے پادریوں کو مذہبی مراسم کی ممانعت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اسی قسم کا استثناء اسی سال پرنس آف ویلز کو بھی عطاء ہوا۔ پہلے ایڈورڈ کو پوپ نے اس لیے جات باہر کر دیا تھا کہ اس نے اپنے آباو اجداد کی میراث کی حفاظت کے سلسلے میں قتل و خون، مقدس اشیاء کی بے حرمتی اور دیگر ظلم و زیادتی کا ارتکاب کیا تھا۔ ۱۳۰۹ء میں پوپ نے جات باہر کیے جانے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ گویا یہ وہ صورت تھی جس میں احتیاطی تدبیریں پیشگی اختیار کی جائیں اور تلافی بعد میں عمل میں لائی جائے۔

۱۳۱۷ء میں پوپ بائیسویں جان نے انگلستان کے بادشاہ سے وعدہ کیا کہ یہ بادشاہ اس وقت بھی جن استثنائی مراعات سے مستفید ہو رہا تھا ان کی علاوہ اس کے گرجا، ذاتی اور عبادت گاہوں کے خلاف کبھی کوئی ایسا حکم صادر نہیں کیا جائے گا کہ وہاں کے پادری مذہبی مراسم کی انجام دہی چھوڑ دیں، اور نہ ہی اس بادشاہ کو جات باہر کیا جائے گا۔[1]

ایک اور رُخ میں بھی یہ نظر آتا ہے کہ مختلف حکمران پوپ پر زور دیتے ہیں کہ وہ ان کے حریف کو حلف کی پابندی سے بری نہ قرار دے۔

۱۴۷۱ء میں گیارھویں لوئی نے ایک سفیر روما روانہ کیا تاکہ پوپ چوتھے سکسٹس سے التجا کرے کہ وہ گوئینن کے ڈیوک کے اس حلف کو برقرار رکھے کہ وہ برگنڈی کی ماری سے شادی نہیں

۱۔ ریکارڈ آفس کی شائع کردہ انگریزی تالیف "پوپ کے فرمانوں کی تقویم" فرمان (۱۸)۔

کرے گا۔[1]

ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جن میں مختلف حکمران حلف اٹھاتے وقت یہ بھی قسم کھاتے ہیں کہ وہ اس حلف سے بری قرار دیے جانے کے لیے پوپ سے مدد نہیں لیں گے۔ چنانچہ ۱۴۷۵ء میں گیارھویں لوئی اور "جسارت مند شارل" نے ایسا کیا تھا۔ ۱۵۲۶ء میں شارل پنجم اور پہلے فرانسوا نے بھی یوں ہی کیا تھا جس کا ذکر ہم اوپر صفحہ 216 پر کر چکے ہیں۔

اکثر پوپ کسی معاہدے کی ضمانت کے لیے ایک فرمان شائع کرتا اور اس کی خلاف ورزی پر جماعت باہر کرنے کی دھمکی دیتا۔ گیارھویں لوئی نے اپنے ایک سفیر ژان دو ارسوں کو ہدایت دیتے ہوئے بیان کیا تھا کہ "کسی دعوے کی ضمانت کے لیے مضبوط مقامات کافی ہیں مگر اس سے بھی بہتر ضمانت یہ ہوگی کہ پوپ ان اقراروں کو اپنے پروانوں یا دیگر تعلق یا حکم کے ذریعے سے تقدس عطا کر دے"۔[2]

۱۵۱۴ء میں ایک معاہدہ فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں میں ہوا تھا، جس میں اولاً یہ بیان کیا گیا تھا کہ فریقین اسے اپنے ہاں کے تینوں طبقات رعایا کے نمایندوں یعنی پادریوں، جاگیرداروں اور باقی عمائد کی توثیق کے لیے پیش کریں گے۔ اور اس کے بعد لکھا تھا کہ اسے پوپ کے پاس بھی پیش کیا جائے گا اور یہ کہ معاہدہ کنندہ پوپ کے پاس اپنے نمایندے بھیج کر یہ التجا کریں گے کہ وہ فریقین میں سے اس کو جماعت باہر کر دے جو اس معاہدے کی شرطوں کی پوری پوری تعمیل نہ کرے۔ اور نیز یہ کہ اس کی پوری سلطنت میں پادریوں کو مذہبی مراسم کی انجام دہی چھوڑ دینے کا

---

[1] موڈ لاکلا فیبئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۴۳۔

[2] موڈ لاکلا فیبئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۳) صفحہ ۲۳۱۔

حکم دے۔ پہلے فرانسوا اور آٹھویں ہنری نے باضابطہ طور سے ان حقوق اور امتیازات سے دستبرداری منظور کی جو اس سلسلے میں ان کے تاج کو حاصل ہوں۔

۴ر اکتوبر ۱۵۱۸ء کو انگلستان کے بادشاہ اور فرانس کے بادشاہ میں ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ ان کی رعایا کی شکایتوں کی تلافی کی جائے۔ پہلا فرانسوا اس کی تعمیل کا حلف لینے کے لیے پاریس میں لے تورنیل کے گرجا کو گیا جہاں انگریز نمایندے بھی موجود تھے۔

اسی سال سینٹ ماری کا رڈینل، جو پوپ کا نمایندہ تھا، ایک افسر تصدیق کے سامنے اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کی اپنی، نیز گواہوں اور انگریزی نمایندوں کی موجودگی میں یہ تسلیم کرلیا ہے کہ وہ اور اس کے لوگ انگلستان کے بادشاہ کے چھے لاکھ کراؤن (سکوں) کے مدیون ہیں تاکہ تورنے کی واپسی عمل میں لائی جائے۔ اور یہ کہ فرانس کے بادشاہ نے یہ قبول کرلیا ہے کہ اگر وہ یہ ادائی عمل میں نہ لائے تو اسے جات باہر کردیا جائے۔ کارڈینل نے بادشاہ کو واقعی جات باہر بھی کردیا۔

اکثر یرغمال بھی دیے جاتے رہے۔ ان میں بارہا ملک کی سب سے بڑی شخصیتیں شامل ہوتی رہیں۔ برے تینی کے معاہدے میں ایک یہ شرط تھی کہ بادشاہ جان کو چاہیے کہ کالے سے روانگی کے چھے ماہ کے اندر اسی یرغمال حوالے کرے۔ ان میں چالیس شہامت باز اور اتنے ہی معزز شہری شریک تھے، جو فرانس کے بڑے بڑے شہروں سے چنے گئے تھے۔ ان معززین میں متعدد شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔

اگر مشکلیں پیدا ہوتیں تو بعض مرتبہ ان کو ایک خصوصی ادارے کے ذریعے سے ہموار کردیا جاتا یعنی "محافظین صلح" کا ادارہ۔ چنانچہ جب کبھی کوئی معاہدہ منعقد ہوتا تو چند ایسے لوگ نامزد کیے جاتے

278

جنھیں اس کی تعمیل کی نگرانی پر مامور کیا جاتا۔ یہ کبھی تو طاقتور شخصیتیں ہوتیں اور کبھی دستخط کرنے والے فریقوں کے کارندے ہوتے جن کا فریضہ یہ ہوتا کہ وقت بوقت کسی معینہ مقام پر باہم ملیں تاکہ جو جو خلاف ورزیاں عمل میں آئیں ان کو جمع کر کے ان سے پیدا ہونے والے جھگڑے کا تسویہ کریں۔ بعض وقت تو معاہدہ کنندہ مملکتوں کے بڑے بڑے شہر یہ فریضہ اپنے ذمے لیتے اور معاہدے پر اپنی بھی مہر تصدیق ثبت کرتے۔

" محافظین صلح " کا ذکر ۱۴۳۵ء کے معاہدۂ آراس میں ملتا ہے۔ ۱۵۰۵ء کے معاہدۂ بلوا میں فرانس کے بارھویں لوئی اور آراگون کے فردیناند نے انگلستان کے بادشاہ سے استدعا کی تھی کہ وہ ان کے معاہدے کا محافظ بننا منظور کرے۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ ہیں:

" انھوں نے جلالت مآب بادشاہ سے استدعا کی کہ اس برادرانہ امن اور اتحاد کا محافظ بن جائے۔"

" محافظ صلح " ہی کے فرایض میں یہ داخل تھا کہ اپنے توسط اور حسن خدمات کے ذریعے سے معاہدے کا نفاذ کرائے اور نئی مخاصمانہ کارروائیوں کے پھوٹ پڑنے کو روکے۔ بطور تدارک و تہدید، محافظ کے لیے یہ حق محفوظ ہوتا کہ اپنی تلوار کا وزن ترازو میں ڈال دے۔ ۱۴۹۳ء کے معاہدۂ سان لی میں محافظین صلح میں حسب ذیل شہروں کے نام بھی ملتے ہیں:

پاریس، رُوآں لیئوں، پواتیے، طُور، آں ژیرُ، اُورلے یاں، آمیاں اور تورنے کے شہر آٹھویں شارل کی طرف سے ..... اور لُوفَین بروسل، آن ؤیر، بُوال ڈُوک، گاں، بروگیس، لیل، دُوے آراس، سینت اومیر، مونس، ؤالاں سینئن، اوت ریشت، مِڈل بورگ، اور نامُور کے شہر شہنشاہ مکس میلین اور اس کے بیٹے آرک ڈیوک فلپ کی طرف سے۔

دستخط کنندوں میں سے ایک نے جو شہنشاہت کا ایک ماتحت تھا، اپنی مہر تصدیق کے ذریعے سے یہ وعدہ کیا کہ وہ صلح کو ملحوظ بھی رکھے گا اور [illegible] اس نے [illegible] کیا کہ اگر کوئی خلاف ورزی عمل میں [illegible] چھ ہفتوں کے اندر کوئی تلافی نہ ہو تو "وہ اپنے آقاؤں یعنی رومیوں کے بادشاہ اور آرک ڈیوک کا ساتھ چھوڑ دے گا اور ان سے قطع تعلق کر لے گا اور نہایت عیسائی بادشاہ کو مدد دے گا"۔[1]

بارھویں لوئی نے فتے نیس والوں کے خلاف ماکس میلین کے ساتھ ایک حلیفی کی تھی جس میں یہ اقرار کیا گیا تھا کہ "جرمنی میں شہنشاہت کے انتخاب میں رائے کا حق رکھنے والے حکمرانوں اور پوری مقدس رومی شہنشاہت کو طے شدہ شرائط معاہدہ کا محافظ مقرر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کو حق ہوگا اور ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس فریق کی تائید کریں جس نے اقراروں کی تعمیل کی ہو، اور یہ [illegible] اقراروں کی خلاف ورزی کرنے والے فریقوں کے خلاف [illegible]۔

تحویل ملزمین کے متعلق انیسویں صدی کے نصف دوم میں خاص کر بکثرت بین الممالک معاہدے کیے جاتے رہے۔ جس چیز کو "جرم کا مرتکب پایا جانا" کا نام دیا گیا تھا، اس کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ جاری رہی۔ قانون عمومی کے جرائم اور افعال ناجائز کو عام طور پر معاہدوں میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ لیکن سیاسی جرائم کے [illegible] بہت سی بندشیں عائد کی گئی تھیں۔

قرون متوسطہ میں علاقہ وار حق پناہ کا اصول برا جتا رہا۔

[illegible] قال، اسپین کا علم جزئیات کا ایک ماہر تھا۔ وہ سنہ ۱۶۲۶ء

---

[1] دیال دکورباں کی فرانسیسی تالیف "علم حکمرانی" جلد (د) صـ ۶۵۶ و مابعد۔

میں اسپین کی عدالت اعلیٰ کا ایک رکن (جج) بنا۔ اس لئے یہ قاعدہ وضع کیا
تھا کہ جو بادشاہتیں اور حکمرانیاں الگ الگ مقتدران اعلیٰ کی ماتحت ہیں،
ان کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ ایسی پناہ گاہیں ہیں جو وہاں آکر
پناہ لینے والوں کو امن و حفاظت مہیا کرتی ہیں۔[1] خود گزشتہ یعنی اٹھارویں
صدی میں ایکس لاشاپیل کی پارلیمان کے وکیل سرکار (اڈووکیٹ جنرل)
نے خاص کر فرانس سے متعلق اعلان کیا تھا کہ وہ اجنبی، جو کسی جرم کا ملزم
ہو، ہماری اس سرزمین کو چھوتے ہی ہر قسم کے تعاقب سے مامون و محفوظ
ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق کلیہ قاعدہ اس (لاطینی) مقولے میں ہے کہ "جو
کوئی فرانس کی سرزمین پر بطور پناہ گاہ آجاتا ہے، وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسے
مجرم کی ذات کی حفاظت کی جانی چاہئے ـــــ ہمارا مولف ان مقولوں
سے استدلال کرتا ہے۔

بعض ملحوظات نے اس قاعدے میں استثناء پیدا کرنے شروع کیے۔
چنانچہ ابتداءً سیاسی خلاف ورزیوں پر توجہ ہوئی۔ پھر شدید اور بدنام جرائم
کی صورت میں مجرم کی تحویل عمل میں آنے لگی۔

کچھ زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ عام طور پر مولفوں کو خود اس کے
متعلق غلط فہمی ہے۔ ابتدائی معاہدوں میں تو یہ اقرار فریقین معاہدہ پر
پابندی عاید کرتا تھا کہ اپنے علاقے میں فریق ثانی کے دشمن کو آنے نہ دیں
اور ضرورت ہو تو (اگر آچکا ہو تو) اسے وہاں سے نکال دیں۔ یہ صرف
کوتوالی کے فرائض کی انجام دہی ہے، نہ کہ کسی قانونی کارروائی کا آغاز۔
اس کا منشاء صرف اتنا ہی ہے کہ کسی دوست سلطنت کو مدد دی جائے۔

۱۳۰۲ء میں انگلستان اور فرانس کے بادشاہوں میں یہ طے ہوا
تھا کہ ان دونوں حکمرانوں میں سے کوئی بھی فریق ثانی کے دشمنوں کو نہ تو
اپنے علاقے میں آنے دے گا اور نہ ہی کسی اور طرح سے اس کی مدد کرے گا

[1] تو ماس کاربے قال کی لاطینی تالیف "مختلف قانونی مباحث" نمبر (۸۴۷)

فریقین نے یہ ذمہ داری لی کہ اپنی رعایا کو ان دشمنوں کی مدد سے روکیں اور خلاف ورزی کے لیے ذات و جایداد کی گرفتاری کی سزا مقرر کریں اور مطالبہ ہونے پر وہ ان دشمنوں کو چالیس دن کے اندر اپنے ہاں سے نکال دیں۔

۱۴۱۳ء میں چھٹے شارل کی حکومت نے انگلستان کے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا کہ فساد پارلیس کے مجرموں کو اچھے پہروں میں حوالے کردے، تاکہ انھیں سزا دی جا سکے۔ 27

۱۴۹۶ء میں ساتویں ہنری اور "حسین فلپ" میں معاہدہ طے ہوا۔ فریقین معاہدہ نے یہ ذمہ داری لی کہ فریق ثانی کے بدنام دشمنوں کو، (جو خشکی یا سمندر یا دریاؤں کے ذریعے سے حملہ کرنے کی تجویز کر رہے ہوں)، کوئی مدد یا مشورہ نہیں دیں گے۔ فریقین معاہدہ میں سے ہر ایک نے یہ ذمہ داری لی کہ فریق ثانی کو اپنے وسائل کے مطابق مدد دے۔ باغی، یا پناہ جو جھگوڑے، کو آنے نہیں دیا جائے گا۔ اگر دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک کو یہ اطلاع ملے کہ اس کا کوئی دشمن فریق ثانی کی سرزمین میں موجود ہے، تو اسے یہ حق ہوگا کہ فریق ثانی کو اس واقعے کی اطلاع دے۔ جس حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہو اس کا یہ فریضہ ہوگا کہ جس مہینے میں اطلاع ملی ہے اسی مہینے میں اس پناہ گزیں باغی کے نام یہ حکمنامہ جاری کرے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر وہ پندرہ دن کے اندر اس کی تعمیل نہ کرے تو چالان کرکے اس کے اخراج کا حکم دیا جائے گا۔ اور اگر وہ چالان اور حکم اخراج کی بھی تعمیل نہ کرے تو قانون تھا کہ اسے سزائے موت دیدی جائے۔

مذکورۂ بالا معاہدے کی شرط کی توجیہ آسان ہے۔ یارک کی مارگریٹ، جو برگنڈی کے فوت شدہ ڈیوک کی بیوی یعنی "جسارت مند شارل" کی بیوہ تھی، وہ نیشبستان (ہالینڈ) میں رہتی تھی، اور ساتویں ہنری کے خلاف سازشیں کیا کرتی تھی۔ چنانچہ اس نے فرضی مدعی پرکن وار بک

کو کھڑا کر دیا تھا جو یہ ادعا کرنے لگا کہ وہ یارک کا رچرڈ ہے، حالانکہ تصور یہ کیا جاتا تھا کہ ۱۴۸۳ء میں لندن کے برج میں اس کو اور ایک دوسرے شہزادے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک خاص لمحے انگلستان کے بادشاہ اور برگنڈی کے ڈیوک کے مابین بڑی مشکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ فلانڈرس کے تاجروں کا انگلستان سے اخراج عمل میں آ گیا تھا۔ نشیبستان ہالینڈ سے تجارت کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انگلستان کے بادشاہ نے صلح کر لی۔

جن جرائم اور افعال ناجائز کو سیاسی حیثیت حاصل نہ ہو، ان کے متعلق بہت شاذ و نادر ہی کوئی معاہدے ہوئے۔ ۱۳۷۶ء میں پانچویں شارل نے ساقوا کے کونٹ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ہر دو فریقوں نے یہ دیکھ کر کہ ناگوار جرائم کے مجرم کسی غیر علاقے میں جا پناہ لینے کی وجہ سے سزا سے بچ جاتے ہیں اور اس طرح دو فینے کے علاقے میں بھی پناہ گزیں آتے ہیں اور ساقوا کے علاقے میں بھی ...... اسی لیے انھوں نے طے کیا کہ فریقین میں سے کوئی جوں ہی مطالبہ کرے تو فریق ثانی اپنے ہاں آئے ہوئے بھگوڑے پناہ گزینوں کی تحویل کر دے گا۔ اور خود اپنی رعایا کو بھی سپرد کر دے گا جب کہ انھوں نے اجنبی (؟ فریق ثانی کے) علاقے میں جرم کا ارتکاب کیا ہو"

سولھویں صدی کے جرمن مولف اس مسئلے کا بڑی بالغ نظری سے تذکرہ کرتے ہیں۔

شہنشاہوں نے جرمنی کے شہروں کو یہ امتیاز دے رکھا تھا کہ شہنشاہت کے طول و عرض میں مجرموں کو گرفتار کر کے اپنے علاقوں میں لا لیں۔ ٹیوبنگن کے پروفیسر یوحان زِشارت نے اس قسم کے ایک امتیازی حق سے اپنی لاطینی کتاب "قانونی فتوے" میں بحث کی ہے لے

لہ۔ یحنس زشاردس (یوحان زشارت) کی لاطینی تالیف "قانونی فتوے"

نکولاس اے فر ہارڈی نے جو جامعۂ انگول اِشتات کا پروفیسر تھا، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ " مقام جرم کا حاکم عدالت، مرتکب جرم کی گرفتاری اور سپردگی کے لیے، ملزم کے مقام پیدائش یا مقام سکونت کے حاکم عدالت سے مطالبہ کر سکتا ہے ۔ چنانچہ (اصل لاطینی الفاظ میں) " مقام جرم کے حاکم عدالت کو مجرم کے مقام پیدائش یا مقام سکونت سے یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ فعل ناجائز کے مرتکب کو گرفتار کر کے سپرد کر دیا جائے"۔[1]

سترھویں صدی میں گروتیوس نے اسی نظریے پر زور دیا تھا کہ کسی قوم یا بادشاہ پر تو اصل میں مجرموں کی حوالگی کی پابندی نہیں ہے بلکہ اسے اختیار ہے کہ یا تو ان کی تحویل عمل میں لائے یا خود سزا دے۔

ہمارے زمانے میں سیاسی جرائم میں تحویل کے حامی اکثر ایک واقعے سے استدلال کرتے ہیں ۔ پہلے شارل کو سزائے موت سنائی گئی تھی ۔ جب وہ دوبارہ برسر اقتدار آیا، تو اس نے ان حکام عدالت کا بے طرح پیچھا کیا جنھوں نے سابقہ فیصلے جاری کیے تھے ۔ انھیں " قانون باہر" قرار دے دیا گیا ۔ ان میں سے تین صوبجات متحدہ میں چلے گئے تھے ۔ پھر وہاں سے نقل مقام کر کے جرمنی چلے گئے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں : مائیلز کاربٹ، جان بارک اِستیڈ اور کرنل او کے۔ شہر ہیگ میں انگلستان کا مقیم سیاسی (ریسیڈنٹ) جارج ڈاؤننگ رہتا تھا یہ کرامول کا ساختہ پرداختہ شخص تھا ۔ جب دوسرا شارل تخت نشین ہوا، تو ڈاؤننگ نے بادشاہ کی نظر عنایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مجرموں کو پناہ دینے کے متعلق مشورہ (افعال ناجائز کے مرتکبین کو ملک کے باہر پناہ دیے جانے کے متعلق)

[1] ۔ نکولاس اے فر ہارڈی کی لاطینی تالیف " مشوروں پر ایک کتاب " (مشورہ (۲۴): چیزوں کا گرفتار کر کے مقام جرم کو واپس بھیجنا اور نیز سزاؤں کے متعلق اشارے

چنانچہ اس نے (ہالینڈ کے) ہر سہ طبقات رعایا کے نمایندوں کے نام ایک
مراسلہ لکھا اور اجازت حاصل کی کہ شاہ کش یعنی بادشاہ کو قتل کرنے والے
لوگوں کو براہ راست پکڑ بلایا جائے اور انھیں جمہوریت کی سرزمین پر
گرفتار کر لیا جائے۔ تینوں طبقات رعایا کے نمائندوں کی مجلس میں ذرا بھی
شبہہ نہ تھا کہ کیا چیز پیش آنے والی ہے۔ شارل اول کے خلاف فیصلہ صادر کرنے
والے تینوں حکام عدالت یہ خیال کر رہے تھے کہ شبستان ہالینڈ کے قانون
کے تحت وہ محفوظ و مامون ہیں۔ اسی لیے وہ ڈلفٹ آئے تاکہ اپنی بیویوں
سے، جو انگلستان سے آرہی تھیں، ملاقات کریں۔ ڈاؤننگ نے انھیں
گرفتار کرا دیا۔ اس نے وہاں کے مقامی افسر حکومت یوحان فان وٹ
سے اس حکمنامۂ گرفتاری کی توثیق کرالی۔ اور اپنی نگرانی میں ان بدنصیبوں 277
کو انگلستان بھجوا دیا۔ ان کا مقدمہ کچھ زیادہ نہ چلا۔ اس میں صرف یہ
دریافت کیا گیا کہ ان اشخاص کی شناخت کر لی جائے۔ اور پھر ۱۹ر اپریل
۱۶۶۲ء کو انگریز قوم کے ان حکام عدالت کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس زمانے
میں لندن میں سامویل پیپیس رہتا تھا۔ اس نے ایک ڈائری لکھی تھی جس میں
روز نامچے کے طور پر اپنے تاثرات درج کیے تھے، جو تاریخ کے لیے ایک قیمتی
دستاویز ہے۔ دفتر بحریہ کا یہ نوجوان ملازم ڈاؤننگ پر الزام دھرتا ہے
اور کہتا ہے کہ اگر ڈاؤننگ اپنی ضمیر کے مطابق کام کرتا تو ہرگز ویسا نہ کرتا
جیسا کہ اس نے کیا تھا۔ پیپس نے ڈاؤننگ پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے
ذلیل ناشکرے پن کا مظاہرہ کیا۔ پیپس کا کہنا ٹھیک ہے۔ اور وہ یہ بھی
کہتا ہے کہ مختلف مولفوں نے جارج ڈاؤننگ کی اس المناک کارروائی
کو ایک نظیر بنا ڈالا ہے۔ اور وہ سیاسی قیدیوں کی تحویل کے لیے اس سے
استدلال کیا کرتے ہیں۔

۱۴ر ستمبر ۱۶۶۲ء کو معاہدۂ لندن طے ہوا۔ اس میں برطانیۂ عظمیٰ
اور جمہوریت کے مابین ایک حلیفی قایم ہوئی۔ اس کی تین دفعات میں یہ
بیان کیا گیا ہے کہ ان ہر دو دوست سلطنتوں کے ملکوں میں جلا وطنوں

اور باغیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔ اگر فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کو معلوم کرائے کہ کوئی باغی اس کی سرزمین میں موجود ہے تو آخرالذکر کا فریضہ ہو گا کہ اس اطلاع دہی سے (۲۰) دن کے اندر اس باغی کو حکم دے کہ اس ملک سے چلا جائے۔ اور اگر وہ پندرہ دن میں اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو اسے سزائے موت دی جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی تحویل ملزم کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ بعض مولف غلطی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

۱۵۵۳ء میں چانسلر نامی ایک انگریز جہازران طوفان کا مارا ماسکو والے تسار (زار روس) کی سرزمین کے ساحلوں پر پہنچا۔ اس تسار کا نام ایوان واسی لئے وچ تھا جسے اس نے اپنے ساتھ لایا ہوا ایک منشور، جو چھٹے ایڈورڈ کا لکھا ہوا تھا، پیش کیا۔ یہ منشور "ان تمام حکمرانوں کے نام جو بحرمنجمد کے اس طرف شمالی اور مشرقی علاقے میں رہتے ہیں، نیز شرق الہند کے حکمرانوں کے نام" موسوم تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ خدا نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے سے محبت کریں چنانچہ اس منشور کے الفاظ میں "انسانوں کا یہ فریضہ ہے کہ نیک کام کرتے رہیں اور احسان کے بدلے احسان کیا جائے۔ انسانوں کو چاہیئے کہ آپس میں انسانیت اور نیکی کے ساتھ ان تاجروں سے برتاؤ، کریں جو تمام عالم کا سفر کرتے ہیں، اور سمندروں اور صحراؤں کو عبور کرتے ہیں تاکہ دور دور ملکوں میں تک وہ اچھی اور مفید چیزیں پہنچائیں جو خدا کی مہربانی سے ان کے اپنے ملک میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور

جن ممالک کو وہ جائیں وہاں سے معاوضے میں ایسی چیزیں حاصل کریں جو ان کے اپنے ملک کے لیے مفید ہوں۔" اس انگریزی دستاویز میں خود تجارت کو نشائے ربانی بتایا گیا " کیونکہ اپنی غیر محدود عنایت سے آسمانوں اور زمین کے خالق نے یہ مناسب نہیں خیال کیا کہ ہر چیز صرف کسی ایک ملک میں پائی جائے"۔[1]

279

ان دیانتدارانہ اور سادہ الفاظ میں اصل میں اس مشہور و معروف جملے کی تشریح کی گئی ہے جو لیبانیوس کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص سین باسل اور سین ژاں کری سٹس توم کا استاد تھا۔ یہ اصل میں قدیم مولفوں کے خیالات کا اس چیز کے متعلق خلاصہ ہے جسے وہ "قوموں کی تجارتی آزادی" کہتے ہیں۔ اور یہ کہ کسی اجنبی کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ کسی ملک میں آئے، وہاں رہے اور وہاں تجارت کرے۔ تجارتی آزادی کے ارتقاء کا یہ جو مفہوم لیا گیا تھا، وہ مختلف معاہدوں اور دستاویزوں میں اپنا مظاہرہ دکھاتا ہے۔ تاجروں کے لیے رہگزری کے امن نامے، میلوں کے زمانوں میں تجارت کی آزادی، کسی نہ کسی مملکت یا شہر کی اجارہ داری۔ یہ اس کے ابتدائی مدارج تھے۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ اجنبیوں کو آنے اور رہنے کی آزادی ہونی چاہئیے۔ اگر یہ واقعے کی حد تک پوری طرح کامیاب نہ بھی ہو سکا، تو کم از کم نظریے کی حد تک وہ مقبول ہو گیا۔ سب سے آخر میں یہ خیال وجود میں آیا کہ مملکتوں کے مابین تجارت کی آزادی تو ہو لیکن یہ آزادی مکمل نہیں بلکہ اس پر بہت سی انتظامی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ کبھی تو چند معینہ مقام یا صوبے اجنبی تجارت کے لیے بند کر دئیے جاتے ہیں، کبھی اجنبی تجارت کے لئے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ معینہ مقاموں یا معینہ صوبوں تک ہی محدود رہے۔ اس سلسلے میں درآمد اور برآمد کے طریقے بھی معین ہوتے

[1] مارتینس کی فرانسیسی "تالیف" اجنبی سلطنتوں کے ساتھ روس کے عہد و پیمان اور معاہدات کا مجموعہ" حصۂ معاہدات انگلستان، دیباچہ صہ (۴)

ہیں۔ بعض اوقات چند معینہ قسم کی چیزوں کی درآمد اور برآمد ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ خصوصی محصول اور خصوصی چنگی کے قواعد قایم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پیش آتا رہا ہے کہ اِس یا اُس قوم کے لیے کچھ مراعات عطا ہوں [1]

کلیسائی حلقوں میں بہت دنوں تک تجارت سے مخالفت کی رَو جاری رہی۔

بنیادی تصور یہ تھا کہ ہر قسم کی منفعت کو سود یا خانگی بیاج قرار دیا جائے۔ چنانچہ توریت اور انجیل دونوں میں لکھا ہے کہ سود پر قرض دینا حرام ہے۔ کلیسائی پادریوں نے اُسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ مجالس شورائے مذہبی نے اپنے احکام کے ذریعے سے خلاف ورزی پر سزائیں مقرر کی تھیں چنانچہ کلیسا والے اگر سود لیتے تو انھیں معطل کر دیا جاتا۔ اور عوام الناس سود لیتے تو انھیں جات باہر کر دیا جاتا، جس کے باعث نہ تو عدالتیں ان کے مقدمے کی سماعت کر سکتیں اور نہ ان کو قبرستانوں میں دفن کیا جا سکتا۔ اس طرح کے احکام ۱۲۷۴ء کی لیوں میں منعقدہ شدہ اور ۱۳۱۱ء میں ویانا میں منعقدہ شدہ مجلس شورائے مذہبی میں بھی دئے جاتے رہے۔

بعض مولفوں نے نہایت بے رحمانہ شدت کے ساتھ اس نظریے کو ترقی دی کہ معاملۂ کاروبار چاہے کسی قسم کا ہو، ناجائز ہے۔ تیرھویں صدی کے ابتدائی سالوں کی ایک تالیف میں ہر تاجر کو سود خوار قرار دیا گیا ہے اور ہر مالدار تاجر کے بیٹے کے متعلق یہ تصور کر لیا جاتا تھا کہ وہ مال حرام پر جی رہا ہے۔ اس کتاب کا مولف رُوبیر ڈکورشوں ہے، جو نوالیوں کا صدر پادری تھا پھر کارڈینل بنا اور بظاہر ایک انگریز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "اس برائی کا ایک علاج ہونا چاہئے" اور وہ علاج

[1] اسی مولف کی فرانسیسی تالیف "سیاسی درس" جلد ۳ "یورپی سلطنتوں کے خارجہ تعلقات کی جدول"

یہ ہے کہ ایک عمومی مجلس شورائے مذہبی منعقد ہو جہاں اسقف اور حکمران یہ فیصلہ کریں کہ ہر قسم کی ثروت ممنوع قرار دے دی جائے، نیز تمام غیر زیر استعمال چیزوں کو۔ اور عیسائی دنیا میں یا تو پادری زندہ رہیں یا تنخواہ یاب نوکر جن میں سے ایک طبقہ اپنے روحانی خدمات کے معاوضے پر بسر برد کرے تو دوسرا اکشوری خدمات کی تنخواہ پر۔"

اکوِیناس کے سینٹ ٹامس نے ان زیادتیوں کا ردعمل کیا۔ چنانچہ اس کی نظروں میں اگرچہ تجارت میں بذاتِ خود ایک حد تک نفرت آمیز عنصر پایا جاتا ہے، کیونکہ اسے اصولاً کوئی دیانتدارانہ مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ وہ محض ایک انفرادی نفع اندوزی ہے، لیکن بہر حال اس ممتاز ہستی نے یہ تسلیم کر لیا کہ تجارت کے ذریعے سے جو نفع حاصل ہو وہ کسی جائز مقصد کے تحت بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس صورت میں تجارت جائز ہو جائے گی۔ اب دوسرے مولف اسی کی پیروی کرنے لگے۔ چنانچہ گیہوں، شراب اور دیگر تمام ضروریات زندگی کی تجارت کو پسندیدہ قرار دے دیا گیا۔ شرط صرف یہ رہی کہ نفع معتدل ہو۔

ایک بات اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ مدرسوں میں عرصے تک ارسطو کے اس نظریے کی تعلیم دی جاتی رہی کہ رقم ایک بانجھ چیز ہے۔ اور عرصے تک سود خواری اور سودی قرضے میں امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ بہرحال ایک ایسا لمحہ آیا جب مولف یہ خیال کرنے لگے کہ قانون قدرت کے تحت سود پر قرض دینے کو کلیتہً برا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ فرانسوا ڈ میئر ونی کا خاص کر یہی خیال ہے۔ یہی رائے تررشوں کی بھی ہے جو سودی قرضے کو تو قابل معافی قرار دیتا ہے لیکن اس قانون ساز کو نہیں جو اس کی قانونی اجازت دے۔ واقعات نے بہرحال پرانے نظریوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اٹلی کی حکومتوں نے ایسے مالی ادارے قایم کیے جہاں قومی مفاد کے لیے سودی کاروبار ہوتا تھا اور خود پوپوں نے اسقفوں اور خانقاہوں کو قرض لینے کے

اجازت دی[1]

قرون متوسطہ کی پوری تجارتی سیاست میں جو تصور سرایت کئے ہوئے تھا، وہ یہ تھا کہ بین الممالک تجارت کی ہر کارروائی میں فاضل رقم کا تسویہ نقد رقم دے کر کیا جاتا۔ حکومتیں پھر یہ کوشش کرنے لگیں کہ جس ملک میں وہ حکمرانی کرتی ہیں وہاں رقم کو محفوظ رکھا جائے[2]۔ اس تصور کے تحت بیشمار تکلیف دہ تدبیریں مختلف حکومتیں اختیار کرنے لگیں۔ اگرچہ یہ غلط نظریہ تھا، لیکن جیسا کہ ژاجرس نے واضح کیا ہے، اس میں ایک ظاہری صداقت نظر آتی تھی۔ جو شخص واقعی معنوں میں تاجر ہو اُسے کوئی ضرورت نہیں کہ اس رقم کو جو اسے وصول ہو، اپنے پاس ہی محفوظ رکھے۔ رقم بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کا واحد فائدہ صرف یہ ہے کہ تبادلے کا وہ ایک ایسا آلہ ہے جو ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے اور اس کی مالیت مقابلۃً منتقل رہتی ہے۔ جیسے جیسے تمدن مستحکم ہوتا گیا، مالیت کے مستقل ہونے کا فائدہ کم سے کم تر محسوس ہونے لگا۔ اور جو شخص واقعی تاجر ہو، اس کا پورا مفاد اس سے وابستہ ہے کہ صرافی کا کاروبار کرنے والے شخص کے ہاتھوں یہ فرض سپرد کردے کہ وہ رقم کی منڈی کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ لیکن حکومتوں کے لیے، خاص کر قرون متوسطہ میں، صورت حال مختلف تھی۔ چنانچہ ژاجرس کہتا ہے کہ: "کوئی چیز چاہے کتنی ہی ضروری اور کتنی ہی ناگزیر کیوں نہ ہو، جس طرح حکومت اسے خود نہیں پیدا کرتی اور حکومت کو خرچ کرنے کے سوا کوئی کام نہیں آتا، اسی لیے ایک مقدار رقم کو حاصل کرنا اور محفوظ رکھنا اس کے لیے قوت اور حفاظت کا ایک ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ چودھواں

281

[1] شارل ژوردیں کی فرانسیسی تالیف "قرون متوسطہ کی تاریخی اور فلسفیانہ سیر" ص ۳۲۴ و مابعد

[2] جیمس تورولڈ راجرس کی تالیف "تاریخ کی معاشی تعبیر" فرانسیسی ترجمہ از کاستلو ص ۹۲

لوئی اپنی شکستوں پر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ یہ (یعنی رقم) وہ آخری تفنچہ ہے جو اس کے پاس رہتا ہے"[1]

قرون متوسطہ کے ابتدائی زمانے میں عرصۂ دراز تک بیزنطینیوں کو بحر متوسط میں سمندری برتری حاصل رہی۔ ایشیا کے تجارتی راستے جن ساحلی علاقوں پر آکر ختم ہوتے تھے، ان کے وہ مالک تھے۔ چنانچہ ایک تو مصر ان کے قبضے میں تھا جہاں بحر احمر کے راستے سے مشرق کی تجارت پہنچا کرتی تھی۔ اسی طرح شام، جہاں خلیج عرب، خلیج فارس یا وسط ایشیا سے چلنے والے کاروان آیا کرتے تھے۔ اسی طرح بحر اسود کے مختلف تجارتی مرکز بھی ان کے قبضے میں تھے۔ ساتویں صدی میں عرب اپنے ملک سے باہر ابل پڑتے ہیں اور بڑی تیزی سے ایک طرف شام، عراق اور ایران فتح کر لیتے ہیں تو دوسری طرف مصر[2]

خود حضرت محمد صلعم سے پہلے عرب تجارت کیا کرتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد مکے کے حاجی تبادلۂ اشیاء میں اضافہ کرنے لگے۔ اور جیسے جیسے اسلامی حکومت پھیلتی گئی، ویسے ویسے ان ملکوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جہاں کہ اہل ایمان مقامات مقدسہ (حرمین شریفین) کی زیارت کے لیے جانے لگے اور مکۂ مقدسہ کے میلوں میں قدرتی پیداوار اور دستکاری کی مصنوعات لیجانے لگے۔

اگر اسلامی فتوحات کی ابتداء میں تجارت کو نقصان پہنچا تھا تو خلفاء کے تعمیری دور کے شروع ہوتے ہی تجارت کی گرم بازاری ہوگئی۔ ایشیائے کوچک، عرب اور مصر کا سفر کرنے والے کاروانوں کے لیے جو اہم مرکز تھے کہ ان میں سے ایک دمشق بھی تھا۔ بغداد کو دریائے دجلہ کے

282

[1] ایضاً ص ۹۳

[2] ہائیڈ کی تالیف "مشرق کی تجارت کی تاریخ قرون متوسطہ میں" فرانسیسی ترجمہ از رینو جلد (۱) ص ۲۴

دونوں کناروں پر بسایا گیا تھا۔ ہندوستان کے شہروں میں نوآبادیاں بسائی گئی تھیں۔ شمالی افریقہ کے پورے ساحل پر نیز صقلیہ اور اسپین میں بادشاہتیں قایم ہوگئی تھیں۔ ان کے تعلقات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور بہرحال عیسائیوں سے بھی تعلقات پیدا ہونے میں دیر نہیں لگی۔

دسویں اور گیارھویں صدی ہی میں بین الممالک تجارت ترقی کرنے لگی۔ بحر متوسط کا علاقہ اہمیت رکھتا ہے۔ اطالوی اور قتلانی شہر تجارت کے سرگرم مرکز بن جاتے ہیں۔ ایشیا کی شاہراہوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کی شاہراہیں یورپ میں سلسلۂ کوہ آلپ میں سے ہوکر دریائے رائن اور بالائی دریائے ڈینیوب کی طرف جاتی تھیں۔ اس طرح بکثرت شہروں کو بڑی جغرافی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔

اطالوی تجارت خاص کر خوب پھلی پھولی۔ بال دُچی پیگولتی چودھویں صدی کے آغاز کا مولف ہے۔ اس نے تجارتی رسم ورواج اور ان قواعد کا ذکر کیا ہے، جو سفر میں تاجروں کو ملحوظ رہنے چاہییں اور بیان کرتا ہے کہ فلارنس والوں کے تعلقات انگلستان، مراکش، مشرق قریبہ حتیٰ کہ چین تک سے تھے[1]۔ جے نوا اور وِنیس نے مشرق کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ جے نوا کے قبضے میں کَفَہ کی نوآبادی تھی، جو قریم (کریمیا) میں واقع تھی، جسے اس نے ایک صدر مقام بنا دیا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس بحر اسود کے ساحل کے تمام حصوں پر اس کی کوٹھیاں تھیں جو پیرا (استنبول) کی نوآبادی پر، جو جے نوا والوں کی تھی، نظر رکھتی تھیں۔ ۱۴۰۸ء میں جے نوا میں "سینٹ جارج کا گھر" یا دفتر قایم ہوا جس نے ۱۶۷۳ء میں "سان جورجیو کی بنک" کا نام اختیار کیا۔ اس جمہوریت نے جن لوگوں سے قرض لیا تھا انھیں بعض سرکاری آمدنیوں کے لینے کا حق عطا ہوگیا تھا۔ اس کمپنی نے بھی جمہوریۂ جے نوا کو قرض دیا اور اسے بھی محاصل کے متعلق اور دیگر

---

[1] سے زار کان تو کی فرانسیسی تالیف "عالمگیر تاریخ" تیرھواں زمانہ، باب (۲۲)

حقوق جدید طور پر عطا ہوئے اور تجارت کرتے کرتے وہ مشرق قریبہ کے متعدد علاقوں پر حکمران ہو گئی۔

ڈینس کی طاقت بے انتہا بڑھ گئی۔ اس کے قبضے میں بکثرت جزیرے اور بہت سے ساحلی علاقے تھے۔ اس کی تجارت عظیم الشان تھی۔ سرکاری بیڑا تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ تجارتی سامان کی برآمد اور درآمد کے لیے اس کے پاس تین ہزار سے زیادہ جہاز تھے۔ اپنی حد تک حکومت ہر سال اہم بندرگاہوں کو چار چار یا چھے چھے بڑی کشتیوں کے بیڑے روانہ کرتی، اور اس پر وہ تجارتی سامان لادا جاتا جو خانگی اشخاص بھیجنا یا منگانا چاہتے۔ یہ کشتیاں سرکاری کام کے لئے تجارت میں حصہ نہیں لیتی تھیں، بلکہ مختلف تاجر اسے سفر کے لیے کرایے پر لیتے۔ صرف ان جہازوں کے اعلیٰ افسروں کا انتخاب حکومت کے ہاتھ میں تھا[1]۔

ڈینس کی تجارتی سیاست اجنبیوں کے لیے خاصی مخالفانہ تھی۔ چنانچہ ڈینس کے کسی جہاز پر کوئی اجنبی تاجر نہیں سوار ہو سکتا تھا۔ ڈینس والوں کے مقابلے میں اجنبی کو محصول درآمد دگنا ادا کرنا پڑتا۔ جہاز، جہاز کے ربّان اور مالک، سبھوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ ڈینس والے ہی ہوں۔ ملکیوں اور اجنبیوں میں کوئی شرکت نہیں ہو سکتی تھی۔ حقوق اور حفاظت صرف ڈینس والوں اور خاص کر شہریوں کے لیے مخصوص تھے۔

جمہوریت کی رعایا کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک وہ شہر جو مضبوط زمین پر واقع تھے اپنا کوئی تجارتی مال ڈینس سے گزرے بغیر روانہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور ڈینس میں انھیں چنگی ادا کرنی پڑتی تھی[2]۔

---

[1] دارو کی فرانسیسی تالیف "ڈینس کی تاریخ" کتاب (۱۹)

[2] ایضاً

قرون متوسطہ میں بیرونی تجارت کو جو ترقی ہوئی اس کی وجہ بڑی حد تک کوٹھیوں کا حاصل کرنا تھا۔ اس میں کچھ تو وہ عمارتیں ہوتیں جو عہدہ داروں کے لیے مخصوص ہوتیں، کچھ وہ مکان جو نوآبادی کے عام استعمال کے لیے ہوتے اور کچھ انفرادی استعمال کے مکان۔ یہ چیز ان بادشاہتوں میں بھی وجود میں آئی جو حروب صلیبیہ میں حصہ لینے والوں نے قایم کیں اور بیزنطینی سلطنت میں بھی اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں بھی۔ ان کوٹھیوں کے خصوصی عناصر میں سے ایک چیز وہ "سیڑھیاں" ہوتی تھیں جن کے ذریعے سے سامان اتارا جاتا اور کوٹھی اور لنگر ڈالنے والے جہازوں میں ان کے ذریعے سے مواصلات قایم ہوتے۔

حروب صلیبیہ کے باعث تجارت کو قابل لحاظ ترقی ہوئی۔ اس عظیم الشان ترقی کے سلسلے میں اطالوی شہروں نے ایک اہم خدمت انجام دی۔ ان کے جہاز اکثر ان سپاہیوں کو منتقل کرتے رہے، یا ان کو اس کا موقع دیتے رہے کہ اپنے فتوحات مستحکم کرلیں۔ ان خدمات کے معاوضے میں ان کو بہت بڑی بڑی رعایتیں دی گئیں۔ جزیرہ نمائے اٹلی کی تین بحری سلطنتیں تھیں یعنی فینیس، جے نوا، اور پیزا۔ ان کو صلیبی جنگجوؤں کی قایم کردہ لاطینی بادشاہتوں کے شہروں میں یا تو کوٹھیاں عطا ہوتی رہیں یا بندرگاہیں۔ فینیس کے ساتھ خاص کر رعایت ہوتی رہی۔ چنانچہ یروشلم (بیت المقدس) کی بادشاہت میں اسے یہ حق حاصل ہوگیا کہ ہر شہر میں اسے ایک حصہ دے دیا جاوے، چاہے اس پر قبضہ کرنے میں فینیس نے کوئی مدد نہ دی ہو۔ مرسیلیا کے تاجروں کو سنہ ۱۱۱۷ء میں ایک منشور حاصل ہوا جس کی رو سے انھیں اجازت ملی کہ شہر یروشلم میں اپنی کوٹھی کے حدود اس طور سے متعین کریں کہ کوئی اجنبی اس کے اندر رہنے کا مجاز نہ ہو۔

جب سنہ ۱۲۰۴ء میں صلیبی جنگجوؤں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تو فینیس والوں کو اسے پی رُس، اکرنانی اسے تولی، جزائر ایونین

پیلو پونے زیا، مجمع الجزائر کے جنوب اور مشرق کے جزیرے، آبنائے دار دنیل، اور بحیرۂ مرمرہ کے یورپی ساحل پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بسے ہوئے شہروں میں سے ایک خاصی تعداد اور ترا قیا (تھریس) کے اندرونی علاقے کے متعدد شہر حاصل ہو گئے۔ ان فی نیس والوں نے صلیبی جنگجوؤں کو ان کے اصلی مقصد یعنی مصر کی فتح سے ہٹا دیا، اور اس مہم کو یونانی شہنشاہیت کے خلاف لگا دیا تھا (اور اس کے معاوضے میں وہ علاقے انھیں حاصل ہوئے تھے)[۵۱]

ساحلی شہروں کی تجارتی رقابت کے باعث ایک سے زیادہ مرتبہ خونریز جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور یہ تک دیکھنے میں آیا کہ عیسائیوں کے جہازی بیڑے گتھ کر آپس میں لڑنے لگے۔ ۱۳۵۲ء میں جب اسی طرح کی ایک لڑائی ہوئی تو جے نوا والوں کے بیڑے میں سے تیرہ جہاز ڈوب گئے اور ان کے حریفوں یعنی فی نیسیوں اور قتلانیوں کے چھبیس جہاز تلف ہوئے تھے۔

ہم ان ممانعتوں کا اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ عیسائی عربوں سے تجارت نہ کریں۔

۱۱۷۹ء میں جو مجلس شورائے مذہبی لاتران میں منعقد ہوئی تھی اس نے سابقہ ممانعتوں کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ کوئی ہتھیار، لوہا، تعمیراتی لکڑیاں اور ایسی چیز فروخت نہ کی جائے جو جنگ میں کام آسکے ورنہ جات باہر کر دیا جائے گا اور غلام بنا لیا جائے گا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ساحلی شہر ان دھمکیوں کے باوجود ذرا بھی باز نہیں آئے۔ وہ کلیسائی قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہے اور تجارتی کاروبار کو برابر جاری رکھا۔ فی نیس نے خاص کر اس ممانعت کو پس پشت ڈال دیا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ تو بحیرۂ آزوف

---

[۵۱] ہائیڈ کی تالیف مذکورہ بالا جلد (۱) صـ ۱۳۱ و مابعد

کے شہر تاناکو کوٹھی بنادیا جہاں سے بطور مرکز یہ کاروبار جاری رہا اور کچھ اس طرح سے کہ نئی نئی چیزوں کی تجارت شروع کردی۔

تب پوپوں نے بلا امتیاز ہر برآمد ممنوع قرار دے دی۔ ان نئی ممانعتوں کی بھی ویسی ہی خلاف ورزی ہوتی رہی۔ سنہ ۱۳۰۸ء میں پوپ پانچویں کلیماں نے غیر عیسائیوں کے ساتھ ہر قسم کا تجارتی کاروبار ممنوع قرار دے دیا۔ اور خلاف ورزی کے لیے جو سزا مقرر کی وہ یہ تھی کہ جتنا مال برآمد کیا گیا تھا اس کی مالیت کے برابر جرمانہ پوپ کے دفتر میں ادا کیا جائے۔ ڈنیس والوں نے اس ممانعت کی ذرا بھی پروانہ کی۔ لیکن ان میں سے بہت سے موت کے متعلق احکام کے سلسلے میں اپنے آپ کو مقروض قرار دیے بغیر گناہوں سے براءت حاصل نہ کرسکے۔ ڈنیس کی حکومت نے اپنی حد تک ان جرمانوں کی ادائی کی ممانعت کردی اور جب سنہ ۱۳۲۲ء میں بائیلوپا جان نامی لیٹرے پوپ نے دو سفیر اس غرض سے روانہ کئے کہ مرے ہوئے لوگوں کے کفاروں کی رقم وصول کریں ورنہ ان لوگوں کو جو اسے دبائے بیٹھے ہوں جات باہر کردیں، تو ڈنیس کی حکومت نے ان مقدس سفیروں کو یہ حکم دیا کہ اس کے علاقے سے نکل جائیں۔ کچھ عرصہ بعد پوپ بارھویں بےنوا نے ڈنیس کی چند کاروباری کمپنیوں کو خصوصی اجازت نامے عطاء کئے اور اس کے بعد سنہ ۱۳۴۵ء میں جمہوریۂ ڈنیس کے تاجروں کی جماعت کو ایک عمومی براءت عطاء کردی۔ چودھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں پوپ پانچویں اُربان نے متوں پیلیے کے شہر کو یہ اجازت دی کہ غیر عیسائیوں سے ساتھ صرف ایک جہاز میں تجارت کریں۔ اور پندرھویں صدی کے وسط میں جو تھے یوجین اور پانچویں نکولاس نامی پوپوں نے ژاگ کور نامی ایک مالدار تاجر کو بھی اس قسم کی اجازت عطا کی۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ سولھویں صدی کے اواخر میں پوپ کلیمان نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے پیشروؤں کی سیاست کو مزید مبالغے کے ساتھ دوبارہ جاری کردے۔ چنانچہ ۱۵۹۵ء میں ایک فرمان کے ذریعے سے اس نے تمام اطالویوں کو ممانعت کردی کہ ایسے ملک سے تجارت کریں جہاں کیتھولک مذہب سرکاری طور سے جاری نہ ہو، بجز اس کے کہ پوپ سے خصوصی اجازت حاصل کریں۔ اور حکم دیا کہ ہر سال حضرت مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کی عید پابندی سے منایا کریں۔ جو لوگ ان دونوں شرطوں میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی کریں تو انھیں عدالت احتساب عقائد کے سامنے پکڑ بلایا جائے گا۔[۱]

مولفوں نے جلدی ہی ہوشیاری سے امتیازات قایم کردئے۔ چنانچہ گوف فرے دو دے ترانی نے بیان کیا ہے کہ کچھ سامان ایسا ہے جو کبھی بھی غیر عیسائیوں کے پاس نہیں لیجایا جانا چاہئے مثلاً ہتیار، لوہا اور لکڑی۔ کچھ سامان ایسے ہیں جو صلح کی حالت میں ان کے سپرد کئے جاسکتے ہیں۔ اس مولف نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ عیسائی کسی بھی صورت میں غیر عیسائیوں کو نہ تو جہاز فروخت کرسکتے ہیں نہ ان کے جہاز چلا سکتے ہیں اور نہ ارض مقدس یعنی بیت المقدس کے معاملات کے سلسلے میں ان کی مجالس مشورت کو مدد دے سکتے ہیں۔

اس زمانے میں اکثر ممالک میں مراعات حاصل ہو جاتے ہیں اور ان سے معاہدے طے پاجاتے ہیں۔ ابتداءً جو معاہدے طے ہوئے وہ اکثر اس غرض کے لیے تھے کہ شکستہ جہازوں کے متعلق جن حقوق کا دعویٰ کیا جاتا تھا، وہ منسوخ کئے جائیں۔ وہ دعویٰ یہ تھا کہ شکستہ

---

[۱] دارِدو کی فرانسیسی تالیف " فنیس کی تاریخ " کتاب ۱۹،

جہازوں کے جو بھی اجزاء ہاتھ آئیں ان کو نیز اس تجارتی سامان کو جو طوفان میں ساحل پر آلگے، ضبط کر لیا جائے۔ اب اجنبیوں کو اپنے علاقے میں آسکنے کا حق عطا ہوا۔ یورپ کے شمال میں "ہانز یاتی" حلیفی وجود میں آئی جس میں بالٹک اور بحر شمال کے آزاد شہر شامل تھے۔ اور انھوں نے اس غرض سے اتحاد کیا تھا کہ ذاتی حفاظت کے لیے ایک دوسرے کی مدد کریں اور تجارت کی حفاظت کریں۔ سویڈن کی پوری تجارت انھیں شہروں کے ہاتھ میں تھی۔ اور انھیں جو حقوق حاصل تھے، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ ساحلی شہروں میں جو عمومی مجالس مشورت قایم ہوں، ان میں آدھے نمائندے انھیں کے ہوں۔

اجنبی ممالک میں ہموطنوں کا متحد رہنا ایک قدرتی معاملہ ہے۔ قرون متوسط میں یہ چیز ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر ایک اہم شہر میں چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں قائم ہوتی تھیں جو اپنا آپ انتظام کرتی تھیں اور خود اختیاری کے متعلق اپنے حقوق منواتی تھیں۔ یورپ کے جنوبی علاقوں میں قنصل اور شمالی ممالک میں آلڈرمان حکومتوں کے نمائندے نہیں ہوتے تھے بلکہ جن لوگوں پر ان کی حکومت چلتی تھی وہی ان کو اپنا سردار مقرر کرتے تھے[1]۔

جہازوں کے متعلق خیال یہ کیا جاتا تھا کہ وہ اسی ملک کے اختیار سماعت کے تحت سفر کر رہے ہیں، جس کا جھنڈا ان پر لہراتا ہے۔ ان جہازوں کے سفر عموماً لمبے ہوتے۔ اور ان پر ایک حاکم عدالت (مجسٹریٹ) بھی ہوتا[2]۔ جب جہاز کسی بندرگاہ پر پہنچتے تو

---

[1] مود لاکلافیئیر کی فرانسیسی تالیف "تاکیا فیلی کے زمانے کی سفارت کاری جلد (۳) ص ۲۹۶

[2] سر ٹراؤرس ٹوِس کا انگریزی مضمون "سرکاری جنگی جہازوں کی خارج الارضی حیثیت" مطبوعہ لامیگزین اینڈ ریفیوں، بابت فروری ۱۸۷۶ء۔

یہ منطقی بات تھی کہ جو لوگ اس پر سوار ہوتے وہ اس بات کی کوشش کریں
کہ ان کا اپنا قومی اختیار سماعت برقرار رہے۔ اور جب تاجروں کو استحکام
حاصل ہو گیا تو اور بھی زیادہ منطقی بات یہ تھی کہ یہ لوگ اس بات کی
کوشش کریں کہ ان کی اپنی عدالتیں اور ان کے اپنے قانون برقرار
رہیں۔ چنانچہ مختلف ناموں سے قنصلی ادارہ رائج ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں بارہا مراعات عطا ہوتی رہیں۔ اور اس بارے
میں معاہدے بھی بکثرت ہوئے۔ مزید برآں بہت عرصہ ہوا کہ ایک اہم
قانون سازانہ رسالہ شائع ہوا۔ چنانچہ لاطینی رسالہ "پرانا قانون"
جو اصل میں ڤی زیگاتھیوں کے مجموعہ قوانین کا ایک ٹکڑا ہے، بادشاہ
رکارڈ اول کے زمانے کی چیز ہے۔ اس بادشاہ نے ۵۸۶ء سے ۶۰۱ء تک
حکومت کی تھی۔ اس میں ایک جملہ سمندر پار کے تاجروں سے
متعلق ہے اور ان کے متعلق (لاطینی میں) یہ حکم دیا گیا ہے کہ
"اگر سمندر پار کے تاجروں میں باہم کوئی جھگڑا پیدا ہو تو ہماری
مجالس میں سے کوئی اس کی سماعت کرتی نہیں سمجھی جائے گی بجز
اس کے کہ انھیں کے قوانین کے ساتھ انھیں کے قصاص (؟ تعزیرات)
ہوں"۔ اس نے حقیقت میں ان کو مقامی اختیار سماعت سے خارج
کر لیا تھا اور انھیں اجازت دی تھی کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ
ان کے اپنے حکام عدالت اور ان کے اپنے قانون کے ذریعے سے
عمل میں آئے۔ ساتویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں "عدالتی
قانون" نامی کتاب لاطینی میں تالیف ہوئی تھی۔ اس کا قسطیلہ کی
زبان میں ترجمہ ہوا۔ چنانچہ اس میں اجنبی تاجروں کے متعلق قانون
برقرار رکھا گیا ہے اور قسطیلہ کے ترجمے میں لفظ "تے لوناری ای"
کے متعلق ذرا بھی شبہہ نہیں رہتا۔ اور اس سے مراد حکام عدالت
ہیں، افسران جنگی بالکل نہیں ہے[1]۔

---

[1] لاطینی تالیف "اسپین کی گاتھک حکومت کے قدیم عدالتی قانون۔ پہلے اس کا

پندرھویں صدی میں عظیم الشان دریافتوں میں کی ابتدائی چیزیں پیش آئیں۔ پرتگالیوں نے رفتہ رفتہ جو نوآبادیاں قایم کیں ان میں سے مدیرا، راس سبز کے جزائر آزور، گینی اور کانگو قابل ذکر ہیں جو ساتھ ہی ساتھ تجارتی حمل ونقل کے درمیانی اسٹیشن بھی ہیں۔ ۱۴۸۶ء میں بارتیلمی دیائس نے راس امید کا چکر لگایا اور پھر داسکو ڈیگاما نیز بعد ازاں آل مائیدہ اور البوکرک، ہندوستان تک پہنچ گئے۔ کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں نئی دنیا دریافت کرلی۔ ۱۵۰۰ء میں پیئیر الوارِ تس کابرال نامی ایک پرتگالی کو شرق الہند کے نئے علاقے دیکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا، تو اس نے نئی نامعلوم سرزمین دریافت کی۔ یہ برازیل تھا۔

ترکوں کی برتری نے فےنیس اور جے نوا کی تجارت پر ایک مہلک وار کردیا تھا۔ اور بحر متوسط کی پوری تجارت پر بھی ویسا ہی گھونسہ لگا، جب سولھویں صدی میں ترکوں نے مصر اور شمالی افریقہ کے ایک حصے پر حملہ کیا اور سمندر ان کے لٹیرے بیڑوں سے بھر گئے۔ سلطان سلیم اول نے مصر فتح کیا تو یہ خاص کر منحوس ثابت ہوا کیونکہ ہندوستان جانے کا یہ ملک ہی آخری بڑا راستہ رہ گیا تھا۔ اور اس فتح کے بعد سے وہ راستہ بند ہوگیا تھا[1]۔

2.88 چودھویں صدی کی ابتداء میں مارینو سانُوتو نامی ایک فےنیس والے امیر نے لاطینی میں "صلیب پرستوں کے اسرار" نامی کتاب لکھی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) نام (لاطینی میں) کتاب قوانین تھا اور اب وہ (قسطیلی زبان میں) عدالتی قانون کے نام سے موسوم ہے" شارح کا نام الفونسو دے فیلادیئے گو ہے مطبوعہ مجریط ۱۸۱۶ء مذکورہ اقتباس کے لیے دیکھئے کتاب ۱۱ عنوان ۳۔ ف ۱، ۲۔

[1] جیمس تھارلڈ راجرس کی تالیف "تاریخ کی معاشی تعبیر" فرانسیسی ترجمہ از کاستت لُوصہ ۲۱۔

جس میں اس نے اپنے ہموطنوں کو تحریص دلائی تھی کہ مصر پر قبضہ کرلیں۔ اور اس طرح مشرق کی تجارت کے مالک بن جائیں کیونکہ ہندوستان اور بحر متوسط کی تجارت کا سب سے قریبی راستہ بحر احمر سے ہے۔ اس کتاب میں اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ خود افریقہ سے بھی سونے اور ہاتھی دانت کی تجارت کے سلسلے میں کتنا نہ قیمتی سامان مل سکتا ہے[1]

اطالوی جمہوریتوں کی دولت زوال پانے لگی لیکن دوسری مملکتیں عظیم الشان جھگڑوں میں مبتلا ہوگئیں۔

ان کی نوآبادیاتی سیاست اس امر پر مشتمل تھی کہ تحفظات عائد کیے جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سولھویں صدی میں تجارتی معاہدے اتنے زیادہ نہیں ہوئے جتنے اس سے پہلے کی دو صدیوں میں ہوئے تھے۔ لیکن سترھویں صدی میں تیس سالہ جنگ ختم ہوئی خاص کر پرے نیز کا صلح نامہ طے ہوا، تو تجارتی مفاد کے متعلق سلطنتوں نے نئے سرے سے توجہ کرنی شروع کی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں اُوترلیشت میں جو معاہدے ہوئے وہ اپنی نوعیت کے اولین معاہدے تھے۔ ان میں بحری اور تجارتی مسائل پر عہد و پیمان عمل میں آیا تھا۔

پندرھویں صدی کے اواخر میں چند اہم معاہدے ہوئے۔

ساتویں ہنری نے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انگلستان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے دور حکومت کے ابتدائی سال اس غرض کے لیے لگادیے کہ خانوادۂ یارک کی سازشوں کے خلاف اپنے آپ کی حفاظت کرے، اور انگلستان کو، جو مفلس ہو چکا تھا اور اس میں آپس ہی میں پھوٹ پڑی تھی اور ہر کسی نے اس کا

---

[1] داروی کی مذکورۂ بالا "تنیس کی تاریخ" کتاب (۱۹)۔

ساتھ چھوڑ دیا تھا، تو اسے اس حالت سے نجات دلانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے عقلمندی اور وسیع القلبی کے ساتھ معاہدے کرنے شروع کیے اور فروری ۱۴۹۶ء میں برگنڈی کے ڈیوک "حسین فلپ" کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا تو اسی سال اکتوبر کے مہینے میں آراگون کے فردینانڈ اور قسطیلہ کی ایزابیلا کے ساتھ بھی۔

ان معاہدوں میں سے پہلے کو فلانڈرس والوں نے "عظیم الشان معاہدے" کا نام دیا اور ۱۵۰۶ء میں جو نامناسب معاہدہ ہوا تھا اسے انھوں نے "برا معاہدہ" سے موسوم کیا تھا۔

اس میں جو باتیں طے ہوئی ہیں وہ دلچسپ ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں میں باہم تجارت کی آزادی ہوگی جس کے لیے اجازت نامہ یا پروانۂ سفر حاصل کر لینا ہوگا۔ تجارتی جہازوں کو جنگ کے دوران میں مسلح کیا جا سکتا ہے۔ نشیبستان ہالینڈ کے مچھیاروں کو یہ حق ہوگا کہ ان پانیوں میں مچھلیوں کا شکار کریں جن کو اس وقت تک انگریزوں نے محفوظ قرار دے رکھا تھا۔ ہر دو قوموں کی بندرگاہیں بحری قزاقوں کے لیے بند رہیں گی۔ لیکن ان تجارتی جہازوں کے لیے کھلی رکھی جائیں گی جو مصیبت اور اضطرار کی حالت میں ہوں۔ دشمن کے تجارتی سامان کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ شکستہ جہازوں سے بچے ہوئے سامان کے متعلق جو قانون تھے ان کو نرم کر دیا گیا۔ فلانڈرس کے تاجروں کو اجازت ملی کہ انگلستان میں جا رہیں اور انگریز تاجروں کو نشیبستان ہالینڈ میں۔ مواخذے اور انتقامی کارروائیوں کو منسوخ قرار دیا گیا۔ قیمتی دھاتوں کی تجارت کو آزاد قرار دیا گیا۔

راجرس نے، جس کی اہلیت مسلمہ ہے، بیان کیا ہے کہ اس معاہدے میں جو عقلمندی اور وسعت نظر کام کر رہی تھی، وہ متعدد نکات کے متعلق اپنے زمانے سے چار سو سال آگے بڑھی ہوئی تھی

283

اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے ہمیں حیرت زدہ ہونا پڑتا ہے۔ یہ حیرت گھٹ جاتی ہے جب ہم یہ سوچیں کہ ان دونوں ملکوں میں کیسے تعلقات پائے جاتے تھے۔ جیساکہ راجرس نے یاد دلایا ہے، فلانڈرس کے شہر روئی اور اُون کی پارچہ بافی کے ذریعے سے دولتمند ہوئے جار ہے تھے، اور تیرھویں سے سولھویں صدی تک یورپ میں انگلستان ہی ایک ملک تھا جہاں ان کی پیداوار ہوتی تھی۔ اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ وہاں کی زمین اور وہاں کا موسم اس کے لیے موافق تھے، بلکہ اس لیے بھی کہ اس ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا اور انگریزوں کو اس کی اجازت تھی کہ بھیڑیں پالیں۔ فلانڈرس کا بڑا مفاد اس سے وابستہ تھا کہ انگلستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے اور انگلستان کے بادشاہ جب کبھی فرانس سے جنگ کرتے تو وہ اس کی کوشش کرتے کہ فلانڈرس والوں اور ان کی حکومتوں کے ساتھ اچھے تعلقات کی آبیاری کریں[1]۔

انگلستان اور فلانڈرس میں رقمی معاملات کے لیے بھی معاہدے طے ہوئے۔ ۱۳۳۰ء میں تیسرے ایڈورڈ نے "بادشاہ فرانس" کا لقب اختیار کیا۔ بعض معاہدوں میں جو فلانڈرس کی مجالس کے ساتھ طے ہوئے تھے، یہ قرار پایا تھا کہ ایک ہی وزن اور ایک ہی کھوٹ کے سونے اور چاندی کے سکّے فرانس اور فلانڈرس اور برابان میں مروج ہوں اور وہی سکے انگلستان میں بھی چلیں۔ ۱۳۴۳ء میں پارلیمان نے اس مسئلے پر بحث کی اور قرار پایا کہ "انگلستان اور فلانڈرس میں ایک سونے کا سکہ ڈھالا جائے اور اگر فلانڈرس والے چاہیں تو وہ سکہ انگلستان اور فلانڈرس میں بھی چلے گا۔ اس سکے کا وزن اور کھوٹ اور مالیت وہی ہوگی جس کا بادشاہ اور اس کی مجلس وزارت حکم دے

[1] جیمس تھارلڈ راجرس کی مذکورۂ بالا تالیف ص ۲۰ و ۹۷۔

اور یہ کہ دیگر تمام سونے کے سکے انگلستان اور فلانڈرس میں ممنوع قرار دیے جائیں اور ان کو انگلستان اور فلانڈرس میں تبادلے میں لے کر گلا دیا جائے اور ان کی اینٹیں بنادی جائیں"۔ چاندی کے سکوں کے متعلق بھی یہی طے ہوا۔

290 اس کے بعد کی صدی میں چوتھے ایڈورڈ نے جسے "بنیا بادشاہ" کہا جاتا تھا، اور اس کے برادر نسبتی "جسارت مند شارل" نے باہم یہ معاہدہ کیا کہ بروگیس میں اس غرض سے کانفرنس منعقد کریں کہ جہاں تک ہو سکے اپنے اپنے سکوں کا چلن پھیلائیں اور بٹاون کو برخاست کریں۔ انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی مناسب خیال کیا کہ اپنے سکوں سے استفادہ بڑھایا جائے اور تجارتی کاروبار کو آسان بنایا جائے۔[1]

جو نمایندے بھیجے گئے ان کے ذمے یہ کام تھا کہ انگریزی اور فلانڈری نظام ہائے سکہ کے موجودہ تعلقات متعین کریں اور دونوں ملکوں میں جو سکے قانونی طور پر رائج تھے، ان کی مالیت چلن کو یکساں کیا جائے اور ساتھ ہی اس بات کی تحقیق کریں کہ آیا یہ ممکن ہوگا کہ مماثل حساب کی کتابیں کھولی جائیں جن کے ذریعے سے آیندہ ان تمام تجارتی کاروبار کو طے کیا جائے جو چاہے انگلستان میں عمل میں لائے جائیں یا نشیبستان (ہالینڈ) میں۔ سکے کے انتظام کے لیے جو عمومی افسر مامور ہوں وہ جلسوں میں مشاورتی حیثیت میں شریک ہوا کریں۔

۱۳ اگست ۱۴۶۹ء کو یہ کانفرنس اس امر میں کامیاب ہوئی کہ سکوں کے متعلق عہد و پیمان کی ایک تجویز مرتب کرے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسی اوزانی وحدت اختیار کی جو دونوں ملکوں میں یکساں ہو اور ایک جدول بھی اختیار کی جس میں تبادلے کے کمل اور مقررہ

---

[1] الفونس دے وتے کی فرانسیسی تالیف "بروجیس میں منعقد شدہ ۱۴۶۹ء کی بین الممالک رقمی کانفرنس"۔

نرخ درج تھے۔ انگریزی سکہ فلانڈری سکے کے مقابلے میں ۱ : ۸ کی نسبت رکھتا تھا یعنی چوگنی قیمت کا حامل تھا۔ اس امر کے متعلق البتہ سمجھوتہ نہ ہو سکا کہ مماثل حسابات کی کتابیں کھولی جائیں۔ برگنڈی کے ڈیوک نے یہ تجویز کی کہ اس کے سکوں کو بادشاہ انگلستان کے براعظمی اور ماورائے بحری مقبوضات میں آزادانہ طور سے داخل ہونے اور نکلنے کی اجازت دی جائے اور اس طرح انگریزی سکوں کو بھی ان ملکوں میں آزادانہ داخل ہونے اور نکلنے کی اجازت ہوگی جو ڈیوک کے قبضے میں ہوں۔ لیکن چوتھے ایڈورڈ کے نمایندوں نے بیان کیا کہ وہ اس تجویز کو اپنے بادشاہ اور اس کی مجلس مشورت کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں باہمی رضامندی سے اس امر کا تعین بھی محفوظ رکھا گیا کہ استعمال سے گھس جانے سے کس حد تک وزن کی کمی معاف کی جائے گی۔ نیز یہ بھی کہ تانبے کے پیسوں کو سکہ قرار دیا جائے۔

نشپتان اور انگلستان کے حکمرانوں میں دو اور معاہدے رقمی معاملات کے لیے طے ہوئے۔ پہلا معاہدہ ۱۴۹۹ء میں ہوا۔ اس کا متن ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ لیکن ۱۵۲۳ء میں جو معاہدہ ہوا اس میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

نشپتان میں سکے کی صورت حال اضطراب انگیز تھی۔ اس کا ابتدائی علاج یہ تجویز کیا گیا کہ سابق میں قومی اور اجنبی سکوں کے متعلق تقرر مالیت میں جو مبالغہ آرائی کی گئی تھی، اس کو گھٹایا جائے۔ چنانچہ شہر کالے میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں بلجیم اور انگلستان کے نمایندے جمع ہوئے اور شارل کین نے جو نئے سکے جاری کیے تھے ان کی اسٹرلنگ قیمت متعین کی گئی۔[1]

291

[1] اسی مولف کا مضمون "فرانس اور انگلستان کے سترھویں صدی تک کے رقمیاتی تعلقات پر چند نوٹ" جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۲۶) میں شایع ہوا دیکھیے ص ۹۱۔

۱۵۲۹ء میں شارل کین نے ایک اس سے بھی زیادہ اہم کام کی کوشش کی۔ چنانچہ مجلس شورائے مملکت نے ایک قرارداد منظور کی اور اس مجلس شورائے راز (پریوی کونسل) کے صدر، ژاں کو لیے، کو ہدایت دی کہ گفت و شنید کے لیے چند نمایندے فرانس بھیجے جائیں۔ یہ فرانس کے بادشاہ سے بیان کریں کہ فرانس اور انگلستان کی رعایا اور تاجروں کی عام بہبودی کے لیے اور نیز اس غرض سے کہ مذکورہ تاجر اپنا کاروبار اچھی طور سے انجام دے سکیں، ہمیں یہ مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بادشاہتوں اور ملکوں کے سکوں کی اضطراب انگیز حالت میں اصلاح عمل میں لائی جائے۔ اور ان کو ایک معینہ قیمت اور بنیاد پر لا کر اور ان کی قیمت مقرر کر کے ڈھالا جایا کرے اور یہ کہ اس غرض کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر فریق کے اعلیٰ افسران سکہ کسی مقام پر جمع ہوں اور اس طرح کا انتظام عمل میں لائیں اور یہ چیز اتنی ہی جلد کی جائے جتنی امکان میں ہو۔[1] لیکن یہ نظام عمل میں نہ آسکا۔ چلتے ہوئے ہمیں یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ سکوں میں باقاعدہ طور سے تبدیلی کی عمداً کوئی کوشش عمل میں آئی تو وہ صرف آٹھویں ہنری کے زمانے میں ہوئی۔[2] فرانس کی حالت اس سے بالکل جداگانہ تھی، وہاں پانچویں شارل کے حاجب نیکول اوریم نے (جو بعد میں لیزیو کا اسقف بنا اور جس نے ارسطو کی کتاب سیاسیات اور کتاب معاشیات کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا)، یہ بتایا ہے کہ سکے کے عدم استحکام سے کیا تباہ کن اثرات پیدا ہوئے؟ اس نے بیان کیا ہے کہ فرانس میں بادشاہ اس بارے میں کس طور سے کام کرتے رہے؟ چنانچہ وہاں تین طریقے برتے جاتے رہے: "نام کی تبدیلی" جس سے مراد یہ ہے کہ قانونی چلن

---

[1] ایضاً ص ۹۲

[2] جیمس تھارولڈ راجرس کی مذکورہ تالیف ص ۱۷۶۔

میں تبدیلی پیدا کی جائے اور مختلف قسم کے سکوں کی مالیت میں فرق پیدا کیا جائے۔ دوسرے "وزن کی تبدیلی" یعنی مختلف سکوں کے وزن اور حیثیت میں تو فرق پیدا کیا جائے لیکن ان کے چلن میں اسی تناسب سے کوئی تخفیف عمل میں نہ لائی جائے۔ اور تیسرے "مادّے کی تبدیلی" یعنی حیثیت میں تبدیلی کی جائے۔[1] 292

رقم کا مسئلہ ایک اہمیت رکھتا تھا۔ اکوِیناس کے سینٹ ٹامس نے اپنی لاطینی کتاب "رہنمائے حکمراناں" میں اس پر ایک پورا باب باندھا ہے۔ اور ارسطو نے جو خیال ظاہر کیا تھا اور جسے ماہر قانون پاؤل نے بھی دہرایا تھا، اس سے بھی اس (اکوِیناس) نے استدلال کیا ہے۔[2]

---

[1] فینزی کی فرانسیسی تالیف "۱۷۸۹ء کے انقلاب سے قبل فرانس کی مالیاتی سیاست پر تبصرے" سلسلۂ جدید جلد (۲) ص ۲۲۷۔

[2] کوزیں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ پورا مسیحی علم کلام پورفیر کے ایک جملے سے نکلا ہے جس کا ترجمہ بوتھیے نے کیا تھا اور جس میں نوع اور جنس کے عمومی تصورات سے بحث ہے۔ یہ جملہ یاد دلا کر ژُوردیں اپنی طرف سے یہ ملاحظہ پیش کرتا ہے کہ قرون متوسط میں معاشی مسائل پر جو ابتدائی بحثیں چھڑیں وہ بھی سب کی سب، بالکل اسی کے مماثل ارسطو کی تالیفوں ("نکو ماک سے سبق" اور "سیاسیات") کی بعض عبارتوں پر مبنی تھیں۔ یہ وہ عبارتیں ہیں جو رقم سے متعلق ہیں۔

"سیاسیات" کی کتاب اول باب (۳) میں ارسطو کہتا ہے:

"یہ عملدرآمد ہے کہ لوگ اغراض تبادلہ کے لیے ایک ایسی چیز دیں اور لیں جو نہ صرف بذاتِ خود مفید ہو بلکہ ساتھ ہی زندگی کی روزمرہ ضرورتوں میں وہ آسانی سے برتی جا سکے۔ مثلاً لوہا یا چاندی یا کوئی اور ایسی ہی چیز۔ اس کے متعلق ابتداء میں حجم اور وزن معین کیا گیا اور پھر آخر میں ان دھاتی ٹکڑوں کے ہر وقت کے ناپ تول کے جھگڑوں سے بچنے کے لیے ان پر ایک خاص نشان کا ٹھپّہ لگایا جانے لگا جو اس کی مالیت کی علامت بنا" ــــــ رومی ماہر قانون پاؤل کا اسی عبارت کو

اکوینا س کا سینٹ ٹامس یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سکہ کوئی ایسی رواجی علامت ہو جو صرف حکومت کی اختیاری سمجھی جائے، اور جس میں سکہ بنانے والا حکمران جو تبدیلی چاہے عمل میں لا سکے ۔ سینٹ ٹامس بتاتا ہے کہ سکہ حقیقت میں ایک ایسا آلہ ہے جس سے تعین اور اندازے میں مدد لی جاتی ہے ۔ اس نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ سکہ ڈھالنے میں حکمران کو تھوڑا سا فائدہ ضرور حاصل ہونا چاہیئے لیکن اس کا خیال ہے کہ حکمران سکے کے وزن اور حیثیت و مالیت کو بدلنے یا گھٹانے کے متعلق اپنا اختیار اعتدال کے ساتھ کام میں لائے ۔ آخر میں سینٹ ٹامس نے بیان کیا ہے کہ ”اس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ رقم چیزوں کا اندازہ کرنے کے لئے ہوتی ہے“[1]

جب ترک یورپ میں آ گئے تو انھوں نے بیزنطینی سلطنت کا نظام نظم و نسق اور عہدہ داروں کے طبقات برخاست کردیے، لیکن انھوں نے اس بات سے اجتناب کیا کہ اپنی رعایا پر اپنے حکومتی ادارے اور وہ کشوری قوانین عائد کریں جو قرآن مجید میں لکھے ہوئے ہیں ۔ ترکوں نے اس کی ذرا بھی کوشش نہیں کی کہ مختلف لوگوں کو ملا کر ایک کریں ۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایسے ماحول میں پڑاؤ ڈالا جہاں عیسائیوں کو تعداد کی اکثریت حاصل تھی اور انھوں نے ان عیسائیوں کے بالمقابل جہاد یعنی حالت حرب باقی رکھی[2] ۔ یہی وجہ ہے کہ خاص کر سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کے بطریرک کو اپنی قوم کا سردار مقرر کر دیا اور اسے اس کے ہم مذہبوں کی وفاداری کا ذمہ دار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دہرانا (قانون روما کی) تالیف ”ڈائجسٹ“ کی کتاب (۱۸) عنوان (۱) قانون (۱) سے معلوم ہوتا ہے ۔

[1] فیٹری کی مذکورہ بالا تالیف ص ۴۴۵ ۔

[2] اس سے بعد ہی کا جملہ پڑھنے سے حیرت ہوگی کہ ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ غیر مسلم رعایا سے حالت حرب بالکل نہیں قائم رکھی گئی بلکہ وہ ”ذمی“ بنائے گئے یعنی ان کی حفاظت کی حکومت ”ذمہ دار“ ہے ۔ (مترجم) ۔

قرار دیا۔ اس طرح عیسائی کلیسا والے حقیقت میں عہدہ داروں کی ایک جماعت بن گئے جنھیں نظم ونسق اور عدل گستری کے نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مزید برآں ہر فرقے کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ محاصل جو وصول ہوں ان کی تقسیم کریں اور جو (بچت) حاصل ہو وہ شہنشاہی خزانے میں داخل کریں[1] قسطنطنیہ پر قبضے سے پہلے ترکوں کے تعلقات وینیس اور جے نوا والوں سے تھے۔ ۱۳۸۴ء میں ایک ترکی سفارت وینیس آئی تھی۔ ۱۳۸۷ء میں جے نوا والوں نے اپنے مختار کل نمایندے پیرا (قسطنطنیہ) بھیجے تھے۔ جب قسطنطنیہ پر ترکوں نے قبضہ کیا تو وینیس والوں کی نوآبادی کا جو منتظم تھا اور جو "بیل" کے نام سے موسوم تھا، وہ موت کے گھاٹ اتارا گیا، اور پانسو وینیس والے قیدی بنائے گئے۔ جمہوریۂ وینیس کو ڈر ہوا کہ اس کی رعایا کے مشرق سے جو عظیم مفادات وابستہ تھے، وہ کہیں پوری طرح تباہ نہ ہو جائیں۔ اس نے گفت وشنید کی اور اسے اختیار ملا کہ آیندہ بھی ایک "بیل" مقرر کرے جو نظم ونسق اور عدل گستری کے فرائض انجام دے۔ لیکن اس اثناء میں حالت بہت کچھ بدل گئی۔ وینیس کو جو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور مسلسل تین صدی سے اسے محصول جنگی سے آزاد رکھا گیا تھا، وہ حالت ختم ہو گئی۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد ثانی نے انھیں مراعات کی تجدید کی جن سے جے نوا کے تاجر اس وقت تک مستفید ہوتے چلے آرہے تھے۔

ترکوں کے تعلقات جو مختلف یورپی مملکتوں کے ساتھ تھے،

[1] اینگل ہارٹ کا فرانسیسی مضمون "مسیحیوں کے متعلق تاریخی اور قانونی ملحوظات" جو رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۲۲) میں شایع ہوا دیکھئے ص ۳۴۸۔

ان کے لیے بالآخر مراعات خصوصی کا نظام وجود میں آگیا۔ اس کے لیے یورپی زبانوں میں جو لفظ کاپی تولاسیوں (یا اس کا کوئی مترادف) مستعمل ہے۔ وہ غالباً اطالوی سے ماخوذ ہے۔ اطالوی زبان میں "کاپی تولاذی بولنے" کے معنی عہد و پیمان اور معاہدے کے ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ اس اصطلاح کا استعمال ۱۵۳۵ء سے پہلے ہوا ہو۔ بہرحال اس سنہ میں فرانسوا اول اور سلطان سلیمان دوم میں حلیفی اور تجارت کا ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ اصول قرار دیا گیا تھا کہ فرانس کے سفیر، قنصل، ترجمان، تاجر اور دیگر رعایا کی حفاظت کی جائے گی اور ان کو پورے آرام و اطمینان سے رہنے دیا جائے گا۔ اس معاہدے کے تحت صرف فرانسیسی جھنڈا اڑانے والے جہازوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ "باب عالی" یعنی ترکی کے مقبوضات سے تجارت کریں۔ رہیں یورپ کی دیگر قومیں مثلاً انگریز، قتلانی، راگ وازی، صقلی، جے نوائی، پرتگالی وغیرہ، سو ان کی حکومتوں نے باب عالی سے دوستی کے معاہدے نہیں کئے تھے۔ مگر ان کو بھی اجازت تھی کہ فرانسیسی جھنڈا اڑاکر اور فرانس کی حفاظت حاصل کرکے جہاز چلا سکتے ہیں۔ معاہدے کی ایک دفعہ میں پوپ، انگلستان کے بادشاہ اور اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کے لئے یہ گنجایش رکھی گئی تھی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو آٹھ مہینوں میں اپنے آپ کو اس معاہدے سے وابستہ کرلیں۔

298

۱۵۳۵ء کا معاہدہ سلطان سلیمان دوم کی وفات پر ختم ہوگیا۔ لیکن ۱۷۴۰ء کا معاہدہ ہونے تک — جواب[1] بھی نافذ ہے۔ اس کی گیارہ مرتبہ تجدید عمل میں لائی گئی۔

---

[1] یعنی ۱۸۹۴ء میں یہ بالآخر ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان کے ذریعے سے ختم ہوگیا۔ (مترجم)۔

دیگر مملکتوں نے بھی اپنی نوبت پر مراعاتِ خصوصی (ترکی میں) حاصل کیے۔[1]

سترھویں صدی سے ایسے معاہدے عمل میں آنے لگے جو یورپی سلطنتوں اور باب عالی کے ان ماتحت ملکوں میں ہوئے جو بربر علاقے کے ساحل پر واقع تھے۔ الجزائر، تونس اور طرابلس میں موروثی نائب السلطنت مامور ہونے لگے۔ یہ باب عالی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرتے تھے اور مصر بھی باب عالی کا ایک باج گزار صوبہ تھا۔ جب ۱۴۹۲ء میں اسپین سے عربی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو شمالی افریقہ کو فتح کرنے کا پرتگالی خواب اسپین کے لیے ایک اہم سیاسی مسئلہ بن گیا۔ کیتھولک مذہب والی ایزابیلا مرنے لگی تو اس نے اپنے وصیت نامے میں اسپینیوں کو باصرار مشورہ دیا کہ وہ اپنی اس فتح سے دستبردار نہ ہوں اور دین کے لیے غیر مذہب والوں سے جنگ کریں۔ صرف عیسائیت کو پھیلانا ہی وجہ تحریک نہ تھی بلکہ اسپین کے ساحلوں کی حفاظت کا اطمینان حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسپین اور بربر علاقے کو ایک ہی شہنشاہت بنا دیا جائے جن کے لیے بحر متوسط صرف ایک "اندرونی جھیل" کی حیثیت رکھے۔[2] لیکن یہ حملے بالآخر ۱۵۷۹ء میں ناکام ثابت ہو گئے۔ مراکش کے بحری قزاق ایک خطرے کا باعث بن گئے۔ سترھویں صدی میں دیگر ملکوں کی طرح اسپین نے بھی مراکش، الجزائر، تونس اور طرابلس سے معاہدے کی گفت و شنید کی۔ یورپیوں

---

[1] فےروژی ژوکی فرانسیسی تالیف "مشرق قریبہ اور بربر علاقوں کی کوٹھیوں نیز فرانسیسی عدالتیں" جلد (۱) ص ۲۶ ۔ مسٹر اڈرس ٹوس کی تالیف "قانون بین الممالک جو توموں کو خود مختار سیاسی جماعتیں تصور کرتا ہے" جلد (۱) ص ۴۳۰۔

[2] تورکاں پو کا فرانسیسی مضمون "اسپین افریقہ میں" مطبوعہ رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۲۴) دیکھئے ص ۴۱۴۔

یٔنے جو معاہدہ کرنا چاہا تھا، اس کی بنیادی دفعہ یہ تھی کہ جہاز گرفتاری سے آزاد رہیں گے اگر ان کے پاس وہ اجازت نامہ ہائے سفر ہوں جن کے لیے باہم عہد و پیمان کے ذریعے سے انتظام کیا جائے گا۔ اور یہ کہ جو (دوست ملک کی) رعایا دشمن جہاز پر پائی جائے اس کی آزادی بھی محفوظ رہے۔ معاہدے کی دیگر شرطیں قنصلوں اور ادا طلب محصولوں کے متعلق تھیں[1]

---

[1] مارٹینس کی فرانسیسی تالیف "سفیروں کی عدالتیں" جلد (۳) (یورپی سلطنتوں کے خارجی تعلقات کی جدول)۔

باب چہاردہم

سفارت کاری اور مستقل سفیر

پندرھویں صدی میں تقریباً ایک ہی وقت یورپ کی تین بڑی سلطنتوں کے اندرونی اتحاد کا کام تکمیل کو پہنچ گیا۔ فرانس اس جنگ سے فتح مند باہر آیا جو اس کے علاقے کو روندنے والی اجنبی مملکت کے خلاف لڑی جاری تھی۔ فردیناند اور ایزابیلا کی شدید کوششوں کے باعث اسپین میں بھی بادشاہت قائم ہو گئی۔ انگلستان کو اندرونی جھگڑوں نے بہت کچھ کمزور کر دیا تھا۔ وہ بھی اب ٹیوڈر بادشاہوں کے زمانے میں ایک نئی قوت حاصل کر لیتا ہے۔ جب یہ تین اہم قومیں اس طرح منظم ہو جاتی ہیں، اور انھیں اپنے متعلق اطمینان ہو جاتا ہے اور اپنی اہمیت اور صلاحیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، تو وہ اپنا تہذیب آموزی کا فریضہ انجام دے سکتی ہیں۔ لیکن جب ایک طرف یہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف ایسی قومیں بھی موجود تھیں، جو ابھی تک اپنا قدم جمانے کی آہستہ آہستہ کوششیں کر رہی تھیں۔ برگنڈی کے خانوادے کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ مقدس رومی

سلطنت ہر قسم کے اندرونی استحکام سے خالی اور عاری نظر آنے لگی۔ شمالی علاقوں میں جو کوشش عمل میں لائی جانے لگی وہ اتنی سست تھی کہ اس سے کوئی فوری اثرات نہیں پیدا ہو سکے۔ اٹلی میں تو روز افزوں پھوٹ ہی بڑھتی گئی۔ یونانی شہنشاہت میں جو اضمحلال آرہا تھا تو وہ ترکوں کا شکار بن گئی۔ اور ترکوں کی زبردست قوت، وسطی یورپ کی عیسائی مملکتوں کو دھمکی دینے لگی۔

اس سے ایک قدرتی مظاہرہ وجود میں آیا۔ جو قومی وحدتیں اپنے معراج کمال پر پہنچ گئیں، انھیں بیرونی سیاست میں ایک عظیم اثر حاصل ہو گیا۔ اور توسیع کے۔ اس رجحان سے دنیا میں ایک سرگرمی اور ایک غیر معمولی حرکت پیدا ہو گئی۔ فتح عموماً ان کوششوں کے ختم پر حاصل ہوتی ہے، جو اس سلسلے میں عمل میں لائی جائیں۔ بہر حال بعض وقت ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کام انجام پا چکا ہے، اس کو مستحکم کیا جائے۔ ان کوششوں کی وجہ تحریک، ایک جائز اور قابل احترام خواہش ہوتی ہے۔ یعنی کسی ہمسایہ سلطنت کی دست درازیوں کے خلاف اپنے آپ کی حفاظت کی جائے۔ ممکن ہے کہ بادی النظر میں کوئی شخص اسے باور کرنے پر آمادہ نہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاسیات کا مقصد اصل میں قومی وحدت کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم اور قرون متوسطہ کی ابتداء میں الگ تھلگ رہنا ہی عام قانون تھا۔ مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے قریب ہونا۔ دورِ جدید کی امتیازی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جلدی ہی بین الممالک تعلقات اس طرح قایم ہو گئے کہ ان میں تسلسل ہو اور کوئی وقفہ حائل نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ، یہ تعلقات بارآور ہوئے اور انسانیت کے لیے ایک نئی زندگی شروع ہوئی[۱]

۲۹۰

[۱] نیس کا مضمون "سفارت کاری اور قانون سفارت کا آغاز گرونیوس سے پہلے" جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک وتقابلی قانون سازی میں شائع ہوا دیکھیے جلد (۱۵) صفحہ ۵۷۰ اور جلد (۱۶) صفحہ ۸۵ و ۱۶۷۔

جس عہد سے ہم بحث کر رہے ہیں اس میں سب سے زیادہ خانوادہ واری حیثیت چھائی رہتی ہے اور شاہی گھرانے ہی ہیں جو نئی مملکتیں بناتے اور ترتیب دیتے ہیں۔ فرانس کا گیارھواں لوئی، انگلستان کا ساتواں ہنری، اور آراگون کا فردیناند عظیم الشان انفرادیت پسند شخصیتیں تھیں (بیکن ان کو "تین بڑے اشخاص" کے نام سے یاد کرتا ہے)۔ انھوں نے اپنی قوموں پر اپنی ذہانت کا ایک ایسا اثر چھوڑا جو بعد میں صدیوں تک ہویدا رہا۔ حکمرانوں کی مدد کو اکثر اعلیٰ اہلیت کے وزیر بھی ہوتے رہے ہیں۔ ایک اور حیثیت سے وہ اہم معاملے جن سے یورپ کی ماہیت ہی بدل گئی، ان میں سب سے پہلے سفارت کاری کو جگہ دی جانی چاہیے۔ "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" نامی نفیس کتاب کے مولف (یعنی مُود لاکلاویئیر) نے خوب کہا ہے کہ: "سفارت کاری اتنی ہی پرانی ہے جتنی دنیا۔ اور صرف اسی وقت ختم ہوگی جب خود دنیا بھی ختم ہو جائے"۔ چند وحشی قبیلوں کو چھوڑ کر، قومیں ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے ذریعے سے خط و کتابت کرتی رہی ہیں جن کو بطور نمایندہ بھیجا جاتا تھا۔ ابتداءً مذہب اور پھر اس کے بعد مسلمہ قانون نے قدیم ترین زمانوں سے سفیر کی ذات کو ہر قسم کی ضرر رسانی سے بالاقرار دیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود، بحیثیت "ایک نظام کے" سیاست کاری صرف قرون متوسط کے نصف دوم میں وجود میں آئی۔

سفارت کاری کی ابتدائی ترقیاں تیرھویں[1] صدی عیسوی ہی سے

---

[1] اس سے کم از کم دو صدی قبل عربوں کے ہاں مستقل سفارتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ چنانچہ امیر علی کی انگریزی "مختصر تاریخ عرب" (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) صفحہ ۴۰۷ تا ۴۰۸۔ صفحہ ۶۲۲ میں لکھا ہے کہ: "جب صوبہ دار گورنر خراج گزار مگر خود مختار حکمران بن گئے اور خلیفے کا اقتدار اعلیٰ کم یا زیادہ درجے کی آقائی تک گھٹ آیا تو خفیہ پرچہ نویس دربار خلافت کے نمایندوں کی حیثیت اختیار کر گئے اور نیشاپور،

شروع ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ شروع شروع میں سفارتیں مختصر مدت کے لیے اور عارضی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جلدی ہی ایک ایسا نظام وجود میں آیا جو زیادہ دیر پا تھا اور جس شخص کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا، اسے اس حکمران کے ہاں جہاں اسے بھیجا جاتا کم یا زیادہ مدت گذارنی پڑتی اور جس مدت کے لیئے اس سے وہاں رہنے کا معاہدہ ہوتا اس سے پہلے وہ وہاں سے واپس جا نہ سکتا۔ اس کے بعد آخر کار مستقل سفارتیں وجود میں آئیں۔ 297

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) مرو، موصل، دمشق وغیرہ کے درباروں میں مستقل مقیم کارندوں کے طور پر کام انجام دینے لگے۔ قرون متوسطہ کے متاخر زمانے میں جس طرح پوپ کے نمایندے ہوتے تھے، خلیفے کے یہ نمایندے بھی ان حکمرانوں کے ساتھ جن کے ہاں وہ متعین ہوتے تھے، ان کی فوجی مہموں میں رفیق سفر رہا کرتے تھے۔ ایسے نمایندے ہمیں نہ صرف الپ ارسلان اور ملک شاہ کے پڑاؤ میں نظر آتے ہیں، بلکہ نور الدین محمود اور صلاح الدین کے ساتھ بھی۔ یہ ہمیشہ سرگرم عمل رہتے اور کبھی کبھی دخل در معقول بھی کیا کرتے اور بعض وقت، مثلاً ایوبی حکمرانوں کے متاخر زمانے میں، متصادم حکمرانوں میں صلح وصفائی بھی کراتے تھے۔ نیز برادر کشی کے جھگڑے چکا دیتے تھے۔ (چنانچہ تاریخ ابو الفداء کے مطابق خلیفے کے نمایندے نے الملک المظفر کے بیٹوں میں جو جھگڑا ہو رہا تھا، اسے ختم کرا دیا۔

دو ساتھ ہی ہر حکمران بھی اپنا ایک نمایندہ، جس کا نام شحنہ ہوتا، دربار خلافت میں متعین رکھتا، جس کا کام یہ ہوتا کہ اس حکمران کے حریفوں اور رقیبوں کی چالبازی پر نظر رکھے۔ پاپائی روما میں تمام جائز اقتدار کے سرچشمے یعنی پوپ پر اثر جمانے کے لیے جیسی شدید کشمکش ہوتی تھی، بغداد میں بھی خلیفے کی ذات کے متعلق وہی حال تھا۔ دار الخلافے کے علاوہ شحنے واسط، بصرہ، تکریت وغیرہ مقاموں پر بھی متعین رہتے تھے۔

"خلفائے عباسیہ اگر ہمسایہ حکمرانوں سے کوئی راز کا کام رکھتے، تو اکثر ایک خصوصی سفیر بھیجا جاتا جسے نظام الحضرتین کہتے تھے"۔ (مترجم)۔

بڑے ممالک میں مستقل سفارتوں اور وزارت خارجہ کے دفتروں کے قیام میں بہت قریبی تعلق رہا ہے۔

اطالوی شہروں نے نمونہ قائم کیا۔ ایک مقابلۃً چھوٹی سی سرزمین میں ایسے ایسے سیاسی کھیل کھیلے گئے، جن کے کھلاڑیوں نے حیرتناک جسارت کا ثبوت دیا ہے اور ان میں سفارت کارانہ قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حلیفیاں قائم ہوتیں اور توڑی جاتیں، جس سے رفتہ رفتہ یکجہتی برخاست ہوتی گئی۔ ایک شہر کو ترقی ہوتی، تو دوسرے کو تنزل۔ اور سب سے زیادہ کوشش اس غرض کے لیے عمل میں لائی جاتی کہ جزیرہ نمائے اٹلی کے حکمرانوں کی قوتوں میں توازن کا ایک نظام قائم کیا جائے۔ ان پیچیدگیوں میں جنگ نے بھی ایک اہم حصہ لیا۔ لیکن جنگ سے بڑھ کر سفارت کاری نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اٹلی میں ایک بھی شہر ایسا نہیں ہے جو فخر کے ساتھ اپنے ہاں کے چند قابل گفت و شنید کنندوں کو پیش نہ کر سکے۔ ان جمہوریتوں میں سے چند نے تو بعض ایسے سیاست داں پیدا کئے ہیں کہ ان سے بہتر تاریخ کوئی اور پیش نہیں کرتی۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں شہر فلارنس کے سفیروں میں برونیتو لاطینی، دانتے، پیٹرارک، اور بکاچیو جیسے نام ملتے ہیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں اسی شہر سے کاپونی، فتوری، گیچاردینی اور ماکیاولی جیسے کارگزار پیدا ہوتے ہیں۔ فینس کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ وہ "سفیروں کی درسگاہ اور کسوٹی ہے"[1]
اس شہر نے قانون سفارت کاری کی تاریخ میں ایک قابل لحاظ حصہ لیا ہے۔ روما سے تو ہر زمانے میں سیاست داں پیدا ہوتے رہے ہے۔ چنانچہ وہاں ایک تحریک اس زور و شور سے اٹھی کہ پوپوں کو بھی یہ

[1] توشوں کی اطالوی تالیف "تیرھویں سے سولھویں صدی تک کی اطالوی سفارت کاری" صفحہ [ ]
[2] آم تو ذلا آو ـــــ سے کی فرانسیسی "فینس کی تاریخ حکمرانی"

کہنے پر مجبور کیا کہ حکمرانوں کا فریضہ ہے کہ اظہار اطاعت کے لیے (پوپ کے ہاں) سفارتیں روانہ کیا کریں۔ چنانچہ "برکارڈ" نے جو افسر مراسم تھا، جے نوا والوں اور پوپ آٹھویں انوسنٹ کے ذکر میں (لاطینی میں) لکھا ہے کہ: "اچھے عیسائیوں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ پوپ کی خدمت میں اظہار اطاعت پیش کریں۔"

وینیس کی سفارت کاری کا نظام اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ یہیں یہ ادارہ ہمیں اس زمانے میں بھی باقاعدہ کام کرتا نظر آتا ہے، جب کہ باقی یورپ میں ابھی اس کا وجود یک نہ تھا۔ 298 چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ تیرھویں صدی ہی سے جمہوریہ وینیس کی بڑی کوشش رہی ہے کہ ایک سلسلۂ تدابیر اختیار کر کے سفارتی معاملات میں مفاد عامہ کی حفاظت کرے۔ ۱۲۳۶ء میں بڑی مجلس شوریٰ نے یہ حکم دیا کہ جو سفیر دربار روما میں بھیجے جائیں وہ دوجے یعنی جمہوریۂ وینیس کے افسر اعلیٰ کے اور چھوٹی مجلس شوریٰ کے حکم کے بغیر کوئی تحفے تحائف حاصل نہ کریں، چاہے کسی کے نام سے کیوں نہ ہوں۔ ۱۲۶۸ء میں یہ حکم نافذ کیا گیا کہ سفیروں کو جو تحفے وصول ہوں انھیں وہ (اپنی حکومت کے) حوالے کر دیں۔[1] ایک اور حکم نامے کے ذریعے سے ان پر یہ حلف لینا ضروری قرار دیا گیا کہ وہ جملہ معاملات میں جمہوریت کی آن اور مفاد کا لحاظ رکھیں گے۔[2]

---

[1] نوشون کی مذکورہ اطالوی تالیف صـ ۶۵ و مابعد۔

[2] آل بے ری کی اطالوی تالیف "سنیٹ کے پاس آنے والے سفارت نامے" سلسلۂ اول جلد (۱)۔ رومانین کی اطالوی تالیف "وینیس کی دستاویزوں کے حوالے سے لکھی ہوئی تاریخ" جلد (۲)، صـ ۵۳۔ باشت کی فرانسیسی تالیف "وینیس کی سفارت کاری"۔ سولھویں صدی کے یورپی حکمران، فرانسوا اول، فلپ دوم، مبدی سیس کی کاترین، ترکی سلطان وغیرہ" صـ ۱۷۔

تقریباً اسی زمانے میں یہ طے کیا گیا کہ سفارتی کارندے اپنی واپسی پر اپنی کارگزاری کی تحریری یادداشت پیش کریں۔ چنانچہ وہ (لاطینی) حکم یہ تھا: "سفیر واپسی پر تحریری طور سے یہ پیش کریں گے کہ وہ ملک کے لیے (کیونکر اور کس قدر) مفید ثابت ہوئے"۔ ۱۲۸۸ء میں ایک قانون نافذ ہوا جس میں اس قسم کی باتوں کا حکم دیا گیا کہ جب کوئی باضابطہ سفارت بھیجی جائے تو سفیر اپنی واپسی کے پندرہ دن کے اندر ایک تحریری یادداشت میں یہ بیان کرنے کے پابند ہوں گے کہ ان کی سفارت کے دوران میں ان کو کیا کیا جواب دیے گئے تھے، نیز یہ کہ وینس کی آن اور وینس کے مفاد کے متعلق انھوں نے وہاں کیا دیکھا یا کیا سنا؟ ان آخری احکام کی، بعد میں کئی مرتبہ تجدید ہوتی رہی، خاص کر ۱۲۹۶ء، ۱۴۲۵ء، اور ۱۵۳۳ء میں۔ چنانچہ حکومت کی اس تدبیر کے طفیل وہ مشہور یادداشتیں ہم تک پہنچ سکی ہیں جن سے وینس کے سفیروں کی بالغ نظری، قابلیت اور غیر معمولی سیاسی مہارت کے متعلق ایک زندۂ جاوید ثبوت ملتا ہے۔

سفارتوں کے متعلق قوانین کا ایک اور سلسلہ بھی تیرھویں صدی میں نافذ ہوا۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد پختہ کارانہ حزم و احتیاط پر قایم تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ کوئی وینس والا بطور سفیر کسی ایسے ملک کو نہیں جا سکے گا جہاں اس کی کچھ جایداد پائی جاتی ہو۔ اور یہ کہ کوئی سفیر اپنی خدمت کو چھوڑ کر اکیلے ایک دن کے لیے بھی کہیں نہیں جا سکے گا۔ جیسا کہ گانتار نے بیان کیا ہے: "ایک ایسے زمانے میں جب کہ یورپ میں تقریباً ہر طرف نظم و نسق ابتری اور تاراج کی حالت میں تھا، اور علم سیاسیات طفلی کی حالت میں، تو اسی وقت وینس کی بڑی مجلس (شوریٰ) صاف اور واضح احکام کے ذریعے سے یہ معین کر چکی تھی کہ اس جمہوریت کی طرف سے جن لوگوں کو کسی سفارت پر باہر بھیجا جائے

299

ان کے کیا فرائض ہوں گے[۱] سفیروں کے قیام کی مدت بھی معین کی گئی۔ تیرھویں صدی میں تین یا چار مہینے کا قیام بھی کسی سفارت کے لیے خاصا لمبا سمجھا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی میں یہ طے کیا گیا کہ کوئی سفیر کسی ایک دربار میں دو سال سے زیادہ متعین نہ رہے گا۔ سولھویں صدی کے اواخر میں اس مدت کو تین سال تک بڑھا دیا گیا۔ سنہ ۱۴۸۱ء میں سفیروں کو اجنبی لوگوں سے اپنی جمہوریت کے معاملات پر گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جو لوگ سرکاری ملازمت میں نہ ہوں، ان کے سوا کسی اور کو سیاسی مسائل پر کوئی چیز تحریر نہ کریں۔ انھیں اس پر بھی مجبور کیا گیا کہ اپنے خطوط کی کسی کو اطلاع دینے سے بھی اجتناب کریں، بجز اس کے کہ انھیں صراحت سے اجازت دی گئی ہو۔ نہایت تفصیل اور دقیقہ رس طور سے ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ بے احتیاطی عمل میں نہ آنے پائے۔ سنہ ۱۴۸۱ء میں مجلس دہ گانہ نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو جلاوطنی اور دو ہزار ڈوکا (سکوں) کے جرمانے کی سزا دی جائے جو کسی اجنبی سفیر سے اپنی مملکت کے معاملات پر گفتگو کریں۔ ایک اور فیصلے کے تحت ان لوگوں کے لیے سزائے موت مقرر کی گئی جو راز فاش کریں۔ اس غرض کے لیے سرکاری مجلس تحقیقات (عدالت تحقیقات اسرار) قائم کی گئی کہ رازہائے سرکاری کے افشاء کو روکا جائے اور افشاء پر سزا دی جائے[۲]۔

[۱] گاشار کی فرانسیسی تالیف "فی نیس کی سفارت کاری کی یادگاریں تاریخ جدید کے نقطۂ نظر سے عام طور پر اور بلجیم کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے خاص طور پر" جلد (۲۷) مطبوعہ سنہ ۱۸۵۳ء جو بلجیم کی شاہی اکاڈمی کے سلسلے میں شایع ہوئی۔

[۲] رومانین کی اطالوی تالیف "فی میس کی دستاویزوں کے حوالے سے لکھی ہوئی تاریخ" جلد (۶) ص ۱۱۱ — زِلّر کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی سفارت کاری سولھویں صدی کے

سفارتی کارندوں کا بھیجنا "پرے گادی" کی مجلس کے اختیار میں تھا اور ۱۴۹۷ء سے یہ اختیار سینیٹ کو حاصل ہو گیا۔ سفیر کا انتخاب کثرت آراء سے ہوتا۔ جس شخص کا انتخاب ہوتا، اسے چودہ مہینوں کے اندر منزل مقصود کو روانہ ہوجانے کی تیار کرنی پڑتی۔ لیکن روانہ ہونے سے قبل اسے ایک صریح حکم کے ملنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ وینیس سے روانہ ہونے سے پہلے اسے مجلس وزراء کی طرف سے ایک خریطہ حاصل ہوتا جو نہ صرف تقرر نامے کی حیثیت رکھتا، بلکہ اس میں سفیر کو عام ہدایتیں بھی دی جاتیں کہ اسے سب سے پہلے کیا کام کرنے ہیں، اسے کتنے دن رہنا ہوگا، اسے کیا تنخواہ ملے گی۔ اور یہ کہ اسے کس طور پر کام کرنا چاہیے؟ اس خریطے کے ساتھ ڈوجے یعنی جمہوریۂ وینیس کے افسر اعلیٰ کا ایک خط بھی ہوتا جو اس ملک کے حکمران کے نام ہوتا جہاں سفیر بھیجا جا رہا ہو۔ یہ تقرر نامے انتہائی سادہ زبان میں لکھے جاتے۔ چودھویں صدی کے وسط سے لاطینی کے ساتھ ہی ساتھ اطالوی زبان بھی استعمال ہونے لگی۔ 300

کبھی تو سفارت میں متعدد سفیر ہوتے جن کے ہمراہ اعزازی شہاست باز اور ان کے نوکر ہوتے، اور کبھی صرف ایک ہی سفیر ہوتا جس کے ماتحت چند وابستگان پائے جاتے۔ سفارتی کارندے کو اختیار تھا کہ اپنے ساتھ جتنے معززین کو چاہے لیجائے۔ مزید برآں ہر سفیر کے ساتھ ایک یا زیادہ معتمد ہوتے جو درجۂ دوم کے معزز گھرانوں سے چنے جاتے۔ وینیس کے قانون سفارت کا یہ خصوصی رواج تھا کہ سفیر جب اجنبی حکمرانوں سے گفتگو کرتے تو یہ معتمد بھی موجود رہتے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سفیر، ان حکمرانوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وسطی میں، گیوم پے لی سیے کی خط و کتابت کی روشنی میں"۔ صـ ۵۲۔

ساتھ تقریباً ہر جگہ سفر کیا کرتے جن کے درباروں میں ان کو متعین کیا گیا ہو۔

خط و کتابت ایک مشکل چیز تھی لیکن پھر بھی سفیروں کے نام کثرت سے خط بھیجے جاتے۔ ان خطوط کے پہنچانے کے لیے خصوصی خطوط رساں استعمال ہوتے تھے۔ لیکن سولھویں صدی سے معمولی ڈاک استعمال ہونے لگی۔ فلارنس کے سفیر اپنی خط و کتابت کے لیے اکثر تجارتی کارخانوں اور بنکوں سے مدد لیتے، اور مصارف ارسال میں حصہ لیتے[1]
جب ماکیاویلی کو سفیر بنا کر فرانس بھیجا گیا تو اس نے متعدد مرتبہ خط و کتابت کے لیے ڈے ای نامی کمپنی کا توسط اختیار کیا تھا۔ فلارنس کی یہ کمپنی فرانس کے شہر لیوں میں قائم تھی۔ ماکیاویلی کے ان خطوط کے آخر میں یہ بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ ان کی ارسال کے آدھے مصارف سفیر نے ادا کیے[2] سفارت کے خطوط رسانوں کی رفتار سفر بہرحال بہت تیز تھی کیونکہ راستے کے طول و عرض میں مناسب مسافتوں پر بدلی کے گھوڑے مہیا رہتے تھے۔ سنہ ۱۴۷۴ء میں شہر رَوان کے کارڈینل پادری نے فرانس کے بادشاہ کے نام ایک خطوط رساں روانہ کیا تھا جس نے وعدہ کیا تھا کہ روما سے پاریس تک (۱۳) دن میں طے کرے گا۔ سنہ ۱۵۰۹ء میں شہر بلوا سے جو خط ۷ رفیوری کو نکلتے وہ ۱۴ر تاریخ کی صبح کو فینس پہنچ جاتے[3]۔ اگر سفیر حمل و نقل کے خانگی ذرائع استعمال

---

[1] ٹوموں کی اطالوی تالیف "تیرھویں سے سولھویں صدی تک کی اطالوی سفارت کاری" ص ۲۱۶۔

[2] ماکیاویلی کا مجموعۂ تالیفات (فرانسیسی ایڈیشن) سفارتیں اور ایلچی گریاں، دربار فرانس میں سفارتیں، خط (۱۴ء)۔

[3] ژیں ژیں لاسارا کی فرانسیسی تالیف "جسارت مند شارل کی معرکہ آرائیوں کے متعلق میلان کے سفیروں کی مراسلتیں" دیباچہ ص ۱۱۔

کرتے تو وہ اپنے مراسلوں کے ساتھ سابقہ مراسلے کی ایک نقل بھی منسلک کر دیتے اور اگر انھیں ڈر ہوتا کہ ان کے مراسلے اجنبیوں کے ہاتھ نہ پڑجائیں تو وہ ایک راز کا طریقہ تحریر استعمال کرتے۔ کبھی تو پورا مراسلہ اسی طور سے لکھا جاتا اور کبھی اس کے صرف اہم حصے۔ جب کبھی سفارت میں ایک سے زیادہ افراد بطور سفیر شامل رہتے، تو مراسلے اجتماعی طور سے ہوتے۔ ایسی بھی صورتیں پیش آتی تھیں کہ مراسلے کسی معمولی سفیر یا کسی غیر معمولی سفیر کی طرف سے ہوتے۔

301

لوگ اس کی اکثر کوشش کرتے رہے کہ سفیروں کے فرائض کی انجام دہی سے اپنے کو بچائیں۔ ابتدا ہی سے ان لوگوں کے لیے جرمانے مقرر کیے گئے تھے جو سفارت پر نامزد کیے جانے کے باوجود اسے قبول نہ کریں یا قبول کر لینے کے بعد اپنی منزل مقصود کو جانے سے انکار کریں۔ ۱۲۷۱ء کے ایک حکم نامے میں اس کا جرمانہ بیس "شو لدی" (سکے) مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۲۸۶ء کے قانون نے یہ قرار دیا کہ صرف کسی شدید بیماری ہی سے کسی شخص کو معذور رکھا جاسکتا ہے۔ ۱۳۶۱ء میں یہ قرار دیا گیا کہ جو لوگ ایک مرتبہ سفارت قبول کرنے کے بعد روانہ ہونے سے انکار کریں وہ ایک سال تک کوئی اور سرکاری خدمت انجام نہیں دے سکتے اور نہ کسی اور منفعت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ۱۵۰۲ء میں اسپین کی سفارت کے متعلق ایک حکم نامہ اس غرض کے لیے جاری کیا گیا کہ اگر کسی شخص کا سفارت کے لیے نیا نیا انتخاب کیا گیا ہو تو وہ اسے آٹھ دن کے اندر قبول کرنا چاہیے اور اگر وہ پہلے ہی سے کسی اور عہدے پر مامور ہے تو ایک مہینے کے اندر[1]

---

[1] باژوت سی اور برشے دو مولفوں کی مشترکہ اطالوی تالیف "یورپی مملکتوں کے سفارت نامے جو سفیروں نے سینٹ میں پڑھ کر سنائے اور جو سترھویں صدی عیسوی میں آئے"، سلسلۂ اول جلد (۱) صفحہ ۔

سفیر کے اخرجات اس کی تنخواہ سے بے حد زیادہ ہوتے تھے۔ اور اس کے لیے جو معاوضہ مقرر ہوتا تھا اس سے اس کا خرچ تین بلکہ چار گنا بھی ہو جاتا تھا۔ بکثرت مراسلوں اور سفارت ناموں میں اس نکتے پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اور ایک سے زیادہ سفیروں نے اس کی تلخی کے ساتھ شکایت کی ہے۔ چنانچہ مارٹیو کافالی نے ۱۵۴۶ء میں لکھا تھا کہ: "جنابان والا: اگر آپ کو ابھی تک معلوم نہیں ہے تو مجھ سے سیکھیے کہ سفیر چاہے بڑی سلطنتوں کے ہوں یا چھوٹی، ان میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ڈینس کے سفیروں کی ہے۔ پوپ کے سفیروں کو روزانہ دس ایکو (سکے) ملتے ہیں۔ اور اگر انھیں یہ رقم وصول نہ ہو تو چونکہ وہ ساتھ ہی ساتھ پوپ کے مذہبی نمایندے بھی ہوتے ہیں، اس لیے وہ لوگوں کو مذہبی اعزازات عطا کر کے اور کلیسائی پابندیوں سے استثناء عطا کر کے، نیز اسی طرح کے دیگر مماثل ذرائع سے پیسے کماتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے اور ان کے خاندانوں کے لیے مشکل ہی سے کوئی عزت کی چیز سمجھی جا سکتی ہے۔ بطور سفیر بھیجے جانے سے پہلے ان کو بطور اسقف نامزد کیا جاتا اور ان کی واپسی پر نہ صرف انھیں کوئی خالی خولی خطاب دیا جاتا، بلکہ سالانہ دو ہزار سے تین ہزار ایکو (سکوں) کی انھیں تنخواہ مقرر ہوتی۔ بہر حال جو کچھ ان کے پاس ہے، وہ انھیں اپنے حکمران یا پوپ سے ملا ہوا ہے۔ شہنشاہ کے سفیر اور فرانس و انگلستان و پرتگال کے سفیر روزانہ آٹھ تا دس ایکو (سکوں) کی تنخواہ پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے معاملات پر انھیں دو تا تین فی صد (فیس) بھی ملتی ہے۔ شہنشاہی سفیر اس طرح تین ہزار ایکو سے زیادہ کما لیتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کو ان کے حکمرانوں کی طرف سے کوئی خانقاہ، کوئی اسقفی یا کوئی عمری خدمت مل جاتی جس سے چار ہزار تا دس ہزار ایکو تک آمدنی ہو جاتی۔ (طنجہ، آثراگ سیئو، اور فےرارے کے اسقفوں کو، سیں موریس کے موں سینی کی پادری اور فلارنس کے سفیر کی یہی حالت ہے۔ اس کے برخلاف ہم

302

دوسروں کی حالت یہ ہے کہ ہمیں روزانہ پانچ ڈوکا (سکوں) پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پھر بھی واضح کرنا چاہیئے کہ ہمیں ڈوکا (سکے) ملتے ہیں ایکو نہیں۔ کیونکہ فرانس میں مجھے کبھی سات لیرا (فرانک) اور بارہ "شو" — (بیس "سو" کا ایک فرانک ہوتا ہے۔ مترجم) — سے زیادہ نہیں ملے۔ اسی آمدنی میں ہم کو ہر قسم کی تقریبیں بھی کرنی پڑتی ہیں، دسترخوان کھلا رکھنا پڑتا ہے، نوکروں کو انعام دینا پڑتا ہے، تنخواہیں ادا کرنی پڑتی ہیں اور ہر قسم کے غیر معمولی اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں جن کی تفصیل ناممکن ہے۔ مزید برآں بے وجہ تین ہزار ایکو کا سرمایہ موری کپڑوں، لباس، گھوڑوں اور اسی طرح کی مماثل چیزوں میں اٹکائے رکھنا پڑتا ہے بلکہ لوگ خود اس سرمایے پر ہاتھ چلانے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ کیوں متعدد شہری اسی کو پسند کرتے ہیں کہ کسی اجنبی ملک کو سفارت میں جانے کی جگہ فلورنس ہی میں رہیں اور معمولی خانگی اشخاص کے طور پر زندگی گزار لیں[1]۔"

ماکیاویلی کے مراسلوں میں بھی اس چیز کی کچھ کم وضاحت نہیں ہے۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ فلارنس اپنے ملازموں سے کم سے کم اتنی ہی قربانی کا مطالبہ کرتا تھا جتنی فلورنس اپنے ہاں کے لوگوں پر عائد کرتا تھا۔ ماکیاویلی اور فرانسوا دلاکاسا نے لکھا ہے کہ: "ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں، بغیر توقف، ضروری رقم بھیجی جائے تاکہ جتنا عرصہ آپ ہم دونوں کو یا ہم میں سے کسی ایک کو یہاں روک رکھیں، اس اثناء میں ہماری ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ خیال تو کیجئے کہ ہماری جائداد اور ہماری ساکھ دیگر بہت سے سفیروں کی طرح ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ یہاں کئی کئی ہفتوں تک اپنے صرف پر رہنے پر

---

[1] توماسیو کی فرانسیسی تالیف "فلورنس کے سفیروں کے سفارت نامے فرانس کے حالات کے متعلق سولھویں صدی میں" جلد (۱) ص ۳۶۱۔

مجبور ہوں اور ہمیں وہ امداد حاصل نہ ہو جس کی ہمیں آپ کی عنایت سے توقع ہے۔" ایک اور خط میں لکھا ہے کہ: "اب تو ستمبر کی دوسری ہو چکی ہے اور ہم ابھی تک گزشتہ خط بھی روانہ نہیں کر سکے ہیں کیونکہ ہم انھیں جو کھم پر بھیجنا نہیں چاہتے اور کسی خطوط رساں کو بھیجنے کے لیے ہمارے پاس وسائل نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتیں تک پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ ہم کو مدد خرچ نہ بھیجیں تو ہمیں اپنی سفارت ترک کر دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ہمارا روزانہ ڈیڑھ ایکو خرچ ہو رہا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے اب تک سو سو ایکو خرچ ہو چکے ہیں تاکہ لباس اور دیگر ضروری سامان خرید سکیں۔ اب ہمارے پاس ایک دینار تک باقی نہیں ہے۔"[1] اسی زمانے میں فردیناند اور ایزابیلا کا سفیر پوئبلا، ساتویں ہنری کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہ بھی رقم نہ آنے کی مسلسل شکایت کرتا ہے۔ اس کی تنخواہ کافی زیادہ تھی۔ لیکن وہ ادا ہی نہیں ہوتی تھی اور پوئبلا ایک مراسلت میں بیان کرتا ہے کہ رومیوں کے بادشاہ کے سفیر کی حالت اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس کی جائداد قرق کر لی گئی ہے اور قرضوں کے باعث خود اس کو قیدخانے میں ڈال دیا گیا ہے۔[2]

بہر حال ڈے نیس کو یہ سمجھ تھی کہ جو خدمات انجام دیے جائیں ان کا معاوضہ دلایا جائے۔ اور قدیم سفیروں کے لیے اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ اگر کسی سفارت پر جانے کے باعث اخراجات لاحق

---

[1] ماکیاویلی کا مجموعۂ تالیفات فرانسیسی ایڈیشن "دربار فرانس کی سفارت" خط (ص ۱۳ و ص ۱۴)۔

[2] برگن روٹ کی انگریزی تالیف "خطوط، مراسلات، اور ان سرکاری کاغذات کی تقویم جو انگلستان اور فرانس کی گفت و شنید سے متعلق ہیں اور جو سی مان کاس وغیرہ کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں" جلد (۱) دیباچہ ص ۲۹۔

ہوکر ان کی جائداد گھٹ گئی ہو تو نظم و نسق کے عہدوں پر مامور ہوکر اور خاص کر مشرقِ قریبہ کے مقبوضات کی نفع بخش خدمتوں پر مقرر ہوکر اپنے نقصان کی تلافی کرلیں۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ سفارت کا دوران تین سال سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس میں ایک سے زیادہ فائدے تھے۔ اس طرح بڑے خاندانوں کے تمام افراد کو سفارتی خدمات بجالانے کا موقع ملتا۔ اور اس کے علاوہ خود سفیر کبھی اپنے ملک کے لیے اجنبی نہیں بن جاتا۔ سفارت پر جانے کے بعد دو سال نہ گزر چکے ہوں تو سفیر کو اس کا حق نہ تھا کہ وطن کو واپس آئے، بجز اس کے کہ کوئی جائز غرض ہو اور مملکت کے افسروں کی اکثریت اس کی اجازت دے[ل] لیکن کسی بھی صورت میں اسے اس کی اجازت نہ تھی کہ اپنے جانشین کے آنے سے پہلے اپنے مسکن سے روانہ ہو۔ جس دن کوئی سفیر وینس واپس ہوتا، تو اسے دفتر دیوان میں حاضر ہونا ضروری ہوتا تاکہ وہاں ایک رجسٹر میں اپنے آنے کی اطلاع درج کرے۔ یہ رجسٹر دفتر دیوان کے بڑے چانسلر کی نگرانی میں ہوتا۔ اس تاریخ کے پندرہ دن کے اندر اس کے لیے ضروری ہوتا کہ سینیٹ کے باضابطہ اجلاس میں، جس کی صدارت دوجے اور وزیر کرتا، اپنے سفر کا ماجرا پڑھ کر سنائے۔ ایک حکم نامے کے ذریعے سے اس پر مزید برآں یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ خزانۂ سرکاری کے افسروں کو ان رقموں کا حساب دے جو اس کے تحویل کی گئی تھیں۔ چند سفیروں کے سرکاری اخراجات کی (جس میں خفیہ اخراجات داخل نہیں ہیں) مقدار ہمیں معلوم ہے۔ سوطویں صدی کے اواخر میں وینس کا ایک سفیر جو پاریس گیا تھا یہ دو سال کے عرصے میں (۸۷،۸۹۰) فرانک خرچ

304

ل۔ گاشار کی فرانسیسی تالیف "وینس کی سفارت کاری کی یادگاریں" صـ ۱۵
باشیت کی فرانسیسی تالیف "وینس کی سفارت کاری" صـ ۲۶۔

کرتا ہے۔ ایک اور سفیر تقریباً (۸۶۸ر۱۰ را) فرانک۔ چودھویں لوئی کے زمانے میں ماہانہ چار سو ڈوکا کا خرچ ہوتا ہے۔

وینیس والوں کے سفارت ناموں کو بڑی تیزی سے شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور یہ عجیب چیز ہے کہ ان میں سے متعدد کو شائع بھی کیا گیا۔ چنانچہ ان کی قلمی نقلیں گشت ہوتیں۔ اور بعض کو چھاپا بھی گیا تھا۔ فران چیسکو کونتارینی نے ۱۶۰۹ء میں انگلستان جانے کا جو سفارت نامہ لکھا تھا، وہ موجود ہے۔ اس میں کونتارینی نے ایک نوٹ اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ وہ نسخہ اس نے شہر روما میں خرید کیا تھا اور وہ بیان کرتا ہے کہ اس کے اصل سفارت نامے کی وہ ہو بہو نقل تو نہیں ہے لیکن اس سے وہ بہت کچھ ملتا جلتا ہے[1]۔

حقیقت میں اجنبی حکمران جملہ وسائل سے اس کی کوشش کرتے تھے کہ جو سفارت نامے ان سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی نقلیں حاصل کریں۔ اور حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اکثر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے تھے۔ لیکن گاشار کا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ خود سینیٹ نے اصولاً اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ سفارت نامے فاش ہو جائیں اور یہ کہ سینیٹ نے اپنے کارندوں کو یہ ضمانت نہیں دی تھی کہ ان کے تاثرات اور ان کے مراسلات راز میں رکھے جائیں گے[2]۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سفیر جو مراسلے بھیجتے تھے، ان کی، بمقابل سفارت ناموں کے، زیادہ حفاظت ہوتی اور ان کو ناوقت شائع ہو جانے سے روکا جاتا۔ مراسلے صرف مجلسِ وزراء کے ارکان کے ہاتھوں میں پہنچتے اور

[1] راڈن براؤن کی انگریزی تالیف "آٹھویں ہنری کے دربار میں چار سال"، جلد (۱) دیباچہ۔

[2] باشت کی فرانسیسی تالیف "وینیس کا محافظ خانہ۔ دفتر راز سینیٹ، مجلس وزراء، مجلس دہ گانہ اور سرکاری تفتیش کنندوں کی، تاریخ فرانس کے ساتھ تعلق کے نقطۂ نظر سے" ص ۳۵۳۔

پھر ان کو دفتر دیوان کے خفیہ محافظ خانے میں محفوظ کر دیا جاتا، جس کی نگرانی سینٹ کے ایک معتمد کے ہاتھ میں تھی۔[۱]

وینیس کے سفارتی تعلقات جلدی ہی اٹلی کی سرحدوں کے باہر تک پھیل گئے۔ صلیبی جنگوں نے اس طاقتور جمہوریت کا مغرب اور مشرق سے تماس پیدا کر دیا۔ چونکہ وینیس مقصدور اور عملی تھا، اس لیے وہ کبھی سیاسی معاملات میں خیال پرستی اور مطمعیت کے پیچھے نہیں پڑا اور ہم بارہا ان صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ غیر عیسائیوں کے خلاف جو جنگیں ہو رہی تھیں، ان سے بڑے بڑے فائدے حاصل کرنے میں وینیس کو کبھی کوئی جھجک نہیں ہوئی۔

ویل آردوین نے بیان کیا ہے کہ فروری ۱۲۰۱ء میں چھے ایلچی، حروب صلیبیہ کے سرداروں کی طرف سے مختار کل بن کر آئے تھے تاکہ وینیس والوں کے بیڑے کی مدد سے، صلیبی جنگجوؤں کی فوج کو ارض مقدس (بیت المقدس) بھیجا جائے۔ چنانچہ ان کی گفت وشنید کا ماجرا اس نے دیا ہے[۲] ان سفیروں کو جو چیزیں مہیا کی گئی تھیں ان میں "اچھے نقشے اور لٹکتی ہوئی مہریں شامل تھیں تاکہ صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے جاگیر دار اور بیرون ان کے ذریعے سے ان تمام معاہدوں کی توثیق کر سکیں جو یہ چھے لوگ سمندر کی کسی بھی بندرگاہ سے طے کریں چاہے کسی مقام پر ہی وہ کیوں نہ جائیں"۔ یہ مورخ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان چھے سفیروں نے کس طور سے آپس میں مشورہ کیا اور کس طرح انھوں نے تسلیم کیا کہ کسی بھی دوسری بندرگاہ کے مقابلے میں وینیس ہی میں جہازوں کی

305

---

[۱] ایضاً ص ۴۰

[۲] ژوفرواد ویل آردوین کی فرانسیسی تالیف "قسطنطنیہ کی فتح" جو اصل مع ترجمہ از وائیلی شائع ہوا دیکھئے باب (۴) و مابعد۔

بہت زیادہ تعداد دستیاب ہوسکتی ہے۔ ہنری وان ڈولو، جو ان دنوں وینیس کا ڈوجے (سردار) تھا، اس کے پاس آکر "سفیروں نے اپنے آقاؤں کے خطوط پیش کئے۔ یہ خطوط تعارفی غریطے تھے اور جاگیردار کونٹوں نے بیان کیا تھا کہ ان سفیروں پر اتنا ہی اعتماد کیا جائے جتنا ان بھیجنے والوں پر اگر وہ شخصی طور سے موجود ہوتے اور یہ کہ جو کچھ سفیر کریں گے، اس کو یہ بھی مان لیں گے۔" چنانچہ باضابطہ معاہدے عمل میں لائے گئے اور جمہوریۂ وینیس نے ایک معینہ رقم کے معاوضے میں اس کا اقرار کیا کہ فوج کی حمل ونقل کا کام انجام دے اور اس کو نو ماہ تک غذا مہیا کرے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے ذمہ داری لی کہ "پچاس مسلح جہاز خدا کی راہ میں مہیا کیے جائیں گے بشرطیکہ جب تک یہ شراکت باقی رہے، جو کچھ فتوحات خشکی پر عمل میں لائی جائیں، یا جو بھی مال خشکی یا تری میں ہاتھ آئے تو آدھا وینیس کو ملے اور باقی آدھا صلیبی جنگجوؤں کو ملے[1]"

سچ پوچھو تو وینیس کی سفارتیں فرانس میں صرف گیارھویں لوئی کے عہد سے شروع ہوئیں۔ جمہوریۂ وینیس کے کارندے سین لوئی، جسارت مند فلپ، خوبصورت فلپ، چھٹے فلپ دوسرے ژاں پانچویں شارل، چھٹے شارل اور ساتویں شارل کے پاس آئے تھے۔ لیکن یہ تمام سفارتیں بہت مختصر رہیں، اور زیادہ تر تجارتی معاملات کے لیے پیش آئیں[2]۔ گیارھویں لوئی کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ابھی یہ حکمران فرانس کا ولی عہد ہی تھا کہ اس نے سفارتی گفت وشنید کا فائدہ

---

[1] ایضاً باب (۲۳)

[2] باشٹ کی فرانسیسی تالیف "وینیس کی سفارت کاری" ص ۳۸۷ و مابعد

اچھی طرح معلوم کرلیا تھا۔ علاقہ ڈوفینے میں اسے ایک حقیقی اقتدار اعلیٰ حاصل تھا اور وہیں سے وہ اٹلی کی جمہوریتوں اور راجدھانیوں سے سازشیں کرتا رہا۔ جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے ہر اس سمت سے تعلقات جوڑ لیے، جہاں سے اسے کسی فائدے کی توقع تھی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ؤینیس سے جب ایک نیا سفیر اس کے دربار میں آیا تھا تو اس نے اس سے گلہ کیا تھا کہ جمہوریۂ ؤینیس کے پاس سے اس کے ہاں سفیر شاذ نادر ہی آتے ہیں حالانکہ برگنڈی کے ڈیوکوں کے دربار میں ؤینیس کے سفیر تقریباً ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ سفیر نے جواب دیا کہ تجارتی مفادات ہی ؤینیس کی رہبری کرتے ہیں[1]۔ میلان کے معاملات جلدی ہی اس نوبت پر پہنچ گئے کہ وہاں کے ڈیوک کی حکومت نے بادشاہ کی خواہشوں کی تکمیل کردی۔ ؤینیس، جو اسفورزا والوں سے کھلم کھلا برسرِ جنگ تھا، دربار فرانس سے قریبی تعلق پیدا کرنے پر مائل ہوگیا۔ اور یکے بعد دیگرے سفیر آتے رہے۔ اور ۱۴۷۸ء کی تاریخ سے پارس میں ایک معمولی سفارت خانہ قائم ہوگیا۔ چنانچہ پہلا سفیر جو وہاں بھیجا گیا، اس کا نام بیچی گابریئل دے جاکومو تھا۔ جب ۱۵۰۸ء میں کامبرے کی حلیفی قایم ہوئی اور پوپ اور فرانس کے بادشاہ اور ماکس میلیان نے جمہوریۂ فرانس کے خلاف جتھا بندی کی اور اس کے سب سے عمدہ مقبوضات چھن گئے، اور ایسے لمحے بھی آئے جب ؤینیس کی سرحدیں صرف اس جزیرے ہی تک محدود ہوگئیں تو ان تعلقات میں ایک عارضی وقفہ پیدا ہوا۔ لیکن ۱۵۱۳ء میں جب بلوا کا معاہدہ ہوا اور ان دونوں سلطنتوں کے

306

[1] اسی مولف کی فرانسیسی تالیف "ؤینیس کا محافظ خانہ" ص ۲۹۳۔

سیاسی تعلقات میں صفائی ہوگئی تو پھر ان کے سفارتی تعلقات اٹھارویں صدی کے آخری لمحوں تک صدق و وفا کے ساتھ جاری و باقی رہے۔[۱] وینیس اور برگنڈی کے ڈیوکوں میں جو تعلقات تھے، جن سے کہ گیارھویں لوئی کو اضطراب پیدا ہوا تھا، وہ پندرھویں صدی کے وسط سے چلے آتے ہیں۔ خود اس سے پہلے بھی بحیرۂ آڈریاٹیک کے اس عظیم الشان تجارتی شہر یعنی وینیس میں اور ہمارے (بلجیم کے) صوبوں میں بکثرت تعلقات رہے ہیں۔ چنانچہ چودھویں صدی ہی سے "فلانڈرس کے جہاز" ہر سال وینیس سے چلتے۔ اور ۱۳۹۹ء میں جسارت مند فلپ نے جمہوریۂ وینیس کے سفیروں سے ملاقات کی۔[۲] اچھے فلپ کے عہد سے تعلقات کا تسلسل جاری رہا ہے۔

جب سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تو ایک تحریک اس غرض کے لیے اٹھی کہ عیسائیت کی تمام طاقتوں کو متحد کیا جائے۔ نہ تو تیسرے فریڈرک کی شہنشاہت اور نہ ہی فرانس میں یہ قابلیت تھی کہ اس مہم کی قیادت کریں۔ صرف ایک ہی حکمران ایسا نظر آتا تھا جس میں اس نئی صلیبی جنگ کے سردار بننے کی کافی طاقت ہو اور یہ "اچھا فلپ" تھا۔ ایک معینہ لمحے میں برگنڈی کے ڈیوک نے ان تمام مملکتوں کے سفیروں کو باریاب کیا جنھیں مسلمانوں کے فتوحات سے خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ پوپ پانچویں نکولاس نے اس کے پاس اپنا ایک شخصی نمایندہ روانہ کیا۔ مشرق کے عیسائی حکمرانوں نے اس کے پاس ایک وفد بھیجا جو انطاکیہ

307

---

[۱] شارییئر کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی گفت وشنید مشرق قریبہ کے ساتھ جلد (۱) دیباچہ ص ۳۰ — باشٹ کی فرانسیسی تالیف" وینیس کا محافظ خانہ" ص ۷۰ —

[۲] گاشار کی فرانسیسی تالیف" وینیس کی سفارت کاری کی یادگاریں" ص ۱۱

کے بطریرک کی قیادت میں آیا اور کچھ عرصہ بعد پوپ پائیس دوم نے۔ جس کی پوری کوششیں اس امر پر مبذول تھیں کہ ترکوں سے لڑا جائے۔ فرینیس والوں کو اس پر آمادہ کیا کہ برگنڈی کے ڈیوک کے ساتھ ایک گہری حلیفی قایم کرتیں[1] یہ صلیبی جنگ اختیار نہیں کی جاسکی۔ اور جنگی کارروائیاں صرف اس پر محدود رہیں کہ بحر متوسط میں ایک بیڑا بھیج دیا جائے۔ لیکن اس کے لیے جو گفت وشنید ہوئی تھی اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ برگنڈی کے دربار اور فرینیس کی جمہوریت میں باقاعدہ تعلقات قائم ہو گئے۔

جب اچھا فلپ ۱۴۶۷ء میں مرگیا تو اس کے جانشین "جسارت مند شارل" کو انتونیو واندولو نے تہنیت کہلا بھیجی۔ دو سال بعد شہرگاں میں ایک معمولی سفیر کی حیثیت سے برناردو بمبو آیا۔ یہ اپریل ۱۴۷۱ء میں بھی ڈیوک ہی کے دربار میں موجود نظر آتا ہے۔ اپنی طرف سے ڈیوک نے بھی اس معزز ترین جمہوریت کے ہاں انتوان ڈموں ژِو کو بطور سفیر بھیجا تاکہ اس حلیفی کی تجدید کی جائے جس کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ میلان والوں کے حالات کا بھی اثر پڑا اور میلان نے بھی دربار برگنڈی سے تعلقات پیدا کر لیے[2]

۱۴۷۸ء میں مارک انتوان موروسینی کو فرینیس نے سفیر بنا کر آسٹریا کے آرک ڈیوک مکس میلیان کے پاس بھیجا۔ یہ برگنڈی کی ماری کا شوہر تھا۔ ۱۴۸۵ء میں نکولاس فوس کاری سفیر ہی کی حیثیت سے نشیبستان (ہالینڈ) پہنچا۔ حسین فلپ کے زمانے میں

---

[1] ژیں لاسارا کی فرانسیسی تالیف "جسارت مند شارل کی معرکہ آرائیوں کے متعلق میلان کے سفیروں کی مراسلتیں" پیش لفظ ص ۵

[2] ایضاً ص ۲

تعلقات اچھے ہی تھے لیکن شارل کین کے زمانے میں تعلقات جلد جلد پیدا کیے جاتے رہے۔ شارل کین سولہ ہی سال کی عمر میں بلجیم کے صوبوں کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ اسپین اور ہر دو صقلیہ کے تاجوں اور غرب الہند کے مقبوضات کا بھی مالک ہوگیا تھا۔ اور انیس ہی سال کی عمر میں اس نے تاج شہنشاہی زیب سر کیا تھا[1]۔ فینیس کی حکومت نے یکے بعد دیگرے بارہ معمولی سفیر اس طاقتور حکمران کے پاس بھیجے اور آٹھ غیر معمولی سفارتیں روانہ کیں۔

308

فینیس اور ساقوا کے حکمرانوں کے تعلقات معاہدۂ کاتوکان بریزی کے بعد سے جو عمانویل فلی بیر کے عہد میں ہوا تھا، مستقل طور سے قایم ہو گئے۔

دوسرے ایڈورڈ کے زمانے ہی میں انگلستان اور جمہوریۂ فینیس میں تعلقات قایم ہوجانے کا پتہ چلتا ہے ۱۳۲۴ء میں تیسرے ایڈورڈ نے فینیس کے ڈوجے (سردار) اور حکومت کے ہاں ایک کارندہ روانہ کیا جس کا کام یہ واضح کرنا تھا کہ ایڈورڈ کو تاج فرانس پر کیا حق حاصل ہے؟ اور یہ کہ فینیس کے جہازوں کی مدد مانگے۔ اپنی نوبت پر جمہوریۂ فینیس نے بھی، جب جےنوا سے اس کی خوب جنگ ہورہی تھی، تو ۱۳۷۰ء میں تاج انگلستان کی تو نہیں البتہ وہاں کے امراء کی مدد مانگی۔ سر جان ہاک وڈ عرصے تک اطالوی جمہوریتوں کی قوت کے متعلق تکلم رہ چکا تھا۔ اگرچہ اس نے مدد دینے سے انکار کیا لیکن دوسرے مہات پسندوں نے فینیس کی مددطلبی پر لبیک کہا[2]۔ بہرحال ماینوساتوتو کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ ۱۴۹۶ء میں بھی ذرایع آمد و رفت کی دشواری کے مد نظر فینیس کی سینٹ نہیں چاہتی تھی کہ انگلستان کو سفیر روانہ کئے جائیں بلکہ اس نے لندن میں مقیم دو تاجروں کو

---

[1] گاشار کی فرانسیسی تالیف "فینیس کی سفارت کاری کی یادگاریں" ص ۱۲

[2] راڈن براؤن کی انگریزی تالیف "آٹھویں ہنری کے دربار میں چار سال" جلد (۱) دیباچہ

اس پر مامور کیا کہ اپنے آپ کو نائب سفیر کی حیثیت سے بادشاہ کے روبرو پیش کریں اور اس کو اس حلیفی میں شریک ہونے کی ترغیب دلائیں جو فرانس کے خلاف قایم ہو رہی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جون ۱۴۹۶ء میں آندریا ترے ئی سان کو ساتویں ہنری کے ہاں سفیر بنا کر بھیجا گیا اور پھر جلدی ہی باقاعدہ سفیر ایک دوسرے کے بعد آتے رہے[1]۔

آٹھویں ہنری کو پوپ سے جو جھگڑا ہو گیا تھا اس سے ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ جمہوریۂ وینیس نے کوشش کی کہ نہ صرف انگلستان کے ساتھ اپنے موجودہ اچھے تعلقات کو برقرار رکھے بلکہ ساتھ ہی ساتھ روما کے ساتھ بھی۔ لیکن آخر کار اسے کم از کم ظاہرداری کی حد تک پوپ کے مطالبات کے آگے جھک جانا پڑا۔ اور ۱۵۳۵ء میں اس نے اپنے سفیر کارلو کاپیلو کو حکم دیا کہ اپنے ملک کو "خصوصی اور ضروری کاموں کے لیے" واپس آجائے۔ سفارت خانے کا معتمد بہرحال وہیں قایم رکھا گیا۔ اپنی حد تک آٹھویں ہنری نے وینیس کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع نہیں کیے بلکہ وہ زور کے ساتھ اصرار کرتا رہا کہ وینیس باقاعدہ تعلقات دوبارہ قایم کرلے۔ اسی زمانے میں ہنری مرگیا جس کے باعث وینیس کے سنیٹ کو اس جائز مطالبے کے ماننے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

جب الزابتھ انگلستان کے تخت پر بیٹھی تو اسی قسم کی مشکلیں پیش آئیں۔ چنانچہ اس نے وینیس کے سفیر کو اپنے دور حکومت کے آخر ہی میں باریاب کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سفارت کے اس پورے وقفے میں وینیس کے سفیر فرانس کو یہ ہدایت تھی کہ وہی اپنی حکومت کو انگلستان کے معاملات کے متعلق اطلاع دیتا رہے۔

309

---

[1] اسی مولف کی اطالوی تالیف "وینیس کا محافظ خانہ خاص کر انگریزی تاریخ کے نقطۂ نظر سے" ص ۱۲۸۔

یہ اس قاعدے کا اطلاق تھا جو عام طور پر ملحوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے مماثل میلان کا سفیر ساؤوا کے حالات کی اطلاع دیتا رہا جب کہ تورین میں سفارت کے عہدے پر کوئی مامور نہ تھا۔ اسی طرح ویانا کا سفیر جو جرمنی کے متعلق اطلاعات بھیجتا تھا وہی پولینڈ کے متعلق بھی کام انجام دیتا تھا جبکہ کراکاؤ (پایۂ تخت پولینڈ) میں کوئی نمایندہ موجود نہ تھا۔

اسپین ہمیشہ خفیہ یا علانیہ طور سے وینیس کا دشمن رہا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ دونوں سلطنتیں آپس میں لڑنے سے باز نہیں آئیں۔ جمہوریہ وینیس کے سفیر مجریط (میڈرڈ) میں تھے۔ اور میلان اور نیپلز میں مقیم سیاسی (رزیڈنٹ) رہتے تھے، لیکن یہ تعلقات شارل کین کے بعد کے ہیں۔

وینیس اور صوبجات متحدہ کے تعلقات شروع میں کشیدہ سے رہے۔ روما اور مجریط بھی اس میں آڑے آتے رہے لیکن بہر حال آخر کار ان میں سفارتی تعلقات قایم ہو گئے۔ البتہ ان سے کوئی اہم نتائج نہیں نکل سکے[1] حقیقت میں ایک طرف تو وینیس کی اہمیت اور اس کی سفارت کاری قابل لحاظ طور سے گھٹتی چلی جا رہی تھی اور ویسٹ فالیا کی صلح کے بعد سے تو وہ بالکل بے اثر ہو گئی۔ اور دوسری طرف چونکہ جمہوریۂ وینیس کی تجارتی سیاسیات، اجارہ داری پر مبنی تھی، اس لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ولندیزی ارباب حکومت کے اس مطالبے کو مان لے جو تجارتی معاہدے کرنا چاہتے تھے۔

روما عرصۂ دراز تک دنیا کے سفارتی اور سیاسی معاملات کا مرکز رہا۔ نویں صدی ہی میں وینیس نے پوپ کے ہاں سفیر بھیجے تھے۔ حکومت وینیس ہمیشہ اپنے پادریوں کو یہ ذہن نشین کراتی رہی کہ وہ انھیں دولت مند دیکھنا چاہتی ہے، بشرطیکہ وہ حکومت کے

---

[1] یونگے کی ولندیزی تالیف "شبستان (ہالینڈ) اور وینیس"

فرماں بردار رہیں اور سیاسیات میں بالکل کوئی حصہ نہ لیں۔ اس طرح وینس کی حکومت پادریوں کے بالمقابل آزاد رہ سکی۔ صرف ایک مرتبہ اس نے پادریوں کے لیے اہم رعایتیں منظور کیں۔ اور یہ اسی وقت ہوا جب اس نے چاہا کہ پوپ اڑول دوم کو کامبرے کی حلیفی سے الگ کر دے۔ کیونکہ یہ حلیفی جمہوریۂ وینس کے وجود ہی کو دھمکی دے رہی تھی[1] وینس کی حکومت انتہا درجہ ناراض تھی۔ اور اس خصوصیت کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ جب کبھی وہاں کی سنیٹ کو روما کے معاملات سے بحث کرنے کا موقع ہوتا تو چانسلر اعظم یہ اعلان کرتا کہ وہ ارکان سنیٹ عارضی طور سے خارج رہیں گے جن کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ پوپ کے علانیہ طرفدار ہیں یا پوپ سے ان کی وابستگی کسی ذاتی مفاد یا با اثر پادریوں کی کسی رشتہ داری کے باعث ہے[2] پوپ کے پاس جو معمولی سفیر روانہ کیے جاتے تھے، ان کے علاوہ اظہارِ اطاعت کی سفارتیں بھی جایا کرتیں، جو ہر نئے پوپ کی مسند نشینی کے وقت سلامی کے لیے حاضر ہوتیں۔ اس سفارت میں چار سفیر ہوتے۔ اور بڑے ٹیپ ٹاپ اور غیر معمولی شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے۔

310

جب تک وینس کو عروج رہا اس نے نہ تو شہنشاہیت کے حکمرانوں سے کوئی واسطہ رکھا اور نہ شہنشاہ سے، البتہ بیان کیا جاتا ہے کہ پندرھویں صدی کے اختتام سے جرمنی میں اس کے مستقل سفیر رہنے لگے تھے[3]

وینس کے جو مفادات مشرق قریبہ سے وابستہ تھے، وہ

---

[1] دارو کی فرانسیسی تالیف "تاریخ وینس" کتاب (۲۸)

[2] باشت کی فرانسیسی تالیف "وینس کی سفارت کلدی" صہ ۱۶۵

[3] کراؤس ے کی جرمن تالیف "مستقل سفارتوں کا ارتقاء" صہ ۳۷

قابل لحاظ تھے۔ بڑے قدیم زمانے سے اس میں اور یونانی شہنشاہت میں دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ جب راوینا (واقع اٹلی) کو زوال آیا تو وینس کا تسلط بحر آدریاٹیک پر قایم ہو گیا اور جلدی ہی وہ مشرق کے معاملات پر حاوی ہو گیا۔ خاص کر صلیبی جنگوں کے باعث اس کی قوت میں اضافہ ہوا۔ اور جب ۱۲۰۴ء میں صلیبی جنگجوؤں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا، تو جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، وینس کو اس نئی شہنشاہت میں ایک اہم حصہ مل گیا جو فاتح، جاگیرداری اصول پر قایم کر رہے تھے۔ اس کے ستاون سال بعد وہ عمارت بیٹھ گئی جسے لاطینیوں نے کھڑا کیا تھا۔ اور میشل پالیولوگ نامی شہنشاہ پایۂ تخت میں داخل ہو گیا۔ لیکن وینس چونکہ کافی چالاک اور کافی طاقتور تھا اس لیے اس نے کانڈیا اور جزیرۂ ایوبیا اور قبرص میں اپنے مقبوضات برقرار رکھے۔ وینس والے یونان سے تجارت کرتے رہے۔ اور اس زمانے سے ان کا ایک سفارتی کارندہ قسطنطنیہ میں رہنے لگا جسے "بیل" کا نام دیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس لفظ کے معنی "سفیر" کے ہیں لیکن ابتداءً اس لفظ کے معنی معلّم، موّدب یا محافظ کے ہوتے تھے۔ کچھ عرصے تک بیل کی حیثیت ایک حکمران کی سی ہوتی تھی، قسطنطنیہ کا ایک پورا محلہ اس کے اختیار میں تھا اور جب کبھی وہ باہر نکلتا تو ایک محافظ دستہ اسے گھیرا رہتا۔ اور بعد میں جب اس کی حیثیت گھٹ گھٹا کر محض ایک سفیر کی رہ گئی، تو اس وقت بھی وہ بہت سے ایسے اجنبی باشندوں کو جنھیں وینس سے کوئی تعلق نہ ہوتا، اپنی حفاظت میں لیتا رہا خاص کر آرمینیوں یا یہودیوں کو۔ یہ لوگ اسے خراج بھی دیتے تھے، اور یہ فائدہ بھی تھا کہ وہ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرتے۔[1]

311

[1] دارِدہ کی فرانسیسی تالیف "تاریخ وینس" کتاب (۱۹)

جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو فےنیس والوں کو ان کے مفاد نے مجبور کیا کہ سلطان کے پاس ایک سفیر بھیجیں اور ایک تجارتی معاہدے کی گفت و شنید کریں۔ علاوہ اور امور کے' اس معاہدے میں یہ شرط تھی کہ حکومت فےنیس جب چاہے قسطنطنیہ کو ایک "بیل" یعنی سفیر روانہ کر سکے گی۔ اس کے ساتھ اس کا عادتی عملہ بھی ہوگا' اور اسے تمام فےنیس والوں پر کشوری اقتدار حاصل ہوگا' نیز وہ ان کے عدل گستری بھی کرے گا' اور یہ کہ سلطان اس بیل کی حفاظت کرے گا اور جب وہ سلطان سے مدد مانگے گا تو اسے مدد بھی دی جائے گی[1]۔

یہ صلح زیادہ دن جاری نہ رہی۔ ترکوں نے فےنیس والوں کے ان مقبوضات پر حملہ کیا جو پےلوپونےزیا میں واقع تھے۔ لیکن ۱۴۷۹ء میں قابل لحاظ علاقے دے کر بالآخر جمہوریۂ فےنیس نے مشرق قریبہ میں اپنے ہم وطنوں کے لیے مفید شرطیں حاصل کر لیں۔ چنانچہ سلطان کا ایک سفیر فےنیس آیا تاکہ وہاں دوج سے صلح نامے پر حلف لے[2]۔

"بیل" کی حیثیت معمولی سفیر کی تھی۔ خصوصی صورتوں میں حکومت فےنیس کی طرف سے مزید برآں سلطان کے پاس غیر معمولی سفیر بھی بھیجے جاتے۔ سولھویں صدی میں کہتے ہیں کہ (۳۳) بیل اور (۷۲) غیر معمولی سفیر بھیجے گئے۔

یہ عہدہ نہایت اہم تھا۔ عرصۂ دراز تک یہ وہ سب سے اہم سفارتی عہدہ تھا جس کی کوئی معزز شخص آرزو کر سکتا تھا۔ اعلیٰ ترین گھرانوں کے افراد ہی اس کے لیے لیے جاتے تھے۔ جن لوگوں کا

---

[1] ایضاً کتاب (۱۶)

[2] کلاچ کو کا مضمون "مسئلہ مشرق کا ارتقا" جو فرانسیسی "رسالۂ ہر دو عالم" بابتہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۶ء میں شایع ہوا۔

انتخاب ہوتا وہ اپنی کارگزاری کے عروج کے زمانے میں ہی عموماً یہاں بھیجے جاتے۔ اور بعض لوگوں نے یہ جو کہا ہے وہ کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ غالباً کہیں بھی وینس کی شہرۂ آفاق سفارت کاری نے اتنے زیادہ حزم و احتیاط اور قابلیت و معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا جتنا قسطنطنیہ کی سرزمین پر۔

سترھویں صدی کے آغاز پر اسپین کا ایک سفیر تیسرے فلپ کو وینس کے حالات کے متعلق ایک مراسلہ بھیجتا ہے۔ اور جمہوریۂ وینس اور ترکی کے "باب عالی" کے تعلقات کا ذکر کرکے بہ زور طور سے جتاتا ہے کہ قسطنطنیہ میں وینس کے سفیر کتنے قابل اور لائق ہیں۔ ان کے ہاتھ میں قابل لحاظ رقمیں ہوتی ہیں جو وہ خیرات کے نام سے رشوت دہانی میں بھی خرچ کرتے ہیں۔ اس سفیر نے مزید برآں یہ بھی بیان کیا ہے کہ وینس نے باب عالی سے تعلقات اچھے رکھنے کے لیے ایک اور ذریعہ بھی اختیار کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمام عیسائی حکمرانوں سے کوئی صفائی نہ رکھنے اور صرف اپنے ذاتی مفاد سے کام رکھنے والا ہونا ظاہر کرتا ہے۔

بیل کے عہدے کی سیاسی اہمیت گھٹتی ہی گئی۔ اور بالآخر وہ صرف اس بات کا ایک ذریعہ رہ گیا کہ خوب نفع کمایا جائے چنانچہ قسطنطنیہ میں رہنے والے سفیر تجارت اور ادا طلب چنگی کے ذریعے سے قابل لحاظ فائدہ حاصل کرتے تھے۔ یاد رہے کہ وینس کے جو باشندے مشرق قریبہ میں رہتے تھے ان سب پر اسی کو اختیار سماعت حاصل تھا۔ اور ترکوں اور وینسیوں میں جو دیوانی مقدمے دائر ہوتے ان کا فیصلہ بھی وہی کرتا۔ مزید برآں از میر (سمرنا) سلانیک، کانیے (بندرگاہ اقریطش) اور روڈس کے قنصل بھی وہی مامور کرتا تھا[1]۔

312

وینس

کریٹ

روڈس

[1] روماین کی اطالوی تالیف "وینس کی دستاویزوں کے حوالے سے لکھی ہوئی تاریخ" جلد (۸) ص ۳۹۲

سولھویں صدی میں ڈینس کے نمایندے یورپ کے اکثر ممالک میں پائے جاتے تھے ۔ ان نمایندوں میں سفیر اور مقیم سیاسی (رزیڈنٹ) داخل تھے ۔ سفیروں کا انتخاب ڈینس کے معززین میں سے ہوتا اور مقیموں کا معتمدوں میں سے ۔ اس کے معمولی سفیر ویانا، پارس، مجریط (میڈرڈ) اور روما میں متعین تھے ۔ شہنشاہ اور شاہان فرانس و اسپین کی طرف سے بھی ایک ایک سفیر ڈینس میں رہتا تھا۔ پوپ کی طرف سے بھی ایک مذہبی سفیر بھیجا جاتا تھا۔ نیپلز، تورین، میلان اور لندن کے علاوہ سوئستانی صوبوں میں ڈینس کی طرف سے مقیم (رزیڈنٹ) روانہ کیے جاتے تھے ۔ قسطنطنیہ میں بَیل (سفیر محافظ) رہتا تھا ۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ حکومت ڈینس کی طرف سے دور دراز ملکوں میں سفیر بھیجے جائیں مثلاً مصر اور ایران ۔ ان سب کے علاوہ بڑے بین الممالک جلسوں یعنی کانگریسوں اور مجالس شوریٰ میں بھی ڈینس کے نمایندے رہتے تھے[1]

سفارت کاری کا نظام اٹلی سے باقی یورپ میں جاتا ہے ہمیں یہ بتانا نہیں ہے کہ سیاسی گردش کا محور اٹلی میں طویل عرصے تک کیسا رہا ؟ اور جو ممالک یورپ کو چلاتے تھے، جزیرہ نمائے اٹلی کے متعلق ان کے مفاد کس طرح متصادم رہے ؟ گیارھویں لوئی نے اٹلی کی اہمیت پہچان لی تھی ۔ اور اپنے پورے زمانۂ حکومت میں اس کے تعلقات اٹلی کے شہروں اور حکمرانیوں سے بہت گہرے رہے ۔ چنانچہ جے نوا کا اسے مطالبہ رہا، فلارنس

313

[1] آلبیری کی اطالوی تالیف "سینٹ کے پاس آنے والے سفارت نامے"، سلسلہ اول جلد (۱) باشت کی فرانسیسی تالیف "ڈینس کا محافظ خانہ" ص ۲۶۸-

اور وینس کے معاملات میں اس نے دخل دہی کی اور فرانسوا اسفورزا نیز میدیچی سیس کے لوران کا وہ حلیف بنا رہا۔ جینوا، روما، نیپلز، فلارنس، وینس، میلان اور نورین کے محافظ خانے اس کی ختم نہ ہونے والی کارروائیوں کے شاہد ہیں[1]۔ سیاسی دماغ رکھنے والی ایک اور بڑی شخصیت راسخ العقیدہ فردیناند کی تھی۔ اس نے بھی اپنے سفارت کارانہ جوڑ توڑ کے لیے اٹلی ہی کا انتخاب کیا تھا۔ پندرھویں صدی کا اختتام اور سولھویں صدی کا آغاز اس کشمکش سے بھرا ہوا ہے جس میں اٹلی دخل لینے والے طاقتور سلطنتیں فرانس، اسپین، شہنشاہیت اور انگلستان تھے۔ توازن قوت کے نظریہ کا جزیرہ نمائے اٹلی کے اندر بھی اطلاق ہونے لگا تھا۔ اس طرح اٹلی نے دنیا کو بین الممالک زندگی کا سبق پڑھایا۔

پھر بھی ادارۂ سفارت کافی طویل عرصہ تک ناواضح اور غیر معین رہا۔ اس میں نہ تو باقاعدگی تھی اور نہ اس کا کوئی کلی تصور پایا جاتا تھا۔ اور یہ واقعہ قابل غور ہے کہ وہ بادشاہ جو اپنے کارندے باہر بھیجنے کے سب سے زیادہ خواہشمند تھے، وہی سب سے زیادہ اس کو ناپسندیدگی اور اضطراب کی نظر سے دیکھتے تھے کہ دوسرے حکمران ان کے پاس سفیر بھیجیں۔ چنانچہ راسخ العقیدہ فردیناند اور ساتویں ہنری کے یہی جذبات تھے۔ "راسخ العقیدہ فردیناند" تو بیرونی سفیروں کے لیے مسلسل

---

[1] علمی اور ادبی سفارتوں کا محافظ خانہ ان سفارت ناموں اور ہدایت ناموں کا انتخاب جو وزیر تعلیمات و فنون لطیفہ کے زیر نگرانی شائع کیا گیا" سلسلۂ سوم جلد [illegible] "گیارھویں لوئی کے خطوط اور ان حکمرانوں کے متعلق جو دستاویزیں اٹلی کے محافظ خانے میں محفوظ ہیں اور جو وزیر تعلیمات کے نام مکتوب سوم ہیں" ان کے متعلق رپورٹ مرتبہ اے بی ین شارا [illegible]

مشکلیں پیدا کرتا رہا۔ وہ ان کو جاسوس اور سازشی خیال کرتا تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے علاقے میں زیادہ دن تک مقیم رہیں۔ساتویں ہنری کا بھی یہی حال تھا۔

اس بارے میں کوبین نے اپنے جو شخصی نظریے بیان کیے ہیں وہ غالباً اس کے آقا اور دوست گیارھویں لوئی کے نظریوں سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "سفیروں کا اتنا آنا جانا کچھ بہت زیادہ قابل اطمینان چیز نہیں ہے کیونکہ اکثر اس میں بری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ ضروری ہے کہ سفیر بھیجے جائیں، سفیروں کو قبول کیا جائے، جو لوگ حقیقی دوستوں یا ایسوں کے پاس سے آتے ہیں جن کے متعلق شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تو ان کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ ان سے تپاک کا سلوک کیا جانا چاہیئے، اور انھیں اجازت ہونی چاہیئے کہ کافی کثرت کے ساتھ حکمران سے ملاقات کرسکیں۔ اور جب ان سے ملاقات کرنی ضروری ہو تو حکمران کو اچھی طرح اس سے آگاہ ہوجانا چاہیئے کہ ان سے کیا کہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جو سفیر ایسے حکمرانوں کے پاس سے آئے ہیں جن کو (ہم سے) مسلسل نفرت ہو، ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ کسی زمانے میں بھی وہ قابل اطمینان نہیں ہیں۔ ان سے برتاؤ تو اچھا ہو، اور ان کے استقبال میں عزت و احترام بھی ملحوظ رہے، جیسا کہ ان کے سامنے اور سفیروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے رہنے کا بھی اچھا انتظام کیا جائے۔ البتہ معتبر اور عقلمند لوگوں کو ان کے ساتھ رہنے پر مامور کیا جائے

314

ل؎ برگن ٹروٹ کی انگریزی تالیف "خطوط، مراسلات اور سرکاری کاغذات کی تقویم" جلد (۱) دیباچہ صہ ۱۵

اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان سے کون لوگ ملتے ہیں۔ اور ہلکے لوگوں اور شورش پسندوں کو ان تک خبریں پہنچانے سے روکا جا سکے گا یہ ظاہر ہے کہ کسی گھر میں سب ہی لوگ مطمئن نہیں ہوتے۔ مزید برآں میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کی باتیں جلد سن کر انھیں رخصت کر دیا جائے کیونکہ مجھے یہ ایک نہایت بری بات معلوم ہوتی ہے کہ دشمنوں کو اپنے ہاں رہنے دیا جائے۔ اگر وہ میرے پاس ایک سفیر بھیجیں تو میں ان کے پاس دو بھیجوں گا۔ اور اگر کوئی مجھے یہ کہہ کر پریشان کرے کہ مزید سفیر نہ بھیجے جائیں تو بھی جب کبھی مجھے ضرورت ہوگی تو موقع اور ذریعہ پاکر میں ضرور وہاں سفیر بھیجوں گا' کیونکہ سفیروں سے بہتر اور قابل اعتماد' نیز ایسا کوئی اور جاسوس نہیں مل سکتا جسے دیکھنے اور سننے کا اتنا زیادہ حق حاصل ہو[1]

تقریباً تمام ملکوں میں سفارتیں برسرکار نظر آتی ہیں۔ فرڈیننڈ اور ایزابیلا ان کارندوں سے بکثرت خط و کتابت کرتے تھے جو انھوں نے باہر بھیج رکھے تھے۔ معتمدوں کو اس غرض سے مامور کیا گیا تھا کہ سفارتی مراسلات مرتب کریں۔ اس زمانے میں وزیر کا کام صرف اس حد تک محدود نہیں ہوتا تھا کہ حکمران سے گفتگو کرے اور احکام دیا کرے' بلکہ اس کو بہت سی ہدایتیں مرتب کرنی' لکھنی اور اپنے ہی ہاتھ سے راز کے طریقے میں منتقل کرنی ہوتی تھیں۔ نیز سفیروں کے پاس سے جو جواب آئیں ان کے راز کے انداز کو حل کرنا اور پڑھنا بھی پڑتا تھا[2]

انگریزی حکومت نے وہ مراسلے اور دستاویزیں شائع کر دی

---

[1] کومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب (۳) باب (۸)

[2] برگن روٹ کی انگریزی تالیف "خطوط' مراسلات اور سرکاری کاغذات کی تقویم" جلد (۱) دیباچہ ص ۱۷

ہیں جو انگلستان اور اسپین کی گفت و شنید سے متعلق ہیں۔ اس میں
فرڈیننڈ اور ایزابیلا کے اصل مددگاروں کے نام بھی ملتے ہیں چنانچہ
فرنان اَلوَراِیتس، یوآن کونوٗنا، دے لا پارا اور میخیل پے ریتیس اَلماتسان
یکے بعد دیگرے ان دونوں حکمرانوں کے معتمد رہے۔ ان میں سے
کونوٗنا اصل میں اطالوی تھا اور فرانس سے گفت و شنید کے لیے
بھی اس سے کام لیا جاتا تھا۔ اسی کی پختہ قابلیت کا نتیجہ ہے کہ
معاہدۂ برشلونا طے ہو سکا تھا، جس کے ذریعے سے اسپین کو روسیلون
اور سیروانیں کے علاقے مل گئے تھے۔ میخل پیریتیس الماتسان ان کیتھولک
حکمرانوں کا سب سے قابل مددگار تھا۔ اس کے مرتب کردہ متعدد
مراسلے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1]

315

اسپین نے انگلستان میں پوئبلا، آیالا، اسنرادا کے ڈیوک فوئنزالیدا
اور ویلز کی شہزادی کاترین کو سفیر بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔
ان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی شخصیت پوئبلا
کی ہے۔ یہ قانون روما اور قانون مذہبی دونوں کا ڈاکٹر تھا۔ اس کا
پورا نام رودرک گونت سالو دے پوئبلا تھا۔ جس زمانے میں
یہ اندلس کے چھوٹے سے شہر اِستیا کا اعلیٰ افسر عدالت تھا تو فرڈیننڈ کی
نظر میں وہ جچ گیا تھا۔ ۱۴۸۷ء کے اواخر یا ۱۴۸۸ء کے اوائل میں
بادشاہ نے اسے نیبر لیوال دے سے پل تے دا کو سفیر بنا کر اس
غرض سے بھیجا گیا کہ آراگون کی کاترین اور ویلز کے شہزادے آرتھر کی نسبت کرائیں۔
لندن میں اسے ساتویں ہنری کے ہاں اچھا رسوخ حاصل ہو گیا اور وہ اس کا بڑا دوست
بن گیا۔ چونکہ یہ فاقہ مست اور محتاج تھا، اس لیے اس نے اپنے
حکمرانوں کی نمائندگی بغیر کسی شان و شوکت کے کی۔ اور چونکہ وہ
وکالت کا پیشہ انجام دے چکا تھا، اس لیے اس کے پاس سفیر

---

[1] ایضاً جلد (۱) دیباچہ ص ۱۸

ہونے کے باعث جو لوگ آنے پر مجبور تھے تو وہ نامناسب (اور غیر شایان شان) طریقے سے ان کی شکایتوں پر توجہ کرتا (اور نفیس انگستا) ۱۵۷۱ء میں فردیناند اور ایزابیلا نے دو نمایندے اس غرض سے انگلستان بھیجے کہ اس سفیر کے واقعات اور حرکات کے متعلق خفیہ تحقیقات شروع کریں۔ اس تحقیقات کے نتائج سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شکایتیں تھیں وہ بہت زیادہ مبنی بر حقیقت تھیں۔ پوئبلا نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا کہ اسپینی تاجروں سے بڑی بڑی رقمیں ناجائز طور سے وصول کرے۔ اس دریافت سے بعض اور نتائج بھی نکلے، اور معلوم ہوا کہ تین سال سے اس سفیر کو جو دو طاقتور حکمرانوں کا نمایندہ تھا بسر برد کے لیے روزانہ صرف دو پنس ملتے رہے۔ وہ ایک تباہ حال مقام پر رہتا تھا۔ جہاں بری قسم کی عورتیں رہا کرتی تھیں۔ وہ اپنا کھانا یا تو ان عورتوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا یا اپنے مالک مکان کے جو ایک وڈر (پتھر پھوڑنے والا) تھا، شاگردوں کے ساتھ۔ مختلف مقامات کے جاسوس وہاں آیا کرتے، اور انھیں یہ آس ہوتی تھی کہ انھیں وہاں مختلف معلومات حاصل ہو جائیں گے۔ اس مکان کا مالک ان سے پوری ڈھٹائی کے ساتھ رقمیں وصول کر لیا کرتا تھا۔ اور اسے پورا یقین تھا کہ پوئبلا اس کی حمایت و حفاظت کرے گا۔ یہ تحقیقات جس شخص کے خلاف ہو رہی تھی اسے اس سے کوئی بھی ناگوار نقصان نہیں پہنچا۔ چونکہ پوئبلا نے ساتویں ہنری سے خوب گاڑھی دوستی پیدا کر لی تھی اس لیے اسپین کا حقیقی وزیر خارجہ وہی بن گیا۔ اس لیے فردیناند اور ایزابیلا کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اپنے سفیر کے ساتھ ڈون پیدرو دے آیالا کو بطور نائب و مددگار کے بھیج دیں جس نے آکر اسکاٹ لینڈ کے متعلق ایک نہایت اہم فریضہ انجام دیا[1]

316

[1] برگن روٹ کی مذکورہ انگریزی تالیف جلد (۱) دیباچہ صفحہ ۱۸ تا ۲۱ از دیباچے کے

یورپ کے اکثر ممالک میں سفارتی تعلقات کا باقاعدہ قیام سولھویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ فرانسوا اول اور انگلستان کے ممتاز وزیر والزے نیز شارل کین نے اس ادارے سے جتنے فائدے ممکن تھے، حاصل کیے۔

فرانسوا اول نے فرانسیسی سفارت کاری کو ٹھوس بنیادوں پر قایم کر دیا۔ اس نے ایک "مجلس شورائے راز" (پریوی کونسل) قایم کی تھی جس سے وہ خارجہ سیاست کے مسائل پر بحث کیا کرتا تھا اور جس کے متعلق ؔوینس کے ایک سفیر نے اپنی (۱۵۱۲ء کی) ایک رپورٹ میں یہ بیان کیا ہے کہ اس کی تشکیل کیا تھی؟ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: آں جلالت مآب کی ایک خفیہ مجلس شوریٰ ہے جسے مجلس شورائے معاملات کہتے ہیں۔ ناوار کی محترم ملکہ بھی اس میں شریک ہے۔ اور اسی لیے جہاں کہیں بادشاہ جائے، اسے بھی ساتھ ساتھ جانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس میں اتنی ہی زیادہ بے آرامی اور جبر پایا جاتا ہے جو ممکن ہے۔ ناوار کا محترم بادشاہ بھی اس مجلس میں اس وقت شریک ہوتا ہے جب وہ دربار میں حاضر ہو۔ اس مجلس میں امیر البحر، آن لو کا صدر پادری، لورین کا محترم کارڈنیل پادری اور ڈوفینے کا شہزادہ یعنی ولیعہد بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا کوئی معتمد نہیں ہے۔ جب تک میں فرانس میں رہا، تمام چھوٹے بڑے معاملات اس مجلس میں کچھ اس رازداری کے ساتھ بحث میں آئے تھے کہ مجھے ان کا یقین نہ آتا اگر میرے پاس ثبوت موجود نہ ہوتا۔[1]

بادشاہ نے پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سفارتی عملے کی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) بعد اصل کتاب کا صفحہ ۱۶۴ و مابعد

[1] زِلَر کی فرانسیسی تالیف "فرانسیسی سفارت سولھویں صدی کے وسط میں" دیباچہ صفحہ ۸ و مابعد

تنظیم کی ۔ اس کے پیشرو یہی کافی سمجھتے تھے کہ چھے یا سات اسقفوں، خانقاہوں کے منتظموں، یا حکام عدالت سے کام لیں اور ان درباروں کو روانہ کریں جہاں انھیں اپنے مفاد کی کوئی چیز ملے کرانی ہوتی ۔ فرانسوا اول نے اپنے کارندوں کی تعداد بڑھائی اور اسی نے پہلی دفعہ قسطنطنیہ، ہنگری، پولینڈ، ڈنمارک اور سویڈن کو سفیر بھیجے ۔ شہنشاہیت کی مجلس شوریٰ میں بھی اس نے نمایندے روانہ کیے ۔ حتیٰ کہ درجۂ دوم کے حکمرانوں کے پاس بھی اس کے سفیر پہنچے[1] معتمدین مملکت کا دفتر اولین بار ۱۵۴۷ء میں قائم ہوا جب کہ تیسرے ہنری کے دور حکومت کا آغاز تھا اور اس نے بادشاہ کے چار معتمدین کماندان (؟ فوج ؟ کلیسا) و مالیہ جملہ معاملات کے ذمہ دار قرار دیے گئے تھے ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے دفتر میں اس امر پر مامور تھا کہ فرانس کے صوبوں کے ساتھ ساتھ اجنبی ممالک کے متعلق بھی توجہ کرے ۔ فرانس کے صوبوں اور اجنبی ممالک کے نام اور تعداد کا تعین بادشاہ خود کرتا تھا چنانچہ ان میں سے ایک کے حصے میں اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کے ساتھ نارمنڈی، پکارڈی اور فلانڈرس کے صوبے آئے تھے ۔ دوسرے کی نگرانی میں ساقوا، جرمنی اور سوئستان کے ساتھ شاں پانیں، برگنڈی اور بریس کے صوبے تھے ۔ تیسرے کی نگرانی میں اسپین اور پرتگال کے ساتھ پروفانس، لانگ ڈوک اور گوی ین کے صوبے تھے ۔ اور چوتھے کی نگرانی میں پی اے مون، روما، ونیس اور مشرق قریبہ کے ساتھ لیون اور دو فینے کے صوبے تھے ۔

فرانسوا اول نے اجنبیوں سے بھی مدد لی ۔ لیکن زیادہ تر دور دراز کی سفارتوں کے لیے ۔ کبھی تو ان کو سرکاری حیثیت دی جاتی ۔ اور کبھی یہ خفیہ کارندوں کی حیثیت سے کام انجام دیتے ۔ چنانچہ

317

[1] باشت کی فرانسیسی تالیف "بیرونی ممالک کے محافظ خانوں کے مواد کی تاریخ" صـ ۱۱

انتوان رین کوں جیسے اسپینی منچلے، ژیرژوم لاسکی جیسے پولستانی پناہ گزین، فرنگی یانی جیسے ہنگرومی سازشی اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں نے فرانس کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ شہنشاہوں نے بھی جلا وطن اطالیوں، میلانیوں اور انیلزیوں سے سفارتی کام کروانے تھے جو "کم و بیش رضا کارانہ طرز سے فرانسیسی اور اپنے معاملات کے بھینٹ چڑھتے تھے"[1]۔ ابھی تک سفیروں میں طبقے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ایک ہی دربار میں ایک ہی معاملے کے لیے گفت و شنید کرنے دو دو سفیر بھی نظر آتے تھے، اور کبھی سفیر مقیم کے ساتھ عارضی طور سے ایک غیر معمولی سفیر بھی موجود ہوتا تھا[2]۔ شروع میں ان کے نام بھی زیادہ متعین نہ تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادارہ ترقی کرتا گیا لفظ "سفیر" اعلیٰ تر خدمات کے لیے مخصوص ہو گیا اور "مقیم" چھوٹی حیثیتوں کے لیے برتا جانے لگا[3]۔

"امباک ساڈور" (= سفیر) کی اصطلاح تیرھویں صدی کے وسط میں پیدا ہو گئی تھی۔ چودھویں صدی میں فرانسیسی جو اصطلاح برتتے تھے وہ "میساژے"، "مسے ژے" اور "مساژیئے" تھی جس کے معنے پیام رساں کے ہیں۔ سفیر کو بھی بعض وقت "پیام" اور "پیغام" کہہ دیا جاتا تھا۔

قدیم دستاویزوں میں جو اصطلاحیں برتی جائیں اور جو مفہوم لیا جاتا تھا، وہ اب بنیادی طور سے بدل چکا ہے۔ قدیم ترین دستاویزوں

318

[1] مودلا کلا فیئیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صـــ ۳۶۰

[2] شاریئیر کی فرانسیسی تالیف "فرانس کی گفت و شنید مشرق قریب کے ساتھ" جلد (۱) دیباچہ صـــ ۳۲

[3] مودلا کلا فیئیر کی مذکورہ تالیف جلد (۱) صـــ ۳۰۰

میں اس سے مراد ایک فریضے (کمیشن) کی انجام دہی ہوتی تھی نہ کہ کوئی نمایندگی (مشن)۔ اس لیے جو نام مروج ہوئے ان میں تفویض کا مفہوم پایا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف نمایندگی اکثر صورتوں میں اس امر پر محدود ہوتی تھی کہ ایک رپورٹ پیش کی جائے۔ چنانچہ سفر سے واپسی پر ایک یادداشت کے طور پر اسے مرتب کیا جاتا۔ کبھی کبھی کانفرنسیں طول کھینچتیں، تو خط وکتابت کی ضرورت پیش آتی[1]

آٹھویں ہنری کے زمانے میں انگریزی سفارت کاری اپنے میدانِ عمل کو وسیع کرتی ہے۔ وُالزے نے اپنے کو تقریباً کلیتۂ خارجہ سیاست سے مخصوص کرلیا تھا۔ اس کے سفیر بکثرت تھے۔ ان کی خط وکتابت ضخیم ہے۔ ساتویں ہنری کی طرح اس نے اپنے سفیر صرف اعلی طبقوں سے نہیں چنے بلکہ اسے تو بڑے گھرانوں کے لوگوں کو مامور کرنے میں ڈر ہی ہوتا تھا کیونکہ ان میں وہ چالاکی نہیں پائی جاتی تھی جس کی ضرورت تھی۔ اور یہ بھی خطرہ تھا کہ رقابتیں اور بے اطمینانیاں نہ پیدا ہوجائیں۔ اس کے چند سفیر تو بالکل بے حیثیت اور غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے مثلاً مجریط (میڈرڈ) کا سفیر جان اسٹائل۔ بعض وقت تاجروں کا انتخاب کیا گیا جیسے ٹامس اسپینیلی جو فلانڈرس میں انگریزی "مقیم" (رزیڈنٹ) تھا۔ برُوشر نے ان کا چربہ کھینچا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ وہ مستقل مزاج اور محتاط ہوتے تھے۔ آسانی سے جذبات کا شکار نہیں ہوتے، اور معاملات کو، حقیقی ہو کہ مصنوعی ایک ظاہری ثقالت اور غیر سرسری پن کے ساتھ دیکھتے تھے[2]
ان انگریزی سفیروں کے متعلق شہرت تھی کہ ان کو آسانی کے ساتھ

---

[1] شارنیر کی مذکورہ تالیف جلد (۱) دیباچہ صہ ۳۴

[2] انگریزی تالیف "بیرونی اور گھریلو خطوط اور کاغذات آٹھویں ہنری کے دورِ حکومت کے" جن کو برُوشر نے مرتب کیا۔

دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ اسپینی اور فرانسیسی ان کی بہت معمولی حیثیت سمجھتے تھے لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر بے انتہا قابلیت کے مالک تھے اور انھوں نے جو مراسلے بھیجے ہیں وہ صحت، وضاحت، اور باریک بینی کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔

شارل کین کے زمانے میں سیاسی معاملات پر عموماً مجلس وزراء میں بحث ہوتی تھی۔ اس کے ارکان اپنی رائے تحریری طور سے دیتے اور جب کافی بحث ہوچکتی، تو وزیر متعلقہ شہنشاہ سے گفتگو کرتا اور ایک فیصلہ عمل میں آجاتا۔[1] شارل کین کے ہاں جس شخص کو کافی طویل عرصے تک اعتماد حاصل رہا، وہ مرکورین آربورینو یعنی گاتی نارا کا کونٹ تھا جس کی پیدائش پی اے مون میں ہوئی تھی۔ ابتداءً یہ دربار ساقوامیں وزیر ومشیر تھا۔ پھر آسٹریا کی مارگریٹ اور مکس میلین نے اس کے ذمے اہم اہم کام کیے۔ آخر میں شارل کین نے اسے وزیر اعظم کی اہم خدمت کے لیے طلب کیا۔ یہ شخص فرانس کا بڑا سخت دشمن تھا، ورنہ اس کا پیشرو شی ایقر اس بات کا حامی تھا کہ فرانس سے حلیفی پیدا کی جائے۔ گاتی نارا کا کونٹ سنہ ۱۵۳۰ء میں (۶۵) سال کی عمر میں مرگیا۔ اس کی وفات پر شہنشاہ نے نکولاس پیرنو کو جو گراں فیل کا جاگیردار اور سابق میں پاریس کا سفیر تھا، وزیر اعظم اور نیپلز وصقلیہ کی بادشاہتوں کی مہروں کا محافظ مقرر کیا۔ یہ شخص بڈھا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد جانشین اس کا بیٹا ہوا، جو گراں فیل کے کارڈینل کی حیثیت سے مشہور ہے۔ شہنشاہ نے فرانسکو دے لاس کوفوس سے بھی زیادہ تر اطالوی اور اسپینی معاملات میں مدد لی۔ اور جرمنی، برگنڈی اور نشیبستان (ہالینڈ) کے معاملات خاص کر نکولاس پیرنو کے سپرد رہے۔

[1] برگمن روٹ کی انگریزی تالیف "خطوط، مراسلات اور سرکاری کاغذات کی تقویم" جلد (۲) دیباچہ صفحہ ۱۰۲۔

شارل کین نے جن لوگوں کو سفیر مقرر کیا تھا، ان میں بکثرت قوموں کے لوگ تھے۔ اور اس کی وسیع شہنشاہت بھی بکثرت قوموں پر مشتمل تھی۔ نشیبستان (ہالینڈ) سے جو لوگ لیے گئے وہ تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور قابلیت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ گیوم ڈشی ایگمز نے، جسے نوجوان شہزادے کا موِدب بھی مقرر کیا گیا تھا، اہم سفارتوں کو قابلیت اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا تھا۔ شارل ڈلانوا جو نیپلز میں نائب السلطنت تھا، اہم ترین معاملات سے اپنے کو وابستہ پاتا رہا۔ بروگیس کا لوئی جو پرانیٹ کا جاگیردار تھا، لندن اور پاریس میں سفیر مقرر ہوا۔ آدریاں ڈکروا نے بعض نازک معاملات اٹلی میں عمدگی کے ساتھ انجام دے کر سرخروئی حاصل کی۔ لُودوِشس فان شور ے، جو مجلس شورائے راز کا صدر نشین تھا، اس غرض کے لیے مامور ہوا کہ اسپین سے گفت و شنید عمل میں لائے۔ فرانسوا فان ڈلفنت کو لندن میں سفیر مقرر کیا گیا۔ ہائرت فان لی دے کرکے کو دربار فرانس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ کورنے ای ڈشیپر، ویلویک، بوسس بک، برومن کو قسطنطنیہ میں مقیم مقرر کیا گیا[1]۔ یہاں ان تمام ممتاز لوگوں کا نام پیش کرنا ممکن نہیں جنھیں اس طاقتور حکمران نے اپنی سفارت کاری کے لیے مامور کیا تھا۔ البتہ سی موں رنار کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو "ایک نہایت ہی قابل، پرجوش، خوش گو لیکن مسخرہ اور گڑبڑ کرتے رہنے والا شخص تھا"۔ اس نے لندن کی سفارت جس قابلیت کے ساتھ انجام دی وہ نادر چیز ہے۔ ایک اور اہم عہدہ یعنی روما کی سفارت میں پیسا کے ڈیوک اور ریمل دے اے ریرا نیز اور تادو نے نہایت قابلیت کے ساتھ شہنشاہ کے مفادات کی حفاظت کی[2]۔

320

---

[1] سین تر ے نوا اور شیپر کی مشترکہ فرانسیسی تالیف "کورنے ای ڈپلی سیوس ڈشیپتر کی سفارت کارانہ کارگزاری" دیباچہ

[2] پاس کوال دے گایاں گوس کی انگریزی تالیف "خطوط، مراسلات اور سرکاری

مستقل سفارتوں کا ادارہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وہ باہمی ہو، یک طرفہ نہیں۔ مگر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ترک اگرچہ دوسری مملکتوں کے سفیروں کو اپنے ہاں آنے دیتے تھے، لیکن ان ممالک میں خود کوئی مستقل سفارت نہیں قایم کرتے تھے۔ اس کا باعث وکفورلنے بیان کیا ہے۔ ترکی کے باب عالی کا تصور یہ تھا کہ اس کے ہاں سفیروں کا بھیجا جانا گویا عیسائی حکمرانوں کی طرف سے اظہار احترام ہے۔ مزید برآں مسلمان ارباب حکومت بہت بدگمان رہتے تھے۔ اور اپنی حد تک یورپی سفیروں کے دل میں واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کو چکمہ دیں۔ ایک اور چیز کا یقین ترکوں کے ذہن میں بہت اچھی طرح جاگزیں تھا کہ اجنبی سفیروں کو صرف ڈرا ہی کر کچھ کام نکالا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ قسطنطنیہ آنے والے سفیروں کو خوفزدہ کریں۔

بادشاہ فرانس کے نمایندے کافی عرصے تک زحمت دہ کارروائیوں سے بچے رہے لیکن دوسرے حکمرانوں کے نمایندوں کی حالت تکلیف دہ تھی۔[1] ان کی گفت کا کوئی ذریعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی بڑی کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ انھیں آپس میں ملنے اور ایک دوسرے سے ملاقات پیدا کرنے سے روکا جاتا تھا۔ عوام الناس ان کی توہین اور ہتک کیا کرتے تھے۔ اور جب کبھی حکومت مفید خیال کرتی تو ان کو قید کر دیا جاتا تھا۔ اور انھیں بے رحمانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کاغذات کی تقویم جو انگلستان اور اسپین کی گفت و شنید سے متعلق ہیں اور سیمانکاس وغیرہ کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں" (دیباچہ صفحہ ۱۲ و مابعد)

[1] کلاریج کو کا مضمون "مشرقی معاملات کا ارتقاء" جو فرانسیسی رسالہ "ہر دو عالم" بابتہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا۔

برتاؤ کی دھمکی دی جاتی۔ بوسبک، سلطان کے ہاں تین شہنشاہوں کی طرف سے سفیر رہا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ بطور سفیر آیا تو اس کا کچھ عرصہ سات دروازوں والے قلعے میں قید کی حالت میں گزرا۔ اور ایک خاص زمانے میں تو اسے اپنی ناک اور کانوں کی خیر نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ بھی یہاں اضافہ کر دینا چاہیئے کہ باب عالی نے مقدس رومی شہنشاہت کے متعلق بہت ہی تحقیر کا انداز رکھا تھا۔ اس پر اس نے کامیاب حملے کیے تھے اور اس پر مجبور کیا تھا کہ سالانہ خراج کا وعدہ کرے۔ ایک واقعہ بہرحال اپنا آپ ترجمان ہے وہ یہ کہ سولھویں صدی میں حتیٰ کہ سترھویں صدی کے آغاز میں بھی جو معاہدے سلطان اور شہنشاہ میں طے ہوئے، ان میں یہ لکھا جاتا تھا کہ فریقین معاہدہ آپس میں انسانیت کا سلوک ملحوظ رکھیں گے اور یہ کہ سفیروں، سفارت خانے کے نگرانکاروں، کارندوں اور ان کے عملے کو قید نہ کیا جائے گا حتیٰ کہ اس صورت میں بھی جب کہ ان میں حالت صلح ختم ہو جائے۔ مزید برآں ترکوں کا ایک خاص تصور تھا۔ ۱۴۹۵ء میں ؐ وینس کا جو سفیر آندرے زانکانی، قسطنطنیہ آیا تھا اس نے جمہوریہ وینس اور سلطان بایزید دوم میں بعض عہد و پیمان کیے۔ وہ لاطینی میں لکھے گئے تھے۔ اس عرصے میں آندرے گرِتی کو وینس کا دوجے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس نے تنبہ کیا کہ جو معاہدے ترکوں کی اپنی زبان میں نہ لکھے جائیں، ان کا وہ اپنے آپ کو پابند نہیں خیال کرتے۔ اس پر وینس کے سفیر نے مطالبہ کیا کہ جن دستاویزوں پر اس نے دستخط کیے تھے، ان کو ترکی زبان میں لکھا جائے۔ ترکوں نے انکار کیا اور وہ عہد و پیمان نافذ نہیں کیے گئے۔

منتقل سفارتوں کے قایم ہونے سے عارضی سفارتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ چنانچہ اظہار شان شوکت کے لیے ایلچی بھیجے جاتے، کسی سرکاری بڑی تقریب کے موقع پر سفیر بھیجے جاتے، اور دورہ کرنے والے سفیر روانہ کیے جاتے (جو موقتی سفارتیں

321

ہوتی تھیں)[1] ۱۴۴۲ء میں انگلستان میں جو سفارت تھی اس نے
فرانس اور اسپین کی مختلف سفارتوں کو بھی جمع کیا اور پھر یہ سب مل کر
سرکاری طور سے لندن میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اس کی کوشش
کی کہ جنگ صد سالہ کو ختم کیا جائے۔

سفیروں کے انتخاب کے لیے کوئی معیّن قاعدے نہیں تھے۔
مودلا کلاؤتیئر نے خوب کہا ہے کہ سفارت کاری کو ایک نہایت
لچک دار چیز خیال کیا جاتا تھا اور ہر نئے دن کی ضرورتوں کے مطابق
وہ نہ صرف کھنچ اور تن سکتی تھی بلکہ اسے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ اور
اسے نازک سے نازک اور تغیر پذیر سے تغیر پذیر حالات کے ساتھ
اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لینا ہوتا تھا۔ کوشش اس کی کی جاتی تھی کہ
ایسے لوگوں کو چنا جائے جو قابل بھروسہ کردار رکھتے ہوں۔ چنانچہ
فلپ ڈکومین کے الفاظ میں: "اچھے اور عقلمند لوگ جن کو بادشاہ
اچھی طرح جانتا ہو، چالاک اور عملی لوگ جو دوسروں کو خوش رکھ سکیں،
جو ہر چیز کر سکیں اور ہر بات کہہ سکیں اور کسی نہ کسی طرح بالآخر اپنا
مقصد حاصل کر سکیں"۔ اطالوی شہر اکثر ماہرین قانون کو مامور کرتے تھے
سولھویں اور سترھویں صدی کے بڑے بڑے اساتذۂ قانون میں سے
قریب قریب سب ہی سفارتی خدمات انجام دے چکے تھے۔

سفارت کاری کے لیے مختلف چیزوں کا جاننا ضروری ہوتا تھا
سفارت کار کو تاریخ سے واقفیت ضروری تھی جو کومین کے الفاظ میں
تبسم کی فریب دہیوں، چالاکیوں اور عہد شکنیوں کی بہت بڑی معلمہ
ہے۔ اہل سیف کو ذرا بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا کلیسا والوں کا بکثرت
انتخاب ہوتا تھا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں سفیروں کے ساتھ

---

[1] مودلا کلاؤتیئر کی فرانسیسی تالیف "مکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ ۳۸۲۔

عام طور پر ایک پادری بھی ہوا کرتا تھا۔ سفارت کاری میں کافی طویل عرصے تک ایک مذہبی نوعیت پائی جاتی تھی چنانچہ نمایندے کلیسا ہی میں جمع ہوتے تھے۔ معاہدات کی گفت و شنید اور عہد و پیمان کی تکمیل پر مذہبی رسمیں انجام دی جاتی تھیں[1]۔ سفارتوں میں اکثر غیر کلیسا والوں میں سے ایک بڑے رتبے والے شخص کے علاوہ ایک اسقف اور ایک قانون داں بھی شریک رہا کرتا تھا۔ مونٹے گو برنارڈ بیان کرتا ہے کہ "اصلاح" سے قبل انگلستان میں ان لوگوں کی تعداد قابل لحاظ تھی جو پادری بننے کی اجازت حاصل کرنے کے بعد قانون روما اور قانون مذہبی سے گزر کر مملکت کی ملازمت میں داخل ہو جاتے تھے[2]۔

322

بارہا دستاویزوں کی تصدیق بھی کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ افسران تصدیق ان کا داخلہ لیتے تھے۔ یہ افسر قرون متوسطہ میں قانون خارجی کے متعلق بھی اسی طرح کام انجام دیتے تھے جس طرح قانون داخلی کے متعلق۔ افسران تصدیق کا تقرر یا تو پوپ کی طرف سے ہوتا، یا شہنشاہ کی طرف سے، یا اس ملک کے حکمران کی طرف سے جہاں وہ اپنا فریضہ انجام دیتے۔ پاپائیت یا شہنشاہیت کے حامیوں کو جو دعوے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جب تک کوئی افسر تصدیق اپنا تقررنامہ پوپ یا شہنشاہ سے حاصل نہ کرے، اس وقت تک کسی ملک میں بھی اسے یہ اجازت نہ ہوگی کہ اپنی خدمت بجا لائے۔ اور جو دستاویزیں وہ مرتب کرے، ان کو

---

[1] فونک برنتانو کا فرانسیسی مضمون "قرون متوسطہ کی سفارت کاری کی مذہبی نوعیت" جو رسالہ "تاریخ سفارت کاری" بابت ۱۸۸۸ء میں چھپا۔ دیکھئے صفحہ ۱۰۲۔

[2] مونٹے گو برنارڈ کی انگریزی تالیف "سفارت کاری سے متعلق مضامین پر چار لکچر" صفحہ ۱۴۰۔

سرکاری ہونے کی حیثیت اور قوت عطا کرے۔[1]

یا پائی افسران تصدیق کی نامزدگی یا تو پوپ کرتا تھا یا وہ لوگ جن کو پوپ یہ اختیار عطا کرتا تھا کہ افسران تصدیق کو نامزد کرسکیں۔ یہ یا پائی افسران تصدیق اہم خدمات انجام دیتے رہے۔ تحقیقات کا ماجرا وہ مرتب کرتے تھے۔ وہ ان سفارتی یادداشتوں کا داخلہ لیتے تھے جنھیں بطور نہائیہ (الٹی میٹم) بھیجنا مقصود ہوتا تھا اور وہی اس کی تصدیق کرتے تھے کہ گفت وشنید ٹوٹ چکی ہے۔[2]

دربار روما میں سرکاری جشنوں کے موقع پر جب کہ اجنبی حکمران یا ان کے وکیل اطاعت کا حلف لیتے تو پاپائی افسران تصدیق اس تقریب میں موجود رہتے اور اس کا ماجرا مرتب کرتے۔

معاہدوں کی تکمیل افسران تصدیق کے روبرو اور گواہوں کی موجودگی میں عمل میں آتی۔ چنانچہ ۱۴۹۴ء میں توردے سی لاس کا معاہدہ ایسا ہی ہوا تھا۔

323

قرون متوسطہ میں شروع سے آخر تک سیاسی معاملات میں وہ تمام مراسم ملحوظ رہے، جو قانون داخلی میں ضروری تھے۔ قریب قریب تمام وزرائے مملکت یا تو بڑے پائے کے ماہر قانون ہوتے یا کم از کم علم قانون سے درک رکھتے۔ وہ سرکاری معاملات کو اسی طرح انجام دیتے، جس طرح کوئی قانون داں خانگی لوگوں کے معاملات کو۔ اسی بناء پر اطلاق کے سلسلے میں ثبوت اور خاص کر تحریری ثبوت کی ہمیشہ ضرورت جتائی جاتی رہی۔ مزید برآں عام سیاست رانی میں بے انتہا احتیاط برتی جاتی تھی اور کبھی یہ مناسب

---

[1] جیمس برائیس کی تالیف "مقدس رومی شہنشاہیت" کا فرانسیسی ترجمہ مرتبۂ اے میل ڈومیرگ صفحہ ۲۴۳۔

[2] موولا کلاڈیئیر کی مذکورہ تالیف جلد (۳) صفحہ ۲۰۱۔

نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ہرچہ بادا باد کہہ کر کوئی سیاسی مہم اختیار کرلیں۔ عام طور پر بادشاہ اور ان کے مشیر عقلمند اور محتاط ہوا کرتے تھے، لیکن اس طرح نہیں کہ ان پر بزدلی کا الزام لگایا جاسکے، کیونکہ وہ قانونی مسائل سے خوب آگاہی رکھتے تھے۔ اس لیے وہ یہ جان لیتے تھے کہ کدھر جارہے ہیں؟ اور اس میدان کو پہچان لیتے تھے جہاں انھیں جولانی دکھانی ہوتی تھی۔ یہ بے شک کہا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آتا تھا۔ اور قدامت پسندی کا جنون رہتا تھا۔ اور اس سے بھی بدتر یہ کہ سطحی پن اور بے ہمتی۔

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ اکثر حکومت کے اعلیٰ افسر پادری ہوا کرتے تھے۔ ان وزرا کی فہرست جو ارباب کلیسا سے ہوں، بہت طویل ہے۔ ابتداءً انگلستان میں چانسلر بادشاہ کا اصل معتمد ہوتا تھا۔ یہ ایک اسقف ہوتا تھا۔ یہی شاہی کلیسا کا رئیس ہوتا تھا۔ یہی بادشاہ کے ضمیر کا محافظ ہوتا تھا۔ گویا حقیقت میں بادشاہ اپنا مذہبی اعتراف جرم اس کے سامنے کیا کرتا تھا۔

جب کبھی سرکاری دستاویزوں سے استناد نہ کیا جاسکے، تو مورخ یہ فریضہ اپنے ذمے لیتے کہ وہ مواد مہیا کریں جس پر حکمران اپنے دعووں کو مبنی کرسکیں۔ ۱۴۳۸ء میں گلبیر دُمِتس نے فرانسیسی میں "شہر پاریس کی منظراتی" نامی کتاب تالیف کی[1] "خدائی شہر" کے فرانسیسی ترجمے پر راؤل دُپ رَیل نے جو شرح لکھی تھی اس کو اس میں لفظ بلفظ نقل کرلیا تھا۔ اس نے ایک اہم صفحے کا اضافہ کیا تھا۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ شارلیمان نے یورپ کا بڑا حصہ فتح کرلیا تھا، اسپین کو مطیع بنالیا تھا، حضرت مسیحؑ کی قبر مقدس

---

[1] اس کا مخطوطہ بروسیل کے کتب خانۂ شاہی میں ہے۔ لُرُو دِلیسی نے ۱۸۵۵ء میں یہ کتاب پاریس میں شایع بھی کی ہے۔

اس نے واپس حاصل کر لی تھی، اور اس نے انگلستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ گلبیر ڈیمتس اس بارے میں لکھتا ہے کہ: "استاد گیوم ڈلیس بی، جو ایک نہایت تجربہ کار مورخ ہے، اس بارے میں یوں کہتا ہے کہ شارلیمان کا ایک رفیق جنگ تھا جس کا نام گائی تھا۔ وہ سرحد انگلستان کا محافظ تھا۔ چنانچہ وہ بڑی قوت کے ساتھ وہاں داخل ہوا۔ اور پورے انگلستان نے اس کی اطاعت کر لی۔ اور وہ بادشاہ اور ڈیوک جنھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے، ان میں سے ہر ایک کا تاج اسی نے شارلیمان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور اس طرح پہلی مرتبہ فرنگیوں نے انگلستان فتح کیا"۔ اس طرح کی مثالیں بے شمار ہیں۔

324

شہادت کو بھی ثبوت کے کام میں لایا جاتا ہے ۱۵۳۰ء میں شارل کین، بولون جاتا تھا جہاں پوپ ساتواں کلیمان اس کی تاج پوشی کرنے والا تھا۔ پوپ نے یہ کہلوا بھیجا کہ نہ تو اسے اور نہ ہی مرکز پاپائیت کو اس کا ثبوت ملا ہے کہ حقیقت میں شارل کین کا انتخاب رومیوں کے شہنشاہ کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو۔ اس پر فوراً ہی ناساؤ کے کونٹ، افسر تصدیق، کاراچی آولی، آندریا دلبورگو بادشاہ ہنگری کے سفیر اور خود جلا لتمآب کے معتمد الگزانڈر نے حلف لے کر شہادت دی کہ ان کی موجودگی میں اسپین کے بادشاہ شارل کین کو منتخب کنندگان شہنشاہت نے رومی شہنشاہ کی حیثیت سے منتخب کیا تھا[۱]۔

زمانۂ حال میں فرانس میں بعض اہل علم اس کوشش میں منہمک رہے ہیں کہ جو لوگ بادشاہت کے دعویدار ہوں ان کی تائید کے لیے

---

[۱] گاشار کی فرانسیسی تالیف "ان مخطوطات کی تفصیل و اقتباسات جو بلجیم کی تاریخ سے متعلق ہیں" جلد (۱) صفحہ ۴۶۳

ثبوت فراہم کریں۔ مشہور وزیر رشلیو کے زمانے میں وہ چیز عمل میں آئی جس کے متعلق میشلے نے کہا ہے کہ حقوق بادشاہت کی ایک فرد تفصیل کے ساتھ تیار کی گئی۔ ۱۳ر جولائی ۱۶۲۶ء کو یہ حکمنامہ نافذ ہوا۔ اس کی رو سے اس بڑے وزیر نے قلعے منہدم کرادیے، لیکن ان کے متعلق جو حقیت نامے تھے ان کو اس نے جمع کرایا۔ دِوپوئی، گود فرائے، گالاں اور مارکا جیسے لوگوں نے اپنا کام جاری رکھا، اور ان کے علم و فضل کے باعث وحدت پیدا کرنے کے کام میں مدد ملی۔ مورخ میشلے نے لکھا ہے کہ: "محافظ خانے کا دلدادہ فاتح اپنی فوجوں کے آگے آگے کوچ کرتا تھا۔ چنانچہ جب لورین پر ہاتھ ڈالنا مناسب خیال کیا گیا تو وہاں کے تین اسقفوں کے محافظ خانے میں دِولوئی کو بھیجا گیا اس کے بعد وہاں کے ڈیوک سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی حقیت ثابت کرے۔ لانگ ڈوک کے متعلق تو گالاں کو یہاں تک بے اعتمادی تھی کہ اس سے اس بات کا تحریری ثبوت مانگا گیا کہ اسے اپنے مقبوضات کی آزادانہ ملکیت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے محصولوں سے مستثنٰی ہے۔ لوگ بے سود یہ استدلال کرتے رہے کہ انھیں حق قدامت حاصل ہے، روایتیں چلی آرہی ہیں، از یاد رفتہ زمانے سے قبضہ حاصل ہے۔ لیکن ہمارے دل داد گان دستاویزات تحریری ثبوت مانگتے رہے"[1]

قومی خصوصیات کے باعث سفارت کاروں میں مختلف امتیازی خصوصیتیں قایم ہوگئیں۔ چنانچہ جرمن سفیر کے متعلق یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ مغرور ہوتا ہے۔ اطالوی سفارت کار بے ایمان اور خطرناک ہوتا ہے۔ برگنڈی والا بڑا ذہین سمجھا جاتا

[1] میشلے کی فرانسیسی تالیف "تاریخ فرانس" کتاب پنجم "توضیحات"

تھا۔ فرانسیسی کے متعلق قابل ہونے کا تو ہمیشہ تصور نہیں ہوتا تھا، لیکن اسے ایماندار سمجھا جاتا تھا۔ انگریز کے متعلق ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اسپینی سفیر کی تہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اسپینی سفارت کار کی امتیازی خصوصیت سست خرامی ہوتی ہے۔ خاص کر فلپ دوم کے زمانے میں یہ عیب لگایا جانے لگا چنانچہ پوپ آٹھویں کلیمان نے اسپین کے بادشاہ کے پاس جو غیر معمولی مذہبی سفیر ۱۵۹۲ء میں بھیجا تھا، اس کے عملے میں سے ایک نے لکھا ہے کہ "اس دربار میں وقت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو بھی طے ہونے کے لیے برسوں لگ جاتے ہیں۔" اور وہ ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کرتا ہے جو کرملی سلسلے کے ایک پادری سے پیش آیا تھا کہ شاہی وزراء، دربار ازل کے اچھے افسر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بات طول کھینچے۔ اس سلسلے میں آسٹریا کے یوحان کے حاشیے والے بڑے امرار میں سے ایک کا مقولہ یاد آتا ہے کہ "اسپینی وزراء کی آہستہ روی سے ایک دن دنیا ہی تباہ ہو جائے گی"۔ اسی کے مماثل شارل کین نے طلیطلہ کے جس ڈون پیدرو کو نیپلز میں نائب السلطنت مقرر کیا تھا، اس کا مقولہ تھا کہ "اسے تمنا ہے کہ اسپین کو موت ہی آجائے کیونکہ یہ یقین ہے کہ اس کی حیات بڑی لمبی ہوگی"[1]

سولھویں صدی کے آغاز میں سفارت کاری کے مکاتب خیال قایم ہو جاتے ہیں۔ ڈوالزے، گماتی نارا، سیلف پیئرلو،

---

[1] گماشار کی مذکورہ تالیف جلد (۱) صفحہ ۲۳۷ نیز اسی مولف کی فرانسیسی تالیف "تے نیس کے سفیروں کے جو شارل کین اور فلپ دوم کے ہاں آتے تھے، سفارت نامے" صفحہ ۳۰۴۔

واقعی مختلف طریقہائے سفارت کاری کے امام اور بانی تھے۔ خاص کر ڈالزے اور پیبرنو نے ضابطہ پرستی اور نخرہ بازی سے یکسر تعلق منقطع کرلیا تھا۔ مزید برآں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض بادشاہی علاقوں میں سفارت کاری کی خدمت صرف چند بڑے خاندانوں کا اجارہ بن گئی تھی۔ قابل لوگوں کے لئے کوئی راستے تو بند نہیں تھے، لیکن یہ نظر آتا ہے کہ فن سفارت کاری باپ سے بیٹے کو وراثت میں ملتی اور واقعی خانوادوں کی صورت اختیار کر چکی تھی[1]۔

ایک مورخ بیان کرتا ہے کہ وِنیس کے سفارت کار کو جس مقدار میں تحریری کام انجام دینا ہوتا تھا، اسے آج کل عظیم الشان خیال کیا جائے گا۔ یہ چیز سولھویں صدی کے سب ہی سفارت کاروں پر صادق آسکتی ہے۔

فرانسیسی سفیروں کے متعلق بھی وہ اتنی ہی درست ہے جتنی اسپینی سفیروں کے متعلق، اور انگریزی سفیروں کے متعلق بھی اتنی ہی جتنی شارل کیں کے سفیروں کے متعلق۔ بیکن نے ساتویں ہنری کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ غیر ممالک کے متعلق نہایت صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس غرض کے لیے وہ ان سفیروں سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا جو انگلستان میں متعین ہوں، اپنے ان حامیوں سے بھی جو غیر ممالک میں ہوں نیز ان کارندوں سے بھی جنھیں وہ خود دوسرے درباروں میں سفیر بناکر بھیجتا تھا۔ ان کو جو ہدایتیں دی جاتی تھیں وہ بڑی تفصیلی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان کو، گفت و شنید کے مباحث سے زیادہ، معلومات اور تحقیقات کے نکات قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور بادشاہ اپنے سفیروں سے یہ چاہتا تھا کہ وہ ان سوالوں

326

---

[1] فِشر کی جرمن تالیف "خارجہ سیاست اور سفارت کاری کی تاریخ" ص ۳۰۶۔

میں سے ہر ایک کا دقیقہ رسی کے ساتھ جواب دیں۔ یہ رائے ان دستاویزوں کو پڑھ لینے کے بعد بالکل درست ثابت ہو جاتی ہے جن کو گرد آلود محافظ خانوں میں سے آج کل بھی نکال کر پڑھا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ چیز نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے، جیسا کہ براڈ فوڈ سمدسہ نے بیان کیا ہے کہ "سابق میں جو سفیر بیرونی ممالک میں متعین کیا جاتا، اسے بین الممالک تعلقات میں سہولت پیدا کرنے سے اتنا کام نہیں ہوتا تھا جتنا دربار وں کے رازوں کا پتہ چلانے اور سازشوں کا جواب سازشوں سے دینے سے تھا۔ اگرچہ بین الممالک تعلقات کو سہل بنانا خود انسانیت کی شرطوں میں سے ایک ہے۔"

مسالمانہ تعلقات کے سلسلے میں جو مسائل پیش آئے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پوپ اور شہنشاہ کو کیا کیا دعوے تھے بین الممالک نظام کے سلسلے میں شہنشاہ کو یہ دعویٰ تھا کہ وہی عیسائی حکمرانوں کو بادشاہت سے سرفراز کر سکتا ہے اور پوپ کو اپنی جگہ یہ دعویٰ تھا کہ اس طرح کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ چنانچہ ۱۰۸۱ء میں پوپ نے یہ شکایت کی کہ شہنشاہ نے برانڈن بورگ کے حکمران کو (جسے شہنشاہ کے انتخاب میں رائے دینے کا حق تھا) بادشاہی کے رتبے سے سرفراز کر دیا "اور یہ لحاظ نہیں رکھا کہ بادشاہ بنانا صرف مقام مقدس پاپائی ہی سے تعلق رکھتا ہے۔"

عرصۂ دراز تک "جلالت مآب" کا لقب شہنشاہ نے اپنے لیے مخصوص رکھا تھا اور دوسرے بادشاہوں کو سموت مآب (ہزہائنس) سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ سویڈن کے بادشاہ گستاف آڈولف کو ۱۶۲۳ء میں شہنشاہ فردنیاند دوم کا ایک خط پہنچا

جس میں اسے سموت آب سے مخاطب کر کے "چچازاد بھائی" اور "دوست" سے موسوم کیا گیا تھا۔ بھائی کے لفظ سے نہیں۔ سویڈن کے بادشاہ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور وہی القاب برتے جو فردیناند نے استعمال کیے تھے، اور شہنشاہ کو بھی سموت آب اور چچازاد بھائی سے موسوم کیا تھا۔

فرانس کے بادشاہ ساتویں شارل کے عہد حکومت میں "بفضل خدا" کا جملہ استعمال کرنے کے متعلق خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ اس تبدیلی کا باعث یہ ہوا کہ آزِن کورٹ کی ۱۴۱۵ء کی لڑائی کے بعد برِیٹنی کے ڈیوک پانچویں ژاں نے یہ خیال کیا کہ اس جملے کے استعمال سے اس کی ڈیوکی کو اقتدار اعلیٰ کے سلسلے میں ایک نئے مظاہرے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ ۱۴۴۲ء میں "اچھے فلپ" کا بھی یہی تصور تھا۔ ساتویں شارل نے ایک اعلان کا مطالبہ کیا جس کے ذریعے سے اس نے یہ تسلیم کیا کہ اس طرح وہ تاج فرانس کے متعلق حقوق پر کوئی دست درازی نہیں کرنا چاہتا۔ ۱۴۴۹ء میں اورلیاں کے ڈیوک فرانسوا اول نے بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اور اس کی ضرورت تھی کہ اس بارے میں احتیاط برتی جائے، کیونکہ نارمنڈی پر ابھی تک انگریزوں کا قبضہ باقی تھا۔ چنانچہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا لیکن بعد میں گیارھویں لوئی نے بریٹنی کے ڈیوک فرانسوا دوم کو اس جملے کے استعمال سے منع کیا مگر بے سود۔ اس ڈیوک فرانسوا دوم کی بیٹی آن جانشین ہوئی تو اس نے تک یہ جملہ چھوڑنا پسند نہیں کیا۔

827

"نہایت درجہ عیسائی" کا لقب قسطنطنیہ کے شہنشاہوں، انگلستان کے بادشاہوں، بلغاریہ کے بادشاہوں اور عام طور پر ان تمام حکمرانوں کو عطا کیا گیا تھا، جو کلیسا کی فرزندی میں آ گئے تھے۔ پھر یہ صرف فرانس کے بادشاہوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لقب پوپ

پاؤل دوم نے ۱۴۶۹ء میں بطور امتیازی خصوصیت کے عطا کرنا منظور کیا تھا۔ "خدائی شہر" نامی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ راؤل ڈپریل نے کیا تھا وہ اپنے ترجمے کے دیباچے میں پانچویں شارل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "آپ کلیسا کے اصلی محافظ اور حامی ہیں، اور ہونا بھی چاہیئے، جیسا کہ آپ کے پیشرو ہو چکے ہیں۔ اور یہ پاپائے روما کے باعث ہے، جو آپ کے پیشرووں اور خاص کر آپ کو خطوط میں حکمرانوں میں سب سے زیادہ عیسائی کے لقب سے مخاطب کرنے کا عادی رہا ہے"۔ جب شہر بال میں مجلس شورائے مذہبی منعقد ہوئی تو شہر لور کے اسقف نے ساتویں شارل کے متعلق لاطینی میں یہ کہا تھا کہ "کلیسا کا شریف ترین رکن ...... بادشاہوں کی سُنت (؟) نسل میں سب سے زیادہ عیسائی اور بے عیب نام سے ممتاز"۔ پوپ پائیس دوم نے ساتویں شارل کو خط لکھ کر یہ واضح کیا تھا کہ "نہایت درجہ عیسائی" کا لقب اس نے اس کے لیے مخصوص کر دیا ہے، جیسا کہ اس کے پیشرو بھی اس خطاب کے حامل رہے ہیں۔ دوسرے بادشاہوں کے خطاب معروف ہیں۔ انگلستان کا بادشاہ "حامیٔ دین" کہلاتا ہے۔ یہ مذہبی خطاب پوپ دسوین لیو نے آٹھویں ہنری کو عطا کیا تھا کیونکہ اس نے لوتھر کے خلاف ایک تحریر لکھی تھی۔ اور اس وقت سے یہ خطاب وہاں چلا آرہا ہے حتیٰ کہ (اس وقت بھی جب آٹھویں ہنری نے پوپ سے ہر طرح کا تعلق توڑ کر اور انگلستانی کلیسا کو مستقل قرار دے کر اس کا ایک علحدہ ڈیڑھ اینٹ کا گرجا بنا دیا)۔ اسپین کے بادشاہ کو "کیتھولک بادشاہ" کا خطاب حاصل تھا۔ اٹھارھویں صدی میں ہنگری کا بادشاہ "پاپائی بادشاہ" کے خطاب سے سرفراز ہوا اور پرتگال کا بادشاہ "نہایت باایمان بادشاہ" کے خطاب سے۔

بوڈین تسلیم کرتا ہے کہ جو حکمران انتہائی اقتدار اعلیٰ کا حامل ہو، اس کے "ماتحت" پچھلے درجے کے لوگ ہوتے

828

ہیں: [1]

(۱) خراج گزار حکمران کی حیثیت، اس حکمران کے مقابلے میں کم ہوتی ہے جسے وہ خراج دیتا ہے، لیکن بہر حال اسے پورا اقتدار اعلیٰ برقرار رہتا ہے۔

(۲) وہ حکمران جو حمایت یا سرپرستی میں ہو۔

(۳) ایسا حکمران جو اپنے ملک میں تو مقتدر اعلیٰ ہو لیکن کسی دوسرے حکمران کا، اعزاز بجا لانے اور خدمت کرنے کی حد تک، ماتحت ہو۔

(۴) وہ سیدھا سادہ ماتحت جو اس حکمران کی رعیت نہیں ہے، جس کا وہ ماتحت اور جس کی عطا سے متمتع ہو۔

(۵) وہ وفادار طور سے ماتحت فرمانروا جو کسی مقتدر حکمران کے ماتحت ہو اگرچہ اس کا حقیقت میں رعیت نہ ہو۔

(۶) قدرتی رعیت۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ تمام تعلقات گڈمڈ سے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں "تولیت کا مرقع" نامی لاطینی کتاب کا مولف یاد دلاتا ہے کہ "سان مارینو ایک چھوٹی سی جمہوریت ہے جس کے ساتھ تقدس مآب پوپ اپنی عزیزترین بہن کا سلوک کرتا ہے۔ اسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، وہ ایک مقتدر مملکت ہے اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اعزازات، رتبے اور خطابات عطا کرے یہ راگو سے بھی "پوپ کی آزاد مملکتوں میں سے" ہے۔

شہنشاہ بکثرت مختلف مملکتوں یا ان فرمانرواؤں کو اپنے خطوط حمایت عطا کرتا تھا، جو شہنشاہ کے انتخاب میں رائے دینے کا حق رکھتے ہوں۔ اس کے بعد خصوصی عہد و پیمان ہونے لگے۔

---

[1] ژان بودین کی فرانسیسی تالیف "جمہوریت پر چھے کتابیں"، کتاب اول باب ۹۔

چنانچہ ۱۲۹۷ء میں اشپیرے کے مقام پر شہنشاہ آڈولف میں اور ووُرمس اور اشپیرے کے شہنشاہی شہروں میں ایسا ہی عمل میں آیا۔ شہنشاہ کی طرف سے حمایت نامہ عطا ہوتا تھا۔ ۱۳۳۸ء میں شہنشاہ چوتھے لوئی (؟ لوودوِش) نے پلاٹینا کے کونٹ اور باویریا کے ڈیوک آڈولف کو اور اس کے پورے علاقے کو اپنی حمایت سے سرفراز کیا۔ بعد کے زمانے میں جرمن حکمران فرانس کے بادشاہ آن ری دوم سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان کو اپنی سرپرستی میں لے لے۔ اس نوبت پر بادشاہ "جرمن آزادی کا محافظ و حامی" کا لقب اختیار کر لیتا ہے۔ شہنشاہ بعض دوسرے حکمرانوں کو بھی اپنی حمایت میں لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ۱۵۴۲ء میں لورین کے آنتوان کو منتخب کنندہ شہنشاہ سرداروں اور ان حکمرانوں اور مقدس شہنشاہی کے ارکان کی رضامندی سے جو نورم برگ میں جمع ہوئے تھے، اپنی حمایت سے سرفراز کرتا ہے۔ کبھی تو یہ سرپرستی دامی ہوتی ہے اور اور کبھی ایک محدود زمانے کے لیے۔ شہر اشپیرے کو فلپ نے، جو شہنشاہ کے منتخب کنندوں میں سے ایک تھا، ۱۴۸۰ء میں بارہ سال کے لئے اپنی حمایت میں لیا تھا۔ یہی شہر ۱۶۷۰ء میں شہنشاہ ژوبیر کی حمایت میں اسی وقت تک کے لئے جاتا ہے جب تک کہ وہ جنبنار ہے۔ اس حمایت میں کبھی تو کوئی خصوصی مقصد ہوتا ہے اور کبھی عمومی مقصد۔ اسی طرح اس کے لئے بعض نہایت واضح اقرار بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ دوسرے آن ری نے اقرار کیا تھا کہ وہ یورپ کی مملکتوں کو فلاں مقداریں (سپاہی اور سامان کی ؟) فراہمی کا ذمہ لیتا ہے اور اگر جنگ جاری رہی تو فلاں مقداریں[1]۔ اس حمایت میں اس سرزمین سے آزادانہ طور سے گزرنے کے حق کا بھی اضافہ ہو گیا۔

---

[1] بلاگ کی لاطینی تالیف "بدافعتی حلیفان جن کی تاریخ، قانون عمومی، اور قانون اقوام کی روشنی میں توضیح کی گئی ہے" مطبوعہ اوت ریشت ۱۸۲۴ء۔

اس کے بعد یہ حق حاصل ہوا کہ بارود کے کوٹھے قائم کیے جائیں۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے چودھویں لوی نے پارم کی ڈیوکی کو بدامی طور سے اپنی حمایت میں لے لیا۔ ایک دوسری چیز آزادانہ تجارت ہے۔ چنانچہ ماں تو کے مارکوئیس اور بارھویں لوئی میں ایسا ہی عہد و پیمان ہوا، نیز تیسرے آن ری اور ریاست جینے ثا میں بھی۔ جو عمومی جنگیں ہوتیں، وہ عمومی رضامندی سے ختم ہوتیں۔ "جلالت" یا "قوم کا انفرادی مرتبہ" اس سے متاثر نہیں ہوتا: قوم ماتحت نہیں ہو جاتی۔ سِسِیرو نے "مکمل شہریت" کی جو لاطینی اصطلاح استعمال کی تھی، اس پر کوئی تحدید عائد نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے خلاف کوئی معاہدہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ محافظ فوج متعین رکھنے کا حق حاصل ہو۔

329

اٹلی آپس کی برادرکشیوں سے پارہ پارہ تھا اور جب کبھی یہ جھگڑنے والے آپس کے جھگڑوں سے تھک کر چور چور ہو جاتے تو اکثر ایک قسم کی عارضی صلح کرلی جاتی۔ اور یہ سب اپنے آپ کو کسی اجنبی سلطنت کی ماتحتی میں دے دیتے: وہ اپنی ملکی حیثیت کو برقرار رکھتے، وہ اقتدارِ اعلیٰ کے وسیع امتیازات کو بھی برقرار رکھتے البتہ وہ ایک حد تک خارجہ تعلقات کو آزادانہ طور سے چلانے کے حق سے اپنے آپ کو محروم کر لیتے، لیکن اس دستبرداری میں کوئی قطعی چیز نہیں ہوتی۔

مختلف معاہدات کے ذریعے سے یکے بعد دیگرے جے نوا کی حکومت نے شہنشاہ ساتویں آن ری کو ۱۳۱۱ء میں اپنا محافظ تسلیم کیا۔ نیپلز کے بادشاہ رَوبیر کو ۱۳۳۱ء میں۔ میلان کے صدر المنقضۃ ثراں وِیْ کونتی اور پھر اسی کے بھتیجوں کو ۱۳۵۴ء اور ۱۳۵۵ء میں[1]

[1] اِنیگل ہارٹ کا فرانسیسی مضمون "محیولاں کے متعلق تاریخی اور قانونی مباحث"

سنہ ۱۳۹۶ء میں فرانس کی تولیت حاصل کرنی زیادہ مفید نظر آنے لگی ۔ اس لیئے شہر جےنوا کی طرف سے دو سفیر چھٹے شارل کے پاس بھیجے گئے تاکہ اس شہر اور اس کی سرزمین کی حکومت اس کو پیش کریں اور شرطیں یہ ٹھیں کہ بادشاہ کسی فرانسیسی کو گورنر نامزد کر سکے گا ۔ وہ اس جمہوریت پر کوئی بار عائد نہیں کر سکے گا ۔ جےنوا والے بادشاہ کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گے اور ان سے لڑیں گے ۔ ان معاہدات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جو جےنوا والوں نے پہلے ہی سے یونانی شہنشاہ اور قبرص کے بادشاہ سے کر رکھے ہیں ۔ اس کے معاوضے میں فرانس کے بادشاہ کا فریضہ ہوگا کہ جےنوا والوں کی حفاظت کرے اور اگر ان سے کوئی قلعے وغیرہ چھن جائیں تو چار مہینوں کے اندر وہ واپس حاصل کرے ۔

سنہ ۱۴۱۱ء میں ایک تبدیلی ہوتی ہے ۔ چنانچہ جےنوا کی جمہوریت ایک سال کے لیے اپنے ہاں کی رئیسی اور سرداری دو مون فیرا کے مارکوئیس کو پیش کرتی ہے ۔ اس کے بعد ملکی لوگوں کو دوجے یعنی سردار بنانے کا ادارہ بحال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میلان کے ڈیوک کی حکومت بحال کی جاتی ہے ۔ اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔

سنہ ۱۴۵۸ء میں یہ جمہوریت ساتویں شارل کے زمانے میں دوبارہ فرانس میں ضم ہو جاتی ہے ۔ اور اس کے آٹھ سال بعد میلان کے ڈیوک کے پاس چلی جاتی ہے ۔ کیونکہ گیارھویں لوئی نے یہ علاقہ اس ڈیوک کو جاگیر میں دے دیا تھا ۔ اور ڈیوک نے اسے اپنے بیٹے گالیاس کے نام منتقل کیا تھا ۔

جس ریاست اتحاد نے جمہوریۂ جےنوا کو فرانس کا ماتحت

330

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی جلد (۲) میں شایع ہوا دیکھئے صفحہ ۲۳۰ ۔

بنا دیا تھا، وہ سولھویں صدی کے آغاز میں زیادہ قریبی ہو گیا۔ فرانسوا اول نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ پھر اسپین اور آسٹریا نے جے نوا پر تسلط جما لیا جو سولھویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ گوف فرے ڈو لوصل بی فی نے ٹھیک کہا ہے کہ: یہ اتحاد کناں جمہوریت گویا ایک گولا تھی جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جارہی تھی، اور جسے اپنی آزادی کی حفاظت کرنے یا اپنی غلامی کی تائید کرنے ـــ کسی کی بھی سُدھ نہ تھی۔

اٹلی میں بعض اور قسم کے محمیے بھی تھے، موناکو، سان ماری نو نیز دو اور، نیم دالماتی، نیم ٹُھینسی، جمہوریتیں یعنی پول لِقا اور رُدوگوس نِساتیا۔

موناکو کی خارجہ سیاست جمہوریہ جے نوا سے مماثل نظر آتی ہے۔ خانوادۂ گری مالدی کی یہ حکومت (موناکو) چھوٹی مدت کے لیے معاہدے کرتی رہی، جن کو "وابستگی" اور "تولیت" کے نام دیے جاتے رہے، جن کے باعث کسی سابقہ جاگیردارانہ ماتحتی کا خیال برطرف ہو جاتا ہے۔ یہ معاہدے یا تو معینہ مدت پر ختم ہو جاتے یا کسی جنگ کے بعد، یا اس گفت و شنید کے اختتام پر جس کے لیے وہ معاہدے عمل میں لائے گئے ہوتے۔ ۱۴۲۴ء میں ژاں گری مالدی کو فلارنس کی "تولیت میں قبول کر لیا گیا" اور گری مالدی نے اقرار کیا کہ اس کے دوست اور دشمن وہی ہوں گے جو جمہوریۂ فلارنس کے ہوں۔ فلارنس نے اپنی طرف سے اقرار کیا کہ وہ اس کی امداد و حفاظت کرے گا، اور اپنے ہر معاہدۂ امن یا جنگ میں اس کو شریک قرار دے گا۔[۲]

---

[۱] ایضاً صفحہ ۲۳۸۔

[۲] ایضاً جلد (۳۵) صفحہ ۳۶۶۔

سفیروں کی اوّلیت اور تقدم کے لیے بھی بہ کثرت جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ لودی کے مارٹن نے اوّلیت کا اصول پندرھویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں پیش کر دیا تھا کہ بڑے حکمران کے سفیر کو چھوٹے حکمران کے سفیر پر اولیت حاصل ہونی چاہیے۔ لیکن کسی حکمران کی بڑائی سے حقیقت میں کیا مراد ہے؟ اس کے لیے مختلف چیزوں سے استدلال کیا جاتا رہا۔ ۱۴۹۳ء میں لوڈوفیک براچی نے، جو رومیوں کے بادشاہ کا سفیر تھا، مطالبہ کیا کہ دیگر تمام بادشاہوں کے سفیروں پر رومیوں کے بادشاہ کے سفیر کو ایک بلند تر جگہ دی جائے۔ چھٹے الگزانڈر کو اس میں ہچکچاہٹ تھی۔ لوڈوفیک براچی نے ایک لمبی چوڑی یادداشت مرتب کر کے پیش کی، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ رومیوں کے بادشاہ کو چونکہ خود کلیسا مذہبی طور سے، چنتا اور تسلیم کرتا ہے اس لیے اسے دوسرے بادشاہوں پر اولیت دی جانی چاہیئے، کیونکہ مقام مقدس پاپائی کا وکیل اور حامی وہی ہوتا ہے اور پوپ ہی اس کو تاج پہناتا ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں دی اے گودے ثوال دیتس نے لاطینی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "اسپین کے بادشاہ اور شہنشاہ کی حیثیت اور رومی مجلس میں اس کے سفیروں کے مقام کے اعزاز کے لیے حقوق کیا ہونے چاہئیں" تھا۔ اس میں اس نے بہت سی دلیلیں پیش کیں جو اسپین کے حق میں اوروں سے جنگجویانہ اختلاف رکھتی تھیں۔ اس میں شارل گراسالیو کے استدلال کا جواب دیا گیا تھا، جس میں ایک صدی پہلے فرانس کے حقوق اور خصوصیات کو سراہا گیا تھا۔ اب اس لاطینی کتاب میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسپین نے سب سے پہلے عیسائیت قبول کی اور عیسائیت پر فدا ہونے والے تعداد میں بھی اور عظمت میں بھی سب سے

881

زیادہ وہیں کے تھے۔

مختلف مولف اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ وہاں کا تاجدار خانوادہ بہت پرانا ہے۔ اسی طرح اس سے بھی استدلال کیا جاتا رہا ہے کہ مکمل اور مطلق آزادی بھی طویل عرصے تک اسی کو حاصل رہی ہے۔ جنگجویانہ کارناموں، قوم کی چاہت آزادی کے لیے، دولت و ثروت، دربار کی شان و شوکت، زبانوں کا اختلاف، خشکی اور تری میں جارحانہ اور مدافعانہ قوت کو بھی برتری کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس نظریے کی توضیح جیمس ہاول نے اپنی دلچسپ کتاب "حکمرانوں کا تفوق، بادشاہوں کی اولیت کے متعلق ایک مقالہ" (ـــــ خط کشیدہ الفاظ یونانی میں ہیں اور باقی انگریزی میں ـــــ) میں کی ہے اور اس نے تین بڑے حکمرانوں یعنی انگلستان، فرانس اور اسپین کے بادشاہوں کے خطابات کی تحقیق و تحلیل کی ہے۔ تخت کے قدیم ہونے کی دلیل خاص کر ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کے تاجداروں کے حامی مولفوں نے پیش کی ہے۔ اور انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ اسپین و پرتگال کی حکومتیں اصل میں وزگاتھ قوم کی لڑکیاں اور نوآبادیاں" سمجھی جاسکتی ہیں۔

۱۶۲۳ء میں اے میرک کروسے نے فرانسیسی کتاب "نئے زمانے کا سینیا" شائع کی۔ اس میں اس نے ایک عالمگیر اتحاد کی

---

[1] سینیا قدیم زمانے میں پیروس نامی بادشاہ کا مشیر تھا۔ اس نے اپنے بادشاہ سے کہا تھا کہ صقلیہ، کالابر، روما اور قرطاجنہ فتح کر لینے کے بعد وہ آرام لے، کیونکہ باقی دنیا اس قابل نہیں ان کی فتح کی زحمت برداشت کی جائے۔ "نئے زمانے کا سینیا" دنیا کے تمام حکمرانوں کو جنگ ترک کر دینے کا مشورہ دیتا ہے (مترجم)

تجویز پیش کی جس میں جملہ ممالک شامل ہوں۔ رتبے اور اوّلیت کے مسائل سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے۔ کوئی چیز جبراً عائد کیے بغیر وہ ایک حل پیش کرتا ہے، جو اس قابل ہے کہ اسے نقل کرنے کی زحمت گوارا کی جائے۔ سب سے پہلے پوپ آتا ہے، پھر ترکوں کا سلطان، اس کے بعد عیسائی شہنشاہ، فرانس کے بادشاہ اور اسپین کے بادشاہ آتے ہیں۔ اس کے بعد کے درجے ایران اور چین کے بادشاہوں، پریسٹر جان[1]، تاتاریوں کے پے‌کوب (؟ خان) اور ماسکو کے گرانڈ ڈیوک ہیں، غور و بحث کے بعد تقسیم کیے جائیں۔ برطانیۂ عظمیٰ، پولینڈ، ڈنمارک، سویڈن، جاپان، مراکش، مغل اعظم اور ہندوستان و افریقہ کے دیگر حکمرانوں کے لیے بھی اوّلیت کا تسویہ کرنا ہوگا۔ کروسے ان کو مشورہ دیتا ہے کہ یہ لوگ دیگر حکمرانوں کے فیصلوں کو مان لیں۔ اور اگر ان میں رائیں برابر برابر رہیں، تو اس کی تجویز ہے کہ آخری فیصلہ جمہوریتوں کے نمایندوں پر چھوڑ دیا جائے۔ مزید برآں اس نے بعض اور ضروری تجویزیں پیش کی ہیں، خاص کر یہ کہ جو پہلے آئے وہی پہلے بیٹھے؛ یا وہ شخص جو سب سے معمر ہو یا یہ کہ باری باری سے جگہ دی جائے۔

ارِ مِنس کے جارج فریڈرک کے ہاں ایک عبارت ہے، جو قانون بین الممالک کی بہت سی درسی کتابوں میں تھوڑی سی لفظی ترمیم کے ساتھ، لیکن اصلِ اصول کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے، نقل ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "سابقہ زمانے میں مجالس شوریٰ میں اور خاص کر ان موقعوں پر جب بہت سے حکمران بذات خود یا اپنے نمایندوں کے ذریعے سے شریک ہوتے تھے، تو رتبے کے متعلق جھگڑوں کا ایک وسیع میدان کھلا ہوا تھا۔ اور اسی بہانے پوپوں

382

[1] یہ قرونِ متوسط کی ایک مبہم سی شخصیت ہے۔ اس سے کبھی تو خانِ تاتار اور کبھی نجاشیٔ حبش مراد ہونا سمجھا جاتا ہے۔ مترجم!

کو موقع ملتا تھا کہ دخل در معقول کریں اور اولیت کے متعلق قواعد وضع کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۱۵۰۴ء میں پوپ یولیوس دوم نے جو قواعد وضع کیے وہ سب سے زیادہ یادگار ہیں[1]۔ یہ چیز مارٹنس کے جارج فریڈرک کی منگھڑت نہیں ہے۔ اس نے اپنا حوالہ بھی دے دیا ہے کہ یہ چیز اس نے جرمن تالیف "حالیت امن کا یوروپی قانون بین الممالک" سے اخذ کی ہے۔ یہ کتاب ۱۶۷۸ء میں ساکسنی کے حکمران کے (جسے شہنشاہ کے انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل تھا) وزیر رگونتر نے شایع کی تھی۔ رگونتر بھی اپنے پیشروؤں کا حوالہ دے سکتا ہے، کیونکہ ۱۵۰۴ء کے قواعد سے بکثرت استدلال کیا جاتا رہا ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے بکثرت مولف اولیت کے مسئلے سے بحث کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت لاطینی کتاب "رومی مراسم" کا حوالہ دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب ۱۵۱۰ء میں روما میں چھپی تھی اور پارِس ڈگراسیس کی تالیف بیان کی جاتی ہے۔ ان مولفوں کے مطابق اس کتاب میں وہ شہرۂ آفاق قاعدہ درج تھا جو پوپ یولیوس دوم نے حکمرانوں کا رتبہ متعین کرنے کے لیے وضع کیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ دوسرے یولیوس نے حکمرانوں کا رتبہ ہرگز متعین نہیں کیا تھا بلکہ پارِس ڈگراسیس کے لاطینی روز نامچے کے شروع میں ایک فہرست پائی جاتی ہے۔ اور مولفوں نے اسی کو وہ قاعدہ قرار دے لیا ہے جو اولیت کے جھگڑے چکانے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اس روز نامچے کا مولف چونکہ افسیر مراسم تھا اور یوحان برک ہارٹ کا بھی رفیق تھا جس نے وہ روز نامچہ مرتب کیا ہے اور جو پوپ چھٹے الگزانڈر کے حالات کے متعلق معلومات کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اس لیے پارِس ڈگراسیس نے اپنے شخصی استعمال کے لیے ایک فہرست

---

[1] برٹش میوزیم کا ضمیمہ مخطوطات نشان (۸۴۴۰ تا ۴۴)

مرتب کی تھی جس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حیرت انگیز ناواقفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے [۱]۔ مزید برآں اس کے روز نامچے میں بھی، مثل دیگر

333

[۱] برٹش میوزیم کے مخطوطے کا متن حسب ذیل ہے :۔

عیسائی حکمرانوں کی ترتیب

(۱) شہنشاہ قیصر
(۲) رومیوں کا بادشاہ
(۳) فرانس کا بادشاہ
(۴) اسپین کا بادشاہ
(۵) اراگون کا بادشاہ
(۶) پرتگال کا بادشاہ
(۷) انگلستان کا بادشاہ
مذکورۂ بالا تین کے ساتھ اختلاف ہے
(۸) سسلی کا بادشاہ
پرتگال کے بادشاہ کے ساتھ اختلاف ہے
(۹) اسکاٹ لینڈ اور ہنگری کے بادشاہ میں باہم اختلاف ہے۔
(۱۰) نوار کا بادشاہ
(۱۱) قبرص کا بادشاہ
(۱۲) بوہیمیا کا بادشاہ
(۱۳) پولینڈ کا بادشاہ
(۱۴) ڈنمارک کا بادشاہ

ڈیوکوں کی ترتیب

(۱) برٹنی کا ڈیوک
(۲) برگنڈی کا ڈیوک
(۳) باویریا کا ڈیوک، پالاٹینا کا کونٹ
(۴) ساکسنی کا ڈیوک
(۵) بران ڈن بورگ کا مارکوئیس
(۶) آسٹریا کا ڈیوک
(۷) سابوڈیا کا ڈیوک
(۸) میلان کا ڈیوک
(۹) ثے نیس کا ڈیوک
(۱۰) باویریا کے ڈیوک
(۱۱) فرانس اور لورین کے ڈیوک
(۱۲) بوربون کا ڈیوک
(۱۳) آریلیا کا ڈیوک۔ یہ چاروں مقام مقدس پاپائی کی اطاعت نہیں کرتے بلکہ شہنشاہ کے ماتحت ہیں۔
(۱۴) جے نوا کا ڈیوک
(۱۵) فے راریا کا ڈیوک

برے کیں یی نے پاریس ڈگراسیس اور اس کے روز نامچے پر ایک مستقل بحث کی ہے جس کے لیے دیکھئے اس کی فرانسیسی تالیف "کتب خانۂ شاہی کے مخطوطات کے حالات و اقتباسات" جلد (۲)۔ اسی تالیف کے مطابق پاریس ڈگراسیس کے روز نامچے کا مخطوطہ کتب خانۂ

834

افسران مراسم کے روزنامچوں کے، ہر لمحہ اوّلیت کے بڑے بڑے جھگڑے نظر آتے ہیں۔ بے شبہ پوپ اس کی پیش بندی کر لیا کرتے تھے کہ ان جھگڑوں کا سدِ باب کر دیں، یا ان کو حل کریں۔ پوپ پانچویں پائس کا افسر مراسم ان جھگڑوں کو لاطینی میں "اوّلیت کی ملعون مشکلیں" کے نام سے موسوم کرتا ہے، لیکن ان کے متعلق نہ تو کوئی ایسا معیّن قاعدہ بنایا گیا نہ بنایا جا سکتا تھا جو ناقابل تبدیل ہو۔ ہمارے مولفوں کو دھوکہ لگا ہے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فاتیکانہ میں محفوظ ہے اور اس میں مزید برآں ایک اور فہرست بھی ہے جو حسب ذیل ہے:۔ عیسائیوں کے ستائیس بادشاہ

(۱) یروشلم کا بادشاہ جس کو تخت نشینی کا تیل کیتھولک کلیسا کے ماتحت کی حیثیت سے ملا گیا۔
(۲) فرنگی بادشاہ ایضاً
(۳) انگریز بادشاہ ایضاً
(۴) قسطیلہ کا
(۵) لی اَتیر کا
(۶) پرتگال کا
(۷) آرگوان کا
(۸) میورقہ کا
(۹) نابولو کا
(۱۰) دا سیا کا
(۱۱) ناروے کا
(۱۲) سویڈن کا
(۱۳) اندلس کا
(۱۴) اسکوٹیا کا (باجگزار)
(۱۵) پولینڈ کا
(۱۶) ہنگری کا
(۱۷) بوہیمیا کا
(۱۸) آرمینیا کا
(۱۹) قبرص کا
(۲۰) سوربیا کا
(۲۱) سارڈینیا کا کیتھولک کلیسا کا باجگزار)
(۲۲) گما دریا کا
(۲۳) آنوانا
(۲۴) ام التونی
(۲۵) کوئکس
(۲۶) بانوا (معروف بہ کولن)
(۲۷) صقلیہ کا

ان میں سے چند نام، اور کچھ نہیں تو، عجیب ضرور ہیں۔

[1] پوپ پولیوس دوم کا حکمنامہ مراتب بڑا دلچسپ ہے۔ آرتھر ڈک کا قول جو کسی قدر بیجا ہے، ہمیں اس سلسلے میں یاد آتا ہے کہ "لوگوں نے معقول طور سے ہمارے ماہرین قانون کی تفصیل کلنگوں یا ایسے پرندوں سے دی ہے جو ایک جائے تو سب اسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں"۔ دیکھئے فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی، جلد (۲۵) صفحہ ۵۱۳۔

سفارت کاری کی ملازمت میں ناگوار باتیں بھی پیش آتی تھیں۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ سفیروں کو تنخواہ کم ملتی تھی اور یہ کہ ان کے مراسلے مطالبوں اور شکایتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ماکیاویلی لکھتا ہے: "ہم زندگی کی ابتدائی ضرورتوں کے لیے تک کافی رقم نہیں پاتے ہیں۔ ہمیں روزانہ ڈیڑھ ایکو (سکہ) خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس ایک دینار تک باقی نہیں رہا ہے۔" اس سے پہلے تو حالت اس سے بھی خراب رہی ہوگی۔ تیرھویں صدی کے ماہرین قانون، سفیروں کی حالت سے بحث کرتے ہیں۔ ہر لمحہ وہ اعلانات نظر آتے ہیں جن میں سفیروں کے افلاس کا دکھڑا رویا گیا ہے۔ گیوم ڈوراتتی جو ایک مشہور نظریاتی مفکر گزرا ہے، سفیر کو نہ صرف مفلس سپاہی بلکہ اس قلاش شخص کے مماثل قرار دیتا ہے جسے (افلاس کے باعث) قید کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "مفلس سفیر، مفلس سپاہی، مفلس ہی امیر عشیرہ اور وہ مفلس جو قید میں ہو یہ سب جمہوریت کے خصوصیات ہیں۔"

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خاص دور، رشوت ستانی سے پاک ہونے کے باعث، درخشاں و نمایاں ہو۔ چنانچہ یہ نظر آتا ہے کہ ارباب حکومت بیرونی بادشاہوں سے رقمیں وصول کیا کرتے تھے، جو بعض وقت خاص بڑی ہوتی تھیں۔ گیارھواں لوئی جن خاص خاص وسایل سے کام لیتا تھا، ان میں سے ایک رشوت دہانی بھی تھی جسے کومین نے "فیاضی" کا نام دیا ہے۔ ترکوں سے گفت و شنید کے سلسلے میں خاص کر روپے نے قابل لحاظ کام کیا ہے۔ وینس کے سفیر لورنزو برنارڈو نے ۱۵۸۵ء کی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ "روپیہ شراب کی طرح ہے۔ طبیب اس کی، تندرست اور مریض دونوں کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ ترکوں کو اس وقت بھی تحفے دینے چاہئیں جب ان کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے رہیں۔ انھیں اس وقت بھی تحفے دینے چاہئیں جب کہ تعلقات کشیدہ ہوں۔"

335

بدمار کا کونٹ ایک مشہور سفیر ہے جسے اسپین نے ۱۹۱۹ء میں فرانس بھیجا تھا۔ اس کا اندازہ ہے کہ قسطنطنیہ میں سالانہ چار لاکھ دوکا (سکے) تقسیم ہوتے ہیں۔

سرہنری واٹن نے سفیر کی تعریف لاطینی میں یوں کی ہے "سفیر ایک بھلا مانس ہے، جسے بیرون ملک، اپنے ملک، کے مفاد کے لیے جھوٹ بولنے کی خاطر بھیجا جاتا ہے"۔ (—— اسی کا فرانسیسی ترجمہ ——)۔ اس نے یہ تعریف اپنے دوست فلے کامیر کی البم کے سادہ اوراق پر لکھی تھی[1] اس تعریف کی وجہ سے شیوپوس اس پر بڑے زہر آلود حملے کرتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ تعریف ایک طنز کے سوا کچھ نہیں۔ جو بھی ہو، بڑے بڑے لوگوں نے خیال کیا ہے کہ سفارت کاری کے کام میں دھوکہ بازی کا عمل میں نہ آنا ضروری نہیں۔ گیارھویں لوئی کے وہ ہدایات مشہور ہیں جو اس نے کوی ین اور برٹنی کے ڈیوکوں اور تو شاڑ اور تسولیہ کے سرداروں کو بھیجے تھے کہ: "اگر وہ تم سے جھوٹ بولیں تو تم ان کو اس سے زیادہ جھوٹ بولو"۔ کچھ عرصہ بعد اسپین کا ایک سفیر اپنے سفر پر روانہ ہونے لگا تو اس نے کہا تھا کہ "اگر وہ جھوٹ بولیں تو میں ان کو دو سو گنا زیادہ جھوٹ سناؤں گا"۔

سرکاری سفارت کاری کے علاوہ، اکثر ایک بڑی اور حقیقی خفیہ سفارت کاری بھی پائی جاتی تھی۔ فرانسوا اول نے فرانس میں لاقو کے اسقف اور روڈیز کے اسقف کو سفیر مقرر کیا تھا۔ ایک ۱۵۳۳ء سے ۳۶ تک اور دوسرا ۱۵۳۶ء سے ۳۸ء تک۔ انھوں نے خفیہ کارندوں کا ایک عملہ قایم کیا جن کا دائرۂ عمل

336

---

[1] دیکھئے مذکورہ رسالے کی جلد (۲۱) صفحہ ۳۰۸ پرنیس کا فرانسیسی مضمون "سرہنری واٹن کی کی ہوئی تعریف سفیر"۔

جمہوریہ فرینس کی سرزمین سے بھی پرے تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی زمانے کے سفارتی مراسلوں میں ان کو "بادشاہ کے اچھے نوکر" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ بڑے مفید ثابت ہوئے۔ ان میں ہر رتبے کے ملازم، گمنام جانباز، اہل کلیسا، بڑے بڑے جاگیردار اور خود امراء وسعرزین کے افراد بھی شامل ہوتے تھے۔

اٹلی میں شارل کین مذہبی سلسلوں کے افراد کو بطور جاسوس مامور کرتا تھا۔ گیس سان لانیلو، ہیبنوری سلسلے کے پادریوں کا صدر تھا۔ یہ شخص شہنشاہ کی رعایا میں سے تھا، شہنشاہ کے مفادات کی نگہداشت کیا کرتا تھا۔ اور اس کے سلسلے کے متعدد راہب بھی شہنشاہی کارندے تھے[1]۔

الفونسو، اسپین کا ایک فرانسسکانی راہب تھا جس سے پوپ روما میں، خوب کام لیا کرتا تھا۔ اسی کے حوالے سے فرینس کے سفیر نے پوپ یولیوس دوم کے اس لاطینی قول کی روایت کی ہے جو فرانس بادشاہ کے متعلق ہے کہ: "یہ گالس — (= مرغ نیز فرانسیی) — تو تمام مرغیاں خود ہی لے لینا چاہتا ہے"[2]

جو اطالوی بنک غیر ممالک میں قائم ہوتے تھے، وہ اپنے ملک کے لیے مالی کام کی طرح سیاسی کام بھی انجام دیا کرتے تھے[3]
مختلف گفت وشنید کے موقعوں پر عورتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فردنیانڈ اور ایزابیلا کی بیٹی کو باضابطہ طور سے اس کے

---

[1] زیلر کی فرانسیی تالیف "سولھویں صدی کے وسط کی فرانسیسی سیاست کاری" صفحہ ۸۷۔

[2] ماری نوسانوتو کی اطالوی تالیف "روزنامچے" جلد ۱۰ ص ۳۵۰ — مودلا کلافیشیر کی فرانسیی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) ص ۴۵۰۔

[3] مودلا کلافیشیر کی مذکورہ تالیف جلد (۱) ص ۴۵۱۔

سُسرے، ساتویں ہنری کے ہاں سفارتی کارندہ مقرر کیا گیا تھا۔
گفت و شنید کرنے والیوں میں بیئیر دے جے دی سیس کی بیوی
نکریدزیا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ۱۴۶۷ء میں ایک فریضہ لے کر
روما گئی تھی۔ اسی طرح ایستے کی ایزابیلا کو اس کے شوہر لوڈوک
اسفورزا نے ۱۴۹۳ء میں ایک راز کا کام سپرد کیا تھا کہ نیپلز
جا کر وہاں فرانسیسیوں کی تجویزیں آشکارا کر دے[1]
۱۵۰۸ء میں جب کامبرے کی حلیفی قائم ہوئی تو آسٹریا کی
مارگریٹ نے اپنے بھتیجے کارل کے لیے اس حلیفی کو خود طے کر کے اس
پر دستخط کیے تھے۔ ۵ راگست ۱۵۲۹ء کو اسی شہزادی نے، نیز
فرانسوا اول کی ماں یعنی ساؤوا کی لویز نے، اسی شہر کامبرے میں
ایک صلح نامے پر دستخط کیے جو اسی باعث "عورتوں کا معاہدہ" کہلاتا ہے۔
جیمس ہاول نے تقدم و اولیت کے متعلق جو کتاب لکھی تھی، اس میں اس نے
خاتون ساردائوس کے واقعے کا ذکر کیا ہے۔ یہ تقریباً ۱۶۴۸ء میں
بروسیل اور ہیگ کے شہروں کا بار بار سفر کرتی رہی اور اسے "واسطۂ صلح" کا نام
دیا گیا تھا۔ ہاول کے انگریزی الفاظ میں یہ "اس کے لیے کوئی شرم کی بات
نہ تھی"۔ ۱۶۴۵ء میں مارشل گیب ریاں کی بیوی کو فرانس کی طرف سے
اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ شہزادی گونزاگ کو جس کی پولینڈ
کے بادشاہ سے شادی ہو گئی تھی، وارسا پہنچا ئے۔ برے تزی کی کونٹیس
ڈولے تیل کو اس کے شوہر کی جگہ پولینڈ اور سویڈن میں سفیر مقرر کیا گیا۔
اور وہ اسی حیثیت سے چودھویں لوئی کے ساتھ خط و کتابت کرتی رہی۔
شیفرروز کی ڈچیس کو اس خانہ جنگی کے زمانے میں (جو چودھویں لوئی کی
کمسنی کے زمانے میں فرانس میں ہوئی تھی) کلیۃً اس فریضے کا ذمہ دار کیا گیا
تھا کہ بروسیل سے گفت و شنید کرے۔ جس معاہدے کے باعث انگلستان

337

---

[1] کراوسن کے کی جرمن تالیف "مستقل سفارت کا ارتقاء" صفحہ ۲۲۹

اور ہالینڈ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اس کی گفت و شنید مختار کل کی حیثیت سے آورلیاں کی ڈچیس لئے انجام دی تھی۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے، ایسا سفارت کاری بھی ترقی کرتی ہے سترھویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں وہ خوب پھلی پھولی۔ مختلف ملکوں میں ایک ایسا دفتر قایم کیا گیا، جو خارجہ معاملات کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور فلاساں کے الفاظ میں یہی وہ دفتر تھا جو حکومتوں کا نفس ناطقہ (سوچنے والا حصہ) سمجھا جا سکتا ہے۔[1] بیرون میں تو مملکتوں کی طرف سے سرکاری نمایندے بھیجے جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کو دوسرے ملکوں کے کارندے بھی قبول کرنے پڑتے ہیں۔ سیاسی توازن قوت کا تصور اس خیال پر مبنی ہے کہ اگر کوئی مملکت اعتدال سے زیادہ ترقی کر جائے تو باقی سبھوں کے لئے وہ خطرہ بن جاتی ہے۔ یہ تصور روز افزوں عمومی سیاست میں رچتا چلا گیا۔ شارل کین اور فرانسوا اول میں، فرانس اور اسپین میں، فرانس اور انگلستان میں جو جھگڑے ہوتے رہے، ان سے تاریخ کے طویل صفحے بھرے پڑے ہیں۔ گفت و شنید، سازشوں اور حلیفیوں کو ایک ناقابل یقین شدت حاصل ہو گئی۔ اور انھیں کے لیے کسی مملکت کے ارباب تدبر کی قابلیت اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ آخری صدیوں کی سیاست کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ سلطنتوں کے مفاد میں تصادم کا تصور پایا جاتا ہے کوہین نے ایک رسالہ فرانسیسی میں تالیف کیا تھا جس کا نام "اس امر کے متعلق مقالہ کہ جنگوں اور اختلافوں کی اجازت خدا نے اس لیے دی ہے کہ حکمرانوں اور برے لوگوں کو سزا دلائے" تھا۔ اس میں تک تصادم مفاد کے اس نظریے کے بڑے خط و خال بیان کر دیئے گئے ہیں اور اس نے دکھایا ہے کہ یورپ میں ہر طرف خدا نے ہر بادشاہ یا قوم کے ساتھ اس کا ایک دشمن بھی پیدا کر رکھا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ "اسی طرح فرانس کی بادشاہت کا اس نے انگریزوں کو مخالف بنا دیا ہے، اور

[1] فلاساں کی فرانسیسی تالیف "فرانسیسی سفارت کاری کی تاریخ" جلد (۲) صفحہ ۵۲۔

انگریزوں کا اسکاٹ لینڈ والوں کو، اور اسپین کی بادشاہت کا پرتگال کو۔ اور جرمنی کے متعلق تم دیکھ چکے ہو کہ ہمیشہ ہی سے آسٹریا اور باویریا کے خانوادے باہم مخالف رہے ہیں"[1]۔ اسی کے مماثل نظام عمل سے لے کر سیاست کاری کو اپنی کارگزاری دکھانی تھی۔

قانون سفارت کے متعلق نظری بحث کرنے والے قرون متوسط میں کچھ زیادہ نہیں ہوئے۔ اور جو ہوئے ان کے تصورات بالکل ابتدائی اور سطحی ہیں۔ جو اولین چیز قبول کی گئی وہ یہ تھی کہ سفیر بھیجنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہوگا جو اعلیٰ ترین اقتدار کا حامل ہو، یعنی حکمران یا ایسی آزاد قوم جو کسی حکمران کی سی سطوت کی حامل ہو (یہی چیز لاطینی الفاظ میں)۔ یہی وہ دو شخصیتیں ہیں جو سفارت کاری کے لیے ایلچی بھیج سکتی ہیں۔ اسی طرح ارسال سفارت کا حق جنگ کرنے کے حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے فرانس میں اس سے ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی۔ اورلیاں کے لوئی نے "ژاں بے خطر" کو ۱۴۱۹ء میں مروا ڈالا تھا۔ اس لوئی نے بہت وسیع سفارتی تعلقات قائم رکھے تھے اور بادشاہوں کے ساتھ وہ برابری کے ساتھ برتاؤ کیا کرتا تھا۔ جب یہ مرگیا تو اورلیاں کی سفارت کاری گھٹ گئی، گو باقی پھر بھی رہی[2]۔ خود گیارھویں لوئی کو بھی اورلیاں سے لڑنا پڑا اور مرنے سے پہلے اس نے اورلیاں کے ڈیوک سے مطالبہ کیا کہ وہ باقاعدہ حلف لے کر اقرار کرے کہ لوئی کے جانشین کے خلاف وہ کسی بھی دوسرے حکمران سے حلیفی نہیں کرے گا۔ جب کم سن آٹھواں شارل تخت پر

---

[1] کومین کی فرانسیسی تالیف "یادداشتیں" کتاب نمبر ۵ باب ۱۸۔

[2] موڑلا کلاتییر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاویلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۱) صفحہ (۱۶۳)۔

بیٹھا تو پھر بھی اورلیان کے ڈیوک کی کوششیں کم ہوتی نظر نہیں آئیں کہ بیرون سے تعلقات جوڑے[1] بریٹنی کا علاقہ بھی اپنی بین الممالک خود مختاری پر اصرار کرتا تھا اور پندرھویں صدی کے آخر تک وہ سفیر بھیجتا رہا۔ دیگر بڑے جاگیردار بھی اس پر عمل پیرا رہے، مثلاً لورین کا ڈیوک، آن ژو کا حکمران رَنے، کالابر کے حکمران ژاں اور نکولاس، فوا کا کونٹ اور آل بیر کا ڈیوک[2]۔

پرانے زمانے ہی سے یہ تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ سفیروں کی ذات قابل احترام ہے اور بنکر شوئک نے ان مولفوں کو بے وقوف بنانے میں خوب لطف دکھایا ہے جو یونانی اور رومی شہادتیں پیش کر کے اس کی طول طویل کوشش کرتے تھے کہ سفیر ایک مقدس شخصیت رکھتے ہیں اور ان پر دست درازی نہیں کی جاسکتی۔ یاد رہے کہ "مقدس" سے مراد یہ ہوتی تھی کہ وہ انسانوں کی طرف سے ہر قسم کی توہین اور ہتک سے محفوظ ہو۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "یہ مولف جتنا زیادہ علم حاصل کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ حوالے اور اسناد پیش کرتے ہیں تاکہ ایک ایسی چیز کو ثابت کریں جس سے کسی کو انکار ہی نہیں[3]" (گویا تحصیل حاصل)۔

339

قانون روما نے سفیروں کو دست درازی سے محفوظ قرار دیا تھا۔ عیسائیوں کے قانون مذہبی نے بھی یہی کیا۔ اور گراتیان نے جب اپنی تالیف "متعارض احکام میں تطابق" میں قانون بین الممالک کی تعریف دینی چاہی تو اس میں بھی یہ شمار کرایا گیا تھا کہ سفیروں کے

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۰۴

[2] ایضاً صفحہ ۱۰۴

[3] بنکر شوئک کی تالیف "سفیروں کے لیے حاکم مجاز پر رسالہ" فرانسیسی ترجمہ از باربیراک باب ۵، ف ۱۔

احترام کا رواج ہے ۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ میں "قانون بین الممالک یہ ہے کہ کسی علاقے پر قبضہ کیا جائے .... سفیروں پر دست درازی نہ کرنے کا مسلک ۔" ایک اور حصۂ کتاب میں گراتیان نے ان لوگوں کو جات باہر قرار دیا ہے جو کسی خطیب، کسی سفیر، نیز کسی پادری، راہب، عورت، اور غریب نہتے شخص سے برا برتاؤ کریں۔

ان ہر دو قانونوں یعنی قانون روما اور قانون مذہبی کے حاشیہ نویس اور شرح نویس ان دونوں بنیادی کلیہ قاعدوں کو ترقی دیتے ہیں اور رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سفیروں کو اپنا راستہ پورے امن اور حفاظت سے طے کرنے دینا چاہیئے ۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ میں: "سفیروں کو سکونت کا امن حاصل ہونا چاہیئے تاکہ وہ دشمن کے پاس تک حفاظت کے ساتھ جا سکیں"۔ ان کے ساتھ جو برا برتاؤ ہوتا، وہ ان کے بھیجنے والے کے خلاف سمجھا جاتا ۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ میں: "جو برا برتاؤ کسی حکمران کے سفیر کے ساتھ کیا جائے، وہ خود اس حکمران کے خلاف کیا ہوا سمجھا جائے گا"۔ یہی وجہ ہے کہ انتقام اور مواخذے کی صورت میں یہ سب بلا کسی استثنار کے سفیروں کو اس بارے میں بری الذمہ قرار دیتے ہیں ۔ دسویں الفونسو نے رومی قانون ہی کی نقل کرتے ہوئے "سات ارکان" نامی مجموعے میں صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ ہر سفیر جو قسطنطنیہ آئے، چاہے عیسائی ہو یا مسلمان، امن و حفاظت میں رہے گا اور کوئی شخص اس کو نہ جانی نقصان پہنچا سکے گا نہ مالی ۔ اگر سفیر بننے سے پہلے اس سفیر نے کچھ قرضہ لیا تھا تو [دوران سفارت میں] نہ تو اسے گرفتار کیا جائے گا نہ اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے گا ۔ البتہ جو قرض سفیر نے سفارتی قیام کے دوران میں لیے ہوں، ان کے متعلق عدالت میں نالش کی جا سکے گی ۔ کرستین ڈپیزان نے اپنی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت کے متعلق کتاب" کو اونورے بونے کے

اثرات سے متاثر ہو کر مرتب کیا تھا۔ اس میں بھی وہ کچھ کم وضاحت سے نہیں بیان کرتی کہ: "میں بھی تجھ سے وہی کہتی ہوں جو کتابی قانون میں لکھا ہے کہ سیاسی یا مذہبی سفیروں کو ہر جگہ یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ جانی اور مالی امن و حفاظت کے ساتھ جائیں۔ اور چونکہ وہ بادشاہ کے پاس جاتے ہیں، اس لیے اس بادشاہ کے آدمیوں کو یہ حق نہیں کہ ان سفیروں کو روکیں"[1] اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مختلف مولف سفیروں کو کچھ اتنی زیادہ مذہبی حیثیت عطا کرتے ہیں کہ اگر کوئی ان کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کرے تو وہ بدترین مذہبی جرم کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ میں "سفیروں کو تقدس حاصل ہوتا ہے۔ جو ان کے ساتھ زیادتی کرے، وہ بدترین مذہبی جرم کا مرتکب ہوتا ہے"۔ ایک اور مولف نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سفیر کی سفارت میں روڑے اٹکائے تو مذہبی قانون کے مطابق وہ جات باہر ہو جاتا ہے اور کشوری قانون کے مطابق اسے دشمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو، چاہے تو، اسے اپنا غلام بنا لے۔ چنانچہ اصل لاطینی الفاظ ہیں: "اگر کوئی شخص کسی سفیر کے لیے چاہے وہ دوست کا ہو یا دشمن کا، روڑے اٹکائے تو قانون مذہبی کے مطابق تو وہ جات باہر ہو جاتا ہے لیکن قانون کشوری کے مطابق اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اسے اپنا غلام بنا لیں"۔

340

عام طور پر عمل اور نظریہ یکساں ہی رہے، اور دشمن کے سفیر کا محفوظ ہونا ان جنگوں میں بھی تسلیم کیا جاتا رہا جو غیر مذہب والوں کے ساتھ بھی لڑی گئیں۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کی تاریخ میں ہم کو ایسی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ عربوں کے سفیروں کے ساتھ واقعی اخلاق

---

[1] کرستین ڈے پیزان کی فرانسیسی تالیف "ہتیاروں کے کارناموں اور شہامت بازی کے متعلق کتاب" حصہ سوم باب ۲۲۔

کا سلوک کیا گیا تھا۔ البتہ ہم کو ایک خاص خصوصیت کا ذکر کر دینا چاہئے جس کا ژوین ڤیل نے تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ مورخ کہتا ہے کہ: "عیسائیوں اور عربوں میں یہ رواج ہے کہ جب بادشاہ یا سلطان مرجائیں تو ان کے بھیجے ہوئے سفیر، چاہے وہ غیر مذہب والے ہوں یا عیسائی، قیدی اور غلام ہوجائیں گے اور چونکہ وہ سلطان جس نے بطریرک کو امن عطا کیا تھا مرچکا ہے اس لیے مذکورہ بطریرک بھی اسی طرح قیدی بن جائیں گے جس طرح ہم[1]" دوسرے الفاظ میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں سفیروں کو تیرھویں صدی میں امن وحفاظت کسی قانونی حق کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ صرف دئے ہوئے قول کے باعث ہوتی تھی۔ اسی لیے اگر وہ حکمران مرجائے جس نے حفاظت کا وعدہ کیا تھا، تو سفیر قیدی بن جاتے[2]

اگرچہ سفیروں کی حفاظت و سلامتی عام طور سے مسلم تھی، لیکن یہی چیز ان کی آزادی کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔

عرصۂ دراز تک سفیر کی آزادی کا مسئلہ اس امر کے گرد گھومتا رہا کہ آیا وہ (مقامی) دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے اختیار سماعت سے بری ہے یا نہیں؟ اور اس بارے میں اتفاق رائے قایم ہونا ممکن نہ ہوا۔ مولفوں کی اکثریت نے تو یہ رائے قبول کرلی کہ انھیں

---

[1] ژوین ڤیل کی فرانسیسی تالیف "سینٹ لوئی کی تاریخ" باب ۱۷

[2] موڈ لاکلاڤینیر کی فرانسیسی تالیف "ماکیاڤیلی کے زمانے کی سفارت کاری" جلد (۲) صفحہ ۴۳ تعلیق نمبر ۳ [ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کا یہی طرز عمل رہا۔ اور بعض مسلمان ممالک میں جہاں یہ رواج تھا، اتفاقاً اور مجبوراً اس کا آغاز ہوا تھا کہ سلطان کی وفات پر سفیر نظر بند ہو جائیں اور نئے سلطان کی تخت نشینی پر نیا امن دے کر ان کو رہا اور بحال کر دیا جائے۔ غلام بنانے کا مسلمانوں کے ہاں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ مترجم]

اختیار سماعت سے بری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس رائے کی بنیاد بظاہر رومی ماہرین قانون پر تھی جن کے خیالات کا اجمالی خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دیوانی معاملات میں سفیروں کو اس مطالبے کا حق ہوگا کہ ان کا مقدمہ ان کے وطن کے حکام عدالت کے سامنے چلے جب کہ بنائے دعویٰ ان معاہدوں سے پیدا ہوئی ہو جو ان کے سفیر بننے سے پہلے عمل میں لائے گئے تھے۔ اور اگر دوران سفارت میں کوئی ذمہ داری لی گئی تھی تو اس کا مقدمہ روما کے حکام عدالت کے سپرد کیا جاتا۔ فوجداری مقدموں میں، اگر جرم کا ارتکاب دوران سفارت میں کیا جاتا تو اس صورت میں بھی روما کی عدالت میں جواب دہی پر مجبور کیا جاتا — لیکن سفیروں سے متعلق قانون روما کے ان احکام کا اطلاق کرنا قرون متوسطہ کے مولفوں کی بڑی سخت غلطی تھی۔ کیونکہ قانون روما میں جن لوگوں کو سفیر کہا جاتا تھا وہ قانون بین الممالک کی اصطلاح "سفیر" سے بالکل مختلف تھے۔ رومی اصطلاح "سفیر" سے مراد سلطنت روما ہی کے کسی صوبے یا شہر کا نائب یا نمایندہ ہوتا تھا جو اپنے صوبے یا شہر کے معاملات کے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لیے اپنے ہی شہنشاہ کے پاس جاتا تھا۔

341

کچھ عرصہ بعد دو نظریے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ سفیر اپنے حکمرانوں کا نمایندہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ سفیر خارجی "بیرونی علاقے میں" ہی ہوتا ہے (مقامی حکومت میں نہیں)۔ ان دونوں نظریوں کے باعث سفیر خارجی کے مراعات و امتیازات کے متعلق مبالغہ آرائی ہونے میں مدد ملی۔ غالباً تاریخی پس منظر کے باعث ان مبالغہ آمیز حقوق و مراعات کو درست بھی ٹھیرایا جا سکتا ہے، کیونکہ مقامی انتظامات ناقص ہونے کے باعث اس کی ضرورت تھی کہ عوام الناس کے فسادوں یا استبداد پسند حکمرانوں کی ہولناک

بے راہ رویوں کے خلاف سفیروں کو ایک مستحکم حفاظت حاصل رہے۔[1]

ہمارے اپنے زمانے میں جو لوگ سفارتی کارندوں کو بہت زیادہ مراعات دینے کے حامی ہیں، وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مراسم (مذہبی) کی انجام دہی کے حق کے علاوہ انھیں جان و مال کی "حفاظت" اور مکمل آزادی حاصل رہنی چاہئے۔ حفاظت سے مراد یہ ہے کہ انھیں مکمل اور پورا امن و سلامتی حاصل ہو اور بطور استحقاق نہایت بیدار مغزی اور نہایت موثر طور سے ان کے بچاؤ کا انتظام عمل میں لایا جائے۔[2] آزادی سے مراد سفیر خارجی کا یہ امتیاز ہے کہ بطور استحقاق اور بطور واقعہ اس پر اس مقام کی عدالت کا اختیار سماعت عاید نہ کیا جائے جہاں وہ سکونت پذیر ہو۔ اور اس پر کسی بھی اجنبی عدالت یا دیگر اقتدار کا عمل دخل نہ ہونے پائے۔[3]

سفارتی کارندے کی آزادی کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ (جہاں اسے بھیجا گیا ہے اس علاقے کے لیے) "وہ بیرونی علاقے میں" ہی ہوتا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق سفیر خارجی کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ گویا اسی علاقے میں مقیم رہتا ہے جہاں سے وہ آیا ہو اور نتیجۃً وہ اس قوم کی سرزمین سے باہر سمجھا جاتا ہے جہاں اسے بھیجا گیا ہو، اگرچہ جسمانی طور پر وہ وہیں رہتا ہے۔

گروتیوس نے صاف صاف تسلیم کیا ہے کہ اس کے خیال میں قوموں نے یہ مناسب خیال کیا ہے کہ ان کے اس عام رواج کو کہ

342

---

[1] پرادی اے فودے رے کی فرانسیسی تالیف "قانون سفارت کی درسی کتاب" جلد (۱)، صفحہ ۲۷۲) تروکیس ژاک ئی کی فرانسیسی تالیف "آرنم سے معاملے میں مشورت" صفحہ ۱۳۴۔

[2] پیرادی اے فودے رے کی مذکورہ تالیف جلد (۲) صفحہ ۱۱۔

[3] ایضاً جلد (۲) صفحہ ۳۹۔

ہر چیز جو کسی دوسرے کی سرزمین پر پائی جائے وہ اسی مقام کے قانون کے تابع سمجھی جائے گی ــــــ اس عام رواج میں ایک استثناء سفیروں کے متعلق پیدا کریں اور اسی طرح ایک مفروضے کے طور پر سفیر ان اشخاص کے قایم مقام سمجھ لیے جاتے ہیں جنھوں نے انھیں روانہ کیا ہو۔ اور نیز ایک مماثل نظریے کے تحت سفیروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس علاقے کے باہر ہیں جہاں وہ بھیجے گئے ہیں۔ انھیں مفروضوں کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے قانون ملک کے اثر سے خارج ہوتے ہیں جہاں وہ آکر رہے ہوں۔ چنانچہ اس کے اصل لاطینی الفاظ میں "مزید برآں اس طرح کے مماثل مفروضے قایم کیے گئے ہیں، گویا کہ علاقے کے باہر ہوں"[1] اس نظریے کو انتہائی حد تک کھینچ تان کر بکثرت ذیلی نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اسی کے باعث وہ محصولوں سے بری ہوتے ہیں اور چنگی سے مستثنیٰ۔ ان کی سکونت گاہ آزاد سمجھی جاتی ہے، جس کے باعث ان کو حق ہوتا ہے کہ کسی اور کو پناہ دے سکیں، بلکہ ان کی سکونت گاہ کے محلے بھی آزاد سمجھے جائیں۔ وہ کوتوالی کے اقتدار سے خارج ہوتے ہیں۔ وہ دیوانی اور فوجداری عدالت کے اختیار سماعت سے پرے رہتے ہیں ــــــ (اس حق کی تائید میں گروتیوس نے ایک نہایت خراب دلیل پیش کی ہے کہ سفیر اصل میں اس حکمران کے، جس کے پاس انھیں بھیجا گیا ہو، ایک مخالف اور دشمن کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں) ــ سفیروں کو اپنے عملے پر اختیار سماعت اور حق نگرانی حاصل ہوتا ہے۔ انھیں اپنے خانگی مذہب پر عمل پیرا رہنے کا حق ہوتا ہے۔ اور انھیں اس کا بھی حق ہوتا ہے کہ عام بازار میں چند دوکانیں

---

[1] گروتیوس کی تالیف "قانون جنگ وصلح" کا فرانسیسی ترجمہ از پرادیے فودے رے کتاب نمبر (۲) باب (۱۸)۔ ف ۴ تعلیق ۸۔

قایم کریں جہاں وہ خاص قسم کا تجارتی سامان فروخت کرسکیں جیسا کہ خاص کر مجریط (میڈرڈ) میں ہوا کرتا تھا۔ ان حقوق میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جن کا سفیروں نے مطالبہ نہ کیا ہو اور جس کی نظریاتی بنیادوں پر تائید کرنے والے نہ پیدا ہو گئے ہوں۔

حقوق سفارت میں مبالغہ آرائی خاص کر سترھویں صدی میں نظر آتی ہے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جس میں سفارت کاری خوب پھلی پھولی۔ اور جہاں تک نظریے کا تعلق ہے وہ گروتیوس کے بعد کا ہے اور گروتیوس نے اس کے متعلق کچھ ایسے اثرات ڈالے جو قابل تشکیک ہیں۔ بنکر شوئیک نے سفیر خارجی کی آزادی کے متعلق بڑا مبالغہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے مکمل ترین آزادی حاصل رہے، اور جہاں تک مقامی اختیار سماعت کا تعلق ہے، سفیر کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ وہ اس مقام پر ہے ہی نہیں جہاں وہ رہتا ہو۔ ابھی تک "علاقے سے باہر ہونے" کی اصطلاح برتنے میں نہیں آئی تھی۔ لارڈ اسٹاول وہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مشہور و معروف فیصلے میں سب سے پہلی دفعہ یہ بیان کیا تھا کہ ایشیائی قوموں کے سماج کے جسد عمومی میں یورپی لوگ داخل نہیں ہوتے بلکہ وہ اجنبی ہی رہتے ہیں بلکہ صاف طور پر یہ کہ وہ اس علاقے میں (جہاں وہ عارضی طور سے گئے ہوئے ہوں) بطور مسافر رہتے ہیں۔ اور واقعے کی حد تک وہ ایک ایسی جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس "علاقے کے باہر" ہو اور مقامی قومیت سے اسے ذرا بھی تعلق نہ پیدا ہو۔[۱]

343

خارجی سفیر ایک زمانے میں مدعی تھے کہ انھیں اپنی سکونت گاہ

[۱] سر ٹراورس ٹوس کا انگریزی مضمون "سرکاری جنگی جہازوں کا اجنبی پانیوں میں بیرون علاقہ حیثیت رکھنا" جو لاہیگزین اینڈ ریڈیو بابت فروری ۱۸۷۶ء میں شایع ہوا۔

میں کسی کو پناہ دینے کا حق حاصل ہے۔ مختلف درباروں میں وہ اس کے بھی مدعی رہے کہ پناہ گزینی کا یہ حق ان محلوں تک بھی وسعت رکھے جو ان کی سکونت گاہ کے اطراف ہوں۔ بعض ممالک میں اس آخرالذکر نکتے کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر لزبن میں، مجریط میں، وینس میں، روما میں، اور شہر فرانکورٹ کنار رائن میں جب کہ شہنشاہ کا انتخاب یا تاجپوشی ہو رہی ہو۔ روما میں کارڈینلوں اور سفیروں کے محل بلکہ خود ہمسایہ مکان اور گلیاں بھی پوپ کی دنیاوی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ بعض پوپوں نے کوشش کی کہ اس بدعنوانی کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ گیارھویں انوسنٹ نے ۱۶۷۶ء میں پوپ منتخب ہونے پر اپنے اس فیصلے کی اطلاع مختلف کیتھولک مذہب رکھنے والے درباروں کو دی۔ مختلف حکمرانوں اور خاص کر فرانس کے بادشاہ نے یہ طے کیا کہ وہ اس کی مخالفت کریں۔

فرانس کا سفیر یعنی ایس ترے کا ڈیوک جب مر گیا تو پوپ نے اس کی تدفین کے فوراً ہی بعد محلۂ فرینس میں جہاں وہ سفیر رہتا تھا، چند پولیس کے جوان بھیجے اور اختیار سماعت کی بعض کارروائیوں کی تعمیل کا نفاذ کروایا۔ لیکن چودھویں لوئی نے لاقاردین کے مارکوئیس کو اپنا سفیر بنا کر روانہ کیا۔ پوپ نے مناسب خیال کیا کہ ایک فرمان شایع کر کے اپنے متعدد پیشروؤں کے چند احکام کی تجدید کرے، جن کے منشا کے تحت محلوں کی آزادی منسوخ قرار دی گئی تھی ورنہ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جات باہر کیے جانے کی سزا مقرر کی گئی۔ فرانسیسی لاقاردین جب روما میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ آٹھ سو مسلح آدمیوں کا ایک حفاظتی بدرقہ بھی تھا۔ مزید برآں پاریس کی پارلیمان نے اس فرمان کو بدعنوانی پر مشتمل اور کالعدم قرار دیا۔

اس کی کارروائی یوں ہوئی کہ ایک درخواست عدالت میں پیش کی گئی اور وکیل سرکار (ایڈ ڈاکیٹ جنرل) تانوں نے اپنی رائے کی تائید کے لیے خاص کر یہ بیان کیا کہ " فرانس کے بادشاہوں کا یہ حق زائل نہیں ہوا ہے کہ وہ روما میں حکمرانی کریں۔"

سفیر کا اپنی سکونت گاہ میں اپنے قومی مذہب پر عمل کرنا — جب کہ اس مذہب پر اس کے سکونتی شہر میں کوئی عمل نہ کرتا ہو — ایک ایسا امر ہے جو بعض مولفوں کی رائے کے مطابق " علاقے کے باہر ہونے" پر مبنی ہے تو بعض دیگر مولفوں کی رائے میں وہ رواج پر مبنی ہے۔ جو بھی ہے، اس طرح کے حق کے متعلق ایک مطالبہ ۱۵۶۵ء میں ہوا۔ یہ مطالبہ انگلستان کی ملکۂ الزابیتھ نے اسپین کے فلپ دوم سے کیا تھا۔

344

جان مان جو گلسٹر کا ڈین تھا اور آکسفورڈ کی مرٹن کارلج کا ماسٹر، اسے ۱۵۶۵ء میں سفیر بنا کر مجریط بھیجا گیا اور جو معاملات طے ہوئے تھے، وہ بعض انگریزی رعایا کے مطالبات پر مشتمل تھے کہ ان انگریزوں کے جہاز بار بار اسپین والے گرفتار کر لیتے تھے جس طرح خود اسپینی جہازوں کو انگریز گرفتار کرتے تھے۔ جان مان کوئی قابل سفارت کار نہ تھا۔ اس میں تدبر اور دانائی کی کمی تھی اور تاریخی نقطۂ نظر سے یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا کیونکہ مجریط (میڈرڈ) میں اس کا قیام ایک ایسے زمانے میں تھا جو خاص کر اہمیت رکھتا تھا۔ یعنی فلانڈرس کی جنگ کی تیاری ہو رہی تھی اور بادشاہ کے عین حاشیے میں وہ ناٹک کھیلا جا رہا تھا جس کے نتیجے کے طور پر ڈون کارلوس کو اپنی موت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

بین الممالک تعلقات میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش ہی نہ آتا اگر اسپین کے بادشاہ فلپ کی نظروں میں انگریزی سفیر جان مان اس عظیم الشان قصور کا مرتکب نہ ہوتا کہ وہ انگلیکن فرقے کا پادری

اور شادی شدہ تھا۔ بڑی مشکل تو اصل میں انگریزی حکومت نے کھڑی کی تھی یعنی آیا اس کے سفیر کو ان حقوق سے محروم تو نہیں کیا جا رہا ہے جو اسپینی سفیر کو لندن میں حاصل تھے کہ سفارت خانے میں اپنے مذہب پر عمل پیرا رہے؟ جان مان کو حکم دیا گیا کہ وہ اس حق کے لیے اصرار کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اسپینی حکومت نے جواب میں تاخیر کی۔ پھر بادشاہ فلپ کے مشیروں نے ایک اولین ملحوظہ پیش کیا کہ بادشاہ یہ سننا نہیں چاہتا کہ کوئی شخص مذہبی آزادی کے حق پر کچھ زبان سے نکالے۔ اور اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ فلپ دوم اپنی جملہ رعایا کی طرح کلیسا کے مقدس احتساب عقائد کا پابند تھا۔ جان مان نے سے لے سو وطور پر یہ استدلال کیا کہ البا کے ڈیوک نے اس بارے میں وعدہ کر رکھا تھا۔ سفیر کو یہ جواب دیا گیا کہ ڈیوک کو دھوکا ہوا تھا اور یہ کہ اسپین کا بادشاہ انگریزی سفیروں کو ان حقوق کے علاوہ کوئی اور حق دینا نہیں چاہتا جو سفیر کے پیشروؤں کو دربار اسپین میں حاصل رہے تھے۔

۲۴ر اپریل ۱۵۶۸ء کو تبادلۂ خیالات ختم ہو گیا اور اسپین کے بادشاہ نے ملکۂ الزابیتھ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے سفیر کو واپس بلا لے۔ اور اسی اثناء میں اس نے فوراً سفیر کو بر ایاس میں نظربند کر دیا۔ فلپ نے جو عذرات بیان کئے تھے وہ یہ تھے کہ جان مان نے بعض شخصیتوں کو ناراض کر دیا ہے۔ اور انگریزی حکومت نے واقعات کی اس تفصیل کو صحیح باور کیا جو میڈرڈ سے ایک انگریز نے لکھ بھیجی تھی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ انگریزی سفیر نے بہت سے لوگوں کو جن میں سے بعض خود اس کے ہموطن بھی تھے، دشمن بنا لیا ہے۔

اصولی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سرکاری طور سے جان مان کا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا گیا۔ اور خبر رسانی

345

کے فرائض خانگی اشخاص انجام دیتے رہے۔ چنانچہ ایک تو اولیفی بیرکینگ یہ کام کرتا رہا جو سابق میں ایک فوجی افسر تھا اور فرانس کا ملازم تھا اور ملازمت کی تلاش میں اسپین گیا ہوا تھا۔ دوسرے رابرٹ ہنگنس یہ کام کرتا رہا۔ یہ ایک انگریز تاجر تھا اور یہ اپنے خطوط انگریزی سفیر فرانس کے توسط سے انگریزی وزیر سیسل کے پاس بھیجتا رہا۔ بالآخر ہنگنس کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن وہ قید سے بھاگ نکلا۔

جن مولفوں نے کم یا زیادہ منضبط طور سے قانون سفارت پر روشنی ڈالی ہے، ان میں بلحاظ قدامت لووی کا مارتن سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کی لاطینی کتاب "سفارت کے متعلق اصولی کلیے" میں انچاس قاعدے بیان ہوئے ہیں، جو حاشیہ نویسوں اور شرح نویسوں سے ماخوذ ہیں[1]۔

گونذرا لتھے دے تھیلا دیے خو نے اپنی لاطینی کتاب "سفارت پر رسالہ" کا دوسرا حصہ حقوق سفارت کے لیے وقف کیا ہے[2]۔ یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کلیسائی ملازموں اور صدر پادریوں کو کوئی دنیادی حکمران سفیر بنا کر بھیج سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب مولف نے اثبات میں دیا ہے۔ اس نے اس امر سے بھی بحث کی ہے کہ سفیروں کی تعداد کیا ہونی چاہیئے؟ ــــ اور اس کی رائے میں تین کافی ہیں ــــ پھر وہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ان کارندوں میں سے اگر کوئی ایک مرجائے تو آیا باقی اپنا فریضہ انجام دے سکتے ہیں یا نہیں؟ عذرات اور قیام مقاموں کے متعلق اس نے قانون روما کے احکام ہی سے استدلال کیا ہے۔

اس مولف نے دو ایسے مسئلوں سے بھی بحث کی ہے جو اٹلی

[1] مارتنس لاؤدنسس (لووی کے مارتن) کی لاطینی تالیف "سفارت کے متعلق اصولی کلیے" رسائل قانون عمومی۔ جلد ۱۹ ورق ۲۱۲ ب۔

[2] گونذرا لتھے دے تھیلا دیے خو کی لاطینی تالیف "سفارت پر رسالہ" رسائل قانون عمومی (۱۳) حصہ دوم ورق ۲۵ ۔

میں پیدا ہوئے تھے یعنی (۱) جو تحفے سفیروں کو دئے جائیں وہ کن کے سمجھے جائیں گے؟ اور (۲) سفیروں کو جو نقصان پہنچے اس کا مواخذہ کس سے کیا جائے گا؟ جہاں تک اختیار سماعت کا تعلق ہے، اس نے قانون روما کے اصول ہی کو اختیار کر لیا ہے، جس کی ہم اوپر تفصیل دے چکے ہیں۔ وہ اس کا قائل ہے کہ سفیر ہر طرح سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور وہ یاد دلاتا ہے کہ سوسے کے ہنری اور ژاں واندریا کے مطابق اگر کوئی سفیر پوپ کے پاس بھیجا جائے اور وہ جات باہر کر دیا جائے تو رواجاً پوپ اس کو پورے دوران سفارت میں اس سزا کے اثر سے باہر رکھتا ہے لیکن اس طور سے کہ جوں ہی سفارت ختم ہو جائے تو جات باہری دوبارہ اپنی اثر اندازی شروع کر دیتی ہے۔

346

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ہمارا مولف قانون عمومی کی سرزمین پر چلا جاتا ہے، اور بتاتا ہے کہ سفیروں کو چننے کے مجاز کون ہیں؟ اس سلسلے میں گونڈزال تھ دے فیلا ویلے تو ان مباحث کا حوالہ دیتا ہے جو قانون مذہبی اور قانون روما کے ماہروں میں اس امر کے متعلق پیدا ہوئے تھے۔ "شہر کے "اتحاد" یا "بڑی اور عام مجلس شوریٰ" کی تشکیل کیسی ہونی چاہئے؟ پوپ چوتھے انوسنٹ نے شہر کے ایسے "اتحاد" میں چالیس سال سے زیادہ عمر رکھنے والے تمام شہریوں کو، خواہ مرد ہوں یا عورت، داخل کیا تھا[1] لیکن دوسرے مولفوں نے عورتوں کو اس سے خارج رکھا اور اس میں خاص کر بارتولے کی رائے کے مطابق صرف ایسے مرد شہری داخل سمجھے گئے جن کی عمر پچیس سال سے زیادہ ہو۔

بدقسمتی سے تمینین ڈولے نے ایک لاطینی کتاب تالیف

---

[1] پوپ چوتھے اِنوسنٹ کی لاطینی تالیف "احکام مذہبی کا خلاصہ پانچ جلدوں میں" کتاب (۵) عنوان (۳۲)، باب (۱۱)۔

کی تھی جس کا نام "ایک کتاب پیام رساں کے جیسے عام طور پر سفیر کہتے ہیں، فرایض کے متعلق ایک اور کتاب پیام رسانوں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق ہے، نیز دیگر ایک جو لی موسین کے اسقف ژاں لانژاکی کی سفارتوں سے متعلق" تھا۔ یہ کتاب نادرالوجود ہے۔ ہم خود اسے دیکھ نہ سکے۔ ڈولے کے سوانح نگار اس کتاب کے متعلق بعض باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ ایسے ایک سوانح نگار نے تذکرہ کیا ہے کہ اس کتاب کا تیسرا حصہ ژاں دوبے لے نامی اسقف اور لانژے کے جاگیردار کی سفارتوں کے متعلق ہے اور یہ کہ یہ حصہ سُداسی (ہکسا میٹر) نظم میں ہے۔ مولف نے یہ چھوٹی سی نظم فنیس کے اثنائے قیام میں لکھی لیکن جب اس نے اسے ۱۵۴۱ء میں شایع کیا تو اس میں بعض ترمیمیں کیں اور اس کے شروع میں دو رسالے نثر میں لکھ کر بڑھا دیے[1]۔ ایک اور سوانح نگار نے بیان کیا ہے کہ ڈولے کی کتاب میں چالاکی اور مکاری کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں اس نے سفیروں کو مشورہ دیا تھا کہ ایسے نوکروں کو ملازم رکھیں جو کم گو ہوں، ایسے جاسوسوں سے کام لیں جو چوکس رہتے ہوں، اور ہر قسم کی فرضی باتیں چلتی کریں خاص کر دربار روما یا اطالوی حکمرانوں سے گفت و شنید کرتے وقت[2]۔

ژول فرقی نے جو لاطینی تالیف "سفیروں کے متعلق رسالہ، اصول سفارت کے مطابق، ان کا اعتماد اور ان کا فریضہ" لکھی تھی اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ایک اور لاطینی رسالہ "حکمران بادشاہوں، قوموں اور شہروں کے سفیر" ہے، جو پیئیر ژبوف کی لاطینی

---

[1] فرانسیسی تالیف "اِتیئین ڈولے کی سوانح عمری جو سولھویں صدی میں شہر لیوں میں ایک مطبع کا مالک تھا" مطبوعہ پارس ۱۸۷۷ء صفحہ ۱۱۴۔

[2] نیبرارٹی کی فرانسیسی تالیف "حکمت کے ضروری ہونے کی تاریخ" صفحہ ۲۹۶۔

تالیف "متفرق رسائل" کے آخر میں پایا جاتا ہے لیکن یہ اصل میں لودی کے مارٹن کی لفظ بہ لفظ نقل پر مشتمل ہے۔

کونارڈ براؤن کی لاطینی تالیف "سفارتوں پر پانچ کتابیں" ایک ضخیم کتاب ہے لیکن اسے کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں۔ یہ شخص آوگسبورگ کا صدر پادری تھا اور اسے اس کا تک پتا نہ تھا کہ سفیر کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اور وہ اس حیثیت سے بحث نہیں کرتا کہ سفیر کسی مقتدرِ اعلیٰ کا بھیجا ہوا ہو۔ اپنی الجھی ہوئی بحثوں میں وہ صرف عام اصولی باتوں پر اکتفا کرتا ہے۔ ایک نکتے پر اس کی رائے دلچسپی کی حامل ہے۔ چنانچہ وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جو سفیر اپنا فریضہ دیانت داری سے انجام دیں وہ ہر قسم کی داروگیر سے محفوظ رہیں۔

347

اوکتاڤیاں ماجی نے ۱۵۶۶ء میں "سفیروں کے متعلق" نامی ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس میں وہ یہ رائے دیتا ہے کہ سفیر کے خلاف دیوانی یا فوجداری کارروائی صرف اس کی واپسی کے بعد ہو سکے گی۔ [1]

پییئیر آیرو نے قانونِ سفارت کا ذکر اپنی ایک فرانسیسی تالیف میں کیا ہے جس کا نام "طریقہ، مراسم اور عدالتی ہدایتیں جو قدیم یونانی اور رومی، عمومی الزام دہی میں، ملحوظ رکھتے تھے (بجز اس کے کہ تعمیل کا نفاذ شروع ہو چکا ہو) اور ان کا مقابلہ ہمارے فرانس کے اسلوب اور رواج سے" تھا۔ یہ تالیف پہلی مرتبہ ۱۵۷۵ء میں چھپی۔ بعد میں خود مولف نے اس کے ضخیم تر ایڈیشن مرتب کیے۔ پییئیر آیرو کا دماغ سلجھا ہوا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے

---

[1] کا تیلانی کا مضمون "آوتاڤیا نو ماجی" جو فرانسیسی رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۱۵) میں چھپا۔ دیکھیے صفحہ ۱۴۰۔

اس نے اس موضوع کو ان التباسوں اور الجھنوں سے نکال لیا جن میں اس کے پیشرووں نے اسے لاڈالا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "بنا بر آں بیجا بحث آرائی نہ کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ نہ تو "حکمرانوں کے نمایندے" ہیں (کیونکہ ان پر ان کے اپنے قنصل یا پریٹر یعنی حاکم عدالت کے سامنے مقدمہ چلایا جاسکتا ہے)، نہ ہی وہ "صوبوں کے نمایندے" ہیں جن کا ہم نے یہاں تفصیل سے ذکر کیا۔ (کیونکہ وہ بھی ویسے ہی رعیت یا شہری ہیں جیسے دیگر لوگ)۔ بلکہ اصل میں یہ "حریفوں یا حلیفوں کے نمایندے" ہیں، جن کو ہم فرانس میں خاص کر ہتیار بند نقیب یا سفیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں"۔ جب جگہ تیار ہو گئی تو مولف نے اس مسئلے سے بحث کی ہے کہ آیا سفیر، دار و گیر سے محفوظ رہتا ہے؟ اور اس محفوظیت کے نتیجے کے طور پر یہ امر بھی کہ وہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے اختیار سماعت سے آزاد رہتا ہے یا نہیں۔

اس کا جواب اس نے اثبات میں دیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ:

"چونکہ تمام لوگوں میں ایک قرابت اور خونی رشتہ پایا جاتا ہے، اور یہ چیز انسانوں میں دیگر تمام وحشی جانوروں کی نسل سے کہیں زیادہ مستحکم ہوتی ہے، اس لیے یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہماری دشمنیاں کبھی ختم ہی نہ ہوں! چاہیے تو یہ کہ ہم بعض اوقات مصالحت بھی کرلیں جس طرح رشتہ دار اور ہم شہری کیا کرتے ہیں۔ اور جس وقت ہم ایسا کرنا چاہیں تو چونکہ ناگزیر ہر چیز میں ایک تبدیلی اور انقلاب ہو جاتا ہے، اس لیے نتیجۃً صلح اور جنگ کے متعلق بھی ایسا ہی ہوگا۔ اور اکثر جبراً و قہراً ہمیں ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ بناء بر آں ایسا کرنے کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ لوگ جو فوجوں اور آگ و خون میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں، وہ ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کے پاس آیا اور جایا کریں تاکہ معاہدہ عمل میں آئے اور صلح کا انتظام ہو سکے۔ اور ایسے لوگوں کو پوری حفاظت اور اس سے مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہیے

348

کہ نہ تو کوئی انھیں چھو سکے اور نہ ان پر زیادتی کر سکے حتیٰ کہ مقدس ومحترم دیوتا بھی انھیں آزار نہ پہنچا سکیں۔ ورنہ یہ خطرناک فریضہ انجام دینے کی کون ہامی بھرے گا؟" گویا ایرؤو کی رائے میں اجنبی سفیروں کے خلاف کسی قسم کی عدالتی کارروائی کا نفاذ یا آغاز نہیں کرایا جاسکتا حتیٰ کہ "انھوں نے جس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کے لئے ملک عدالت سے چارہ جوئی" نہیں کی جاسکتی۔ ایک اور دلیل جو اس نے پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ سفیر اپنے حکمران کی ذات کا نمایندہ ہوتا ہے اور حکمران کی ذات "مقدس ہوتی ہے" اور وہ بحث کرتا ہے کہ "اگر تم سزا دینی چاہو تو تم حکمران کو صرف اس طور سے سزا دے سکتے ہو کہ اس کے کارندے کی ذات پر اس کا نفاذ عمل میں آئے جو اپنی اس حیثیت میں کسی بھی ناجائز فعل کا مرتکب نہ ہوا ہوگا اور اگر ہوا بھی ہو تو وہ قوانین کے تحت بری الذمہ ہے اور اس کو کوئی شخص نہ تو سزا دے سکتا ہے نہ اس پر کوئی مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور نہ اسے کسی حاکم عدالت کے سامنے لایا جاسکتا ہے بجز خود اس کی اپنی ذات کے۔" ایک نئی چیز وہ غور کے لیے یہ پیش کرتا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ سفیر ہمارے پاس صرف اس لیے رہتا ہے کہ اپنے فرائض منصبی انجام دے اور بہر حال تمام دیگر کارروائیوں میں جن سے اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو اس کے متعلق یہ تصور اور فرض کر لیا جائے گا کہ وہ غیر موجود ہے۔ وہ (ہمارے ملک میں) وصیت کر سکتا ہے۔ لوگ اس کے وارث بن سکتے ہیں جو کسی اجنبی کے لیے ممکن نہیں۔ نہ وہ آزاد ہوتا ہے۔ جنگ چھڑے تو وہ ملک کو واپس ہو جاتا ہے اور یہ اپنے ذاتی حق کے باعث نہ کہ حق بازگشت اسیر کے سلسلے میں۔ اسی لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی جرم کی صورت میں اس کے خلاف مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ غیر موجود ہوتا اور ایسا ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ مزید برآں

ایرو یہ بیان کرتا ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سفیر دار و گیر سے محفوظ نہیں ہوتا ہے اور کسی جرم کی بنا پر اس کے خلاف استغاثہ کیا جاسکتا ہے تو اس سے ہر قسم کی برائیوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اگر اجنبی سفیر کے خلاف گواہ فراہم کرنے اور حکام عدالت مہیا کرنے کی سہولت حاصل ہو تو سفیروں کے متعلق لوگ کیا کچھ نہ الزامات لگایا کریں گے! جو سفیر جتنا زیادہ "کارگزار اور سمجھدار ہو" اتنا ہی زیادہ وہ الزاموں کا ہدف ہوگا۔ کیونکہ اس کا دشمن یہی چاہے گا کہ اس کا قصہ پاک ہو جائے[1]۔ ایرو نے جس خیال کی تائید کی تھی اس کا ایک اور حامی ۱۶۱۶ء میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انتوان ڈمور ناک نے یہ رائے دی کہ سفیر کچھ اتنا زیادہ قانون بین الممالک کی حفاظت میں ہوتے ہیں کہ انھیں اس امر پر کوئی شخص نہیں مجبور کر سکتا کہ وہ خود یا ان کے لوگ عدالت میں آکر جوابدہی کریں، معاملہ خواہ دیوانی ہو یا فوجداری[2]۔

349

۱۵۷۹ء میں ایک اور لاطینی تالیف شایع ہوئی یعنی "سفیر یا حقوق و امتیازات سفارت، سفراء اور ان کے فرایض منصبی کی انجام دہی پر ایک چھوٹی سی کتاب جو ڈائجسٹ اور کوڈ پر مبنی ہے۔ اس کو فلپ اور التو وائی کونٹ شیفرنو، فرانس کے نائب قنصل کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا مولف لفائیے ہے جو عدالت اعلیٰ میں وکیل بھی ہے" تما پبلکس ڈلاتوت لفائیے کی یہ تالیف بہت مختصر ہے۔ اس میں (۴۳) صفحے ہیں اور بارہ بابوں میں سفیروں کی جسمانی اور دماغی

---

[1] ایرو کی فرانسیسی تالیف "طریقۂ مراسم اور عدالتی ہدایتیں" کتاب اول حصۂ چہارم ۱۲ صفحہ ۱۷ و مابعد۔

[2] ڈمورناک کی لاطینی تالیف "ڈائجسٹ کے متعلق چند ملاحظات" باب چارہ جوئی کا نون (۲) ف (۳)۔

صلاحیتوں، ان کے عہدے، ان کے عملے اور وطن کو ان کی واپسی کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ مولف نے (لاطینی میں) بیان کیا ہے کہ سفیر" دشمن کے ہتھیاروں تلے محترم اور محفوظ" رہتے ہیں۔ اپنی تالیف کے آغاز میں اس نے بیان کر دیا ہے کہ وہ سفیروں کی تاریخ لکھنی نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ (لاطینی میں): "سفیر اولاً یا زیادہ تر اسی وقت وجود میں آئے جب پانڈورا نے ہر قسم کی برائیوں کے بیج اس دنیا میں، جو زرخیز اور خوب قابل زراعت زمین تھی پھینک دیئے۔"

شارل ڈی گوں نے ایک فرانسیسی کتاب تالیف کی اس کا نام "فرانس کے حکومتی اور عدالتی حالات اور عہدوں پر مقالہ جس میں مختصر طور سے اس سے بحث کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو کیا اقتدار حاصل ہوتا ہے، کن پر اختیار سماعت چلتا ہے اور ان کے مخصوص فرائض کی کیا نوعیت ہے؟" تھا۔ اس کتاب میں متعدد صفحے قانون سفارت کے متعلق ہیں۔ اس مولف نے چونکہ قانونی نقطۂ نظر سے کوئی بحث نہیں کی ہے، اس لیے ہم اسے بالکل نظر انداز کر دیتے اگر اس میں چند ایسے خیالات نہ ہوتے جو قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔

ڈی گوں نے بیان کیا ہے کہ: "انصاف کے اثرات سلطنت کی عمومی حالت کے تحفظ تک وسعت اختیار کرتے ہیں۔ اس غرض کے لیے (مرکز میں) نیز سرحدی صوبوں میں جلالت مآب کے گورنر اور نائب مامور و مقرر ہوتے ہیں تاکہ، اور امور کے علاوہ، اس امر پر نظر رکھیں کہ وہ اجنبی حکمران جو ان کے زیر انتظام و نگرانی صوبوں کے ہمسایہ ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ اور اس کا سد باب کریں کہ وہ اجنبی حکمران ان صوبوں کے متعلق کوئی سازش یا مہم اختیار نہ کریں۔ اور بادشاہ کو عادت ہے کہ مختلف بادشاہوں اور بڑے ہمسایہ حکمرانوں کے پاس

350

جن سے اس کی اچھی صلح، دوستی، حلیفی اور پیمان ہو، سفیر بھیجا کرے اور ان کے پاس ان سفیروں کو متعین کرے۔ اس غرض کے لیے ایسی شخصیتوں کا انتخاب اور چناؤ کرنا ہوتا ہے جو مطلوبہ صفات رکھتے اور کفایت مہیا کرتے ہوں۔ اور ایسے لوگ ہوں جو سمجھ اور تجربہ رکھتے ہوں تاکہ مذکورہ حکمرانوں سے وہ اچھی طرح برتاؤ رکھ سکیں اور تسویے کرا سکیں۔ جن حکمرانوں کے پاس انھیں بھیجا جاتا ہے ان کا دل موہ لینے کے لیے معاملات کی حالت اور نوعیت کا لحاظ رکھنا اور بادشاہوں کی خدمت میں رہنے کا سلیقہ رکھنا ہوتا ہے"۔ لی گون کی رائے کے مطابق سفیروں کو چاہیے کہ حکمرانوں کے مابین صلح و آشتی برقرار رکھنے کے لیے کوشش کریں۔ اور ایسے اقدامات کا سد باب کریں جن سے دوستی میں خلل پڑ سکتا ہو اور اپنے بادشاہ کو ہر ایسی چیز سے باخبر رکھیں جو پیش آئے۔

مولف نے یہ بھی یاد دلایا ہے کہ "اس کا رواج ہے کہ مجلس شورائے مملکت کے ارکان یا دیگر بڑی شخصیتوں ہی کے سپرد اکثر سفارتی فرائض کر کے انھیں نمایندہ بنا کر بھیجا جائے"۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اجنبی حکمران بھی اپنی نوبت پر فرانس کے بادشاہ کے پاس مقیم (سفیر) بھیجتے رہے ہیں۔ یہ مقیم" عام طور پر تین سال رہتے ہیں اور جب ان کی مدت پوری ہو جائے تو ان کی جگہ دوسروں کو بھیجا جاتا ہے اور پرانے مقیم اپنی واپسی سے پہلے نئے آنے والوں کو ہدایتیں دیتے ہیں۔ اور خاص کر یہ بتاتے ہیں کہ سب سے آخر میں کیا غلطیاں ہوئی ہیں، اور ان کے ذمے کے کام کی کیا حالت ہے؟"

بالتازار دے آیالا نے "جنگ کے قواعد و قوانین اور فوجی ضبط" کے نام سے ایک لاطینی کتاب تالیف کی تھی۔ اس میں وہ سفیروں کے متعلق محض ضمناً بحث کرتا ہے۔ چنانچہ کتاب اول کے نویں باب میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن صرف اس نقطۂ نظر سے کہ جنگ کے زمانے میں کن کو سفیر بنایا جاتا ہے؟

آلبیری گس جنتی لیس کی کتاب اپنے زمانے کی اس موضوع پر سب سے اہم چیز ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق اختلاف رہا ہے۔ اس کی تعریف اور تنقیص دونوں میں مبالغہ آرائی ہوئی ہے اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آکسفرڈ کے اس ممتاز پروفیسر کی کتاب اگر ایک شاہکار نہ بھی سمجھی جائے، تو کم از کم وہ ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر شایع ہونے والی سب سے پہلی کتاب ہے جس میں ایک ترتیب اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی لاطینی تالیف "سفیروں کے متعلق تین کتابیں" ۱۵۸۵ء میں شائع ہوئی اور اس میں (۱۴۶) صفحے ہیں۔

پہلی کتاب میں بیس باب ہیں۔ شروع میں جنتی لیس سفارت کی مختلف نوعیتوں کا ذکر کرتا ہے۔ پہلی تقسیم ان اشخاص کے لحاظ سے ہے جو سفارت روانہ کرتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ فہرست یوں بیان کرتا ہے کہ اولاً کسی آزاد مملکت یا آزاد حکمران کی سفارت کسی آزاد مملکت یا آزاد حکمران کے ہاں۔ دوسرے کسی غیر آزاد مملکت یا غیر آزاد حکمران کی سفارت کسی غیر آزاد مملکت یا غیر آزاد حکمران کے ہاں۔ اور آخر میں مخلوط سفارت یا دوسرے الفاظ میں ایسی سفارت جو کسی غیر آزاد مملکت یا غیر آزاد حکمران کی طرف سے کسی آزاد مملکت یا آزاد حکمران کے ہاں، یا اس کے برعکس۔ ایک دوسرا امتیاز مقصد سفارت کی بناء پر قایم کیا گیا تھا۔ چنانچہ سفارت کے پیش نظر اگر کوئی مفاد عام ہو تو وہ عمومی سفارت ہوگی۔ اسی طرح سفارت کا مقصد اگر خصوصی یا خانگی مفاد ہو، تو یہ "آزاد سفارت" ہوگی۔ (یہ اصل میں قانون روما کی "آزاد سفارت" سے ماخوذ ہے)۔ اور آخر میں وہ سفارت ہے جس کے پیش نظر صلح یا جنگ ہو۔

جنتی لیس نے مستقل سفیروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جو تعریف دی ہے وہ (لاطینی میں) یوں ہے: "عارضی یا موقتی سفیروں

351

سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو کسی معین اور مخصوص کام کے لئے نہ بھیجے گئے ہوں بلکہ کسی معین یا غیر معین وقت تک کے لیے روانہ کیے گئے ہوں تاکہ جب تک وہ سفارت میں رہیں، تمام پیش آنے والے متعلقہ امور کی نسبت گفت و شنید کر سکیں۔"

پھر وہ سفارت کے مراسم اور ارکان مجلس خارجہ وغیرہ سے بحث کرتا ہے۔ یہ ہوبہو قانونِ روما نظر آتا ہے۔ مولف نے قانونِ سفارت کے آغاز سے بھی بحث کی ہے۔ لیکن اس بارے میں وہ کوئی نئی چیز نہیں پیش کرتا۔

دوسری کتاب میں (۲۳) باب ہیں۔ مولف جنتی لیس نے اس احترام کو خاص زور سے بیان کیا ہے جو قدیم زمانے میں سفیروں کے لیے ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ پھر وہ بیان کرتا ہے کہ سفیر صرف ان لوگوں کے لیے سفیر کی حیثیت رکھتا ہے جن کے پاس اسے بھیجا گیا ہو اور یہ کہ دوسرے ملکوں میں اس کو سفارتی حقوق بالکل حاصل نہیں ہوں گے۔ کوئی حکمران سفیروں کو آنے دینے سے انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اسے اس انکار کی کوئی وجہ رکھنی چاہیے۔ جنتی لیس نے مختلف مفروضے قایم کیے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی دوسروں کے سفیر پر ہاتھ چلائے گا تو اسے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ اس کے اپنے سفیروں کا بھی احترام کیا جائے گا۔ باغیوں کو حقوق سفارت حاصل نہیں ہیں۔ یہی حال بحری قزاقوں اور ڈاکوؤں کا بھی ہے۔ گیارھویں باب میں مولف نے ایک دلچسپ مسئلے سے بحث کی ہے کہ آیا جات باہر ہوئے ہوئے لوگوں کو سفارت کا حق حاصل ہے؟ یہ معاملہ تھےکیس والوں کے سلسلے میں پیش آیا تھا، جنھیں پوپ دوسرے یولیوس نے جات باہر کر دیا تھا اور پھر بھی انھوں نے عیسائی مملکتوں کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات برقرار رکھے تھے۔ اس مسئلے کا حل بصورتِ اثبات کرنے کے لیے اس امر سے بھی استدلال کیا

جاسکتا ہے کہ رومن کیتھولک حکمران، پروٹسٹنٹ حکمرانوں سے، تعلقات باقی رکھتے ہیں۔ اس بحث سے جنتی لیس کے جواب کا بھانپ لینا ممکن ہے کیونکہ جنتی لیس خود پروٹسٹنٹ مذہب کا تھا۔ اُس مولف نے اس سوال کا بھی اثبات میں جواب دیا ہے کہ آیا ترکوں سے تعلقات رکھنے کی اجازت ہے، اور وہ کہتا ہے کہ تمام مذہبی اختلافات کے باوجود حق سفارت قائم رہتا ہے۔

تیرھویں اور اس کے بعد کے بابوں میں مولف نے ایسے سفیروں کی قانونی حیثیت سے بحث کی ہے جو کسی حکمران کے پاس آتے ہیں۔ یہ ہر داروگیر سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اور جنگ بھی چھڑ جائے تو ان کا احترام کیا جانا چاہئے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس بارے میں جنتی لیس کی رائے کچھ قطعی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک خصوصی صورت میں، یعنی اس وقت جب سفیر اس حکمران ہی کے خلاف سازش کرے جس کے پاس اسے بھیجا گیا ہو، تو اس کے متعلق جنتی لیس کی رائے ہے کہ "جولیس سیزر کے شاہی قانون" کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا کیونکہ سفیر کی موت مقصد سے متجاوز ہوگی۔ اس کا مروانا بالکل ضروری نہیں اور صرف یہ کافی ہے کہ مرتکب جرم کارندے کو اس کے آقا کے پاس واپس بھیجدیا جائے۔ 352

اس سے ایک سال پہلے انگلستان میں ایک شہرۂ آفاق واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ کھٹور نے اس کا ان چند الفاظ میں ذکر کیا ہے:

ڈون برنارڈین دے مینڈوزا کو اسپین کی طرف سے ملکۂ الزابتھ کے ہاں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہ مسلسل ملکہ کی ذات اور اس کی مملکت کے خلاف سازشیں کرتا رہا......... اس نے اس سازش میں بھی حصہ لیا تھا جو تھروگ مارٹن نے ملکہ کی جان لینے کے لئے کی تھی۔ اور اس سفیر نے ایسی متعدد سازشوں کی قیادت کی تھی جو نہایت خطرناک تھیں۔ مجلس وزراء نے اسے طلب کیا اور اس کے طرز عمل پر خوب تلخ و ترش لعنت ملامت کی۔ اور اس سے

کہا کہ وہ جلد سے جلد اس ملک سے روانہ ہو جائے۔ اور چونکہ اس بارے میں اس نے کوئی مستعدی نہیں دکھائی اس لیے اسے کپتان ہاکنس کے جہاز پر سوار کرا دیا گیا جس میں اسے خارج البلد کر کے شہر کالے پہنچا دیا گیا۔[1] اس معاملے میں انگریزی حکومت نے البیری کس جنتی لیس سے بھی مشورہ کیا تھا۔ اور جان ہاٹ من سے بھی۔ آخرالذکر شخص نے "سفیر کا فریضہ اور رتبہ" نامی کتاب تالیف کی تھی اور جامعۂ آکسفرڈ میں وہ بھی اسی دن مامور ہوا تھا جس دن جنتی لیس۔ جنتی لیس اور ہاٹ من نے یہ مشورہ دیا کہ سفیر کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے اس کے حکمران کے ہاں واپس کر دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ جنتی لیس نے اپنی تالیف میں اس مسئلے پر جو رائے دی ہے، وہ اصل میں اسی رائے کی توثیق ہے جو اس نے ایک اہم اور سنجیدہ عملی موقع پر دی تھی۔

جنتی لیس کی تالیف کی تیسری کتاب میں بائیس باب ہیں اور اس میں زیادہ تر ان اخلاقی، ذہنی اور جسمی صفات کا ذکر ہے جو کسی اچھے سفیر میں پائے جانے چاہییں۔ جنتی لیس کی رائے میں سفیر کو دنیاوی مال و دولت بھی حاصل ہونا چاہیئے اور عطایائے فطری سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیئے۔ وہ سنجیدہ علوم و فنون سے واقف ہو، اگرچہ بڑا علم اس کے لیے بیکار ہوگا۔ سفیر کی زبان چلتی ہوئی ہونی چاہیئے۔ اسے اس ملک کی زبان کا ایک حد تک علم ہو جہاں اسے بھیجا گیا ہو۔ اسے علم تاریخ اور خاص کر "فلسفے کے اس حصے سے جو اخلاق اور حکمرانی سے بحث کرتا ہے" واقفیت ہونی چاہیئے۔ ایک اہم اور قابل ذکر صفحے میں جنتی لیس نے ماکیاویلی کو سراہا ہے جسے سولھویں صدی کے اواخر میں اس قدر لتھاڑا جاتا رہا ہے۔ اور

[1] وکفوور کی فرانسیسی تالیف "سفیروں کے متعلق یادداشتیں" صـ ۱۴۱۔

جسٹی نین نے ماکیا ویلی کی تالیفوں کی تائید کی ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ عمومیت کا قصیدہ گو اور زبردست محافظ تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "ماکیاویلی ظلم و ستم سے نفرت کرتا تھا۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ظالموں کی تجاویز اور اسرار کی پردہ دری کرے، نہ یہ کہ کسی شخص کو تربیت دے کر ظالم بنائے"۔

یہاں اس کا ذکر کرنا ہمارے لیے ضروری ہے کہ بڑے انگریز عہدہ دار کیا کرتے رہے۔ کسی دور میں ماہرین قانون کا اتنا اثر نہیں پڑا جتنا قرون متوسطہ میں۔ یہ ہر جگہ نمایاں ہے لیکن انگلستان میں خاص کر جہاں کے موجودہ ادارے انھیں مستحکم بنیادوں میں ٹکے ہوئے ہیں، جن کو اہل قانون نے قائم کیا تھا۔ انگلستان میں سیاسی نقطۂ نظر سے قانون روما کے عناصر کا قابل لحاظ اثر پڑا ہے۔

بارھویں صدی کے وسط میں جب اسٹی فین بادشاہ تھا تو کنٹربری کے آرک بشپ تھیوبالڈ کے مشورے سے ویکاریوس نامی شخص کو آکسفرڈ میں قانون روما کی تعلیم دینے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ اس گزرے ہوئے زمانے ہی سے ایسے متعدد مولف نظر آتے ہیں جو قانون روما سے آگاہی رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں سالسبری کے جان کی تالیفوں "پولی کراتیک" اور "خطوط" کا نام لیا جا سکتا ہے نیز پیٹر ڈبلوا کی تالیفوں کا جو لندن کا آرک ڈیکن اور والٹر ہیوبرٹ کا قرین تھا۔ ٹامس بکٹ نے قانون کی تعلیم اٹلی کے شہر بولونیا میں پائی تھی۔ گلان ویل کے رانلف نے، براکٹن نے اور "فلیٹا" نامی کتاب کے مولف نے بھی جسٹی نین کی قانونی کتابوں سے اثرات قبول کیے تھے۔ مزید برآں قانون روما کے اصول اور ضوابط مختلف عدالتوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عدالتہائے چانسلری، عدالت ہائے جامعات، عدالت سرحیئل قصر شاہی، عدالت سپہ سالار (مارشل) اور عدالت امارت بحریہ میں۔

353

انگریزی افسران سرکاری نے بھی قانون بین الممالک کے متعلق تعاون میں حصہ لیا ہے۔ ان کے پاس جو معاملے پیش ہوتے تھے ان کی وہ علمی طور سے جانچ کرتے تھے۔ حکومت بھی قانونی آبیاری و ترقی سے دلچسپی رکھتی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آٹھواں ہنری یہ تک ارادہ کر چکا تھا کہ قانون بین الممالک و سفارت کاری کے لیے ایک مدرسہ قایم کرے۔ ٹامس ڈینٹن، نکولاس بیکن اور رابرٹ کیری نے یہ تجویز مرتب کی تھی۔ اور اس مدرسے میں لاطینی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم بھی شامل کی جانے والی تھی۔[1]

سفارت کارانہ تعلقات کے نقطۂ نظر سے قانون روما میں جو فائدہ تھا، اس کی توثیق چھٹے ایڈورڈ کے دور حکومت میں سمرسٹ کے ڈیوک نے کی ہے، جو محافظ مملکت کے عہدے پر فائز تھا۔ چنانچہ اس نے بشپ رڈلے کے نام ایک خط لکھ کر بیان کیا تھا کہ وہ (یعنی بشپ) حقیقت میں نہیں جانتا کہ قانون روما کی تعلیم اجنبیوں سے معاہدات کی گفت و شنید کے لیے کس قدر ضروری ہے[2]؟ بات یہ ہوئی تھی کہ بشپ مذکور کو جامعۂ کیمبرج کا معائنہ کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ اور اس نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دینیات کے خرچ پر قانون روما کی طرف توجہ کو وہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا۔ فرانسس بیکن کو بھی یہی شہادت دینی پڑی تھی۔ چنانچہ اس نے بکنگھام کے ہونے والے ڈیوک کو خط لکھا تھا اور اسے وزیر اعظم کے فرایض یاد دلائے تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ "اگرچہ میں خود انگلستان کے قانون غیر موضوعہ کی تعلیم دیتا ہوں لیکن میں چونکہ اپنے ملک کا ایک سچا اور مخلص دوست ہوں اس لیے میں آپ کو سنجیدگی کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ ان لوگوں کی

354

[1] دیکھئے اوپر اصل کتاب کا صفحہ ( ) ۔

[2] سر رابرٹ فلی مور کی انگریزی تالیف "قانون بین الممالک کی تشریحیں" طباعت اول کا دیباچہ صفحہ ۵ و مابعد۔

حوصلہ افزائی کریں جو قانون روما کی تعلیم دیتے ہیں ورنہ اگر ہمیں فرانس یا کسی اور اجنبی مملکت سے کوئی معاملہ پیش آئے تو عالم فاضل ماہرین قانونِ (روما) کے نہ ہونے سے بہت بڑی بے بسی سے سامنا ہوگا۔"

یہ یاد دلانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس انجمن نے کیا خدمات انجام دیے جو لنڈن میں قائم ہوئی تھی اور جس میں وہ لوگ شریک تھے جو قانون مذہبی یا قانونِ روما کی بطور وکیل پریکٹس کرتے تھے یا ان عدالتوں میں بطور حاکم نشست کیا کرتے تھے جہاں قانونِ مذہبی یا قانونِ روما میں سے کوئی ایک نافذ کرایا جاتا تھا۔[1]

اگر "سرکاری کاغذات کی تقویم" نامی انگریزی کتاب کی جلدوں[2] کی کوئی شخص ورق گردانی کرے تو نظر آئے گا کہ جس زمانے میں قانون بین الممالک نے بڑی بڑی ترقیاں کیں، اس سے پہلے ہی انگریزی حکومت نے اس بات کی ضرورت کو پہچان لیا تھا کہ بین الممالک معاملات سے متعلق قانونی نقطۂ نظر سے بحث کرنے والی کتابوں اور تالیفوں کو مہیا کرایا جائے۔ اور آدمی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ انگریزی حکومت اپنے عہدہ داروں میں سے ہر ایک کی صلاحیتوں سے کس قدر ٹھیک ٹھیک فایدہ اٹھاتی تھی۔ ان عہدہ داروں نے جو یادداشتیں مرتب کی ہیں، ان میں سے چند واقعی علمی مقالوں سے مشابہ ہیں۔ مثال کے طور پر قالتائن ڈیل نے ان قدیم اور جدید جنگوں کے مسئلے پر جو ناجائز طور سے اور بے وجہ شروع کی گئی تھیں سوال کئے جانے پر جو جواب مرتب کیا تھا۔ بعض دوسری یادداشتیں بھی بالکل علمی حیثیت

---

[1] دیکھیے اوپر اصل کتاب کا صفحہ 262۔

[2] "سرکاری کاغذات کی تقویم" نامی انگریزی کتاب جو الزابتھ کے دورِ حکومت میں سے ۱۵۸۱ء تا ۱۵۹۰ء کے متعلق گھریلو واقعات پر مشتمل ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲۵۱۔

رکھتی تھیں۔ چنانچہ بحری قزاقوں کو مدد دینے والے لوگوں کے متعلق سوال پر جو رائے دی گئی تھی اس کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے[1]۔ چند ایسی یادداشتیں بھی ہیں جو واقعات و حقائق کے متعلق آتش شوق کو فروزاں کرنے والی دلچسپی کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر وہ تنقید جو قانون روا کے اس فاضل ماہر نے لارڈ برگلے کی خواہش پر اس کتاب پر کی تھی جس میں ڈون انٹونیو نے یہ بتایا تھا کہ وہ تخت پرتگال کا حقدار ہے اور فلپ دوم ان حقوق سے انکار کرتا تھا[2]۔ چنانچہ لارڈ برگلے کو جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر ڈیل نے بارتولے کی لاطینی تالیف "متعلق مراتب" پر ایک نوٹ کا اضافہ کیا تھا جو اس امر کے متعلق تھا کہ کوئی حکمران اپنی سرزمین کے باہر ہو تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

وہ معاملات جن کے متعلق مشاورت عمل میں لائی گئی تھی ان میں سے بعض شہرۂ آفاق ہیں۔ ان میں سے لزلی کے معاملے کا وکفور نے ذکر کیا ہے، اور بیان کیا ہے کہ جان لزلی جو شہر راس کا بشپ تھا 855 اسے ماری اسٹوئرٹ نے انگلستان کی ملکۂ الزابتھ کے پاس اپنے نظر بند ہو جانے سے بھی پہلے، اپنا معمولی سفیر مقرر کیا تھا............ انگلستان میں امن مملکت کے خلاف کوئی ایسی سازش نہیں کی گئی اور نہ ہی ملکۂ الزابتھ کی جان کے خلاف کوئی سازباز کی گئی، اور نہ کوئی دیگر سازشیں ہوئیں جن کا یہ بانی نہ رہا یا اہم حصہ لینے والوں میں سے ایک نہ رہا ہو۔ اس کے متعلق ثبوت اتنے زیادہ بیّن تھے کہ مجلس وزراء نے جب اسے طلب کیا تو اس نے اتنا کچھ اعتراف کر لیا کہ جس رتبے کا وہ حامل تھا اور جس کے باعث وہ حفاظت کا مدعی تھا اس کا لحاظ کئے بغیر اسے سزا دی جا سکے......... مجلس وزراء نے لندن کے اعلیٰ ترین

---

[1] برٹش میوزیم میں ہارلے کے مخطوطات دیکھئے صفحہ ۱۶۸۔
[2] "سرکاری کاغذات کی تقویم" جلد مذکورۂ بالا صفحہ ۶۳۔

ماہرین قانون کی رائے طلب کی۔[1] یہ ماہرین قانون ڈاؤڈ لیوس، ثالنٹائن ڈیل، ولیم ڈرُوری، ولیم آبرے اور ہنری جونس تھے۔ ان کو مختلف سوالات کا جواب دینے کے لئے بلایا گیا تھا اور ان کے جوابوں ہی کے مطابق سفیر مذکور کو قید کر کے جزیرۂ ایلی بھیجدیا گیا پھر وہاں سے لندن کے برج میں منتقل کر دیا گیا۔[2]

خود ماری اسٹورٹ کا معاملہ بھی ثالنٹائن ڈیل کی رائے کے لئے بھیجا گیا تھا اور اس بارے میں اس نے جو نوٹ لکھے ہیں وہ بھی محفوظ اور موجود ہیں۔[3]

ایک ابتدائی نوٹ میں ڈیل نے نیپلز کے بادشاہ یعنی دوسرے رابرٹ کے مشہور و معروف واقعے سے استدلال کیا ہے۔ شہنشاہ ساتویں ہنری نے ۲۵ر اپریل ۱۳۱۳ء کو اس دوسرے رابرٹ کے خلاف ایک فیصلہ صادر کیا تھا جس میں اسے ایک غدار اور باغی ماتحت قرار دے کر، اسے اس کے علاقوں سے محروم کیا تھا اور اسے شہنشاہیت سے جات باہر کر کے اس کے خلاف سزائے موت صادر کی تھی۔ لیکن چند ہی ماہ بعد ۲۴ر اگسٹ کو خود شہنشاہ کی وفات ہوگئی۔ پوپ پانچویں کلیماں نے ۱۴ر مارچ ۱۳۱۴ء کے اپنے ایک حکمنامے کی رو سے اس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جو رابرٹ کے خلاف

[1] وِکفور کی فرانسیسی تالیف "سفیروں کے متعلق یادداشتیں" صفحہ ۱۴۰۔

[2] ڈاؤڈ لیوس (فوت ۱۵۸۴ء) حاکم عدالت امارت بحریہ۔ ثالنٹائن ڈیل (فوت ۱۵۸۹ء) افسر مطالبات سرکاری، جسے بکثرت اہم فرائض کے لیے مامور کیا جاتا رہا۔ ولیم ڈروری (فوت ۱۵۸۹ء) جج۔ ولیم آبرے (فوت ۱۵۹۵ء) جامعۂ آکسفرڈ کا پروفیسر قانون روما۔ یہ سب کے سب کالج آف ڈاکٹرز کامنس میں معلم تھے۔

[3] اِسٹرائپ کی انگریزی تالیف "تاریخ اصلاح" جلد ۳ حصۂ اول صفحہ ۵۳۰ اور حصۂ دوم صفحہ ۳۹۸۔

صادر ہوا تھا۔ وجہ یہ بیان کی کہ رابرٹ کو قانون کے مطابق جوابدہی کے لیے طلب نہیں کیا گیا تھا، اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ شہر "پیزا" جہاں شہنشاہ اس وقت تھا آ نہ سکتا تھا۔ لیکن پوپ نے اس کو تو تسلیم کر لیا کہ شہنشاہ کو اس طرح فیصلہ صادر کرنے کا حق ہے، خاص کر اس صورت میں جب کہ کوئی شخص شہنشاہی سرزمین پر جرم کا ارتکاب کرے اور وہیں اسے گرفتار کیا گیا ہو۔[1] زِیل نے اس دلیل کو آڑ بنایا تاکہ لارڈ بر گلے کی اس رائے کی تائید کرے کہ اسکاٹ لینڈ کی ملکہ ماری اِسٹوَرٹ کے خلاف جو ضابطہ اختیار کیا گیا تھا وہ جائز تھا۔ چنانچہ وہ انتہائی وثوق کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے جو قاعدہ بیان کیا ہے اس سے زیادہ صحیح اور یقینی کوئی اور قاعدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ جو نوٹ منسلک کیا گیا تھا اس میں اس نے چند اعتراضوں کی تردید کی ہے مثلاً رتبۂ بادشاہی کے متعلق یہ (لاطینی) کلیہ کہ "برابر والوں میں برابر والا حکمران نہیں سمجھا جا سکتا"۔

۱۵۸۷ء میں آکسفرڈ میں چھوٹی تقطیع کے چودہ صفحوں کا ایک لاطینی رسالہ شایع ہوا جس کا عنوان "سفیر اور مملکت کی سلامتی کے خلاف سازش کے اصول" تھا۔ اس تالیف کی ابتدائی سطروں میں مسئلہ اور اس کا حل بیان کیا گیا ہے یعنی آیا کسی حکمران کا سفیر یا خود حکمران اس صورت میں موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے جب کہ وہ کسی اور مملکت میں وہاں کے حکمران کی جان یا خود اس مملکت کے خلاف سازش کرے؟ اس کا جواب اثبات میں دیا گیا ہے تاریخ طباعت سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مولف کے پیش نظر مندوزا کا واقعہ تھا جو فلپ دوم کا سفیر تھا نیز ملکۂ ماری اِسٹوَرٹ کا۔
یہ ممکن نہیں کہ اس رسالے کے مولف کا پتہ چلایا جا سکے۔

---

[1] کلیماں تین کی تالیف "پاسٹرولس" جلد (۲) صفحہ ۱۱ - نمبر ۲ -

اس کا نام کہیں بھی نہیں لکھا گیا ہے لیکن جیسا کہ مسٹر ٹی ای ہالنڈ نے گمان ظاہر کیا ہے "یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں میں سے کسی ایک کا مقالہ ہو جنھوں نے ۱۵۸۷ء میں قانون کے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس سال ایسے تین لوگ تھے؛ ولیم ووڈ، فرانسس جیمس اور ولیم برڈ۔ اور یہ تالیف بطور مقالہ ڈگری حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی ہوگی اور اس کی دلیلیں جنٹی لیس نے سمجھائی ہوں گی۔

چارلس پاس کالی نے "سفیر" نامی ایک کتاب لاطینی میں تالیف کی تھی جس کا پہلا ایڈیشن ۱۵۹۸ء کا ملتا ہے۔ وکفور کا بیان ہے کہ یہ عالم فاضل تو بڑا تھا لیکن نہایت کم قابلیت والا وزیر۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی کتاب عرصۂ دراز تک بہت اشتہور رہی۔ اس کتاب میں (۸۷) باب ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد ناظر یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ ان بابوں میں سے کونسا اس کی شہرت کا باعث بنا؟ بنکر شوئک کو اس بارے میں اچھا حکم سمجھا جاسکتا تھا۔ اس نے اس کتاب کی قدر و قیمت بہت کم آنکی ہے۔ اور اس کی رائے ہے کہ اس کتاب میں عالمانہ طمطراق اور شوکت الفاظ تو بہت ہے، لیکن قوت فیصلہ اور صحت کم پائی جاتی ہے[۱]

بلحاظ تاریخ اس کے بعد کرسٹوف ثار شتے فسکی کی لاطینی تالیف "سفیر اور سفارت" آتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۵۹۵ء میں نکلا۔ اور اس پر اس کا نام لاطینی میں کرسٹوفورس ثار سے فی گیوس لکھا ہے اور اس کے سرورق سے مولف کی حیثیت اور قومیت معلوم ہوجاتی ہے چنانچہ اس پر لاطینی میں یہ الفاظ ہیں "پولستانی شہامت کار" ثار شتے فسکی کا ایک ہمعصر یعنی جان ہاٹ سن اس کا حوالہ دیتا ہے اور

---

[۱] بنکر شوئنک کی تالیف "سفیروں کے لیے حاکم مجاز پر رسالہ" فرانسیسی ترجمہ از باربیراک باب (۲۰) فقرہ ۷۔

357

اس کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "وہ ایک نہایت فاضل شریف پولستانی شخص تھا اور اسے پولستان (پولینڈ) کا بادشاہ اکثر سفارت پر مامور کیا کرتا تھا" اس کتاب کو کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ مولف کی جدت یہ ہے کہ وہ نئی مثالیں دیتا ہے بجائے اس کے کہ پرانی تاریخ سے چنی ہوئی مثالوں پر اکتفا کرے جیسا کہ اس کے قریب قریب تمام پیشروؤں نے کیا تھا۔

یرمی زیشیر نے لاطینی میں "سفیروں کا عہدہ" نامی ایک مقالہ لکھا جو سنہ ۱۶۰۰ء میں شائع ہوا۔ کاشپتس کا مقالہ سنہ ۱۶۰۳ء کا ہے۔ اس کے بعد کا مقالہ آتونیپ تیدا کا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۱۵ء میں اس نے ایک لاطینی مقالہ "مشورے اور مشیر" شایع کیا تھا۔

سنہ ۱۶۰۳ء میں پاریس میں جان ہاٹ من کا رسالہ "سفیر" چھپا اور پھر نظر ثانی اور اضافے کے بعد یہ "سفیر کا فریضہ اور رتبہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ "سفیر" کے حقوق اور دارو گیر سے اس کے محفوظ ہونے کے مسئلے سے بحث کرتے ہوئے ہاٹ من نے اس سوال کی تحقیق کی ہے کہ اگر سفیر اس حکمران کے خلاف سازش کرے جس کے پاس اسے بھیجا گیا ہو تو کیا کرنا چاہیئے؟ مولف نے ان تمام نظریوں پر نظر ڈالی ہے جو اس کے زمانے میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ سازش کو عمل میں لائے بغیر صرف اس کی تجویز اور سخت ویز ہوئی ہے یا یہ کہ اسے عمل میں بھی لایا گیا ہے؟ — اور قانون بین الممالک، ارتکاب کردہ فعل ناجائز اور تجویز کردہ فعل ناجائز کو یکساں نہیں قرار دیتا اور محض خیال پر سزا نہیں دیتا، جیسا کہ قانون روما بادشاہ کی جان کے خلاف جرم کے متعلق حکم دیتا ہے۔ لیکن بعض دیگر لوگوں کی یہ رائے تھی کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ سفیر کے فعل کو اس کے آقا نے درست قرار دیا تھا یا اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس طرح کا معاملہ انگلستان میں پیش آچکا تھا اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ منڈوزا کی سازش کے موقع پر ہاٹ من نیز البیرکس جنتی لیس سے مشورہ کیا گیا تھا۔ ہاٹ من کی بھی وہی رائے ہوئی تھی جو آکسفرڈ کے پروفیسر یعنی جنتی لیس کی۔

ہرمان کرشنر نے لاطینی میں ایک کتاب "سفیر، اس کے حقوق، رتبے اور فرائض، کی دو کتابوں میں توضیح" لکھی۔ یہ ۱۶۰۳ء میں شائع ہوئی مگر اسے کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

ایک گمنام مقالے کا حوالہ دینا چاہیئے جو سنہ ۱۶۰۰ء میں اشتراس بورگ میں شائع ہوا تھا اور اسی سال دوبارہ پاریس میں اس (لاطینی) عنوان سے چھپا کہ "ہمیشہ کا اور ہر وقت تازہ سوال کہ آیا قانون اقوام کے تحت کسی سفیر کو جو کسی اجنبی حکمران یا جمہوریت کے پاس بھیجا گیا ہو اس وقت روک رکھا جا سکتا یا سزا دی جا سکتی ہے جب کہ وہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہوا ہو؟" اس مولف کی رائے میں اس سفیر کو سزا دی جا سکتی ہے جو کسی ایسے بادشاہ کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے جس کے پاس اسے بطور سفیر مامور کیا گیا ہو۔ البتہ مولف نے احتیاط کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

بلحاظ تاریخ اس کے بعد ڈولفانگ ہائیڈر آتا ہے جس نے "سفرا اور سفارتیں" نامی ایک لاطینی رسالہ سنہ ۱۶۱۰ء میں چھپوایا تھا۔ اس کے بعد مارٹن بورنٹ ہے جس نے سنہ ۱۶۱۱ء میں "سفارتیں اور سفرا" کے نام سے ایک لاطینی رسالہ لکھا۔ اسے ایک اور مولف ڈومینیک خان آروم نے اپنی لاطینی تالیف "حقوق عمومی پر علمی مباحث" میں نقل کر دیا ہے اور اسی میں "سفرا" نامی ایک لاطینی مقالہ بھی جو گیورگ شوبارت نے جامعۂ ییے نا میں پیش کیا تھا اور جو جامعہ کے پروفیسر یوحان گری پن کرل (دگر پیان ڈر) کی نگرانی میں لکھا گیا تھا شائع کر دیا گیا ہے۔ ڈومینیک خان آروم نے خود

358

بھی ایک لاطینی مقالہ لکھا تھا۔ اس کا عنوان "سفیر کے متعلق مقالہ کہ اصولاً کس صورت میں سازش پر اسے سزا دی جاسکتی ہے؟" تھا۔

بورٹ کا مقالہ قانونی سے زیادہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ اور شوبارت کے ایا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے استاد گری پیاں ڈر کے مقالے کا بھی یہی حال ہے۔ ان دونوں نے جنتی لیس، کرشنر، تھارشے فسکی اور ہائیڈر کی تعریفوں کا حوالہ دیا ہے اور نیز ایک اور مولف کا بہ کثرت ذکر کیا ہے جو آج کل بالکل بھلا دیا گیا ہے لیکن جو سترھویں صدی میں ایک بڑی شہرت کا مالک تھا یعنی فریڈرک فورئوس سیریولانس جو اسپین کا ایک مدبّر اور اخلاقیات پر لکھنے والا مولف تھا۔ اس نے اسپینی زبان میں "سفیر اور سفارت" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی تھی جس کا کئی مرتبہ لاطینی میں ترجمہ ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں ہم ایک اور مولف کا بھی ذکر کریں گے۔ جو اسی کی طرح ایک زمانے میں مشہور رہا تھا یعنی پیئر آندرے کانوں ایسے ری۔ اس نے ۱۶۱۴ء میں شہر آن فیبر میں اطالوی زبان میں ایک کتاب شائع کی تھی اس کا نام "سیاسیات، ضرورت مملکت اور اچھی حکمرانی کے طریقے پر تمہید" تھا۔ اس کا تیسرا حصہ سفیروں کے متعلق ہے۔ اسی مولف نے ۱۶۱۴ء میں "سفیر" کے نام سے لاطینی میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔

۱۶۱۸ء میں شہر آن فیر میں نیم یونانی نیم لاطینی عنوان یعنی "نقیب، سفارتی حیثیت سے، جو دو کتابوں پر منقسم ہے" کے نام سے ایک تالیف شائع ہوئی جس میں چھوٹی تقطیع کے (۲۵۱) صفحے تھے۔ اس کا مولف ایک خود پسند شخص فریڈرک دے مارس لیر تھا۔ بعد کے ایڈیشنوں میں قابل ذکر اضافوں کے بعد اس کا نام لاطینی میں "سفیر" نظر آتا ہے۔

اس کے بعد جلدی جلدی چند چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوئے۔ چنانچہ آلبرے ہرمانس کی لاطینی تالیف "سفیروں کے

فرائض، حقوق اور خریطہ ہائے تقرر" ۱۶۱۹ء میں شائع ہوئی۔
۱۶۲۰ء میں اسپینی میں "سفیر" کے نام سے ژاں انتوان ڈیرا اے تی ژیروا اور کنتی خا نے مل کر شائع کی۔ کنتی خا کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس کی ماں تھی۔ اسی سنہ ۱۶۲۰ء میں رائن آرٹ گونتش نے لاطینی میں "سفرا اور سفارتیں" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ۱۶۲۲ء میں "سفیروں اور سفارتوں پر قانون اور سیاسی مباحث" کے عنوان سے ایک لاطینی مقالہ جامعہ ٹیوبنگن میں کرسٹوف بے زولٹ کی نگرانی میں لکھ کر شائع کیا گیا تھا۔ کارل کریمبرگ نے ایک لاطینی مقالہ "سفارتیں اور سفراء" کے نام سے لکھا تھا۔ دو اور لاطینی مقالے یوحان گیرہارٹ کے ملتے ہیں جن کے عنوان "کیا کام ختم ہونے پر سفیروں کے خلاف چارہ جوئی ہوسکتی ہے؟" اور "کیا سفیر تحفے قبول کر سکتے ہیں؟" تھے۔
۱۶۲۴ء میں "سفیر پر مقالہ" کے نام سے ژاں وِشتو کئے نے ایک لاطینی مقالہ لکھا نیز اسی سال کرسٹوف بے زولٹ نے بھی ایک اہم کتاب تالیف کی۔ یہ شخص سترھویں صدی میں قانونیات اور سیاسیات کے ممتاز ترین ماہروں میں سے ایک تھا۔ اس نے قانون سفارت کے متعلق دو مقالے لکھے نیز ایک لاطینی مقالہ بعنوان "حلیفوں کے حقوق پر سیاسی و قانونی بحث اور حمایت و محمیت نیز غیر جنبہ داری پر اجمالی بحث"[1]
جس لاطینی رسالے سے ہم بحث کر رہے ہیں اس کا عنوان "سفراء اور ان کے حقوق" ہے۔ اس کے مولف بے زولٹ نے سفارت کے متعلق جو مقالے لکھے تھے، ان میں سے پہلے مقالے میں اس نے وہی امتیاز باقی رکھا تھا جو قانون روما میں پایا جاتا

[1] صفحہ 224 پر اس کتاب کے نام کے آخری جزء میں خفیف فرق ہے (مترجم)

ہے۔ لیکن ۱۶۲۴ء میں اس نے جو رسالہ لکھا اس میں اس نے ایک اور امتیاز کی تجویز پیش کی ہے، جس کا تعلق فوجداری اختیار سماعت سے ہے۔ وہ فرایض انسانی اور فرایض سفارت میں فرق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر سفیر کسی انسانی حق کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے تو اسے سزا دی جا سکتی ہے، لیکن اگر وہ فرائض سفارت کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے اور یہ یقین کرنے کی وجہ ہو کہ وہ شخص جس نے اسے سفیر بنا کر بھیجا ہے، اسے سزا نہ دے گا تو ہمارا مولف یہ سوال کرتا ہے کہ آیا کوئی شخص خود سفیر کو دشمن قرار دے کر سزا دے سکتا ہے؟ رنکر شوئک نے اس تالیف کے متعلق لکھا ہے کہ بے زولٹ اس مسئلے پر مختلف مولفوں کی مختلف رائیں تو پیش کرتا ہے لیکن خود کوئی قطعی رائے نہیں دیتا۔

جیمس اول کے دور حکومت میں سفیروں کے حقوق کا مسئلہ انگلستان میں موضوع بحث بنا رہا۔ خود بادشاہ ایک ایسی سیاست پر عامل رہا جسے قوم کی اکثریت نے مردود قرار دیا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ شہزادۂ ویلز کی (جو بعد میں چارلس اول بنا) شادی اسپین کے شاہی گھرانے میں جو تھے فلپ کی بہن انفنٹا (شہزادی) ایزابیلا سے کرے۔

دربار مجریط (میڈرڈ) نے انگریز بادشاہ کی تجویز پر رضامندی ظاہر کی اور ۱۶۲۳ء میں شہزادۂ ویلز اور اس کے ہمراہ بکنگہام کا ڈیوک مجریط آوارد ہوئے۔ گفت وشنید نے نوبت بہ نوبت جو پلٹے کھائے، اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ چارلس، انگلستان واپس آگیا اور تجویز پوری طرح منقطع ہوگئی۔ گفت وشنید کے ٹوٹ جانے کی خبر پر، جوش وخروش کے ساتھ، مسرت کا اظہار کیا گیا اور اس ناکامی کا الزام بکنگہام کے ڈیوک پر لگایا گیا۔ اسپین کے سفیر ڈون کارلوس دا سے کولونا اور اینی یوسا کے

مارکوئیس نے قسم کھا کر یہ چیز بیان کی، تاکہ اسے بادشاہ کی نظروں میں گرادیں۔

حقیقت میں ان سفیروں نے یہ افواہ پھیلائی کہ بکنگھام کے ڈیوک نے شہزادۂ ویلز کی رضامندی سے یہ تجویز سوچی تھی کہ بادشاہ کو قلعہ تھیوبالڈ میں قید کر کے شہزادۂ ویلز کو بادشاہ بنادے جلدی ہی اس افواہ نے استحکام حاصل کر لیا اور وہ بادشاہ جیمس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اینی یوسا کے مارکوئیس نے خیال کیا کہ وہ بڑا تیر مار لے گا اگر وہ بادشاہ کے پاس حاضر ہو کر اسے اس سازش کی اطلاع دے دے۔

بادشاہ پریشان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے [سفیر کی اس] اطلاع سے شہزادۂ ویلز اور بکنگھام کے ڈیوک کو آگاہ کرایا جنھوں نے 360 بادشاہ کی اطمینان دہانی کے لئے بہت سے مشیران راز (ارکان پریوی کونسل) اور نوابوں کا حلفیہ بیان دلایا کہ الزامات محض بے بنیاد ہیں۔ بادشاہ جیمس نے نئے سر سے پوچھ گچھ کی۔ اب کی انھوں نے مقابلۃً کم اثباتی انداز اختیار کیا، اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کی کہ بکنگھام پارلیمان کو پھسلانا چاہتا ہے۔ اب بکنگھام اور مخالف اسپین جماعت کو موقع ملا کہ جوابی اقدام کریں۔ چنانچہ مجلس شورائے راز (پریوی کونسل) میں اس امر پر غور کیا گیا کہ آیا یہ ممکن نہیں کہ ان سفیروں کو سزا دی جائے اور ان پر بیت الامراء میں مقدمہ چلا کر انھیں سزائے موت دی جائے؟ اس پر نہایت راز میں کارروائی کی گئی۔ اور جب ان ماہرین قانون نے، جن سے مشورہ کیا گیا تھا، موافقت میں رائے دی تو بادشاہ سے اس کا معروضہ کیا گیا۔ بادشاہ ہچکچایا اور لندن کے محافظ خزانۂ دستاویزات میں اس کا خط محفوظ ہے جس میں اس نے مشیران راز کو جواب دیا ہے۔ چنانچہ ان کی

دلیلوں کی تنقیح کرنے کے بعد اس نے کہا تھا کہ : " ان استدلالوں نے میری ماں کا سر قلم کر دیا ہے ۔" سفیروں کے خلاف کارروائی کی کوئی پیش رفت عمل میں نہیں لائی گئی ۔ لیکن مطالبۂ عامہ کی تشفی ہو گئی ۔ سفیروں کو رخصت کر دیا گیا اور انھیں عادتی اعزازی محافظ دستہ تک مہیا نہیں کیا گیا ۔

مجلس شورائے راز کو [اس بارے میں] جو [قانونی] مشورے دیئے گئے ان میں ایک سر رابرٹ کاٹن کا بھی ہے ۔ اس شخص سے نازک مسائل میں بارہا مشورہ طلب کیا جاتا رہا تھا ۔ اور موجودہ معاملے میں بھی اسے بھلایا نہ گیا ۔ کوئی دس برس پہلے خود یہ بھی ایک اسپینی سفیر کے کارستانیوں کا ہدف رہ چکا تھا ۔ اس نے سفیر کے خلاف کارروائی کرنے کی تائید میں رائے دی ہے اور مختلف نظیروں سے استدلال کیا ہے ۔ چنانچہ دوسرے اور تیسرے ہنری کے زمانے کے مذہبی سفرائے پوپ کا، شارل گیں کے سفیر لوی ڈیپرائے کے واقعے کا، اسپین میں ملحوظ رکھے جانے والے طرز عمل کا، رآس کے بشپ اور منڈوزا کے معاملات کا حوالہ دیا ہے[1]۔

اسی طرح اس زمانے کے حاکم عدالت مرافعہ و محافظ دستاویزات (ماسٹر آف رولس) سر جولیس سیزر کے لکھے ہوئے نوٹ اور ولیم ویلواڈ کے مشورے کا خاکہ جواب بھی پائے جاتے ہیں[2]۔ ولیم ویلواڈ نے شاید اپنا نوٹ، بلکہ غالباً نوٹ کا خاکہ، سر جولیس سیزر کے پاس بھیج دیا تھا ۔ اس کے شروع ہی میں لاطینی میں "مسودہ" [زیر تیاری چیز] کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں ۔

---

[1] برٹش میوزیم کے مخطوطات ہارلے جلد (۳۰۴)

[2] برٹش میوزیم کے اضافہ شدہ مخطوطے نمبر (۱۲۴۹۶)

اس میں یہ اصول پیش کیا گیا ہے کہ سفیر ہر قسم کی داروگیر سے محفوظ رہتا ہے لیکن ویلواڈ نے یہ لکھنا نہیں بھلایا ہے کہ اس میں غلو نہیں کرنا چاہئے (لاطینی میں) "فرائض منصبی کی، مطابق قانون تکمیل اور چیز ہے اور ان سے بے جا استفادہ اور چیز"۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سفیر کا احترام کرنے کی ذمہ داری صرف اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ خود قانون سفارت کا احترام کرتا رہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کبھی تو راست بغاوت کی صورت اختیار کرتی ہے، کبھی سازش کی اور کبھی (لاطینی میں) "حکمران سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے خلاف" سازبازکی، جس میں وہ تمام افعال داخل ہیں جن سے جرم توہین کا ارتکاب عمل میں آتا ہے۔ نیز وہ توہین جو خود انھیں مذکورہ اشخاص کے خلاف عمل میں لائی جائے۔

361

پوپ کی سفارتوں کو ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی۔

جہاں تک جدید کلیسا کے قواعد کا تعلق ہے، مختلف کلیساؤں کو پوپ کی طرف سے نمایندوں کا بھیجا جانا خاصا قدیم ہے۔ سارڈیک میں جو مجلس شورائے مذہبی منعقد ہوئی تھی وہ ہمارے لیے ایک باضابطہ حکم مہیا کرتی ہے کہ (لاطینی میں) "اگر وہ شخص جو اپنے معاملے کے لئے حجت پیش کرتا ہو اپنے استدلال سے روما کے اسقف (پوپ) کو اس کے سفرائے ہمنشین کے خلاف مطمئن کر دے تو اسے اس کی اجازت ہوگی......."[1]

مذہبی نمایندے بکثرت بھیجے جاتے رہے اور سوائے مشرق کے، ان کو قبول کرنے سے عام طور پر کسی نے انکار نہیں کیا۔

[1] کیس کا مضمون "قانون بین الممالک اور پاپائیت" جو فرانسیسی " رسالہ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۱۰) میں شائع ہوا دیکھئے صفحہ ۵۵۵

کافی طویل عرصے تک قسطنطنیہ کے شہنشاہوں کے ہاں افسران جواب نویس متعین رہے لیکن ان کی حیثیت ذرا بھی نمایندے کی نہ تھی۔ حقیقت میں ان کا فریضہ صرف یہ تھا کہ شہنشاہوں کی خدمت میں پوپ کے مفادات نہیں بلکہ اس حلقۂ کلیسا کے مفادات کی عرض و معروض کریں جس کے وہ نمایندے ہوتے تھے[1] قرون متوسطہ میں مذہبی سفیروں کا عہدہ قایم کیا گیا۔

ابتداءً مذہبی سفیر، کلیسائی دوروں پر، نویں لیو اور دوسرے حکمران (پوپوں) کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ ساتویں گریگری کے زمانے سے ان کے فرائض میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ جو استحصال بیجا کرتے تھے اور جن فضیحت انگیز بدعنوانیوں کا ارتکاب عمل میں لاتے تھے، وہ کیتھولک مذہب کی تاریخ کے تاریک بابوں میں سے ایک ہے۔ ان کا غرور اور ان کے ہتک آمیز تکبر کے باعث چو طرف احتجاج ہونے لگے۔ اور غالباً ایک بھی حکمران ایسا نہیں بچا جس نے یہ قرار نہ دیا ہو کہ مذہبی سفراے پوپ اس کی اجازت کے بغیر اس کے علاقے میں داخل نہ ہونے پائیں۔ فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں نے اپنے حقوق اقتدار اعلی کی حفاظت میں ایک واقعی انتہائی خودسری دکھائی۔ ولیم فاتح نے تو پوپ دوسرے اربان سے ایک معاہدہ کرلیا جس کی رو سے طے پایا کہ پوپ صرف اسی شخص کو مذہبی سفیر بناکر بھیجے گا جس کا بادشاہ انتخاب کریں۔ تیسرے ہنری نے وہ حق برقرار رکھا جو ۱۱۰۰ء سے اسکاٹ لینڈ کے متعلق تسلیم شدہ نظر آتا ہے۔ جرمنی میں ہوئیں اشتاوفن خانوادے کے حکمران بھی مستعدی اور شدت دکھاتے رہے۔

[1] بون پار کا فرانسیسی مضمون "پوپ اور قانون بین الممالک" صفحہ ۱۰

جہاں تک قانون مذہبی کا تعلق ہے، مذہبی سفیروں کے تین طبقے ہیں (لاطینی میں): پہلے سفرائے ہمنشین، دوسرے سفرائے پیام رساں، اور تیسرے سفرائے مرکزی[1]۔

ان میں سے پہلی قسم کے سفیر یا تو معمولی ہوتے ہیں یا غیر معمولی۔ اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ آیا وہ کسی صوبے کے لیے بھیجے گئے ہیں یا صرف کسی غیر معمولی صورت حال کے موقع پر۔ یہ لوگ پوپ کی ہمنشینی سے اس لیے دور ہوتے تھے کہ کسی فریضے کی انجام دہی کریں۔ ان کو ہر قسم کا پورا پورا اختیار سماعت عملاً ہوتا تھا۔ اور جن صوبوں میں انھیں متعین کیا جاتا تھا، وہاں ان کی حیثیت، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے، حاکم الحکام کی ہوتی تھی۔ انھیں وہ تمام اقتدارات حاصل ہوتے تھے جو بطریرکوں، "صدر پادریوں"، "آرک بشپوں"، بشپوں (اسقفوں) اور دیگر حکام مذہبی کو حاصل تھے۔ البتہ انھیں وہ اختیارات نہ ہوتے جو صراحت کے ساتھ پوپ کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ شہر ترنت میں جو مجلس شورائے مذہبی منعقد ہوئی تھی اس نے صراحت کے ساتھ حکم دیا کہ سفرائے ہمنشین، نیز دیگر سفرائے مذہبی اختیار سماعت کے استعمال میں بشپوں کے اختیارات میں دخل نہ دیں جب کہ معاملہ عدالت کلیسائی سے متعلق ہو۔ اور اسی طرح حکام مذہبی کے خلاف بشپوں کے توسط کے بغیر کوئی کارروائی نہ کریں بجز اس کے کہ ان بشپوں نے سزا دینے میں

---

[1] توماسین کی لاطینی تالیف "کلیسا کے نئے اور پرانے ضوابط" حصہ ۱ کتاب ۲ باب ۱۱۔ فرآریس کی لاطینی تالیف "قانون مذہبی کے مباحث" حصۂ سفارت۔ ہرٹ شوک کی جرمن تالیف "پراٹسٹنٹ دینیات اور گرجا کی انسائکلوپیڈیا" عنوان سفرائے پوپ۔ مورونی کی اطالوی تالیف "کلیسائی تاریخ کی علمی لغت" عنوان سفیر پوپ۔

غفلت کی ہو۔ لیکن عجیب عجیب قسم کے دعوے کئے جاتے رہے۔ مختلف مولف یہ رائے دیتے ہیں کہ سفیر ہمنشین حقیقت میں پوپ کا نائب ہوتا تھا اور اسے (لاطینی میں) "اقتدار خالص بھی اور مخلوط بھی حاصل ہوتا ہے بجز اس کے کہ وہ صراحت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہو۔

سفرائے پیام رساں کی دو قسمیں تھیں۔ ایک تو طبقۂ اول کے اور دوسرے طبقۂ دوم کے۔ سفیر مرکزی کا رتبہ صرف مذہبی مرکز کو حاصل ہوتا تھا اور صدر پادری (پری لیٹ) کو نہیں۔

مذہبی قانون کے احکام کے مطابق تمام مذہبی سفیران صوبوں کی حد تک، جہاں انھیں متعین کیا گیا ہو، حاکمانہ اختیار سماعت کے حامل ہوتے تھے۔ لیکن سفیر پیام رساں کو ہمنشین کے مقابلے میں محدود تر حقوق حاصل ہوتے تھے۔

مذہبی سفیروں کے متعلق کافی کثیر لٹریچر پایا جاتا ہے۔ لودی کے مارتن نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے اور گونذزال دے دے ثیلا دیے خو نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں ایک لاطینی تالیف "رسالۂ سفارت" کے نام سے لکھی تھی جس کا حصۂ اول پوپ کے سفیروں سے متعلق ہے۔ آندرے ڈبر بانیانے ایک لاطینی کتاب تالیف کی تھی جس کا نام "کارڈینل سفرائے ہمنشین کے متعلق رسالہ" تھا۔

سولھویں صدی کے آغاز میں پئیر آندرے گاں بارو نے جو "گاں باری نی والے" کے نام سے بھی مشہور ہے، ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا نام "رسالۂ فرائض و اقتدارات سفرائے ہمنشین" تھا۔ اینے دے ای فالکونی نے لاطینی "رسالہ متعلق سفیر ہمنشین" شائع کیا۔ اس کے بعد جن لاطینی رسالوں کا نمبر آتا ہے ان میں سے "کالیا کے سفرائے ہمنشین کے اقتدار پر رسالہ" مولفہ

963

نکولاس بوئیمیے، اور "سفرا" کے رتبے اور اقتدار پر رسالہ " مولفہ ژاں برو نو ہیں۔ سولھویں صدی کے وسط میں رافائل سی لے نیوس نے "پوپ کے سفیر" کے نام سے ایک لاطینی رسالہ شائع کیا۔[1]
ان مختلف رسالوں میں قابل توجہ نظریے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ قرون متوسط کے سفیر مذہبی کی جگہ پوپ کے ایک اور عہدہ دار نے لے لی، جسے ایک دوسری ہی اہمیت حاصل ہے۔
اصلاح مذہب کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ ابتدار میں اسے کامیابی پر کامیابی ہوتی جاتی ہے۔ ۱۵۵۵ء میں جونہی صلح آؤگس برگ میں ہوئی تھی اس کے بعد کے سالوں میں پراٹسٹنٹ تحریک ہر طرف فتحمند نظر آتی ہے۔ جرمنی کا شمال اور وسط اس کے ہو گئے تھے۔ جنوب کے متعلق بھی اسے اطمینان ہو چکا تھا۔ آسٹریا، اِستوریا اور کارنتھیا کے علاقے بھی اس سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ بوہیمیا اور موراویا میں ہس نامی شخص نے ایک مذہبی تحریک شروع کی تھی۔ اور اب یہ تحریک بھی تحریک اصلاح کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ تمام شہنشاہی شہر پراٹسٹنٹ ہو گئے تھے۔ سوئٹزرلینڈ (سوئستان) میں بھی جدید مذہب ہی کا بول بالا ہو گیا تھا۔ پولینڈ کے امراء اور عوام بھی روما سے کٹ گئے تھے۔ سویڈن اور ناروے میں بھی یہی نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ انگلستان میں آٹھویں ہنری اور چھٹے ایڈورڈ کی کارروائیاں قطعی کامیابی حاصل کر چکی تھیں۔ نشیبستان (ہالینڈ) میں ایک ہمت ور اور سرگرم پرچار جاری تھا۔ فرانس میں اوگینو لوگوں نے بہ زور صلح نامہ سینٹ ژرمین حاصل کر لیا تھا۔ اٹلی میں کالگی نی فرقے کی

---

[1] یہ رسالے بڑی حد تک تسی لیتی کی شایع کردہ لاطینی تالیف "رسائل قوانین عمومی" جلد (۱۳) حصۂ دوم میں موجود ہیں۔

جماعتیں جتھا بندی کرتی نظر آتی ہیں۔

اس سب سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ عرصہ گزرنے پر کیتھولک مذہب نے کھوئے ہوئے علاقے کا کچھ حصہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ جسد کلیسا کے قواعد میں اصلاح کی گئی۔ اصولی چیزوں پر مکرر مہر توثیق ثبت کی گئی۔ دشمن کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والا سلسلۂ کارروائی قایم کیا گیا ــــ رد عمل کے یہ خاص مہرے تھے۔ ترنت میں منعقد شدہ مجلس شورائے مذہبی نے اس کام کے ایک حصے کی تکمیل کر لی۔ باقی کام پوپوں، کیتھولک مذہب کے حکمرانوں اور خاص کر یسوعی (جیسوئیٹ) فرقے کے لوگوں نے انجام دے دیا۔

364 ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ کیتھولک کلیسا کو ان تمام لوگوں پر اختیار سماعت رکھنے کا ادعا تھا جو بپتسمہ لے چکے ہوں۔ بنا برآں پوپوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک تو (اطالوی زبان میں) "وہ صوبے جو تبلیغ مذہب کی مقدس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں"، اور دوسرے وہ صوبے جو مقام مقدس یا پاپائی سے تعلق رکھتے ہیں"۔ جو حصہ مقام مقدس پاپائی کا وفادار تھا اس پر عیسائیت کے عادی قوانین کا اطلاق ہوتا تھا اور جو حصہ مقام مقدس یا پاپائی سے مخاصمت رکھتا تھا اس پر ایک ایسے قانون کا اطلاق ہوتا تھا جس میں حالات کے مطابق تبدیلی ہوتی تھی[1]۔ صوبہ جات مقام مقدس میں پوپوں کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہاں دین کو برقرار رکھیں اور صوبہ جات تبلیغ میں روا کی، سوائے اس کے کچھ غرض نہ ہوتی تھی کہ عیسائی مذہب وہاں قایم کیا جائے۔

قرون متوسطہ ہی سے اسقف، احتساب عقائد شروع کر دیتے

---

[1] مایر کی جرمن تالیف "تبلیغ" جلد (۱) صفحہ (۹۳) و مابعد۔

ہیں۔ ان کو مرکزی افسر احتساب عقاید کہا جاتا جیسا کہ قانون مذہبی میں نام دیا گیا ہے۔ اس احتساب عقائد کے پہلو بہ پہلو پوپ کے خصوصی فرستادوں کا احتساب بھی جاری ہوا۔

جب تحریک احتساب سے کیتھولک کلیسا کا وجود ہی خطرے میں نظر آنے لگا تو پوپ تیسرے پاول نے پادریوں کی ایک خصوصی مجلس، احتساب کے لیے قایم کی اور بطور استحقاق خود پوپ اس کی صدارت کرتا تھا۔ چوتھے پائیس اور پانچویں پائیس نیز پانچویں سکسٹس نامی پوپوں نے اس مجلس کے اختیارات میں اضافہ کیا لیکن مجلس احتساب صرف ایک کلیسائی عدالت تھی، اسے کشوری طاقت کی تائید اور مدد ضروری تھی۔ جب ارباب مملکت، کیتھولک مذہب کے نہ ہوں تو اس وقت ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ ان کو راسخ العقیدہ بنایا جائے اور ہر قسم کے وسائل اختیار کر کے انھیں روما سے وابستہ کیا جائے۔ اس غرض کے لیے ایک اور مجلس مقرر کی گئی جسے مجلس تبلیغ کہتے ہیں۔ اس کا چھوٹا موٹا آغاز تیرھویں گریگری کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ بعد میں یہ نظر آتا ہے کہ پوپ پانچویں پاؤل کو ایک اسپینی راہب نے مشورہ دیا کہ ایک وسیع ادارہ قایم کرے جہاں سے تمام غیر کیتھولکوں کے خلاف یکساں کارروائی اختیار کی جائے۔ پوپ پندرھویں گریگری نے اس تجویز کی تکمیل کی اور مجلس تبلیغ کے قیام کا فرمان پاپائی ۲۱/ جون ۱۶۲۲ء کو صادر ہو گیا۔ دو اور حکمناموں کے ذریعے سے یہ ادارہ مکمل ہو گیا اور پوپ آٹھویں اُربان نے اپنے پیشرو کے کام کی تکمیل کر دی۔

عہدہ داران تبلیغ خاص کر پری فیکٹ اور عاقب (ٹیکار) ہوتے تھے۔ عاقبوں کو اس جگہ بھیجا جاتا تھا جہاں اسقفی نظام

365 نہیں چل سکتا تھا۔ (لاطینی میں) "جہاں اسقفی مرکز کے قیام میں رکاوٹیں ہوتی تھیں"۔ اس تبلیغ کے کارندوں اور مددگاروں میں پوپ کے سفیر اور خاص کر مستقل سفیر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کے متعلق شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف درباروں میں متعین سفرائے پوپ کو جو ہدایتیں دی جاتی تھیں اور جس طور سے ان کی تعمیل ہوتی تھی، اس کا مکمل ثبوت دربار روما کے انداز بیان سے حاصل ہو جاتا ہے[1]۔

درباروں میں متعین ان سفرائے پوپ کی بیک وقت دو حیثیتیں ہوتی تھیں: ایک تو وہ کیتھولک مذہب کی تبلیغ کے کارندے ہوتے تھے، اور دوسرے وہ پوپ کے سفارتی نمایندے ہوتے تھے۔ یہ دوگونہ حیثیت بڑی اچھی طرح ان مستقل سفارتوں میں ہویدا ہو جاتی ہے جو سولھویں صدی میں پوپ کی طرف سے مختلف درباروں میں مقرر کی گئیں۔ دیانا، لوسرن، کولون، وارسا اور بروسیل کے درباروں میں جو سفیر پوپ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے انھوں نے پراٹسٹنٹ مذہب کے خلاف جنگ کرنے کا فریضہ پورے جوش و خروش کے ساتھ انجام دیا تھا۔

دربار ویانا کا پاپائی سفیر ۱۵۱۳ء ہی سے مقرر تھا لیکن سچ پوچھو تو اس عہدے کو اہمیت اس کے ساٹھ سال بعد حاصل ہو سکی۔ کولون میں پوپ کی سفارت ۱۵۸۰ء میں قایم کی گئی ورنہ اس سے پہلے ویانا کا پاپائی سفیر ہی جرمنی اور بلجیم سے تعلق رکھتا تھا۔ جب کولون میں نیا عہدہ قایم کیا گیا تو بلجیم کے معاملات کی نگہداشت بھی اسی کے سپرد کر دی گئی اور بعد دیگرے یہاں ژاں فرانسو ابونومی نی دفر سے ای کا

---

[1] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۲۳ و مابعد۔

اسقف) اور اوکٹا فئے فرنگی پانی زکا یا ذو کا اسقف) مامور کئے گئے۔ اس آخر الذکر شخص کو ۱۵۸۴ء میں بالائی اور نشیبی جرمنی کا سفیر پوپ مقرر کیا گیا تھا۔

یہ چیز اٹلی میں ۱۶۰۶ء میں داخل ہوئی اور آرک ڈیوک البرٹ اور ایزابیلا نے پوپ پانچویں پاول کی جانب سے بروسیل میں سفیر پوپ کی حیثیت سے دیقیوس (دے سیوس) کارافہ کے لیے جو دمشق کا آرک بیشپ تھا نامزدگی کروالی۔ گیئی بنتی ووليو، آسکا نیو جے سوالدی، لوچے دے مورا، لوچے سان سے فے رے نی، لے یوس فال کونے ری، فابیوس دے لاگونیسا یکے بعد دیگرے اس عہدے پر مامور ہوتے رہے۔

۱۶۳۳ء میں جب ایزابیلا مرگئی تو پوپ نے بروسیل کو بجائے سفیر کے شریک سفیر روانہ کرنا مناسب خیال کیا کیونکہ بلجیم میں اسپین کے ماتحت گورنر جنرل ہی حکومت کرتے تھے لیکن اس شریک سفیر کو وہی اختیارات ہوتے تھے جو سفیروں کو۔ انھیں (لاطینی میں) "اختیارات سفیر کے ساتھ مامور کیا جاتا تھا۔" زے شار پاول استرا فیوس کے زمانے سے شہر کا سفیر کا سلسلہ شروع ہوا جسے ۱۷۸۷ء میں یک بیک توڑ دینا پڑا جب دوسرے جوزف نے انتوان فیلکس دزوند اداری کو واپس کردیا۔

ہر سفیر پوپ کے اختیار سماعت میں ہمسایہ پراٹسٹنٹ ممالک کا ایک حصہ دے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ کولون کے تحت ڈنمارک، ہامبورگ، لوبک جرمنی کا ایک بڑا حصہ اور شہنشاہت کے بعض دیگر حصے تھے۔ بروسیل

366

سطح یولی کے کتب خانۂ شاہی کا لاطینی مخطوطہ ۱۱۷۰۹ "مختلف اشخاص کے حالات"

کے سفیر پوپ کو صوبہ جات متحدہ، انگلستان اور آئرستان کے متعلق کارروائی کا اختیار تھا۔ لوسرن کے سفیر کو سوئٹزرلینڈ اور جنوبی جرمنی دیا گیا تھا۔ وارسا کے سفیر کو سویڈن اور ناروے۔ اور اس طور سے میدان عمل کا تعین کیا گیا تھا۔ ان کو جو ہدایتیں تھیں ان کا اندازہ بیان کئے بغیر بھی کر لیا جا سکتا ہے۔ فنے ناف رد کے بشپ اکوینیاس کے لاوس لاس کو جب دربار لوسرن میں سفیر مقرر کیا گیا، تو سترھویں صدی کے آغاز کی ایک تالیف میں وہ لکھتا ہے کہ تبلیغ کا مقصد کیتھولک مذہب کو برقرار رکھنا ہے۔ پوپ پانچویں سکٹس نے سک اپنے ایک سفیر کو لکھ بھیجا تھا کہ اُس کا فریضہ ملحدوں کو ایماندار بنانا ہے۔

باب پانزدہم

براعظموں کی دریافتیں

ہفنٹر[1] کا قول ہے کہ: "قدرت اس میں آڑے نہیں آتی کہ قومیں زمین پر اپنی شہنشاہت کی توسیع کریں۔ لیکن قدرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ صرف کوئی ایک قوم ہر جگہ اپنی خواہش پر اپنا تسلط جا لینا چاہیے۔ تمدن کا پھیلانا، تجارتی اور صنعتی مفادات کو ترقی دینا، نیز غیر پیداکار چیزوں کو حرکت میں لانا تک اس بات کے لئے کافی عذر نہیں ہیں کہ تسلط ایک ہی قوم کو حاصل ہو۔ اس سلسلے میں جو کچھ گوارا کیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ نوع انسانی کی بقا کے لئے قوموں کو اجازت ہوگی کہ وہ آپس میں اتحاد کر کے ایک مشترکہ کارروائی اختیار کریں تاکہ ان بندرگاہوں کو اپنی تجارت کے لیے کھلوائیں جنھیں کسی ملک نے راہبانہ انداز میں بند کر رکھا ہو۔ . . . . . . " یہی مولف یہ بھی بیان کرتا ہے کہ قبضہ جمانے کے ذریعے سے ملکیت حاصل کرنے کا اطلاق صرف انھیں چیزوں پر ہو سکتا ہے جن کا کوئی مالک نہ ہو۔ چاہے ایسی کسی کی

مملوکہ چیزوں پر تسلط جمالینا ممکن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ان اشخاص تک وسیع نہیں کیا جاسکتا جنھیں خواہی نخواہی دستبردار ہونے کی ضرورت ہو۔ نئے قبضے کے ذریعے سے ملکیت کا حصول خاص کر ان ملکوں یا جزیروں کے متعلق ہوتا ہے جو یا تو انسانی آبادی سے خالی ہوں یا جن کے پورے حصے پر دوسروں کا قبضہ نہ ہو۔ لیکن دنیا کی کوئی سلطنت یہ حق نہیں رکھتی کہ خانہ بدوش بلکہ وحشی لوگوں پر تک اپنے قوانین جبری طور سے عائد کرے۔ اس سلطنت کی رعایا کو تو اجازت ہوگی کہ ان آخرالذکر لوگوں سے تجارتی تعلقات جوڑنے کی کوشش کرے، ضرورت کے وقت ان کے علاقے میں سفر کرسکے، ان سے ناگزیر اشیائے بسر برد کا مطالبہ کرسکے نیز ان سے اس کی بھی گفت وشنید کرسکے کہ وہ اپنی رضامندی سے اپنے علاقے کا ایک حصہ اس کے سپرد کردیں جس کی نوآبادکاری مقصود ہو[1]۔

368

سولھویں صدی میں جو تصور یا نظریہ چھایا ہوا تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کردیا جاسکتا ہے۔ یعنی جن ملکوں پر لامذہبوں یا غیر مذہب والوں کا قبضہ ہو، وہ اسی عیسائی قوم کے سمجھے جائیں گے جس نے ان کو دریافت کیا ہو۔

۵ مئی ۱۴۹۶ء کو ساتویں ہنری نے جان کابوتو اور اس کے بیٹوں کو جو منشور عطا کیا تھا وہ سبق آموز ہے۔ یہ کابوتو، وینیس کا باشندہ تھا۔ یہ اور اس کے تینوں بیٹوں نے بادشاہ سے ایک منشور کی استدعا کی کہ وہ ان کو اس امر کا مجاز کرے کہ ایسے جزیروں اور ملکوں کو دریافت کرنے کے لئے بحری سفر کریں جو تاحال نامعروف ہوں۔

ساتویں ہنری نے کابوتو اور اس کے بیٹوں کو نیز اس کے وارثوں کو یہ حق عطا کیا کہ پانچ جہازوں کے ساتھ مشرقی، مغربی

---

[1] ہفٹر کی فرانسیسی تالیف "یورپ کا قانون بین الممالک"، فقرہ ۷۰۔

اور شمالی سمندر کے تمام علاقوں کی طرف بحری سفر کریں۔ اور اپنے جہازوں پر بادشاہ کا جھنڈا اڑائیں تاکہ ایسے جزیرے، ملک اور صوبے دریافت کریں جو اُمّیوں (لامذہبوں) اور غیر مذہب والوں کے ہوں بلا لحاظ اس کے کہ وہ دنیا کے کس حصے میں واقع ہیں۔ بادشاہ نے ان کو اس کا بھی مجاز کیا کہ ایسے نو دریافت علاقوں میں بادشاہ کا جھنڈا جا گاڑیں۔ اور جو کچھ فتوحات یہ کریں ان کی حد تک بادشاہ نے ان کو اپنا ماتحت حکمران اور نائب قرار دیا اپنے لیے صرف اقتدار اعلیٰ باقی رکھا۔ اس قسم کی مہموں کے لئے صرف برسٹل کی بندرگاہ استعمال کی جاتی تھی۔ اور بادشاہ نے یہ بھی قرار دیا کہ جب کبھی یہ لوگ برسٹل واپس آیا کریں، تو منافع کا پانچواں حصہ بادشاہ کو ادا کیا کریں۔ جو تجارتی سامان دور دراز ممالک سے لایا جائے اسے چنگی اور محصولوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ کابوتو اور اس کے بیٹوں کو تجارت کی اجارہ داری حاصل ہو گئی۔ اور ان کی اجازت کے بغیر بادشاہِ انگلستان کی رعایا میں سے کوئی شخص بھی نو دریافت علاقوں کو نہیں جا سکتا تھا، ورنہ اس کے جہاز اور اسباب دونوں ضبط کر لیے جاتے۔ قبضے کے ذریعے سے ملکیت حاصل کر لینے کے حق کو اس سے زیادہ بھیانہ انداز میں ظاہر کرنا ممکن نہیں جتنا خود اس منشور کے (لاطینی) الفاظ میں ہے کہ: "سفر پر جا کر اُمّیوں اور غیر مذہب والوں کے جزیروں، ملکوں، علاقوں اور صوبوں کی تلاش و دریافت عمل میں لائیں چاہے یہ دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ ہوں البتہ تا حال کسی اور عیسائی کو ان کا پتا نہ چلا ہو"[1] پرتگالیوں اور اسپینیوں کا بھی یہی تصور تھا۔ ایک مولف، فرانسوا دے فیتوریا اس سے اختلاف کرتا ہے۔ اور

[1] رِیمر کی لاطینی تالیف "حلیفیاں" جلد ۵ حصہ ۴ صفحہ ۸۹۔

جامعۂ سالا مانکا کی پروفیسری دینیات کی کرسی کی بلندیوں پر سے اس نے اکوئیناس کے سینٹ ٹامس کا حوالہ دیتے ہوئے یہ رائے دینے کی جرأت کی کہ اگر ان نو دریافت ممالک کے لوگوں نے عیسائیوں کو، چاہے وہ عوام الناس ہوں یا کلیسا سے تعلق رکھنے والے، اشتعال نہ دلایا ہو تو انھیں کشوری اقتدار اور حکمرانی سے محض اس بناء پر محروم نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ غیر عیسائی ہیں۔ فیتو ریا نے یہ بھی بیان کیا کہ اسپینیوں کو امرندیوں (امریکہ کے اصلی باشندوں) پر اس سے زیادہ حقوق حاصل نہیں ہیں جتنے ان امرندیوں کو اسپینیوں پر جب کہ وہ اسپین آئے ہوتے۔ اس کا نظریہ بڑا فیاضانہ تھا۔ اس کی رائے تھی کہ امرندیوں کے خلاف جنگ کرنے کی جائز ترین وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں اسپینیوں کو سفر کرنے سے روکیں، اور ان چیزوں میں حصہ لینے دینے سے انکار کریں جو قانون بین الممالک نیز رواج عامہ کے باعث تمام لوگوں کے لئے عمومی حق ہیں یعنی تجارت کرنے سے روکیں۔

غیر مذہب والوں کے علاقوں کی دریافت میں سبقت کے علاوہ، ایک اور چیز سے بھی بارہا حقیت جتائی جاتی رہی۔ اور یہ پوپ کی طرف سے عطیے میں حاصل ہونا تھا۔

پوپ کی طرف سے عطا کچھ تو اس ادّعا پر مبنی تھی کہ پوپ کو عمومی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، اور کچھ شہنشاہ قسطنطین کی عطا کے باعث۔ (اس کا ذکر اوپر صفحہ (23) پر آچکا ہے)۔

پوپ ساتویں گرے گری نے لکھا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے جب سینٹ پیٹر کو آسمان اور زمین پر حل و عقد کے اقتدار اعلیٰ کا حق عطا کیا تھا تو اس سے کسی شخص کو بھی مستثنیٰ نہیں رکھا تھا، اور اس کے اقتدار سے کسی کو بھی باہر نہیں قرار دیا تھا۔ خدا نے تمام راجدھانیاں اس کے ماتحت بنادیں اور تمام عالم کی

حکمرانیاں اس کے زیر فرمان کر دیں۔ خدا نے اس کو اس دنیا کی بادشاہت کا سردار مقرر کر دیا۔" لہذا سینٹ پیٹر کے جانشین کی حیثیت سے پوپ دنیا کا مالک ہوگا اور یہ چیز اسے ربانی حقوق کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔

قسطنطین کی عطا میں جزیروں کا ذکر تھا۔[۱]

جزیروں کے متعلق حق کا پوپ دوسرے اربان نے بھی ادّعا کیا ہے۔ اور ۱۰۹۱ئہ کے ایک فرمان یا پائی میں یہ لاطینی جملہ ہے کہ "مغربی (سلطنت روما) کے پابند مذہب شہنشاہ قسطنطین نے اپنے ذاتی حق اقتدار کے تحت تمام جزیرے مقدس پیٹر اور اس کے جانشینوں کو عطیے میں دیدیے تھے۔ سالسبری کے جان نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شخص اس سفارت میں شامل تھا جو انگلستان کے دوسرے ہنری نے روما روانہ کی تھی، تاکہ چوتھے آدریاں کو پوپ بننے پر اظہارِ عقیدت پہنچائے۔ چوتھا آدریاں ایک انگریز تھا اور سالسبری کا جان اپنی لاطینی کتاب "ماورائے منطق" میں تذکرہ

870

[۱] ان جعلی احکام پاپائی میں جو اسی دور کی طرف منسوب ہیں، اس کا متن لاطینی میں یوں دیا گیا ہے:-

"ہر گاہ مقدس ترین حواریوں پیٹر اور پاول کے کلیسا کی روشنی پھیلانے کے لیے (؟) ہم اپنے مقدس ترین باپ اور جانشین حواری سلفسٹر اور اس کے تمام جانشینوں کو اپنے ارضی مقبوضات اور دیگر چیزیں دیتے ہیں اور یہ — چاہے مشرق میں ہوں یا مغرب میں نیز چاہے شمال میں ہوں یا جنوب میں، مزید وضاحت کے لیے ہند، یونان، ایشیا، تراقیا (تھریس)، افریقہ، اور اٹلی اور دیگر جزائر — اپنے شہنشاہی مقدس حقوق کے تحت اپنی فیاضی سے عطا کرتے ہیں اور انتہائی حالت ہوش و حواس میں ہمیشہ کے لیے منتقل کرتے ہیں۔" (اسی دور کے

کرتا ہے کہ اس کی استدعا پر پوپ نے بادشاہ کو ائی بر نیا یعنی آئرستان کا علاقہ عطا کر دیا۔ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پرانے حق کے باعث جو قسطنطین کی عطا کے ذریعے سے حاصل تھا، تمام جزیرے کلیسائے روما کے سمجھے جائیں گے۔ ایک بعد کے زمانے میں جب دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں سے دوسرے فریڈرک نے اپیل کی کہ وہ اس کے دنیاوی حقوق کی حفاظت میں مدد دیں، تو اس نے بھی ان ادعاؤں کی طرف اشارہ کیا تھا، جو پوپ کو جزیروں کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ قانونی مولفوں کی کتابوں میں پاپائی تصورات ہی کا عکس نظر آتا ہے۔ چنانچہ بار تولے نے "جزیرے کے متعلق رسالہ" نامی جو لاطینی تالیف لکھی تو چونکہ یہ خود شہنشاہ پسند تھا، اس لئے اپنی عادت کے مطابق اگرچہ یہ اس نظریے کی طرف میلان ظاہر کرتا ہے جس کے مطابق وہ تمام جزیرے جو کسی معینہ مملکت کے بالکل قریب واقع نہ ہوں وہ سب شہنشاہ کے مملوکہ سمجھے جائیں کیونکہ شہنشاہ ہی تمام چیزوں کا مالک ہے، پھر بھی وہ یہ بیان کرتا ہے کہ ان جزائر کے متعلق حق قبضہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اور بار تولے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ پوپوں نے بارہا ایسا کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مختلف موقعوں پر پوپوں نے اس حق کا استعمال کیا تھا جس کا انھیں ادعا تھا۔ چنانچہ ۱۳۴۴ء میں چھٹے کلیمان نے لوی دلا سیردا کو "جزایر خوش نصیب" کا (جن کو آج کل جزائر کناری کہتے ہیں) اقتدار اعلیٰ ایک عطا کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) مصنوعی احکام پاپائی اور انجیلی رامنی کا خط شایع کردہ "ہنشیوس" ص ۲۵۲)۔

ذریعے سے منتقل کردیا تھا اور سالانہ ایک خراج مقرر کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ جزیرے پچاس سال پہلے ہی دریافت ہوچکے تھے۔ پندرھویں صدی میں پرتگال کے بادشاہ نے پوپ پانچویں مارٹن سے استدعا کی کہ جدید دریافت شدہ علاقوں کی ملکیت کی توثیق کردے۔ چنانچہ پوپ نے اس کو وہ تمام علاقے عطا کردیے جو راس یوتزا ڈور (واقع شمال مغربی صحرائے افریقہ) اور راس نوّن سے ہند تک دریافت کئے جائیں۔ ساتھ ہی پوپ نے ان تمام لوگوں کے گناہ معاف کردیے جو اس کوشش میں مرجائیں کہ لوگوں کو عیسائی بنانے میں ہاتھ بٹائیں۔ ۱۴۵۲ء میں پوپ پانچویں نکولاس نے پرتگال کے بادشاہ الفونسو کو اپنے اقتدار پاپائی کی بنیاد پر یہ حق عطا کیا کہ عربوں، لامذہبوں اور دیگر غیر مذہب والے دشمنان حضرت مسیحؑ پر حملہ کرے، مطیع بنائے اور ہمیشہ کے لئے ان کو غلام بنالے۔ پوپ نے اس کو یہ بھی اجازت دی کہ ایسے لوگوں کا مال چھین لے اور خود ان کا مالک بن جائے۔ ۱۴۵۴ء میں اس نے اپنے اس سابقہ فرمان کی توثیق کی، بلکہ وسیع تر حقوق عطا کئے کہ وہ تمام دریافتیں جو افریقہ کے مغربی ساحل پر عمل میں آچکی ہوں یا آئندہ لائی جائیں وہ سب پرتگال کے بادشاہ اور اس کے جانشینوں کی سمجھی جائیں گی۔ جب تصورات کا یہ اندازہ ہو تو جعلی دستاویزیں بھی بن جاتی ہیں۔ چنانچہ جزیرۂ سارڈینیا پر پیزا والوں کو جو دعوے تھے، اس کی تائید کے لئے انھوں نے بیان کیا کہ پوپوں نے ان کو ۱۰۱۶ء اور ۱۰۴۹ء میں اس کا عطیہ دے دیا تھا۔ لیکن یہ عطا نامے بالکل جعلی تھے۔

بعض مشہور فرامین پاپائی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ

371- پوپ چھٹے الگزانڈر نے فردیناند اور ایزابیلا کو وہ تمام علاقے عطا کر دیے جو وہ دریافت کر چکے ہوں یا جن کی وہ دریافت عمل میں لائیں۔ اور وہ اس کے حدود یہ بیان کرتا ہے کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک۔ ان دستاویزوں کی قدر و قیمت کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے اسے قابل نفرت غصب قرار دیا، اور بعضوں نے اسے اہم اور فیصلہ کن تحکیم کی حیثیت سے سراہا ہے۔ خود فردیناند اور ایزابیلا پوپ کی اس عطا کو جو اہمیت دیتے تھے، اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان دونوں حکمرانوں کی سیاسیات کی گہری تحلیل کی جائے۔

جب انگریزی ملاح ڈریک اپنی مہم پر روانہ ہوا، تو اسپین کے دوسرے فلپ کے سفیر منڈوز نے ملکہ الزابتھ سے احتجاج کیا۔ ملکہ نے جواب دیا کہ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اس کی اور یورپ کی تمام دیگر سلطنتوں کی رعایا کو اس امر سے محروم کیا جائے کہ وہ ہند (؟ شرق الہند؟ غرب الہند؟ ہندوستان) سے تجارت کرنے سے محروم رہیں۔ ملکہ نے یہ بھی کہا کہ وہ اس امر کو تسلیم نہیں کرتی کہ اسپینیوں کو پاپائے روما کی عطا کے باعث کوئی حقیت حاصل ہو گئی ہو یا انھیں کسی ایسی جگہ حقوق حاصل سمجھے جائیں جہاں ان کا واقعی قبضہ نہ ہو۔ حقیقت میں ایک صدی پہلے فردیناند اور ایزابیلا نے بھی یہی رائے قایم کی تھی۔ جب کرسٹوفر کولمبس نے سان سالتفادور دریافت کیا تو اس نے اس جزیرے پر قسطیلہ کی ملکہ کے نام سے قبضہ جمایا، اور اسے اس امر سے ذرا بھی سروکار نہ تھا کہ سابق میں پوپوں نے پرتگالیوں کو جو حقوق عطا کر دیے ہیں ان کی اس سے خلاف ورزی ہوگی۔ اور جب فردیناند اور ایزابیلا نے پوپ کے ہاں اپنی استدعا روانہ کی تو انھوں نے یہ واضح کرنا بھی

نہ بھلا یا کہ عالم و فاضل ماہران قانون کی یہ رائے ہے کہ انھیں اپنے حقوق کی توثیق حاصل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ انھوں نے پوپ سے جو استدعا کی ہے، اس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ پوپ کے متعلق اپنے لحاظ و احترام اور اطاعت کا اظہار کریں۔

پرتگالیوں کو متعدد پوپوں کی طرف سے نئی دریافتوں کے متعلق عطایا حاصل ہو چکے تھے۔ اور سب سے پہلا فرمان پاپائی جس میں اسپینیوں کو بھی پرتگالیوں کے مماثل حقوق عطا کیے گئے تھے، وہ ۳ مئی سنہ ۱۴۹۳ء کا ہے۔ دوسرا فرمان جو ۴ مئی سنہ ۱۴۹۳ء کا ہے اس میں اولاً ابتدائی فرمان ہی کے الفاظ دہرائے گئے ہیں، پھر ان حدود کا تعین کیا گیا ہے جہاں سے اسپینیوں کا حصہ شروع ہوگا۔ چنانچہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ایک خط کھینچا گیا جو جزائر آزور اور راس ؤبر دی سے سو فرسخ کے فاصلے سے گزرتا تھا اور وہ تمام ملک جو اسپین والے اس خط کے مغرب میں دریافت کریں اور جس پر کرسمس سنہ ۱۴۹۲ء سے پہلے کسی اور عیسائی سلطنت کا قبضہ نہ ہو چکا ہو، وہ سب اسپین ہی کے سمجھے جائیں گے۔ اسی طرح وہ تمام ملک جو اس خط کے مشرق میں دریافت ہوں وہ پرتگال کے ہوں گے۔

یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا پوپ کا نیا فرمان جو ان دونوں رقیب قوموں میں تقسیمات عمل میں لاتا ہے، وہ اسپین کے سفیر متعینۂ روما کی درخواست پر صادر ہوا یا کیا؟ اسپینی سفیر کی درخواست پر ایسا ہوا ہونا کچھ زیادہ قرین قیاس نہیں بلکہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۳ مئی کو جو فرمان لکھا گیا تھا، اس کے الفاظ کا ابہام ہی اس نئے فرمان کے صادر کرنے کا اصل باعث بنا ہوگا

اس سے پرتگال کے بادشاہ کی جتنی کم تشفی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ چند ہی سال پہلے فردیناند اور ایزابیلا اس امر کا اقرار کر چکے تھے کہ وہ پوپ پانچویں مارٹن کے فرمان کا احترام کریں گے۔ (اور جس میں راس بوہڑا ڈور اور راس نون سے لے کر ہندوستان تک کے تمام نو دریافت علاقے پرتگال کے قرار دیے گئے تھے) ژاں دوم نے تو ایک مہم کی تیاری کی جس کا مقصد افریقہ ہونا ظاہر کیا گیا تھا لیکن جو حقیقت میں ان علاقوں کی طرف بھیجی جانے والی تھی جو کرسٹوفر کولمبس نے دریافت کئے تھے۔ لیکن گفت و شنید شروع ہوئی اور ۷ جون ۱۴۹۴ء کو توردے سی لاس کے معاہدے سے میں خط فاصل کو راس ویردی کے جزائر کے مغرب میں ہٹا کر (۳۷۰) فرسخ پر کر دیا گیا اور قرار پایا کہ اس خط کے مغرب میں جو بھی ہو وہ اسپین کا ہوگا، اور مشرق میں جو بھی ہو پرتگال کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

ہمیں اس واقعے پر زیادہ تکیہ نہیں کرنا چاہئے کہ پوپ کا فیصلہ فردیناند اور ایزابیلا کے باعث بدلا۔ بہر حال ہم یہ کہہ سکتے ہیں غیر مذہب والوں کے علاقے کی فتح کے حق کے متعلق خود ان بادشاہوں کا خیال اس سے کچھ بدلا ہوا نہ تھا جو ان کے دوست انگلستان کے ساتھ ساتویں ہنری کا تھا۔ اس آخرالذکر بادشاہ نے پوپ کی کچھ پروا کئے بغیر اس کی اجازت عطا کر دی تھی کہ اس کا شاہی جھنڈا "امتیوں یعنی لامذہبوں اور غیر مذہب والوں کے جزیروں، ملکوں اور صوبوں میں" گاڑا جائے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ آراگون اور قسطیلہ کے حکمرانوں یعنی فردیناند اور ایزابیلا کے لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ جلد سے جلد وہ اپنے لئے بھی

ایک ویسی ہی حقیت حاصل کرلیں جیسی پرتگالیوں کو حاصل ہوگئی تھی۔ اگرچہ اس حقیت کے متعلق ہر کوئی یہ یقین کامل رکھتا تھا کہ وہ لغو ہے لیکن پھر بھی اس سے اس بات کا موقع مل سکتا تھا کہ وقت حاصل کیا جائے اور ضابطے کی کارروائی عمل میں لائی جائے بلکہ خود ہیر پھیر اور پیچیدگیاں ڈالی جائیں۔ قرون متوسط میں کسی کے حق کا واقعی یا ظاہری احترام کرنے کے متعلق جو خصوصی رجحان پایا جاتا تھا، اس کا مکرر مظاہرہ اسپین کو عطا کی ہوئی اس پاپائی دستاویز کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔

اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا کہ چند مزعومہ ماہرین قانون اور ماہرین تاریخ نے فردیناند اور ایزابیلا کی رضامندی سے "فاتحین" کے رواج کے متعلق ایک عام کلیہ وضع کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو آبادیاں نئے طور سے دریافت ہوں، انھیں چاہیئے کہ اسپین کے بادشاہوں کا اقتدار تسلیم کرلیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ اقتدار پوپ چھٹے الگزانڈر کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے۔ مورخ ہے رے را نے یہ کلیہ قاعدہ جن الفاظ میں دہرایا ہے، اور اس میں جن خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے وہ ان نظریوں سے انتہائی تضاد رکھتے ہیں، جو سولھویں صدی عیسوی میں مستند ترین ماہرین قانون اور ماہرین دینیات بیان کرتے رہے[1]

عرصۂ دراز تک یورپی قوموں کی نوآبادیاتی سیاست اس امر پر مبنی تھی کہ انھیں تو اجارہ داری حاصل رہے۔ اور مادر وطن ہی کو اس کا حق رہے کہ جہاز رانی یا تجارت کرے۔

373

[1] رابرٹ سن نے اپنی تاریخ امریکہ میں اس کے اصل الفاظ نقل کئے ہیں دیکھئے جلد (۱)، نوٹ (۳۶)۔

اسپینی نوآبادکاری میں ایک سہ گانہ عنصر پایا جاتا تھا یعنی چند مہمات پسند، چند کشوری یا باقاعدہ ارباب کلیسا، اور تاجدار[1] - دنیاوی اصول یہ تھا کہ امریکہ کی پوری سرزمین کا مالک تاجدار ہی ہے۔ البتہ وہ اپنی طرف سے سخاوت و خیرات کرتا تھا اور کافی بڑی جاگیریں عطا کیا کرتا تھا۔ امرندیوں یعنی امریکہ کے اصلی باشندوں کے ساتھ ابتداءً حقیقی غلاموں کا سا برتاؤ کیا گیا۔ بعد میں صورت حال منضبط ہونے لگی۔ چنانچہ ان کو قانونی نابالغوں کی حالت میں قرار دیا گیا۔ فتوحات کے آغاز میں ان کے ساتھ بڑا ہولناک سلوک کیا گیا، لیکن بعد میں اس میں نرمی خاص کر اس وقت پیدا ہوئی جب الگ تھلگ رہنے کی سیاست کا اطلاق کیا گیا، نیز افسرانِ شاہی اور اس کے بعد تبلیغی جماعتیں جو زیادہ تر سترھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئیں، اس بات کی کوشش کرنے لگیں کہ گوروں کو ان مقامات پر جانے سے روکا جائے جہاں امرندی بستے ہوں۔

اجنبیوں کو در آنے سے روکا گیا تھا۔ اور اسپینی نوآبادیوں میں اگر کوئی اجنبی جہاز آجاتا تو اسپینی اسے مجرم قرار دیتے۔ شارلکین کے زمانے سے تو اجنبی ہی نہیں بلکہ کوئی ہموطن بھی اس وقت تک جزائر امریکہ کو نہیں جاسکتا تھا جب تک کہ وہ بادشاہ کی صریح اجازت حاصل نہ کرے۔ عموماً یہ اجازت دو سال کے لئے دی جاتی تھی۔ اور اجازت اس وقت تک نہ دی جاتی تھی جب تک کہ کوئی معقول وجہ نہ بتائی جائے[2]۔

خاص کر میکسیکو میں ایک انتہا پسندانہ اجارہ داری اسپینی

---

[1] - پاؤل لروا بولی او کی فرانسیسی تالیف "جدید قوموں کی نوآبادکاری"، صفحہ ۴ و مابعد
[2] - ایضاً

حکومت نے قایم کردی۔ میکسیکو کے اصلی باشندوں کا کام صرف یہ تھا کہ وہ سرکاری خزانے اور تجارت کو مالا مال کرنے کا آلۂ کار بنیں۔ موسیو اے لی زے رکلو[1] نے اس افسوس ناک صورت حال کا بڑا اچھا ہوا تذکرہ کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ قوانین مال کی ہر خلاف ورزی پر سخت سزا دی جاتی۔ اور اکثر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اجنبیوں سے تعلقات رکھنے کی سزا موت مقرر کی گئی تھی۔ طوفان زدہ تک قید کر دیے جاتے بلکہ بعض وقت تو انھیں ہلاک کر دیا جاتا۔ اور اس کا باعث اصل میں یہ ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ اصلی باشندوں کے ساتھ تجارتی تعلقات کی گفت وشنید نہ کرلیں۔ جو راستے ساحل کو جاتے انھیں باقاعدہ ویران کر دیا گیا۔ اور میکسیکو کا پورا ساحلی علاقہ سنسان اور اجڑ گیا.......... نوبت یہاں تک پہنچی کہ ٹیرا کروڈز کی بندرگاہ سے اسپین جانے والا بیڑا تین سال میں صرف ایک مرتبہ روانہ ہوسکتا تھا اور اشبیلیہ یا قادس کے سوا کسی اور بندرگاہ میں جا اترنا ایک خلاف سرکار جرم قرار دیا گیا تھا۔ پارے کی کانوں کی تلاش ممنوع رہی۔ اور ۱۸۰۳ء تک انگور اور زیتون کی کاشت سے روکا جاتا رہا۔ ان تمام چیزوں کا منشا صرف یہ تھا کہ اسپین والوں کے امتیازات کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔

پرتگالیوں کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا کہ مشرق کی تجارت کی اجارہ داری انھیں کو حاصل رہے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ اس میں نہ آ دھمکیں[2]۔ پرتگال کو جن ملکوں پر

---

[1] اے لیزے رکلو کی فرانسیسی تالیف "نئی عالمگیر جغرافیہ" جلد (۱۷) صفحہ ۱۱۳ -

[2] پاؤل لروا بولی او کی کتاب مذکورۂ بالا صفحہ ۴۴۔

374

تسلط حاصل تھا، لزبن ان کی ایک عام منڈی بن گیا۔
پرتگالی تسلط کا طریقہ یہ تھا کہ انھوں نے بنکوں اور قلعوں کا ایک زنجیرہ ڈال رکھا تھا اور کاراک یعنی جنگی بھاڑوں کی مدد سے قیمتی پیداواریں وہاں سے لائی جاتی تھیں۔
ولندیزیوں (ہالینڈ والوں) نے اس امر کی ناکام کوشش کی کہ شمال سے جاکر جاپان اور چین پہنچ جائیں۔ اس کے بعد انھوں نے راس امید کا راستہ اختیار کیا[1]۔ سنہ ۱۶۰۲ء میں "شرکت ہند" نامی کمپنی قایم کی گئی جسے یہ حق حاصل ہوگیا کہ راس مجلاّن سے پرے تجارت کرے، مشرق کی سلطنتوں سے جنگ اور صلح کرسکے، فوجی حفاظت و مدافعت کا اطمینان حاصل کرلے، اور عدل گستری کیا کرے۔ یہاں بھی سوائے اجارہ داری اور سوائے اصلی باشندوں کو نچوڑ ڈالنے کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔
فرانس کے بادشاہوں نے سولھویں صدی میں ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ انگلستان اور صوبجات متحدہ سے بھی پہلے یہ نوآبادیاتی سیاست شروع کرسکتے تھے۔ یہ ایک ایسا نظام العمل تھا، جو کالقئی فی فلسفے پر مبنی تھا۔ اور اس کے مشورے بھی دیے گئے۔ تیسرے آں ری (ہنری) کے دور حکومت کے ابتدائی سالوں میں ایک ذہین شخص فلپ ڈموور نے تھا۔ اس نے اس بات کی زور و شور سے ترغیب دلائی کہ مادر وطن کی توسیع عمل میں لائی جائے، موروثی دشمن سے جنگ کی جائے، دوسرے فلپ کی بادشاہت میں بیرون یورپ جو مقبوضات تھے ان کو فتح کیا جائے، نیز تجارت اور نوآبادیوں کے ذریعے سے بیرون میں عظمت حاصل کی جائے۔ اس مشورے پر کان نہیں دھرا گیا۔ اِدگینو فرقے

---

[1] پاؤل لروابولی او کی کتاب مذکورۂ بالا صفحہ ۶۱۔

کے لوگوں کا پیچھا کر کے ان کو تباہ کرنا زیادہ بہتر فریضہ سمجھا گیا۔ اور کیتھولک فرقے کے اندر اتحاد برقرار رکھنے کے لئے ہر چیز کو قربان کر دیا گیا۔

سولھویں صدی کے آغاز میں چند کمزور سی کوششیں کی گئیں سنہ ۱۵۱۸ء سے دو فرانسیسی یعنی ڈلری اور سین ژوست اس بات کی تجویزیں کرنے لگے تھے کہ شمالی امریکہ کی سرزمین میں نو آبادکاری کی جائے۔ لیکن نتیجہ نفی تھا۔

سنہ ۱۵۲۴ء میں فلارنس کا ایک باشندہ ویرات سانی فرانسیسی جھنڈا اڑاتے ہوئے بحری سفر کرتا ہے۔ اور شمالی امریکہ کے ساحلوں پر آکاڈیا اور فلوریڈا کے مابین قطع مسافت کرتا ہے۔ جو سرزمینیں دریافت ہوئیں، ان کو "نئے فرانس" کا نام دیا گیا۔ سنہ ۱۵۳۴ء میں ژاک کارتیے نے ان ساحلوں کی تحقیق کی جو بعد میں "نئی سرزمین" "نیا اسکاٹ لینڈ" اور نیا برونزویک سے موسوم ہوئے۔ اس بحری سیاح نے خاص کر ان دو علاقوں پر قبضہ کیا جہاں بعد میں کوے بک اور مونٹ ریال آباد ہوئے۔ اور یہ قبضہ فرانسوا اول کے نام سے کیا گیا۔ جب یہ فرانس واپس ہوا، تو اس نے بادشاہ کے سامنے ایک مکمل تجویز رکھی۔ اور بادشاہ نے ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۵۴۰ء کو تین مسلح جہاز، جن میں پندرہ مہینوں کا آذوقہ تھا، اس کی تحویل میں دیئے۔ جب یہ بحری سفر کامیاب اختتام کو پہنچ گیا، تو فرانسوا اول نے طے کیا کہ نو دریافت علاقوں میں کوٹھیاں قایم کرے۔ موجودہ کینیڈا بھی اس کا ایک جزء تھا۔ یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ سنہ ۱۶۰۳ء میں فرانس ہی کی طرف سے ایک کوشش اور عمل میں لائی گئی۔ دوران کوشاں پلیں نے کوے بک کی بنیاد رکھی۔ پھر سنہ ۱۶۴۱ء میں مونٹ ریال آباد کیا گیا۔ اس کے کوئی بیس سال بعد کول بیر

375

کی وزارت کے زمانے میں نوآبادی میں مستحکم ادارے قائم کئے گئے۔
اوگینو فرقے کے فرانسیسی، نوآبادکارانہ سیاست کا پرچار کرتے رہے اور اس پرچار میں وہ نظائر کا بھی حوالہ دیتے رہے۔ اصلاح کے دور یعنی ۱۵۵۵ء ہی سے ٹیل گائیں یوں کے نکولا دیوراں کے حکم سے برازیل کے ساحلوں پر چند ایک کوٹھیاں قایم ہو گئی تھیں۔ اور خلیج جنوری کے ایک چھوٹے سے جزیرے میں قلعۂ کولیں یی تعمیر کیا گیا تھا۔ دو مہمیں فلوریڈا کی طرف روانہ کی گئیں۔ فرانس کے تعلقات اسپین کے ساتھ صلح اور مسالمت کے تھے لیکن دوسرے فلپ نے یہ طے کرلیا کہ ایک ایسی نوآبادی کو تباہ کردے جہاں کے قریب قریب تمام باشندے ملحد تھے۔ بادشاہ نے اپنی تجویز کے نفاذ کے لئے پیدڑو مے نیدیذ دے آبیلا کا انتخاب کیا۔
چنانچہ اسے اجازت ملی کہ پانچ سو سپاہیوں، مزدوروں، پادریوں، اور یسوعی فرقے کے لوگوں (جیسوئیٹ) کو امریکہ منتقل کرے۔ اس شخص نے وعدہ کیا کہ تین سال میں وہ علاقہ فتح کرے گا، جہاں فرانسیسی کوٹھیاں ترقی کر رہی تھیں۔ فرانسیسی حکومت کو اس تجویز کی بھنک پہنچ گئی۔ میدی سیس کی کاترین نے اپنی سفیر متعینۂ پاریس سے پوچھ گچھ کی اور اس نے کہا کہ: "ہم خیال کرتے ہیں کہ دوستوں کی رعایا میں باہمی تجارت بے کھٹکے اور آزادانہ ہونی چاہیئے"۔ اس کے باوجود بھی بادشاہ فلپ اپنی تجویز کے جاری رکھنے میں تامل نہیں کرتا اور فرانس کی اس تنبیہ پر سرد مہری برتتا ہے۔ چنانچہ وہ اس پر تلا رہا کہ کولینیلی نے جس کام کی تجویز سوچی تھی، اسے نیست و نابود کردے۔
نوآبادکاری کی سیاست اصل میں کالفی نی فلسفے کی وسیع تجویز کا ایک جزء تھی۔ کال ڤین کے پیرؤں میں جو تعمیری ذہنیت

پائی جاتی تھی، وہ بالکل اس کے مطابق ہے۔ کالفی نیوں کو اسپین سے جو نفرت تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا۔ کیونکہ اسپین ہی روما کے بڑے بڑے کاموں کی تعمیر کیا کرتا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ کالفین کو اسپین کے خلاف جو نفرت تھی وہ بظاہر اس کو اوگینو فرقے والوں کو وراثت میں منتقل کر رہا تھا اور وہی نفرت ہالینڈ اور انگلستان کے لوگوں میں بھی سرایت کر گئی۔ 376

نوآبادیاتی کوششیں انگلستان میں کافی دیر سے شروع ہوئیں اس کی ذمہ داری خاص کر الزابتھ پر ہے۔ اس نے بحریے پر جیسا چاہیئے، توجہ نہیں کی تھی۔ اس نے خانگی مہمات پسندوں کو تنک مدد اور اعانت کرنے میں غفلت برتی تھی، حالانکہ یہی لوگ اپنے وطن کے لئے صحت اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہے تھے۔ ڈریک، ہاکنس اور فرابشر نے جو بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں، ان کا ذرا بھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں کہ ملکہ کو مشورے نہ دیے گئے ہوں۔ سرہمفرے گلبرٹ، جارج پیک ہام، کار لائل، مشہور ریاضی داں ہیرٹو اور سر والٹر رالے نے بہترین یادداشتیں پیش کی تھیں اور بعد میں انھیں یادداشتوں کی سفارشوں کو نافذ کیا گیا تھا۔ اگر ان یادداشتوں پر فوراً عمل کیا گیا ہوتا تو انگلوسیکسن نسل ترقی کی راہ میں پچاس برس پیچھے نہ رہ گئی ہوتی۔ اسپین کی نوآبادیاتی سیاست میں سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ یہ پوری کی پوری سیاست زر کی خواہش پر مبنی تھی۔ اسے سونے اور چاندی کی کانیں درکار تھیں۔ سولھویں صدی کے اختتام ہی پر ممتاز انگریزوں نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ نظریہ مہمل ہے۔ سر والٹر رالے نے ہیرٹو کو اس امر پر مامور کیا تھا کہ سب سے پہلی نوآبادی کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرے۔ اس نے

۱۵۸۰ء میں ایک سرکاری دستاویز تیار کی کہ کسی نوآبادی کے لئے سونا اور چاندی ہی سب کچھ نہیں ہے، یہ کہ سب سے مالدار ملک وہی ہے جو سب سے زیادہ انسانوں کو پالے اور یہ کہ پوری نوآبادیاتی سیاست کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ نئے میدان ہائے عمل تلاش کئے جائیں اور بے کار اور بچی ہوئی آبادی کو کام پر لگایا جائے نیز تبادلۂ اشیاء عمل میں لایا جائے اور بحریے کو بڑھایا جائے۔

جس طرح کابوٹو کو منشور عطا کیا گیا تھا، اسی قسم کے مختلف منشور الزابیتھ کے زمانے میں عطا ہوئے۔ ۱۵۷۸ء میں ملکہ نے سر ہمفرے گلبرٹ کو ایک منشور کے ذریعے سے اس کا اختیار عطا کیا تھا کہ تمام لامذہب اور وحشی لوگوں کے علاقے دریافت کئے جائیں، اور جن پر ابھی تک عیسائی حکمرانوں یا قوموں کا قبضہ نہ ہوا ہو، ان پر تسلط جمالیا جائے۔

چنانچہ اصل انگریزی الفاظ میں "ایسے دور دراز لامذہب اور وحشی علاقوں، ملکوں اور سرزمینوں کی دریافت، تحقیق اور تلاش عمل میں لائی جائے جن پر فی الواقع کسی عیسائی حکمران یا قوم کا قبضہ نہ ہو۔ اور اس بارے میں اسے، اس کے جانشینوں اور اس کی طرف سے جن لوگوں کے ذمے کوئی کام کیا گیا ہو، ان سب اور ان میں سے ہر ایک کی رائے میں جو مناسب معلوم ہو کیا جائے اور اس کو نیز اس کے جانشینوں اور اشخاص مفوضہ کو ایسے علاقوں کے لینے، ان پر قبضہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حق ہوگا۔ اس میں ہر قسم کی منفعتیں اور اختیار سماعت و حقوق شاہی (رایلٹی) داخل ہوں گے اور تری اور خشکی دونوں پر اس کا اطلاق ہوگا"[1]

۱ ہاک لوئٹ کی انگریزی تالیف "انگریز قوم کے اہم دریائی سفر، تجارت اور دریافتیں" جلد (۳) صفحہ ۱۳۵۔

377

الزابتھ کی حکمرانی کی ایک خوبی کی داد دینی البتہ انصافاً ضروری ہے۔ ۱۵۸۲ء میں مشیر امراء نے فنٹن کو شرق الہند اور چین کی زیر تیاری مہم کے متعلق ہدایتیں دی تھیں۔ چنانچہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ عیسائیوں سے دوچار ہوں تو ان سے کوئی چیز نہ چھینی جائے اور بغیر قیمت ادا کرنے کے ان سے کوئی چیز نہ لی جائے۔ ساتھ ہی اسے یہ حکم دیا گیا کہ عیسائیوں کی طرح لامذہبوں سے بھی اچھے اور ایماندار تاجر کی حیثیت سے اسے چاہیئے کہ اخلاق کا برتاؤ کرے۔

شرکت شرق الہند (ایسٹ انڈیا کمپنی) کا قیام اس دور حکومت کے بڑے کاموں میں سے ایک تھا۔ اس سے پہلے متعدد مرتبہ الزابتھ سے التجا کی جا چکی تھی کہ ایسی شرکت کے قیام کا منشور عطا کرے لیکن اس نے ہمیشہ اسے اس بنا پر نامنظور کر دیا گیا تھا کہ اس وقت بلکہ اصل میں اسپین کے بادشاہ سے گفت و شنید میں لگی ہوئی تھی کیونکہ اسپین کے بادشاہ نے پرتگال کا الحاق کر لیا تھا۔ ۱۵۹۹ء میں لندن کے تجارت پیشہ مہمات پسندوں نے ایک ایسی شرکت قایم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی استدعا کی تائید کے لئے ایک یادداشت مرتب کروائی جس میں پرتگال اور اسپین کے ادّعاؤں کے باعث جو اعتراض کیا جا سکتا تھا، اس کا جواب دیا تھا، اور ایک فہرست دی کہ پرتگال اور اسپین نے مشرق میں کیا کیا مقبوضات حاصل کر لیے ہیں۔ ایک اور فہرست مالدار ممالک کی ایک طویل تعداد پر مشتمل تھی جو نہ تو اسپین و پرتگال کے اقتدار اعلیٰ میں تھے اور نہ کسی اور (عیسائی ؟) قوم کے۔ اور جہاں صرف تاجروں کے جانے کی ضرورت تھی۔

یہ یادداشت محنت اور احتیاط کے ساتھ مرتب کی گئی تھی۔ اس میں اس کا بھی ذکر کیا گیا تھا کہ مزعومہ ادعاء کن اسناد پر مبنی ہے۔

چنانچہ بتایا گیا ہے کہ یہ یا تو پرتگال، اسپین، اٹلی، انگلستان اور ہالینڈ کے ملاحوں کی تحریروں پر مبنی ہیں یا تلاش و تفتیش کرنے والے لوگوں کی، جن کے نام بھی بتائے گئے تھے، نیز زبانی شہادتوں پر مبنی ہیں؛ یا یہ کہ خود سرکاری دستاویزوں پر۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک پرتگالی رجسٹر کا بھی ذکر ہے جو ہندوستانی حکمرانی کے متعلق تھا اور جسے ۱۵۹۲ء میں چھین لیا گیا تھا۔

منشور ۳۱ر دسمبر ۱۶۰۰ء کو عطا کر دیا گیا۔

پہلے جیمس کے عہد حکومت میں ۱۰ر اپریل ۱۶۰۶ء کو ایک منشور ایک ایسی جماعت کے لئے عطا ہوا جو بارتیلمی گوس نولڈ کی دریافت کردہ سرزمینوں سے استفادہ کرنے کے لئے قایم ہوئی تھی۔ اس دستاویز میں شرکائے شراکت کو دو حصوں یا جماعتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک میں لندن اور اس کے مضافات کے لوگ تھے، اور دوسری میں مشرقی علاقے کے اور خاص کر برسٹل، ایک زیٹر اور پلے متھ کے لوگ تھے۔ ہر دو میں امراء، شہامت باز (نائٹ) اور تاجر شامل تھے اس منشور نے اصل میں صرف ایک ہی نوآبادی قایم کرنے میں مدد کی جسے لندن کی شراکت نے بسایا تھا۔

اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں نوآبادکاری کی قابل لحاظ سرگرمی رہی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ دیگر تمام قوموں کی نوآبادیوں کی طرح سے اس کی سیاست بھی تامین پر مبنی تھی۔ اس کی آزادی نہ تھی کہ جو چاہے نوآبادیوں میں جا بسے، بلکہ ضرورت تھی کہ یا تو وہ بادشاہ کی رعایا ہو یا رعایا بننا قبول کرے اور اس کا وعدہ کرے[1]۔

878

[1] ۔گوگی کی فرانسیسی تالیف "منشور ہائے نوآبادیات اور شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ کے دستور" جلد (۱) صفحہ ۱۱۔

379

باب شانزدہم

سمندروں کی آزادی

قانون روما کے تحت سمندر ان چیزوں میں داخل ہے جو قانون قدرت کے مطابق سب کے لیے عام ہیں۔ قرون متوسط میں جب بحری تجارت اہمیت اختیار کرنے لگی اور وہ دولت عامہ کے اہم عوامل میں سے ایک ہوگئی تو پھر ایسے ادعا پیدا ہونے لگے جو بعض سمندروں پر حکمرانی جتانے کے متعلق تھے۔

ونیس ان تمام جہازوں سے قابل لحاظ محصول وصول کیا کرتا تھا جو بحر آدریاتیک میں سفر کرتے یعنی راس رافین سے لے کر خلیج فیوم تک۔ ترے ویز، پادوا، فیرارے۔ راقنا اور آن سون کے باشندے بھی اسی طرح یہ محصول ادا کرنے پر مجبور تھے، جس طرح جے نوا، پیزا، سسلی (صقلیہ) اور مشرقی ممالک کے باشندے۔ بولونیا نے اس پر احتجاج کیا اور اپنے منصفانہ دعووں کی تائید کے لئے ہتھیاروں پر تکیہ کیا۔ اُسے

شکست ہوئی اور صلح کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ خراج ادا کرے گا۔

شہر آں شون نے پوپ کے احکام سے استدلال کیا۔ جب آں سون کو بھی شکست ہوئی تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ؤینیس کو، اس کے عائد کردہ محصول کے باعث، بحر آدریاتیک پر آقایانہ اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہے۔

مزید برآں یہ دعوائے اقتدار اعلیٰ اس امر پر بھی مبنی تھا کہ پوپ تیسرے الگزانڈر نے یہ چیز عطا کی تھی۔ جمہوریہ ؤینیس نے فریڈرک بار بروسہ کے مقابلے میں پوپ کی تائید کی تھی اور ممنونیت کے اظہار کے لیے پوپ نے ؤینیس کے ڈوجے (سردار) کو ایک انگوٹھی عطا کی تھی جو سمندر کی شہنشاہیت کی علامت تھی۔

380

مختلف شہروں نے اس ادائی سے مستثنیٰ کیے جانے کی خواہش کی، اور اپنے جہازوں کی خاص طور سے حفاظت کرنے کی التجا کی —— یہ ؤینیس کی برتری کو تسلیم کرلینا تھا۔ ؤینیس چوکسی کرتا رہا کہ کہیں بحر آدریاتیک میں اجنبی جنگی جہاز نہ گھس آئیں۔ جب پوپ دوسرے پائیس نے چند جنگی کشتیاں آں سون بھیجنی چاہیں تو ؤینیس نے اس کی اجازت دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ خلیج کی حفاظت اس کے فرائض میں داخل ہے۔ جے نوا اور پیزا نے بھی علی الترتیب بحیرۂ لی گوریان اور بحیرۂ تیرنیان پر اپنی انفرادی ملکیت جتانے کی کوشش کی۔

خاصے ابتدائی زمانے ہی سے انگلستان کا قانون عمومی یہ نظریہ تسلیم کرتا رہا کہ ملک کے متصل سمندروں پر تاجدار انگلستان ہی کا اقتدار اعلیٰ پایا جاتا ہے۔ براکٹن کا ہنری بیان کرتا ہے کہ انگلستان کے چار سمندر ہیں، جن تک وہاں کے تاجدار کا

اختیار سماعت پھیلا ہوا ہے۔

جب راس امید کا راستہ دریافت ہو گیا تو پرتگالی ادعا کرنے لگے کہ وہ علاقہ گنی اور شرق الہند کے سمندروں کے مالک ہیں۔ اپنی نوبت پر اسپینیوں نے ادعا کیا کہ وہ امریکہ کے سمندروں کے مالک ہیں۔

ڈنمارک اور ناروے کے بادشاہ بھی یہ امر جتاتے رہے کہ جن سمندروں کی موجیں ان کے علاقوں کے ساحل کو تھپیڑے لگاتی رہتی ہیں، ان پر صرف انھیں کو حقوق حاصل ہیں۔

ان ادّعاؤں کی تائید کے لئے سرگرم حامی پیدا ہو گئے۔ اور اس پر کتابیں تالیف کیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں مکتب "شارحین" کے متعدد ماہرین قانون نے ضمناً وینیس کے حقوق کو تسلیم کر لیا تھا۔ پندرھویں صدی میں بارتیلمی گے پولا صریح الفاظ میں تسلیم کرتا ہے کہ وینیس والوں کو خراج وصول کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ اس کے لاطینی الفاظ میں "ان کو سمندرو میں بھی اتنا ہی اختیار سماعت حاصل ہے جتنا وینیس کے شہروں میں"۔ ۱۶۷۲ء میں رافائیل فل گوسے اور رافائیل دے کورس نے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا نام "وہ وجوہ جن کی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ وینیس کو خلیج کی ملکیت حاصل ہے" تھا۔

سترھویں صدی میں خاصی کثیر تعداد ایسے مقالوں کی ملتی ہے جو اطالوی میں مولفوں نے اپنے اپنے شہروں کے متعلق لکھے تھے۔ ایسے اہم مقالوں میں سے ایک مارک انتوان پیے ریگ ریتو کا ہے جو پادوا میں پروفیسر تھا، اور اس نے ایک مرتبہ لندن میں ایک مقدمے کی بطور وکیل پیروی کی تھی جس میں فریق ثانی کی طرف سے البیری کس

جنتی لیس پیروی کر رہا تھا۔[1] مزید براں کور نے لیوس فراگی یانو کی تالیفوں اور فراپاولو ساربی کے دو رسالوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلی تالیف اطالوی میں ہے اور دوسری لاطینی میں اور آخرالذکر طباعت کے وقت مولف کا نام فرانسس کس دے انگے نورٹس درج تھا۔ مذکورۂ بالا تینوں مولفوں نے ان ادعاؤں کی تائید کی تھی جو وینس کو بحر آدریاتیک کے متعلق تھے۔ پینیر باپ تیسیت اور گوسنے بحیرۂ لی گوریان کے متعلق جینوا کے ادعاؤں کی تائید کی تھی۔

بہرحال یہ امر قابل ذکر ہے کہ سمندر کی آزادی کے اصول کی حمایت کرنے والے مولف بھی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ اُو بالدی کا آنجیلو اس معاہدے کی شرح کرتا ہے جو وینس اور جینوا میں ہوا تھا۔ اور چودھویں صدی عیسوی ہی میں بیان کرتا ہے کہ "سمندر اور اس کے کنارے ویسے ہی عمومی ملک ہیں جیسے پانی اور ہوا۔ قانون قدرت اور قانون بین الممالک بھی حکم دیتے ہیں۔" البتہ اس نے یہ تسلیم کیا کہ طویل تسلط کے ذریعے سے ایک ایسی چیز ضرور وجود میں آجاتی ہے جسے "مماثل قبضہ" امر کہا جا سکتا ہے۔[2]

نکولاس اے فرنارڈی نے جو مالی نیس کی مجلس عام کا ممتاز صدر گزرا ہے، ۱۵۱۶ء میں ایک لاطینی کتاب شائع کی جس کا نام "قانونی مسائل جن میں قانونی دلائل کے حوالے بھی ہیں" تھا۔ اسی طرح اس نے ایک لاطینی کتاب لکھی جس کا

---

[1] نیس کا مضمون "سر جولیس سیزر کے مخطوطات" فرانسیسی "رسالۂ قانون بین الممالک و تقابلی قانون سازی" جلد (۱۹) میں دیکھیے صفحہ ۳۶۶۔

[2] آبالدی کے آنجیلو کی لاطینی تالیف "دلائل" ، ویل (۲۸۰)۔

نام "قانونی فتاوی کے مطابق مشورے" تھا۔ یہ دونوں کتابیں اس کی موت کے بعد چھپیں[1]۔ علاقۂ زے لانڈ کے شہر زیرک زے میں اور ہالینڈ اور زے لانڈ کے کونٹ کے نائب میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ اس سلسلے میں نکولاس اے ڤرہارڈی نے رائے دی تھی کہ تمام سمندروں اور دریاؤں میں جہازرانی کو آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ اس کے خیال میں سوائے شاذ صورتوں کے جہازرانی پر محصول عائد نہیں کئے جا سکتے اور نہ کسی بندرگاہ کے داخلے پر محصول وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس کے خیال میں ایسا حق یا تو پوپ کی عطا کے باعث ہوگا یا شہنشاہ کے حکم سے، یا رومیوں کے بادشاہ کے حکم سے، یا جملہ فقہائے عیسائیت کی مجلس شوریٰ کے حکم سے یا کسی نہایت قدیم رواج کے باعث۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ان صورتوں میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ حق قدامت کے باعث آزادی حاصل رہے۔ اور ملاحوں

382

[1] نکولاس اے ڤرہارڈی (اے ڤرہارڈ کا بیٹا نکولاس) مڈل بورگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا تعلق گریبس کرک کے شریف خاندان سے تھا اور روایت ہے کہ وہ نارمنڈی کے سرداروں میں سے ایک کی اولاد میں ہے۔ اس کے قریب قریب سب ہی بیٹے نظم و نسق، سیاست کاری، قانون اور ادبیات میں ممتاز ہوئے۔ اے ڤرہارڈ نکولائی کو شہر مالی نیس کی مجلس عمومی کا صدر بنایا گیا۔ گرودیوس ایک اچھا شاعر تھا اور اس نے شارل کین کی طرف سے متعدد نازک سفارتی فرائض انجام دیئے۔ اوریان ماریوس نکولائی نے "گیبا آسوریس" کے نام سے ایک عاشقانہ نظم لکھی تھی۔ یہ گلڈر کی ڈیوکی اور سوت فین کی کونٹی کا چانسلر بنا۔ ژان سکوس نے "باسایا" (بوسے) نامی تالیف لکھی، جو داستان ہائے عیش پر مشتمل ہے۔ نکولاس اے ڤرہارڈی کے پوتے اور پڑپوتے بھی اپنے ممتاز خاندان کی شہرت باقی رکھنے والے تھے۔ عرصۂ دراز تک یہ نظر آتا رہا کہ جنوب کا کیتھولک علاقہ ہو کہ شمال

اور ان کے تجارتی اسباب پر محصول وصول کرنے کا حق اس صورت میں ساقط ہو جاتا ہے جب کچھ عرصے تک اس حق کو حکام مقتدرہ استعمال نہ کریں۔

سولھویں صدی میں فرانسکانی سلسلے کا راہب فرانسوا الفونسو دے کاسترو ایک لاطینی کتاب تالیف کرتا ہے جس کا نام "قانون تعزیرات کا اقتدار" تھا۔ اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ "ان لوگوں کی رائے مشتبہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جے نوا بلکہ خود وِنیس والے بھی دوسرے لوگوں کو خلیج جے نوا اور بحر آدریاتیک میں جہاز رانی سے اس بناء پر روک سکتے ہوں کہ انھیں موجوں پر حق قدامت حاصل ہے"[1] وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "یہ خیال نہ صرف قوانین موضوعہ کے خلاف ہے بلکہ قانون قدرت کے بھی اور بنیادی قانون بین الممالک کے بھی جو غیر متبدل پذیر ہے"۔ فرانسوا الفونسو دے کاسترو ان پرتگالی مؤلفوں کی رائے کی بھی مخالفت کرتا ہے جو یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے بادشاہ کو شرق الہند کی جہاز رانی پر حق قدامت حاصل ہے۔ اسی طرح وہ ان اسپینی مؤلفوں کی بھی مخالفت کرتا ہے جو اپنے ملک کے حکمران کے متعلق غرب الہند کے سلسلے میں اسی طرح کے ادعا کرتے ہیں۔ آخر میں وہ یہ اضافہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا پروٹسٹنٹ، سب جگہ عدالتوں میں اسی خاندان کے افراد سارگزار تھے۔ سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں اسی خاندان کی ایک شاخ شہر انگول اشٹاٹ کو متعدد عالم و فاضل پروفیسر مہیا کرتی ہے، نیز باویریا کے ڈیوکوں کو اچھے اچھے مشیر فراہم کرتی ہے پھر سب ختم ہو گیا۔ یہ سلسلہ جو عرصے تک شاہ بلوط جنگل کے تناور درخت کی طرح مغرور تھا، جو عمر رسیدہ ہونے پر ضعیف اور خستہ ہو جاتا ہے، اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔

[1] فرانسوا الفونسو دے کاسترو کی لاطینی تالیف "قانون تعزیرات کا اقتدار" کتاب (۲) باب (۱۴)

کرتا ہے کہ اس واقعے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں (لاطینی میں) "کیونکہ کارگزار اور بیمار میں فرق ہونا چاہئے (۹)۔"

اسی زمانے میں فردیناند ثاس کیس مِن شاکا بھی حقیقی اصول کو ترقی دیتا ہے، اور بیان کرتا ہے کہ قانونِ قدرت نیز غیر تبدل پذیر بنیادی قانون بین الممالک کے یہ امر خلاف ہوگا کہ سمندر اور موجیں کسی ایک شخص کی ملکیت ہو جائیں۔ چنانچہ وہ فرانسوا الفونسو دے کاسترو کے بیان کو دہراتے ہوئے کہتا ہے کہ "سمندر اور تمام اشیائے غیر منقولہ ابتداءً عمومی ملکیت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگر زمینوں کے متعلق یہ چیز بدل چکی ہو تو سمندروں کے متعلق تو نہیں بدلی ہے"۔[له]

سمندروں کی آزادی کا مسئلہ گروتیوس نے اٹھایا۔ ۱۵۹۷ء میں ہالینڈ کا ایک بیڑا پہلی مرتبہ شرق الہند کے سمندروں میں داخل ہوا تھا اور پرتگالی چاہتے تھے کہ وہاں کسی اور قوم کو نہ آنے دیں۔ صوبجات متحدہ (ہالینڈ) کی اس زمانے میں اسپین کے بادشاہ دوسرے فلپ سے جنگ ہو رہی تھی۔ اگرچہ دوسرا فلپ اپنی ماں ایزابیلا کے حقوق سے استدلال کرتے ہوئے ۱۵۸۰ء میں پرتگال کا بھی تاج شاہی زیب سر کر چکا تھا لیکن صوبجات متحدہ صرف اسپین سے برسرِ جنگ تھے، پرتگال سے نہیں۔ پرتگال والوں نے محض اس ادعا کی بناء پر کہ انھیں انفرادی ملکیت حاصل ہے، ہالینڈ کے جہاز رانوں کو بحری قزاق قرار دینا شروع کیا۔ اور جب ۱۶۰۲ء میں ہالینڈ کی شرکت شرق الہند نے اپنا کاروبار شروع کیا تو اسے بے شمار مشکلیں

383

له فردیناند ثاس کیس مِن شاکا کی لاطینی تالیف "مشہور جھگڑے" کتاب نمبر (۲) باب (۸۹) ف ۳۰۔

پیش آنے لگیں۔ البتہ اس شراکت کے جہازوں نے بھی جارحانہ اقدام کیا اور پرتگال والوں سے قابل لحاظ مال لوٹ لیا۔

اس شراکت کے ارکان عقلمند تھے۔ اس لیے انھوں نے اس مال غنیمت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے وہ غیر منصفانہ خیال کرتے تھے۔ جب یہ جھگڑا بڑھا تو گروتیوس نے بحری غنیمت کے قانون پر ایک رسالہ لکھا۔ اس لاطینی رسالے کا نام "قانون غنیمت" ہے۔ لیکن اس نے اسے شائع نہ کیا اور پہلی مرتبہ یہ کتاب ۱۸۶۸ء میں چھپی۔

۱۶۰۸ء میں گفت و شنید شروع ہوئی اور بالآخر ۹ اپریل ۱۶۰۹ء کو صلحنامۂ آن ویر پر دستخط ہوئے۔ اس کی رو سے اسپین نے یہ ادعا کیا کہ وہ صوبجات متحدہ کو شرق الہند میں تجارت سے ممنوع قرار دیتا ہے۔ ہالینڈ کی شراکت شرق الہند نے رائے عامہ سے اپیل کرنی چاہی۔ اور اسی کی استدعا پر گروتیوس نے اپنی تالیف سے وہ باب الگ کر دیا جو سمندروں کی آزادی کے متعلق تھا۔ یہ رسالہ مولف کے نام کے بغیر لاطینی میں "سمندروں کی آزادی، جس کے حقوق کے باعث ہالینڈ والے ہندوستان سے تجارت کرنے کا حق رکھتے ہیں" کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن اس پر کسی نے توجہ نہ کی۔ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو اس وقت بارہ سال کے لئے ایک صلح ہو گئی تھی اور ہندی سمندروں میں جہازرانی کا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔

گروتیوس کی تالیف پر شروع میں اسپین اور پرتگال والوں نے تردید نہ لکھی تو اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ تیسرے فلپ کی حکومت نے ایسی کتابوں کو چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کیا جو ہالینڈ والوں کے ادعاوں کی مخالفت پر مبنی ہوں۔ لیکن جب چوتھا فلپ تخت نشین ہوا تو ۱۶۲۵ء

ین ہیر افین دے فرائی تاس نے ایک رسالہ شائع کیا جو اس حکمران کے نام معنون تھا اس لاطینی رسالے کا نام "پرتگالیوں کی ایشائی شہنشاہی کی حقیت اور گروتیوس کی تالیف موسوم بہ سمندروں کی آزادی کی تردید" تھا۔
یہ قابل ملاحظہ رسالہ ہے۔ اس کا مولف غیر معمولی اور نادر قابلیت کے ساتھ ایک نامناسب چیز کی تائید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے مولف فرائی تاس نے وہ تمام وسائل اختیار کئے ہیں جو کسی دقیقہ رس اور ہوشیار بحاث کے بس میں ہوں اور اس نے اپنے استدلال کی تائید میں بکثرت دیگر مولفوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔
"سمندروں کی آزادی" نامی کتاب میں صرف پرتگالیوں اور اسپینوں کے ادعاوں سے بحث تھی۔ یہ انگلستان ہی تھا جس کے احتجاجوں کے باعث اس چھوٹے سے رسالے کو اتنی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔
اپنے علاقے کے اطراف کے سمندروں کی ملکیت اور اس پر اقتدار اعلیٰ اپنے تاجدار کو حاصل ہونے کا جو نظریہ (انگریزوں نے) پیش کیا تھا تو اس سے ناگزیر یہ نتیجہ بھی نکلا کہ وہاں مچھلی کا شکار کرنے کا حق بھی تاجدار ہی کو حاصل ہے۔ بہرحال مختلف معاہدوں کے ذریعے سے اجنبیوں کو یہ حقوق بعض وقت عطا کیے گئے تھے کہ "امن کے ساتھ ہر طرف سمندر پر جائیں تاکہ مچھلیوں کا شکار کرکے اپنی بسر و برو کا سامان کریں"۔ چنانچہ پندرھویں صدی کے آغاز میں برگنڈی کے ڈیوک کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہی طے ہوا تھا۔ "عظیم الشان رابطے" میں بھی، جیسا کہ ہم اوپر (صفحہ 75 پر) تحریر کر چکے ہیں، یہی قرار دیا گیا تھا۔
یہ ناگزیر تھا کہ جھگڑے پیدا ہوں۔ چنانچہ پندرھویں صدی کے وسط میں ایک انگریز شاعر نے اپنی تالیف "انگریزی سیاست کی

ہنک" میں اس عظیم سیاسی حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ انگلستان کی قوت خشکی سے کہیں زیادہ سمندر میں ہے اور اس نے اپنے ہموطنوں کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ شہنشاہت حاصل کی جائے جس کا انھیں حق حاصل ہے۔ اس مشورے پر بہرحال کان دھرا گیا اور مختلف مراحل کے بعد انگریزی بحر سیے نے قابلِ لحاظ اہمیت حاصل کرلی۔

اس ملک کی بحری قوت کا سکہ زیادہ تر جنگی جہازوں نے بٹھایا۔ اسی کے باعث خونریز جھگڑے پیدا ہوئے جس میں فریقین منفعت اندوزی کے جذبات سے یقیناً مملو تھے لیکن پھر بھی ان بہادرانہ کارگزاریوں میں وطن پرستی بھی اثرانداز تھی۔

ہندوستان (بشمول شرق الہند و غرب الہند) میں انگریزوں نے پرتگالیوں، اسپینیوں اور ولندیزیوں پر دھاوا کیا۔ جلدی ہی یورپ میں مچھلی کے شکار کا مسئلہ انگریزی اور ولندیزی ملاحوں میں نازک ترین اختلافات پیدا کرنے کا باعث بن گیا۔

۱۵۸۰ء ہی سے دور اندیش انگریزوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ مچھلیوں کے شکار کو بطور ایک قومی اجارہ داری کے ترقی دیں۔ اس تامینی سیاست کے سلسلے میں تدابیر کا ایک سلسلہ اختیار کیا گیا۔ چنانچہ ۱۶۰۹ء میں ایک اعلان شاہی کے ذریعے سے اجنبیوں کو اس کی ممانعت کی گئی کہ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرستان کے تینوں علاقوں کے سمندروں اور ساحلوں کے کنارے مچھلی کا شکار کرنے آسکیں۔

ولندیزیوں کے لیے یہ وار بہت سخت تھا۔ چنانچہ گفت و شنید شروع کی گئی اور دو موقعوں پر سفیر لندن آئے دوسرے موقع پر گروتیوس بھی شریک تھا۔ ۱۶۱۵ء میں یہ جھگڑا تلخ ہوگیا۔ اِسپتس برگ اور گرین لینڈ نیز ہندی علاقوں

میں ولندیزیوں نے دعویٰ کیا کہ یہ حق اور یہ اجارہ داری صرف انھیں کو حاصل ہے۔ اور جوں ہی پرتگالیوں اور اسپینیوں نے بھی ایسے حق کا دعویٰ کیا تو انھوں نے اس اجارہ داری کے مبنی برحق ہونے کو مشتبہ امر قرار دے دیا۔ ان جھگڑوں سے کوئی جنگ نہ چھڑی البتہ ان کا مطالعہ قانون بین الممالک کے لئے کافی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انھیں کے باعث بکثرت کتابیں لکھی گئیں۔

385

سنہ ۱۶۱۳ء میں اسکاٹ لینڈ کے ولیم ولواڈ نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "تمام سمندری قواعد کا خلاصہ" تھا اس میں اس نے گروٹیوس کے نظریے کے خلاف احتجاج کیا تھا اور جہازرانی کی آزادی اور مچھلیوں کے شکار کی آزادی میں فرق ہونا ثابت کیا تھا۔ گروٹیوس اس امر پر تیار تھا کہ ان تنقیدوں کی تردید کرے۱۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں ولیم ولواڈ نے ایک لاطینی کتاب میں جس کا نام "سمندروں کی ملکیت قانونی نقطۂ نظر سے اور مملکت کے زیر مشاہدہ خصوصی حقوق کا مختصر اور منظم و مرتب طور سے تذکرہ" تھا، یہی الزام دوبارہ عائد کیا تھا۔

جب پہلا چارلس بادشاہ بنا تو بعض نئی مشکلیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس بادشاہ کی تجویز یہ تھی کہ سمندروں پر انگلستان کی مکمل برتری کا اطمینان حاصل کیا جائے۔ اس مغرورانہ نظریے کا عکس دو تالیفوں میں پڑا ہے۔ ایک تو انگریزی تالیف ہے جس کا نام "برطانوی سمندروں کا اقتدار اعلیٰ جس کا ثبوت دستاویزوں، تاریخ، اور اس بادشاہت کے قوانین ملکی سے ملتا ہے" تھا۔ دوسری تالیف لاطینی میں ہے جس کا نام "بند سمندر"

---

۱ گروٹیوس کا مخطوطہ جامعہ لائیڈن کے کتب خانے میں ہے۔ مولر نے اسے کافی تفصیل کے ساتھ اپنی ولندیزی تالیف میں نقل کر دیا ہے۔ یہ ولندیزی کتاب سنہ ۱۸۷۲ء میں امسٹرڈام میں چھپی اور اس کا نام "بند سمندر یا انگلستان اور ہالینڈ میں سترھویں صدی وغیرہ کی رقابت کے حالات پر بعض نئے معلومات" تھا۔

تھا۔ اول الذکر کتاب سر جان باروز نے لکھی تھی لیکن ۱۶۵۲ء سے پہلے چھپ نہ سکی۔ دوسری تالیف جان سیلڈن کی ہے اس کا آغاز تو ۱۶۱۸ء میں ہوا تھا لیکن وہ ۱۶۳۵ء میں پہلے چارلس کے حکم سے چھاپی گئی۔

"بند سمندر" میں یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ قانون قدرت، قانون بین الممالک اور قوموں کی رضامندی کے باعث وہ سمندر جو انگلستان کو گھیرے ہوئے ہیں وہ برطانیہ عظمٰی کی مملکت اور اقتدار اعلیٰ کا جزء لاینفک ہیں اور یہ کہ جہاں تک ہمسایہ ممالک کے جنوبی اور مشرقی ساحلوں کا تعلق ہے بیرنوں (جاگیرداروں) نے اسے قایم کردیا ہے۔ البتہ شمالی اور مغربی سمندر میں اس کا قایم کیا جانا ابھی باقی ہے۔ اس مفروضے کے ناگزیر نتیجے کے طور پر ان سمندروں میں نہ تو کوئی شخص تجارت کرسکتا تھا نہ جہازرانی جب تک کہ اس بادشاہ کی اجازت حاصل نہ ہو جو وہاں اختیار سماعت برتتا اور اس اختیار کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

یہ کتاب "بند سمندر" پریشان بیانی کی حامل ہے، اور اس کا اسلوب بھی درشت ہے۔ لیکن اس کے مولف کے بڑے علم و فضل کی داد دیے بغیر چارہ نہیں اور مولف وڈ کے انگریزی الفاظ میں وہ "اور میدان ہائے عمل کی طرح یہاں بھی اپنے آپ کو" انگریزی قوم کے میدان علم کا زبردست آثار (وِکیٹر) "ہونا ثابت کردیتا ہے" یہ نظریہ تو غلط تھا لیکن فرڈینانڈ فاس کیس منشا کا اور گروتیوس نے صحیح نظریے کی بھی اتنی اچھی حمایت نہیں کی تھی جتنی اس کی ہوئی تھی۔ بہر حال یہ امر قابل ذکر ہے کہ گروتیوس کا نظریہ اس زمانے کی ضرورتوں کے خلاف پڑتا تھا۔ گروتیوس کی تالیف کی خوبی کم نہیں ہے لیکن اس کی ناکامی کی وجہ وہی تھی جو ہم نے بیان کی۔ تجارتی سیاسیات اسی لاطینی کلیے پر مبنی تھی کہ "جو براجے وہی بیوپار کرے"۔ جس طرح کہ

386

کلیسائی سیاسیات اس لاطینی اصول پر مبنی تھی کہ "جو بر لجے، مذہب اسی کا ساتھ دے" سلڈن کی کتاب بادشاہ کے نام معنون کی گئی تھی۔ اس پر ایک مغرورانہ جملہ لاطینی میں لکھا ہے کہ "سمندر بھی اس کی بات مانے گا" ___ (یہی جملہ کرر فرانسیسی میں) ___ پہلا چارلس چاہتا تھا کہ اس پیشین گوئی کا تحقق عمل میں آئے۔ اب لاطینی کتاب "بند سمندر" ایک واقعی اعلان بن گیا۔ چنانچہ اس کا ایک نسخہ عدالت ایکس چکر میں محفوظ کردیا گیا اور ایک نسخہ عدالت امارت بحریہ میں، نیز ایک تیسرا نسخہ مجلس شورائے راز (پری ٹی کونسل) کے استعمال کے لئے رکھا گیا کہ یہ کتاب "برطانوی سمندروں میں اقتدار اعلیٰ کے حق کی سچی اور ٹھوس شہادت" پر مبنی تھی۔ ۱۰ رمے ۱۶۳۶ء کو ایک شاہی اعلان ہوا جس میں پہلے جیمس کے ۱۶۰۹ء والے شاہی اعلان کی تجدید کی گئی اور اجنبیوں کو ممانعت کی گئی کہ ان سمندروں میں شکار کے لئے آویں جو انگلستان کو گھیرے ہوئے ہیں بجز اس کے کہ پیشگی اجازت حاصل کرلی گئی ہو۔

بادشاہ نے اپنے بیڑے کو یہ حکم دیا کہ کتاب "بند سمندر" میں جو اصول بتائے گئے ان کو جامۂ حقیقت بھی پہنائے۔ لیکن اس کی کوششوں کو کامیابی نہ ہوسکی۔ بادشاہ کے جو ادّعا تھے وہی کرامویل نے بھی دہرائے اور ۱۶۵۴ء میں معاہدۂ ویسٹ منسٹر کی دفعہ (۴) میں ولندیزیوں نے محافظ یعنی کرامویل کے ان مطالبوں کو مان لیا کہ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرستان کو گھیرے ہوئے سمندروں میں ان ممالک کی جمہوریت کے جھنڈے کو بطور علامت احترام سلام کرنا ضروری ہوگا۔

اس کتاب "بند سمندر" کا جواب دینے کے لیے "نمایندگان ہر سہ طبقات" نے ایک ماہر لسانیات پیٹر فان در کوئن کو مامور کیا۔

کچھ عرصے بعد گروٹیوس کے ایک نوعمر رشتہ دار تی ایری گراس ونکل نے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا نام "سمندروں کی آزادی کا اثبات جو مشہور شخص جان سلڈن کی تردید میں لکھی گئی ہے" تھا۔ لیکن مجلس ہر سہ طبقات کو ہمت نہ ہوئی کہ اس کتاب کو چھاپنے کی اجازت دے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ یہ کیا کہ اس کو مخطوطے ہی کی صورت میں محفوظ رکھا جائے البتہ ضرورت پر اسے ایسے سفیروں کے پاس بھیجا جائے جنھیں سمندروں کی آزادی کے مسئلے سے سابقہ پڑے۔ ۱۶۳۷ء میں ایزاک پون تانکس میدان میں نظر آتا ہے۔ اس نے ایک لاطینی کتاب تالیف کی جس کا نام "تاریخی مباحث پر دو کتابیں جو بطور خاص تفصیل کے ساتھ اس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ کونسے سمندر اور کس حد تک تجارت کے لئے کھلے یا بند ہیں" تھا۔

گراس ونکل نے دوبارہ ۱۶۵۲ء میں سمندروں کی آزادی کی حمایت کی جب کہ پیٹر باپ تیست بورگو نے اپنے آپ کو جے نوا والوں کے ادعاوں کے حامی کی حیثیت سے پیش کیا تھا کہ جے نوا والوں کو لی گوریان کے سمندر پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ اس کی لاطینی کتاب کا نام "سمندروں کی آزادی سے اختلاف کی تائیدی دلیلیں جو پیٹر باپ تیست بورگو نے جمہوریۂ جے نوا کو بحیرۂ لی گوریان میں اقتدار اعلیٰ حاصل ہونے کے متعلق مرتب کیں" تھا۔ سلڈن نے اس کا ایک شدت آمیز جواب دیا کیونکہ گراس ونکل نے ضمناً سلڈن کی کتاب "بند سمندر" پر یہ کہتے ہوئے حملہ کر دیا تھا کہ سلڈن نے وہ کتاب صرف بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے تالیف کی ہے، اور یہ کہ اس کا منشاء اصل میں یہ تھا کہ قید خانے سے نجات حاصل کرے جہاں بادشاہ نے اس کو بطور سزا بند کر رکھا تھا کیونکہ اس نے بیت العوام میں [بادشاہ کی] مخالفت کی تھی۔

387

سمندروں کی آزادی ایک ایسا مسئلہ تھا جو حل نہ ہو سکا۔ اکثر ملکوں میں مختلف لوگ برابر اس پر تالیفیں کیے جاتے رہے اور خود اٹھارویں صدی میں ایک اہم بحث اس وقت چھڑی جب شہنشاہ چھٹے شارل نے یہ خواب دیکھا کہ ہندی تجارت کے مدنظر ایک ایسی شراکت قایم کرے جسے خصوصی مراعات حاصل ہوں اور جب مجلس نمایندگان ہرسہ طبقات نے یہ ادعا کیا کہ اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ بلجیم کے تاجروں کو آزاد ممالک اور خود مختار سلطنتوں سے تجارت کرنے کی اجازت دے۔

388

باب ہفدہم

امن کا خواب دیکھنے والے[1]

قرون متوسط میں امن کے مطمح نظر کے متعلق جو کچھ ہوا، وہ اس موضوع کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ ہم اوپر بھی بیان کر چکے ہیں کہ کلیسا نے عیسائیوں کے مابین امن قائم کرنے سے دلچسپی لی تھی اور ہر لمحہ اس نے کوشش کی تھی کہ جھگڑوں کا خاتمہ کر ڈالے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں ان میں سے بعض شہرۂ آفاق ہیں مثلاً "خدائی صلح" کا قیام۔

دور قرون متوسط میں مختلف عجیب رجحانات جاری و ساری رہے اور قیام امن کے سلسلے میں اہم تحریکیں ظاہر ہوتی رہیں۔

---

[1] (یہاں مولف نے "ایرے نی فرقے کے لوگ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ) اصل میں یہ اصطلاح شارل ایرے نے کاشل ڈیتین پیئیر سے ماخوذ ہے اور اسی نے لندن کی رائل سوسائیٹی آف سائینس کے متعد

بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "برادران امن" کے نام سے ایک سلسلہ قائم ہوا جس کی تجویز ایک حقیر بڑھئی نے پیش کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ امن کو ملحوظ رکھوایا جائے۔ یہ تحریک پورے فرانس میں پھیل گئی۔ پھر ایک عجیب تحریک اٹلی میں پیدا ہوتی نظر آئی جو رقیب شہروں کے جھگڑوں کے خلاف شروع کی گئی تھی چنانچہ ژاں وشاں سین ایک ڈومینیکی راہب نے ۱۲۳۳ء میں ایک سنجیدہ مجلس طلب کی جس میں لومبارڈیا کے تمام شہروں کے نمایندے آئے تھے اور جس میں عمومی امن آرائی کی ایک دستاویز مرتب کی گئی تھی۔ جو کوئی اس پیمان کی خلاف ورزی کرے تو وہ عذاب جہنم کا مستوجب قرار دیا گیا تھا۔ 389

ڈومینیکی اور فرانسسکانی سلسلوں نے اس زمانے میں متعدد فیاض لوگ پیدا کئے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کوشش کے لیے وقف کر دیں کہ ڈاکے، جھگڑے اور خانہ جنگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

ملحد فرقے بھی امن آرائی کے جذبات لیے رہے چنانچہ ان کی اکثریت نے یہ اعلان کیا کہ جنگ ایک نفرت انگیز چیز ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سر ہانس سلون کے نام ایک مکتوب میں اس اصطلاح کا استعمال ان لوگوں کے لئے کیا تھا جو مدامی امن کے امکان پر یقین رکھتے تھے یہ اصطلاح اور اس اچھے پادری کے نام کا دوسرا جزو، دونوں ایک یونانی لفظ سے ماخوذ ہیں۔ اس کے معنے امن ہی کے ہیں۔ سر ہانس سلون کے نام لکھا ہوا خط برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

یہ بیان کرنا بے سود ہوگا کہ "ایرے نیت" اور "یوٹوپیائیٹ" باہم مترادف نہیں ہیں۔ کیونکہ لفظ یوٹوپیا کے معنے اصل میں کسی خیالی چیز پر یقین کرنے کے ہیں۔

اور ان کی رائے میں جنگ اصل میں گناہ ہی کی ایک صورت ہے۔
"سفید کفارہ دہندہ" اصل میں ایک ملحد فرقہ تھا جو سمجھا جاتا ہے کہ اسپین میں شروع ہوا اور پھر فرانس اور اٹلی میں پھیل گیا۔ مرد، عورت، بچے، ہر کوئی سفید کپڑے پہن کر زائرانہ نکلتے اور زمین پر خدا کا رحم ہونے کی التجا کیا کرتے۔ اٹلی کے اکثر شہر اس قسم کے مظاہروں کی منظر گاہ بن گئے۔ اور یہ صرف اسی وقت ختم ہوئے جب پوپ نے صراحت کے ساتھ انہیں ممنوع قرار دیا۔

مختلف مولف بھی امن کا پرچار کرتے ہیں۔ گیارھویں صدی کے اواخر میں ایف ڈشارت نے فرانس کے اسقفوں کے نام ایک خط لکھا تھا کہ حضرت یسوع مسیح کی تشریف آوری صرف روحانی امن کے قیام کے لیے نہ تھی بلکہ دنیاوی امن کے قیام کے لئے بھی تاکہ تمام عیسائی ایک ہی جان اور ایک ہی جسم بن جائیں۔ اور اس لئے کہا کہ "مسیح کی بادشاہت میں اب مزید کوئی فساد نہیں ہونا چاہیئے۔ روحوں کو ہر قسم کی برائی سے اور ہاتھوں کو ہر قسم کے برے کام سے پاک رہنا چاہیئے۔"

بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں گرہوخ نے جو رائیشرزبرگ کا افسر اعلیٰ تھا، یہ رائے ظاہر کی کہ کسی جنگ کے جواز کے لئے کلیسا کی اجازت ایک ناگزیر شرط ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا منشاء یہ تھا کہ پوپ کو تمام مناقشوں میں اعلیٰ ترین حاکم قرار دیا جائے۔ لیکن اس کے یہ بھی معنے تھے کہ گرہوخ کی رائے میں اس طرح اس امر کی تیاری ہوسکتی ہے کہ امن ہی کا بول بالا ہو۔ بہرحال اس کی رائے میں یہ پادریوں کا کام ہے کہ ہر انفرادی معاملے کی جو پیش آئے چھان بین کریں اور بتائیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور جب فیصلہ

صادر ہوجائے تو مقدس نقاروں کی آواز سے مقاتلوں کی ہمت بیدار ہوجائے گی اور عالم قدس سے روحانی اتصال پیدا ہوکر قوت حاصل ہو جائے گی۔ اور جو کوئی ناحق مخالفت کرے یا اس پیمان کو ماننے سے انکار کرے تو اسے جات باہر کردیا جائے اور کسی عیسائی قبرستان میں اسے دفن ہونے کا حق نہ رہے[1]

390

تقریبًا اسی زمانے میں ایک پادری نے لکھا تھا کہ "مسیح" ہی امن ہے اور امن کلیسا کا ورثہ ہے۔ یروشلم موجود ہے اور وہ ان سب کی ماں ہے۔ اور وہی امن کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ جو امن کے خلاف کام کرے وہ مسیح کے خلاف اور کلیسا کے خلاف کام کرتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔"

کچھ عرصے بعد نکولاس ذکرِ نے لکھا کہ "ہر بادشاہ اور ہر شہنشاہ ایک فریضہ عمومی کے انجام دینے کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہ مفاد عامہ سے متعلق ہوتا ہے۔ مفادِ عامہ امن ہی ہے۔"

شہنشاہ کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ امن قائم کرے۔ شہنشاہ کے خطابوں میں سے سب سے درخشاں خطاب (لاطینی میں)

"شہنشاہ امن آرا" تھا[2]

---

[1] لاطینی کتاب "زبور نمبر (۱۴) بگڑے ہوئے کلیسا کے احکام کی کتاب کے مطابق" اس کو بلوتسے نے اپنی لاطینی کتاب "متفرقات" جلد (۵) صفحہ (۱۱۷) پر نقل کیا ہے۔

[2] براش کی کتاب "مقدس رومی شہنشاہت جرمنی اور جرمنی کی موجودہ شہنشاہت" کا فرانسیسی ترجمہ از ذومبرگ صفحہ ۳۲۱۔

ہبش لے کے الفاظ ہیں بادشاہ کے تمام کارناموں میں سب سے زیادہ شاہانہ کام امن ہے۔ بادشاہ سینٹ لوئی نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی کہ "پیارے بیٹے! میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ جو جنگیں اور جو قضیئے تیرے ملک اور تیرے لوگوں میں پیش آئیں تو ان کے متعلق کوشش کر کہ ان کا پُر امن تسویہ ہو جائے، چاہے تجھے تکلیف ہی اٹھانی کیوں نہ پڑے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے آقا خداوند کو خوب پسند ہے۔ اور اس کا خوب عمدہ نمونہ محترم سینٹ مارٹن نے ہمارے لئے پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ امن قایم کرنے کے لئے اپنی آرک بشپی کے اہل کلیسا میں ایسے زمانے میں گھس گیا جب اسے ہمارے خداوند نے یہ معلوم کرا دیا تھا کہ اسے مرجانا پڑے گا۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طور سے اپنی جان قربان کر دینے کو اس نے اچھا خیال کیا۔" "مروّت" کی تحریک، پندرھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی۔ یونانی تہذیب کی تجدید اٹلی میں چودھویں صدی کے نصف دوم ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ پالّا اِستروت سی اس کا روح رواں تھا۔ اس نے مانوئل خریسولوراس کو، جو شہرے میست پلے تون کا شاگرد تھا، فلارنس بلا بھیجا۔ جب خریسولوراس مرگیا تو اس کے متعدد ممتاز شاگرد اس امر کا اطمینان دلا رہے تھے کہ اس کے مقصد کو کامیابی حاصل ہو گی۔ ان تہذیب آموزوں کی پہلی صف میں ہمیں گارینی، رینیغرتو کا گرے گری، فرانسوا فلیف طرابزون کا جارج، تھیوڈور گوڈزد نظر آتے ہیں۔ جب ترکوں

لے۔ آن بُرو از فریں دی ذوکی فرانسیسی تالیف "آل دے مانوپچے اور شے نیس میں تحریک تہذیب یونانی"

نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو اس تحریک کو اور بھی زور سے قوت حاصل ہوئی۔ لوراں ہمیں یاد دلاتا ہے کہ یورپی دور نشأۃ ثانیہ کے لوگ سب ہی امن کے حامی تھے اور اپنی انسانیت کے باعث امتیاز رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "دور نشأۃ ثانیہ کی امن آرا ذہنیت کو سمجھنے کے لیے قدیم فلسفیوں کی آخری تالیفوں خاص کر رواقی فلسفے کی کتابوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح یہ بات بھی نہیں بھلانی چاہئے کہ "رومی امن" کیا چیز تھی اور شہنشاہیت کے بسنے والوں اور شاعروں کو وہ کس طرح جذبات جوش سے مملو کر دیتی تھی۔ اصل میں زمانۂ قدامت کے یہی جذبات اور خیالات تھے جنھوں نے دور جدید کا آغاز کیا اور یہی جذبات سولھویں صدی کی تحریک مروّت کے حامیوں میں جاری و ساری تھے۔ وہ بے شک عیسائی عفو کا ذکر کرتے ہیں مگر سچ پوچھو تو ان کی مقدس کتاب، انجیل سے کہیں زیادہ سنیکا (کا فلسفہ) ہوتا ہے۔ شاعر یوفے نال نے فاتحوں کے خلاف جو طعن و تشنیع کی تھی، وہ ان پر سینٹ جان کے الفاظ محبت سے کہیں زیادہ اثر کرتی تھی۔ یہ تحریک کلیۃً ادبیات کے لئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مطالبات حقائق کا کم لحاظ رکھا گیا تھا۔"[1]

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ[2] وائیکلف کے خیالات نے انگلستان کی تحریک مروت پر کیا اثر ڈالا تھا۔ وائیکلف جنگ کے جواز کے نظریے کا جانی دشمن تھا۔ انگلستان کی تحریک

891

---

[1] لوراں کی فرانسیسی تالیف "تاریخ انسانیت پر مباحث" جلد (۱۰) تو ہتیں صفحہ ۳۹۴ –

[2] دیکھئے اوپر اصل کتاب کا ص 48 –

مروت کے ممتاز علمبردار جان کولٹ، ٹامس مور اور اِیراسمس گزرے ہیں۔

آکسفورڈ کے دو نوعمر استاد گروسن اور لیناکر تھے۔ انھوں نے بھی اٹلی میں انھیں چشموں پر علمی پیاس بجھائی تھی۔ اور یونانی فلسفے اور ادبیات سے واقفیت حاصل کرکے آکسفورڈ میں یونانی تہذیب کو روشناس کیا تھا۔ کولٹ انھیں کا شاگرد تھا۔ اور اپنی نوبت پر وہ خود بھی اٹلی گیا۔ اور غالباً وہ فلارنس میں ساؤونارولے کے اثرات سے متاثر ہوا تھا۔ یونانی تہذیب کی جو چیز کولٹ کا دل لبھاتی ہے وہ ادبیات اتنے نہیں جتنا فلسفہ ہے۔ اس کے نزدیک سب سے اہم معاملہ ہمیشہ یہی رہا کہ افلاطون اور عیسائیت کے نظریوں میں تطابق پیدا کیا جائے۔

آکسفورڈ کے اس حلقے میں گروسن، لیناکر، لاٹی مر، اور ٹامس مور موجود نظر آتے ہیں لیکن کولٹ کو ان سب پر ایک حقیقی سربرآوردگی حاصل ہوگئی تھی۔ ٹامس مور اس زمانے میں بہت نوعمر تھا لیکن یقیناً وہ نئی پود کا سب سے ممتاز نمایندہ تھا۔ اسی حلقے میں ایک اور مولف بھی شامل تھا جسے اسی زمانے میں شہرت حاصل ہو چکی تھی یعنی اِیراسمس جو اسی زمانے میں اپنے زیر تربیت شخص لارڈ ماونٹ جائے کے ساتھ انگلستان آیا تھا۔

ان لوگوں کو کسی قدر مبالغہ آرائی کے ساتھ آکسفورڈ کے مصلحین کا نام دیا گیا ہے۔ بہرحال یہ لوگ مخلص اور دیانتدار تھے۔ وہ کلیسا اور کشوری سماج میں بعض تبدیلیوں کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کی سرگرمی کا ایک پہلو خاص طور پر دلچسپ ہے۔ چنانچہ مسٹر زے بوم نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کے بھائی بھائی ہونے اور قوموں کے بھائی بھائی ہونے کا یقین رکھنے کا باعث ان تینوں کو یہ بات کافی نہیں معلوم ہوئی کہ حکمرانوں کی خود پرورانہ

392

جنگوں کو صرف بڑا ٹھیراویں، بلکہ انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ بین الممالک سیاسیات میں بدعہدی کی جگہ عیسائی اصول کا یہ زرین قاعدہ نافذ کیا جانے کہ: دوسروں کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے متعلق کیا جانا پسند نہ کرو۔[1]

کولٹ برابر آٹھویں ہنری کی جنگجویانہ سیاست کا مقابلہ کرتا رہا۔ جنگ کے متعلق اس کی تلخ تنقید زیادہ تر اس کے وعظوں میں نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ان وعظوں کے متن ہم تک نہیں پہنچے ہیں لیکن ایراس مس اور آرک بشپ پارکر نے ان کی تحلیل کردی ہے۔ کلیسائے سینٹ پال کے ڈین یعنی صدر پادری کی حیثیت سے کولٹ نے مختلف موقعوں پر بادشاہ کے سامنے وعظ کہا تھا۔ ۱۵۱۱ء میں وہ جنگ کی ان تجویزوں کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا جو آٹھواں ہنری اس وقت دوسرے یولیوس، شہنشاہ ماکس میلیان، اور آراگون کے فرڈینانڈ کے ساتھ مل کر کر رہا تھا، اور اس طرح اس نے بارھویں لوئی کے خلاف جتھا بندی کرلی تھی۔ ۱۵۱۳ء میں بھی اس نے اس سے کچھ کم سرگرمی نہیں دکھائی جب بادشاہ نے شمالی فرانس پر حملہ کرنا چاہا تھا۔ ایراس مس بیان کرتا ہے کہ "اس نے قابل تعریف طور سے حضرت مسیح کی فتح کا وعظ کہا اور عیسائیوں کو ترغیب دلائی کہ مسیح کے جھنڈے کے نیچے ہی لڑیں اور جیتیں۔ اس نے بتایا کہ شریر لوگ نفرت یا لالچ کے تحت باہم ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایک دوسرے کو تباہ کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ حضرت مسیح کے جھنڈے کے نیچے لڑنے والے نہیں سمجھے جا سکے، بلکہ شیطان کے جھنڈے

---

[1] فریڈرک زے بوم کی انگریزی تالیف "آکسفرڈ کے مصلح جان کولٹ، ایراسمس اور ٹامس مور اور ان کے کام کی تاریخ"

کے نیچے لڑنے والے۔ اس نے یاد دلایا کہ میدان جنگ میں عیسائی موت مرنا کتنا مشکل ہے اور وہ لوگ کتنے زیادہ ہیں جو جنگ کو صرف نفرت اور لالچ کے باعث شروع کرتے ہیں۔ مزید براں جو لوگ اپنے میں واقعی وہ برادرانہ محبت رکھتے ہیں جس کے بغیر خداوند تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں تو ان کے لیے یہ کس قدر سخت بات ہے کہ اپنے ہی بھائی کے خون سے اپنی تلوار کو رنگیں۔ اس نے آخر میں یہ کہا کہ سیزر اور سکندر کی نقالی کی جگہ عیسائی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مثال کی پیروی کرے جو اس کے ربانی آقا نے اس کے لئے مقرر کی ہے۔"

ایسی بکثرت عبارتیں ہیں جن میں ایراس مس نے اپنے امن آرا جذبات ظاہر کئے ہیں۔ چنانچہ وہ پولینڈ کے بادشاہ زی گس موند کو لکھتا ہے کہ "افلاطون کی رائے میں جو جنگ یونانی کرتے ہیں وہ ایک خانہ جنگی ہے۔ اب ایک عیسائی تو دوسرے عیسائی کے ساتھ اس سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتا ہے جتنا ایک شہری دوسرے ہم شہری کے ساتھ، یا خود ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ۔" اس کے ایک خط میں جو فرانسوا اول کے نام لکھا گیا تھا، یہ درج ہے کہ: "جنگ کی جا سکتی ہے لیکن صرف اس صورت میں جب باقی ہر کوشش بے سود ثابت ہوگئی ہو اور جنگ ضروری ہو گئی ہو۔" بابئل نے ایراس مس کے متعلق بیان کیا ہے کہ: "وہ امن سے محبت رکھتا تھا اور اس کی اہمیت سے واقف تھا۔" ایراس مس نے خود اپنے آپ کو "امن والے شخص" کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہ کہ جنگ ایک خلاف فطرت حالت ہے اور وہ انجیلی مسیحیت کے مخالف چیز ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: "حضرت مسیح نے کہا تھا، اور بار بار کہا تھا کہ آپ کی تعلیم کا

خلاصہ بس عفو ہے۔ اور جنگ سے بڑھ کر عفو کی مخالف چیز کیا ہو سکتی ہے؟ حضرت مسیح نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی خواہش ہے کہ سب لوگ واحد فی اللہ ہو جائیں۔ لیکن جب لوگ باہم اتنے مختلف ہوں کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں تو انہیں یہ وحدت فی اللہ کیسے حاصل ہو سکے گی؟ انجیلی تعلیم میں لوگوں کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں بتائی گئی ہے جو خونریز جھگڑوں کو جائز قرار دے سکے یا ان جھگڑوں پر انھیں معذور تسلیم کر سکے۔ اصل میں برے جذبات، لالچ، ہوسناکی اور خواہش انتقام ہی جنگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ فرض کرو کہ کسی حق کی تائید ہی کا معاملہ ہو۔ کیا یسوع مسیح نے ہم سے نہیں کہہ دیا ہے کہ کسی پکے اور پورے مسیحی کو اپنے حق کے حصول کے لیے پیچھے نہیں پڑ جانا چاہئے بلکہ معرضت کا جواب تک اسے فنائے ذات کے ذریعے سے دینا چاہئے؟ جو لوگ مسیحیت پر سنجیدگی سے اعتقاد رکھیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ جنگ کو بھی اتنا ہی برا سمجھیں جتنا نالش بازی کو۔"

ٹامس مور بھی امن کا ایک پر جوش شیدائی تھا۔ اس نے اپنی کتاب "یوٹوپیا" (یعنی مطلبی دنیا) میں دکھایا ہے کہ اس مطلبی دنیا کے لوگ جنگ کو اتنی ہی نفرت انگیز چیز سمجھتے ہیں جتنا کسی بہیمانہ وحشت انگیز چیز کو۔ اور یہ کہ انسان کسی دیگر نوع حیوانی کے مقابلے میں زیادہ کثیر تعداد میں وحشت دکھاتا ہے۔

آٹھویں ہنری کی بیٹی شہزادی میری کا ایک مودب تھا جس کا نام ژان لوی فی فیس تھا۔ اس نے بھی جنگوں کو اتنا ہی برا ٹھیرایا تھا۔ اور جو خط اس نے آٹھویں ہنری، پہلے فرانسوا اور پوپ چھٹے آدریان کے نام لکھے، وہ

ان جذبات کی شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ پوپ کے نام لکھتا ہے کہ "یہ نہ کہو کہ تم حکمرانوں کے مابین صلح کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بہت سے پوپ اور بہت سے علماء ایسے بہانوں کی تلاش کرتے رہے کہ جنگ کے جواز کی حمایت کریں۔ ہمت کرو کہ تم بھی انہیں کے جیسے نہ ہو جاؤ، بلکہ یہ کہو کہ عیسائیوں کے مابین جنگ ایک مجرمانہ اور شرانگیز چیز ہے۔ اور جنگ کو اسی طرح مکمل طور سے ملعون قرار دے دو جیسے ایک ہی جسد کے مختلف اعضاء کے مابین جھگڑا۔ کیونکہ مسیح کے ہاں کوئی اسپینی اور کوئی فرانسیسی نہیں ہوتا۔"

ایک اور عجیب ذہانت نمودار ہوئی یعنی گیوم پوستل۔ یہ بھی مدامی امن کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کی رائے میں پوری دنیا کو عیسائی مذہب قبول کر لینا چاہئے اور صداقت کے تینوں دشمن یعنی یہودی، مسلمان، اور بت پرست ناپید ہو جائیں۔ یہ کہ عالمگیر حکمرانی کا حق فرانس کے بادشاہوں کو ہے۔ حضرت نوح کے بیٹوں میں سے یافث کو حکمرانی کا حق ہے، سام مذہبی اعلیٰ افسر تھا اور حام اپنے بھائیوں کے ماتحت۔ اب چونکہ یافث کا بڑا بیٹا گومیرس تھا اور یہی گال یعنی فرانس والوں کا جد اعلیٰ ہے، اگر فرانس کے بادشاہ تمام جماعتوں کو متحد کرنے کی تجویز ترک کر دیں تو وہ خدا اور اپنے ملک کے خلاف ایک گناہ کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔ پوستل، یہ عبارت، پہلے فرانسوا اور دوسرے ہنری اور دوسرے فرانسوا سے متعلق کرتا ہے۔

توماس کامپانیلا اپنی لاطینی تالیف "سورج کا شہر" میں جنگ کا جواز تسلیم کرتا ہے۔ اور وہ بیان کرتا ہے کہ آفتاب پرستوں کے ہاں "فورن سس"[1] ادارہ پایا جاتا تھا جس سے مراد ایک شخصیت

[1] (اس لاطینی لفظ کے لغوی معنی "عدالت سے متعلق" یا "سرکاری لباس"

394

ہوتی تھی جیسے مذہبی افسر کی حیثیت حاصل ہوتی اور جیسے دشمنوں
کے ہاں اس لئے بھیجا جاتا کہ یا تو غنیمت کی واپسی کا مطالبہ
کرے یا اپنے حلیفوں کے خلاف ہر قسم کی مخاصمانہ کاروائی
کو روکنے کا یا ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے شہروں کی آزادی
کا۔ اگر دشمن اس مطالبے کو ماننے سے انکار کریں تو وہ ان کے
خلاف جنگ کا اعلان کرتا۔ لیکن یہی کامپانیلاؔ اپنی لاطینی تالیف
"مسیح کا راج" میں ایک صلح جو اور امن آرا کی حیثیت سے
نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: "دورِ زرّین کا آغاز ہوجائے گا
اگر پوری دنیا پر ایک ہی شخص کی حکمرانی قایم ہو، جو وقتِ
واحد میں بادشاہ بھی ہو اور پادری بھی؛ اس سے اوپر کوئی اور
سردار نہ ہو؛ اور سوائے ایک سچے اور واحد مذہب کے، جو
خدا سے تعلق پیدا کراتا ہو، کوئی اور مذہب باقی نہ رہے۔
کرۂ ارض پر جو برائیاں غم و اندوہ کا سامان پیدا کرتی ہیں،
ان کا باعث جنگ ہے، وبا ہے، قحط ہے، اور موجودہ مذہب
سے اختلاف رکھنے والی ایک رائے ہے۔ یہ برائیاں دور
ہوجائیں گی۔ کوئی الحاد باقی نہیں رہے گا۔ کوئی جنگ پیش
نہیں آئے گی۔" لیکن اس مقصد کو حاصل کیسے کیا جائے؟
کامپانیلاؔ اس رائے کی تردید کرتا ہے کہ ایک ہی شخص پوری
دنیا پر حکومت نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے نام کی دھاک
تمام قوموں پر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسی طرح وہ اشوتو کی رائے
کو بھی غلط ٹھیراتا ہے جس نے غلطی سے ارسطو کی پیروی
کرتے ہوئے ایک طرف تو یہ تسلیم کیا تھا کہ پوپ کو آقائی
حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی رائے میں یہ آقائی کشوری معاملات
میں نہیں ہوتی بلکہ صرف روحانی معاملات میں۔ کامپانیلاؔ کی
رائے میں پوپ کو اولیت دی جانی چاہئے۔ اور وہ کہتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کہے ہیں بعض وقت اس سے فصاحت ٹیگی مراد ہوتی ہے۔ یہاں جو چیز مراد ہے اس کا ذکر خود متن میں کیا گیا ہے (مترجم)

یہ اولیت موجود بھی ہے۔ کیونکہ مسیح کی آمد اس دنیا میں اس لئے ہوئی تھی کہ عہد زرین کا قیام عمل میں آئے۔ اور آپؑ نے اپنا ابدی قانون جاری فرمادیا ہے، اور ایک ایسا عالمگیر اقتدار نافذ کردیا ہے جس کی ماتحتی تمام حکمرانوں کے لئے قانون الٰہی کے مطابق بھی ضروری ہے اور قانون انسانی کے مطابق بھی۔ اور یہ چیز دنیاوی معاملات کے متعلق بھی ہے اور روحانی معاملات کے متعلق بھی۔

لاطینی کتاب "مسیح کا راج" کے مولف یعنی کامپانیلاؔ کے نظریے کے مطابق پوپ کو منفردہ حکمرانی عطا کرنے سے، دیگر بادشاہتیں اور جمہوریتیں مٹ بالکل نہیں جاتیں بلکہ ان کی توثیق حاصل ہوجاتی ہے اور ان کی بہتری کا سامان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی ان میں اتحاد پیدا کرتی ہے۔ تمام ممالک مل کر ایک جمہوریت کی تشکیل کریں گے جس کا صدر پوپ ہوگا۔ اس طرح کسی دشمن کے مقابلے میں وہ ناقابل شکست بن جائیں گے اور ان کے اندر آپس میں امن و سلامتی کا دور دورہ رہے گا۔ مختلف حکمران پوپ کے باجگزاروں کی حیثیت نہیں رکھیں گے بلکہ ان کی حیثیت ویسی ہی ہوگی جیسی بیٹوں کی باپ کے سامنے یا شاگردوں کی استاد کے سامنے یا بھیڑوں کی اپنے چرواہے کے سامنے۔

395 سترھویں صدی کے پہلے تہائی حصے میں یورپ میں اس خیال کے متعلق قابل لحاظ حرکت نظر آئی ہے۔ تجویز یہ تھی کہ ترکوں کے خلاف عیسائی ایک علیفی پیدا کرلیں اور جنگ کر کے عیسائی آبادیوں کو آزاد کرالیں اور بالآخر اس امر میں کامیاب ہوں کہ یورپ میں امن کا دور دورہ قایم کرادیا جائے یہ رائے قابل لوگوں میں پائی جاتی تھی اور بڑے بڑے مدبر بھی اس سے اتفاق رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۶۳۶ء میں ایک

حقیر زائر نے لکھا تھا کہ "خدا کرے کہ ایک مکمل اتحاد قایم ہو اور عیسائی حکمرانوں کے مابین ایک اچھا اور مسیحی سمجھوتا ہو جائے اور ان کے دلوں سے لالچ اور تحقیر کے جذبات دور ہو کر مسیح کے نام کی مدافعت کے لئے ان کے حوصلے اور ہتھیار یکجہتی اختیار کر لیں۔" مدبروں میں سے عیسائیت کی وحدت کا یہ تصور بے شبہہ ریش لیو اور خاص کر فرانسوا لک لیرک دو ترال بلے کے ذہنوں میں بسا ہوا تھا۔ آخر الذکر شخص "باپ (فادر) پادری) ژوزف[1] کے نام سے سلسلۂ سین فرانسوا میں داخل ہو گیا تھا اور مشہور وزیر ریش لیو کا ہوشیار وزیر بنا رہا ہے کیا ان کے پہلے چوتھے ہنری کا بھی یہی خیال ہو گیا تھا؟ بہرحال ایک واقعہ یقینی ہے۔ وہ یہ کہ سنہ ۱۶۱۰ء میں اس بادشاہ پر قاتلانہ وار کے موقع پر یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ کوئی عظیم الشان واقعہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ "عظیم الشان تجویز" اسی سے متعلق ہے۔

ہوا یہ تھا کہ بے تون کا ماکس میلین جو روزنی کا بیرن تھا اور بعد میں سولی کا ڈیوک بنا، اس نے ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "ہنری اعظم کی سلطنت کی گھریلو، سیاسی، اور فوجی معاملات شاہی و فرزانہ کے متعلق یادداشت" تھا۔ اس نے یہ کتاب چوتھے ہنری کے مرنے سے کچھ ہی پہلے اپنے مددگاروں کو املا کرانی شروع کی تھی۔ اس کے جیتے جی تو پہلی دو جلدیں ہی لکھی جا سکیں اور سنہ ۱۶۳۸ء میں قلعۂ سولی میں چھاپی گئیں۔ ان کا

---

[1] کوگل ہالز کی جرمن تالیف "دیسولی کے ڈیوک کی یادداشت میں مدامی امن کی جو تجویز ہے اس کا سرچشمہ۔"

[2] فان اِدیبے کا مضمون "پادری ژوزف اور ریش لیو" جو فرانسیسی رسالۂ مسائل تاریخی جلد (۳۶) میں شائع ہوا دیکھیے صفحہ ۷۹۔

تعلق سنہ ۱۵۰۷ء سے سنہ ۱۶۰۵ء تک سے ہے۔ جب ڈیوک مرگیا تو اس کے دو مددگاروں اور ژاں لا بورور نے اس کام کو جاری رکھا۔ اٹھارویں صدی میں خانقاہ لوژ کے مہتمم راہب نے اس "معاشیات شاہی" کو "سولی کی یادداشت" کی حیثیت میں تبدیل کردیا۔[۱]

سولی کے ڈیوک نے ایک تجویز کا ذکر کیا ہے جسے اس نے چوتھے ہنری کی طرف منسوب کیا ہے کہ "نہایت راسخ العقیدہ عیسائی جمہوری بادشاہت" کو "پندرہ حکمرانیوں پر مشتمل ہونا چاہئے جن میں سے بعض کو اقتدار اعلیٰ زیادہ حاصل رہے اور بعض کو کم۔ یعنی پانچ منتخب کنندگان شاہی کی، چھے موروثی بادشاہوں کی، اور چار منتخب دیگر قسم کی جمہوریتوں کی شامل ہوں۔ پانچ منتخبہ قسم کی حکمرانیوں میں پوپ، شہنشاہ اور پولینڈ اور ہنگری اور بوہیمیا کے بادشاہ داخل ہوں گے۔ چھے موروثی حکمرانیوں میں فرانس، اسپین، انگلستان، ڈنمارک، سویڈن اور لومبارڈی داخل ہوں گے۔ چار مقتدر اعلیٰ جمہوریتوں میں ایک تو وینس کی جمہوریت ہوگی جسے فرمانروایانہ راجدھانی کا لقب حاصل ہوگا۔ دوسری ایک ڈیوکی جمہوریت ہوگی جس میں خاص کر جینوا، فلارنس، مانتوا، پارماں اور موڈانیا کی ڈیوکیاں شامل ہوں گی۔ تیسری جمہوریت عہدیۂ سوئستان (سوئٹزرلینڈ) اور اس کے قدیم حلیفوں کی ہوگی جس کے ساتھ تینوں ہمسایہ سلطنتیں بھی متحد ہو جائیں گی۔ اور چوتھی جمہوریت صوبجات متحدہ کی ہوگی جس میں نشیتان کے سترہ صوبے اور متعدد دیگر علاقے داخل ہوں گے۔ یہ تمام ممالک ایک صدر مجلس کے ماتحت ہوں گے جس میں ساٹھ نمائندے ہوں گے۔ اور ہر مملکت اپنی

---

[۱] دے کلوزو کا مضمون فرانسیسی "رسالۂ تاریخ" جلد (۳۳) صفحہ ۲۴۵۔

اہمیت کے تناسب سے نمایندوں کو نامزد کرے گی۔ اس تجویز کو مکمل بنانے کے لئے ترکوں کے خلاف ایک عام جنگ کو بھی داخل کر دیا گیا کیونکہ عیسائی مملکتوں کا فریضہ تھا کہ یورپ سے غیر مذہب والوں کو نکال باہر کریں۔ بادشاہ کے نام جو خط اس نے لکھا اس میں اس نے "ان عظیم الشان تجاویز کے متعلق" مقصد کی وضاحت کی تھی جو اس پوری تجویز میں پیش نظر تھا۔ چنانچہ لکھا تھا کہ "بادشاہ کی تمام بڑی اور عظیم الشان تجویزوں کی مضبوط ترین بنیادوں میں سے ایک اس امر پر مشتمل ہے کہ یورپ کی پوری پندرہ بڑی حکمرانیوں کو رفتہ رفتہ قوت میں، بادشاہت میں، دولت میں، وسعت اور آفاقی میں مساوات عطا کر دی جائے اور ان کو ایسے حدود اور سرحدیں مہیا کی جائیں جو ٹھیک طور سے بیٹھتی ہوں اور اعتدال پیدا ہوتا ہو۔ تاکہ ان کو جو زیادہ بڑے اور زیادہ ہوسناک ہوں اپنے کو بڑھانے کی خواہشیں اور چاہتیں نہ پیدا ہوں، اور نہ ہی دوسروں کو اشتعال اور حسد پیدا ہو اور نہ ہی اس کا دھڑکا پیدا ہو کہ ان پر زیادتی کی جائے گی"[1]

عرصۂ دراز تک مورخ یہ یقین کرتے رہے کہ واقعی ایسی کوئی تجویز سوچی گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ فلپ ڈمور نے کے مددگار مارتو نے ۱۶۵۶ء اور ۱۶۶۲ء کے مابین اس کتاب "معاشیات شاہی" پر تنقید لکھی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ قال تیر نے اس مشہور تجویز کو ایک ڈھکوسلہ خیال کیا تھا۔ بہر حال عام طور پر مختلف مولف سولی کی تجویزوں کو مشتبہ قرار دینے میں احتیاط کرتے رہے جن کے متعلق سولی کا ادعا تھا کہ وہ اس کے آقا چوتھے ہنری کی سوچی ہوئی تھیں۔ لیکن اب مکمل ثبوت حاصل ہو چکا ہے۔

---

[1] سولی کی فرانسیسی تالیف "معاشیات شاہی" شائع کردہ پیتا تو جلد (۷) صفحہ ۹۴۔

اور ایک فرانسیسی مولف نے شاید ضرورت سے زیادہ سختی کے ساتھ یہ کہا ہے کہ "سولی صرف اس بات کا خواب دیکھ رہا تھا کہ واقعات اس کی مرضی کے مطابق گردش کریں تاکہ اس کی اپنی ہوس پیرانہ کی تکمیل ہو اور ضرورت پر وہ اس سے تک باز نہ رہا کہ دستاویزیں ترمیم والحاق کر کے آئندہ نسلوں کو دھوکا دے"[1]

397 امے رک کروسے نے فرانسیسی میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "نیا سینیا[2] یعنی مملکت کے متعلق مقالہ کہ کن مواقع اور وسائل سے پوری دنیا کے لئے ایک عمومی امن اور تجارت کی آزادی قایم کی جاسکتی ہے" تھا۔ یہ تالیف جو "موجودہ زمانے کے بادشاہوں اور مقتدر حکمرانوں" کے نام معنون کی گئی تھی، ۱۶۲۳ء میں پاریس میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا نام معنی خیز ہے۔ لائب نٹس نے خانقاہ سین پیئیر کے مہتمم پادری کے نام لکھا تھا کہ "یہ سب جانتے ہیں کہ سینیا اصل میں یونانی بادشاہ پیرس کا معتمد علیہ مشیر تھا۔ اسی نے بادشاہ کو ابتداءً مشورہ دیا تھا کہ صقلیہ، کالابرے، روما اور قرطاجنہ فتح کر لینے کے بعد آرام لے۔ اور بعد میں اس نے اعتراف کیا کہ یہی اس کا منشا بھی تھا (کیونکہ دنیا میں عمدہ اور قابل فتح علاقے صرف یہی ہیں)۔"

کروسے جنگ کا سخت مخالف تھا اور وہ لگاتار امن کے فوائد کو سراہتا، محبت انسانی کا پرچار کرتا، اور عمومی بہبودی کے لئے کوشش کرنے کے فریضے پر زور دیتا رہا۔ اس نے ظاہر کیا ہے کہ حکمرانوں کے برے جذبات ہی اصل میں خونریز جھگڑوں کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اس کا خیال ہے کہ تجارت کو آزادی اور صنعت کو ترقی ملنی چاہئے۔

---

[1] دے کلوزو کا مضمون فرانسیسی "رسالۂ تاریخ" جلد (۳۳) میں دیکھئے صفحہ ۲۴۔

[2] اس لفظ کی توضیح ابھی چند سطروں بعد آتی ہے (مترجم)

اور وہ بیان کرتا ہے کہ مکمل مذہبی رواداری ایک ناگزیر ضرورت ہے۔
کیا عمومی امن ممکن ہے؟ کروسے اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ داخلی رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں، اور قومیت کا اختلاف یا مذہب کا فرق جنگ کو جائز بنانے والے اسباب نہیں بن سکتے۔ البتہ اس امن کے استقرار کے لئے کوشش کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ میں "خواہشیں تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ اور زمانۂ حال کے لوگوں کی کارروائیاں کسی طرح اپنے جانشینوں کو پابند نہیں کرتیں"۔
کتاب "نیا سینیا" کا مولف یعنی اسمے رک کروسے یہ یاد دلاتا ہے کہ جنگ کے اسباب کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں۔ البتہ اسے تسلیم ہے کہ دشواریاں پیش آسکتی ہیں اور ان کو دور کرنا چاہیے۔ اس کا علاج اس کی رائے میں یہ ہے کہ: "ایک شہر مقرر کیا جائے جہاں تمام مقتدر حکمرانوں کے سفیر سدا موجود رہیں تاکہ جو بھی جھگڑے پیدا ہوں، انھیں پوری مجلس کے فیصلے سے چکایا جائے۔ جن حکمرانوں کا مفاد اس سے وابستہ ہو، ان کے سفیر اپنے آقاؤں کی شکایتوں کی ترجمانی اور نمایندگی کریں اور دیگر نمایندے، [طرف داری کے] جذبات سے خالی رہ کر، اس کا فیصلہ کریں۔ اس فیصلے کو مزید استناد عطا کرنے کے لئے بڑی جمہوریتوں کی بھی رائے لی جائے جن کے نمایندے بھی اسی شہر میں ہوا کریں۔ جو کوئی اتنی ممتاز جماعت کی قرار داد میں آڑے آئے تو وہ باقی تمام حکمرانوں کی ناراضی کا مستوجب ہوگا جن کے پاس یقیناً اس کے وسائل ہوں گے کہ اسے راہ راست پر لائیں"۔
کروسے کی رائے میں وینیس اس مجلس کا صدر مقام مقرر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ "یہ مملکت ناطرفدار اور دیگر تمام حکمرانوں سے یکساں غیر جنبہ دار ہے نیز اس لئے بھی کہ اسے ایک مرکزی مقام

398 حاصل ہے۔" مولف کی تجویز تمام ممالک پر حاوی ہے: اس میں ایران بھی شامل ہے، چین بھی، حبشہ بھی، شرق الہند بھی غرب الہند بھی۔ وہ یہ بات چھپاتا نہیں کہ اگر کوئی بھی اس بارے میں پیش قدمی نہ کرے تو دوامی امن و تجارت کی آزادی کی تجویز کبھی بر نہ آسکے گی۔ اس کی رائے میں دو آدمی ایسے ہیں جو مختلف حکمرانوں سے سامنا کر سکتے ہیں: پوپ عیسائی حکمرانوں سے اور فرانس کا بادشاہ مسلمان حکمرانوں سے کیونکہ ان مسلمان حکمرانوں کے ہاں بھی وقعت اور شہرت رکھتا ہے۔

بے شبہہ گرد نیوس بھی امن کے حامیوں میں سے ہے لیکن اسے "امن کا خواب دیکھنے والوں" میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" کا ایک حملہ بظاہر وہ "دنیا بینیا" سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ اور وہ اس میں اتحاد اور حکمرانوں کی کانفرنسوں کو سراہتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "جس وجہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کے باعث یہ نہ صرف مفید بلکہ ایک حد تک ضروری بھی ہے کہ عیسائی سلطنتیں آپس میں ایک قسم کی تنظیم پیدا کر لیں اور اس کے اجلاسوں میں ان میں سے ہر ایک کے تصادم اور جھگڑوں کا فیصلہ، دیگر کوئی مفاد نہ رکھنے والوں کی رائے سے کیا جائے۔ بلکہ خود ایسے وسائل تلاش کئے جانے چاہئیں کہ فریقین کو معقول شرائط کے مان لینے پر مجبور بھی کیا جا سکے۔"

ہیسے رائن فلز کا حکمران ارنسٹ، ایک جرمن امیر تھا (اور جرمن شہنشاہ کی طرف سے افسر عدل گستری بھی تھا)۔ اسے اِمے رِک گروسے کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس نے ۱۶۶۰ء میں جرمن میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "سچا اور مخلص نیز محتاط ذہنیت والا کیتھولک" تھا۔ (پھر کتاب میں اسی کا نامکمل فرانسیسی ترجمہ) ــــ اس میں اس نے حکمرانوں کے سماج کے لئے ایک عدالت قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور یہ کہ یہ عدالت شہر لوسیرن میں ہو۔

ایک دوسری تالیف اس سے بہت زیادہ مشہور ہوئی۔ یہ "مدامی امن" کے نام سے موسوم تھی اور ۱۷۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مولف ایک نفیس اور محبت انسانی سے لبریز شخص تھا:۔

شارل ای ارے نے کا ستل ڈسیں پیئر نے اپنی (یہ) تالیف چوتھے ہنری کی سرپرستی میں دے دی اور تجویز کی کہ ایک "یورپی جمہد" قائم کیا جائے۔ اس حلیفی میں جو سلطنتیں شریک ہوں، انھیں آپس میں جنگ کر سکنے سے دست بردار ہونا اور اس حلیفی کی مجلس عمومی کے بیچ بچاؤ اور تحکیم کو قبول کرنا ہوگا۔ یقیناً یہ ایک دلپسند خواب تھا اور ایسے شخص کا خواب جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ بھلائی کا حامی تھا۔ لیکن یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس تجویز کا مرتب کرنے والا احمقانہ خود فریبیوں میں مبتلا نہ تھا۔ اسے ترقی پر یقین تھا تو ساتھ ہی حقائق کے احساس سے بھی وہ عاری نہ تھا۔ اس تالیف کے ساتھ ایک تعارفی خط بھی منسلک تھا، جس میں لکھا تھا کہ: "یہ ایک ایسی تجویز ہے جسے شائد آپ اور میں کبھی بھی بر آتا نہ دیکھ سکیں۔ لیکن ہمیں اپنے اجداد سے جو بھی اچھی چیز ملی ہے، اس کے اعتراف میں کیا ہمیں اس بات کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے اخلاف کے لئے اس سے بھی زیادہ بڑی بھلائی فراہم کریں؟" یہ ایک شرافت بھرا اقرار ہے بلکہ اس کا بھی کہ ہر شخص کا یہ فریضہ ہے کہ انسانیت کی قوتوں کو ترقی دینے میں ہاتھ بٹائے، جس کی جھلک چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں دانتے نے بھی دیکھ لی تھی اور جسے اس نے "تمدن" کے خوبصورت نام سے موسوم کیا تھا۔ 399

خاتمہ

400

مسٹر رابرٹ فلنٹ نے اپنی نفیس کتاب "تاریخ فلسفہ تاریخ"

میں بتایا ہے کہ کوئی علم اپنے ہمسایہ معلومات سے اپنے آپ کو علیحدہ کرکے ایک مستقل علم کی حیثیت خاصی دیر میں حاصل کرتا ہے۔ وہ ذہین شخص جسے کسی علم کا بانی کہا جاتا ہے، وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کرتا کہ اس علم کے عناصر کو جو پہلے ہی موجود ہوتے ہیں، الگ کر لیتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو صرف اس پر محدود رکھتا ہے کہ اس کے منتشر اعضاء کو یکجا کر کے ان میں زندگی کی روح پھونک دے[1]۔

ہم ان کوششوں پر تبصرہ کر چکے ہیں جو کئی صدیوں تک اس غرض سے عمل میں لائی جاتی رہیں کہ قوموں کے تعلقات میں حق ہی کا بول بالا ہو۔ مسٹر رابرٹ فلنٹ نے جو قابل ملاحظہ چیز پیش کی ہے اس کا اطلاق ہوگو گروتیوس کی لاطینی کتاب "قانون جنگ و صلح" پر کیا جائے تو اس کی صداقت ہمیں بے اختیار مان لینی پڑتی ہے۔

اس ممتاز مولف کا خاندان اصل میں برگنڈی سے تعلق رکھتا تھا اس کے دادا کورنے ای کورنے نے گروت فان کراآین بورگ کے تیئیری کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ چونکہ تیئیری کو کوئی اولاد ذکور نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس کی صریح خواہش کے مطابق تو اسے اپنے نانا کے نام سے موسوم کئے گئے۔ کورنے ای کورنے کا بڑا بیٹا ہوگو فان گروت نعالجس کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک کا نام کورنے ای رکھا گیا، اور دوسرے کا یوحان ہوگو اور یہی آخر الذکر ہمارے ممتاز مولف کا باپ تھا۔ (اور گروت کا لفظ لاطینی میں جا کر گروتیوس ہو گیا ہے)۔

ہمارے مولف گروتیوس کو اپنی عملی زندگی شروع کرنے میں بڑے اچھے مواقع حاصل ہو گئے تھے۔ تاریخ میں ایسی

[1] رابرٹ فلنٹ کی انگریزی تالیف "تاریخ فلسفہ تاریخ" جلد ۱، صفحہ ۲۸۔

کم مثالیں ملتی ہیں کہ اتنی کم عمری میں کوئی شخص اتنا پختہ کار ہو جائے۔ نو سال کی عمر میں وہ لاطینی میں بڑی اچھی نظمیں لکھ لیتا تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں اسے جامعہ میں شریک کر لیا گیا۔ سنہ ۱۵۹۸ء میں مجلس نمایندگان ہر سہ طبقات کی طرف سے جو سفارت چوتھے ہنری کے پاس بھیجی گئی تھی اس میں اسے بھی وابستہ کر دیا گیا تھا۔ (جب کہ اس کی عمر پندرہ سال کی تھی) بادشاہ اس کی فضیلت اور اس کی قابلیتوں سے کچھ اتنا گرویدہ ہو گیا کہ "ہالینڈ کا اعجوبہ" کہہ کر اسے دربار میں پیش کیا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں گروتیوس وکیل بن گیا۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے لاطینی میں "قانون غنیمت کی شرح" لکھی جو ڈھائی سو سال تک چھپے بغیر پڑی رہی۔ تیئیس سال کی عمر میں اسے ہالینڈ کا (سرکاری) وکیل مالیہ نامزد کیا گیا۔ جلد ہی ہم دیکھتے ہیں کہ شہر روتردام نے اس کی تنخواہ مقرر کر دی ہے اور اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے اسے انگلستان روانہ کر رہا ہے۔ وہ مجلس ہالینڈ اور مجلس نمایندگان ہر سہ طبقات کا رکن بھی بن گیا اور اپنے ملک کے سیاسی اور مذہبی جھگڑوں میں بھی الجھ گیا۔

یہ زمانہ اضطراب اور پریشانیوں کا تھا۔ مذہبی جھگڑوں اور ناساؤ کے حکمران موریس کی ہوس نے ایک تشویشناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ پہلی مرتبہ مشہور اولڈن بارنے ولٹ نے اس ہوس مند حکمران کی تجویزوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا لیکن جب "آرمینیوسی اور گوماری" فرقوں کے جھگڑے پیدا ہوئے تو حکمران مذکور کو موقع مل گیا کہ اپنا انتقام لے "آرمینیوسی" فرقے کے لوگوں کو بعض وقت "احتجاجی" بھی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ چاہتے یہ تھے کہ کالوین نے مسئلۂ جبر و قدر کے متعلق جو نظریہ پیش کیا تھا اس کی شدت کو گھٹائیں۔ خاص کر روشن خیال طبقوں میں یہ فرقہ مقبول ہو گیا۔

اولڈن بارنے فلٹ بھی اسی کا معتقد تھا۔ ناساؤ کے موریس نے گوماری فرقے کے عقائد قبول کئے۔ یہ لڑائی طویل رہی۔ لیکن حکمران کی چالاکی بالآخر کامیاب رہی۔ اہل ملک کی تائید کے بھروسے پر اس نے آرمینیوسی فرقے کے لوگوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ اسپین کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ اور جب ڈورڈریشت میں ایک مجلس مذہبی منعقد ہوئی، تو اس نے وہاں ایک قرارداد منظور کرائی کہ آرمینیوسی فرقے کے خیالات غلط ہیں۔ اور اس نے کچھ اس عمدگی سے کارروائی کی کہ اولڈن بارنے فلٹ، ہوگو گروتیوس، ہوگر بیتس اور لیدن برگ کو غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ملزموں کا چالان الگ الگ کیا گیا۔ اولڈن بارنے فلٹ کے متعلق جو غیر منصفانہ فیصلہ صادر ہوا، اس سے سب واقف ہیں۔ ۱۳ مئی ۱۶۱۹ء کو جلاد نے اس شخص کا سر قلم کر دیا جو، ناسی تورن کے بعد، اپنے وطن کی آزادی کے لئے سب سے زیادہ کوشش کر چکا تھا۔ گروتیوس اور ہوگر بیتس کو قید عمری کی سزا دی گئی۔ لیدن برگ نے خودکشی کر لی۔

گروتیوس کو اپنی سزا کاٹنے کے لئے لووے فے اشٹائن کی گڑھی میں منتقل کر دیا گیا تھا، جہاں اس کا طرز عمل قابل تعریف رہا۔ اسے اپنی قسمت کی کچھ پروا نہ تھی اور ہر قسم کی من مانی کارروائیوں پر اُف تک کئے بغیر صابر رہا۔ اس نے اپنے آپ کو کام میں مشغول کر لیا۔ چنانچہ یونانی ادبیات عالیہ کے بہترین ترجمے، "ہالینڈ کے علم قانون کی تمہید"، "دعیسائی مذہب کی حقانیت پر رسالہ" (جو خاص کر ادنیٰ طبقے کے اور چھوٹے لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا)، "چاروں انجیلوں کی شرح" —— ان کتابوں جیسی چیزیں اس کے زمانۂ قید کی اہم تالیفی یادگاریں ہیں۔ تقریباً دو سال گزر گئے اور وہ ۲۲ مارچ ۱۶۲۱ء کو کسی طرح

قید سے بھاگ نکلا۔ وہ آن قیبر پہنچا پھر فرانس اور شہر پاریس میں اسے صدر نشین تراں نیں نیز پیرسک اور کون دے کے حکمران اور قیبر کی مہر کے محافظ سے بڑی مستحکم تائید حاصل ہوئی مطالعہ ہی "جلاوطن" گروتیوس کی دل بہلائی کا سامان رہا جس طرح "سرکاری قیدی" گروتیوس کے لئے تھا۔ پیرسک کے مشورے سے اس نے اپنی کتاب "قانون جنگ و صلح" مرتب کرنی شروع کی۔ گروتیوس نے پاریلیان ایکس کے اس ممتاز مشیر کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ "قرجل نے تو کہا تھا کہ آپ کے حکم سے جو بیتیں لکھی گئی ہیں انھیں قبول فرمائیے۔ اب اے ممتاز پیرسک! میں اپنی حد تک آپ کے پاس بیتیں نہیں بلکہ ایک کتاب بھیجتا ہوں جو آپ ہی کی ترغیب پر اور آپ ہی کی سرپرستی میں شروع ہوئی تھی۔"

تاریخ تمدن میں کم کتابیں ہیں جنھوں نے اس "قانون جنگ و صلح" کا سا کام کیا ہو۔ یقیناً یہ کہنے میں ذرا بھی جسارت نہیں ہوگی کہ یہ کتاب اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ حق و انصاف کو چاہنے والا کوئی ایک شخص بھی باقی ہے اس ممتاز نشیبنائی مولف نے انسانیت کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ ہمیں بہ آواز بلند کہہ دینا چاہیئے کہ اس نے دنیا کے ساتھ جو بھلائیاں کی ہیں انھیں کبھی کوئی گن نہ سکے گا۔ گروتیوس کے خیالات ایک ایسے حلقے میں سرایت کر گئے جہاں ان کے اثرات بے انتہا نکوکارانہ[1] رہے۔ انھیں خیالات کی وجہ سے قوموں کے مسالمانہ تعلقات میں انصاف کا

[1] یہاں "نکوکارانہ" کی جگہ "بہ کارانہ" کا لفظ زیادہ صحیح ہوگا اگر یہ نیا لفظ گھڑنے کی اجازت دی جائے۔ (مترجم)۔

دور دورہ ہونے میں مدد ملی۔ انھیں نے جنگ کی بے رحمیوں کو کم کرنے میں حصہ لیا۔ اور اس خاص سلسلے میں انسانیت کی جو بھی کوشش یا تدبیر عمل میں لائی گئی اس کے متعلق کچھ نہیں تو جزءً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی بڑے مولف کے باعث عمل میں آئی۔

"قانون جنگ وصلح" کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے وجوہ سمجھنے آسان ہیں۔ موضوع اہم تھا اور کتاب میں وہ چیزیں جمع تھیں جن کا اس کی اشاعت کے زمانے میں عمدہ استقبال ہونا ناگزیر تھا۔ ادبیات عالیہ کی مہارت نے اس میں اپنا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ اس میں ایک مذہبی روح دلولا رہی تھی۔ اس میں بائبل اور کلیسائی پادریوں کے کثیر اقتباسات عمومی مذاق کے بالکل مطابق تھے۔ اور ساتھ ہی اس کتاب میں استدلالی انداز بہت زیادہ نمایاں تھا۔ اور اس کا مولف حکمرانوں کے امتیازات کو سراہ رہا تھا۔[1]

403

یہ نہیں کہ کتاب بے عیب ہو۔ عیوب کا ہم ابھی ذکر کریں گے۔ مولف پر یہ بھی الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی کتاب کا ڈھانچہ کچھ مستحکم نہیں ہے۔ اور وہ مثالیں تو بے شمار دیتا ہے لیکن وہ کسی اصول یا نظام پر کافی حد تک بنی نہیں ہیں۔ پھر بھی ڈیوگالڈ اسٹیورٹ نے جسے گروتیوس ذرا بھی نہیں بھاتا یہ اعتراف کیا ہے کہ: قانون قدرت، قانون بین الممالک، اخلاق اور سیاسی معاشیات کے بہت سے مولف گروتیوس ہی کے باعث پیدا ہوئے یا پوفنڈورف کے باعث جو خود براہ راست گروتیوس ہی سے تعلق رکھتا ہے۔[2]

---

[1] انگریزی رسالہ "اڈنبرا ریفیو" بابت اکتوبر ۱۸۶۰ء صفحہ ۳۸۶۔

[2] ڈیوگالڈ اسٹیورٹ کی انگریزی تالیف "ماوراء الطبیعی، اخلاقی اور

سترھویں صدی عیسوی کے دوران میں کتاب "قانون جنگ و صلح" کا ترجمہ سویڈن، ہالینڈ، انگلستان، فرانس اور جرمنی کی زبانوں میں ہو گیا اور اسی صدی میں مختلف ملکوں میں اسے شریک نصاب کیا گیا۔ لوگ اس کا مطالعہ کرنے لگے اور اس پر شرحیں لکھی جانے لگیں۔ اگر اس شریف کتاب کی فاتحانہ پیش قدمی کا پورا تذکرہ کرنے کی کوشش کی جائے تو قانون بین الممالک کی پوری "ادبی تاریخ" لکھنی پڑے گی[1]

اس کتاب سے جو علمی حرکت جرمنی میں پیدا ہوئی وہ قابل لحاظ ہے۔ پیئیر بائیل کے ایک دوست اے تن این شوفتیں نے سترھویں صدی عیسوی کے آخر ہی میں یہ چیز محسوس کر لی تھی۔ اور وہ بتاتا ہے کہ یوحان ہائن رش بوئیک لر، فلپ مولر، گاس پار تسیگ لر، یوحان گیورگ زیمون، داقد مےقیوس، یوحان قیس مار نے گروتیوس ہی کی کتاب کو اپنی تالیفوں کی بنیاد بنایا تھا۔ شوفتیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ پالاتینا کا حکمران، کارل لودوِش نے، جسے جرمن شہنشاہ کے انتخاب میں رائے دینے کا بھی حق حاصل تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سیاسی فلسفے کی ترقی پر جو یورپ میں احیاء ادبیات کے بعد سے ہوئی مقالہ شائع کردہ سر ولیم ہاملٹن جلد (۱) صفحہ ۱۷ ومابعد۔

[1] حسب ذیل کتابیں پیش نظر رہ سکتی ہیں، آومپ لے ڈا کی جرمن تالیف "مجموعی نیز قدرتی اور وضع کردہ قانون بین الممالک کے ادبیات" مطبوعہ ۱۷۸۵ء۔ کامپٹ سے کی جرمن تالیف "قانون بین الممالک کے نئے ادبیات" مطبوعہ ۱۸۱۷ء نیز بطور خاص الفونس ری فیسے کی عالمانہ فرانسی تالیف "گروتیوس سے اب تک کے نظام قانون بین الممالک کی ادبی تاریخ کا خاکہ" جسے ہولت سن دورف نے اپنی جرمن تالیف "قانون بین الممالک کی دستی کتاب" نیز اپنی فرانسی تالیف "قانون بین الممالک کی تمہید" میں شامل کیا ہے۔

اس بات کا حکم دیا تھا کہ کتاب "قانون جنگ و صلح" کی توضیح کے لئے جامعۂ ہائیڈلبرگ میں عمومی لکچر دیئے جایا کریں اور قانون قدرت و قانون بین الممالک کے لئے اس نے سب سے پہلی پروفیسری قایم کی جس پر ساموئل پوفن ڈورف کو مامور کیا[1]۔ اہم تالیفوں پر بکثرت مقالوں کا بھی اضافہ ہوتا رہا اور مختلف جامعات میں قانون بین الممالک کے خصوصی نکات پر سیکڑوں مقالے لکھے جانے لگے جو خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ عام طور پر مقالہ پروفیسر ہی لکھ کر دیا کرتا ہے اور طالب علم اس پر امتحان میں ہونے والے سوالات اور اعتراضات کا جواب دینے ہی تک اپنے کو محدود رکھتا ہے۔

404

انگلستان میں قانون بین الممالک پر جن لوگوں نے کتابیں لکھیں انھوں نے اس ولندیزی مولف کے خدمات کو نہایت مخلصانہ طور سے سراہا ہے۔

اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ فرانس میں سترھویں صدی کے اختتام پر قانون بین الممالک کے متعلق کوئی کتابیں نہیں لکھی گئیں اور یہ زمانہ وہ ہے جس میں قانون بین الممالک کی بالکلیہ نفی ہی کرنے والی چیزیں شائع ہوتی رہیں۔ اور پورے یورپ کے رو در رو فرانس کے بادشاہ اس نظریے کی حمایت میں ڈٹے رہے کہ شہنشاہیت، تاج فرانس کے ساتھ لاینفک طور سے وابستہ ہے۔ چونکہ یہ نظریہ داخلی طور پر مطلقیت پر مبنی تھا، اس لئے خارجی سیاسیات میں وہ دوسرے ممالک کے حقوق سے انکار کرتا رہا۔

قانون بین الممالک نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو ترقی کی اس کی تفصیل ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔ بہر حال اٹھارویں

[1] فرانسیسی در رسالۂ علماء جو ١٦٩٦ء میں برلن میں مرتب ہوا تھا دیکھئے صفحہ ٢٢٠ و ما بعد۔

صدی میں اکثر ملکوں میں اس فن پر بڑی عمدہ عمدہ کتابیں لکھی گئیں اور یہاں بھی گروشیوس ہی کے خیالات مولفوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس زمانے کے واقعات اندوہناک ہیں۔ اور شاہی سیاسیات کے باعث سازش اور بدعہدی برا جنے لگتی ہیں۔ اس زمانے میں چند درخشاں دن اگر استثنائی حیثیت رکھتے ہیں، اور مجالس دستور ساز بین الاقوامی تعلقات میں انصاف کے دور کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہیں تو وہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ عمومی سیاسیات میں منافقی اور دو رخا پن چھائے ہوئے تھے۔

انیسویں صدی میں قانون بین الممالک کی ترقی بہر حال حقیقی تھی۔ اس کے نصف دوم میں جہاں تک نظریوں کا تعلق ہے، موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے اور جہاں تک واقعات کی سرزمین کا تعلق ہے، اسی زمانے میں متعدد ایسے ادارے قائم ہوئے جو عمومی نوعیت رکھتے تھے اور جن کا منشاء بین الممالک نظم ونسق کی زیادہ سے زیادہ تکمیل تھا۔ بے شبہہ جنگ اپنی ہولناکیاں برپا کرتی رہی لیکن پھر بھی قوانین جنگ کا اتنا کچھ احترام ہوتا رہا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اب جنگ کا ان وحشیانہ اداروں پر تکیہ نہیں رہا جو اس کی ہولناکی کو بڑھایا کرتے تھے، یعنی انتقامات، بحری قزاقی، غیر محدود لوٹ کا حق، قیدیوں کو غلام بنانا۔ بلکہ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ مذکورۂ بالا چیزیں جو عرصۂ دراز تک جنگ کا ناگزیر سہارا سمجھی جاتی رہی ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو کیا ایک دن جنگ خود اپنی اس حیثیت میں کہ حقوق جتانے کا وہ ایک ذریعہ ہو، ختم نہ ہو جائے گی؟

مستقبل ہم سے چھپا ہوا ہے۔ لیکن ماضی اور حال سے ہم مستقبل کے متعلق نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ چونکہ ماضی اور حال میں ہمارے

تسلی کا سامان رہا ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان فیاض لوگوں کی کوششیں، جن کے کارناموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں، نہ صرف یہ کہ تباہ نہیں ہو جائیں گی بلکہ تکمیل کو پہنچیں گی۔ اور اپنا مقصد حاصل کریں گی۔ 405

ہیگل کے نظریے میں عالمی ذہنیت کو قومی ذہنیت کے اوپر جگہ حاصل ہے۔ اور ہر قوم ایک دہری زندگی بسر کرتی ہے یعنی ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی جو اول الذکر کی پرورش و تکمیل کرتی ہے۔ عالمی ذہنیت ایک دن قومی ذہنیت کو اپنے میں ضم کر لے گی اور ایک عالمگیر مملکت وجود میں آکر قانون بین الممالک ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ مفروضہ کبھی حقیقت بن سکے تو جنگ ناممکن ہو جائے گی کیونکہ وحدت جنگ کے راستے میں حائل رہے گی۔

اگر عالمگیر مملکت قائم نہ ہو اور انفرادی مملکتیں اپنا وجود برقرار ہی رکھیں تو بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب قوت کا استعمال نہیں ہوا کرے گا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون نہیں بہے گا۔ فیلڈ مارشل مولٹ کے نے بلونچ لی کے نام اپنا جو شہرۂ آفاق خط لکھا تھا اس میں جنگ کے فوائد سراہے گئے ہیں۔ اس کا جملہ بڑا لطیف ہے لیکن ہمیں بیان کر دینا چاہئے کہ وہ آن سیئوں کی فرانسیسی تالیف "یورپ کے نظم سیاسی کے انقلابات کی جدول" سے تقریباً لفظ بلفظ اڑایا گیا ہے۔

بہر حال یہ نہ بھلایا جائے کہ دنیا پر تین بڑے تصورات حکمرانی کرتے ہیں یعنی ترقی، آزادی اور انسانیت۔ چونکہ ان تصورات کے خلاف کوئی چیز سربراہ نہیں ہو سکتی، اس لئے اس اعتقاد کو استحکام حاصل ہوتا ہے کہ زیادہ بہتر زندگی وجود میں آئے گی اور ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ انھیں تصورات کے باعث امید بندھتی ہے۔ انھیں کے باعث اس کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ ایک ایسا

زمانہ آنے والا ہے، جب میرابو کا وہ درخشاں جملہ جو سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا اس نے مجلس قانون ساز کی بلند جگہ سے اپنی زبان سے نکالا تھا کہ "حق ہی دنیا کا مقتدر اعلیٰ ہے اور مریخ (جنگ کا دیوتا) ہی اصل ظالم ہے" پورا ہو کر رہے گا!

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ

حصۂ اول

محولہ کتابیں اور مضامین

یادداشت: ۔ (ح) سے مراد حاشیۂ صفحہ ہے۔ اور بڑے ہندسے پر چھوٹے ہندسے (مثلاً ۵ ۲) سے مراد یہ ہے کہ صفحہ (۵) پر وہ نام دو مرتبہ آیا ہے۔

معذرت: ۔ اشاریے کی تیاری پر کتاب کی بعض کوتاہیاں ظاہر ہوئیں۔ چنانچہ چند نام مختلف صفحوں پر مختلف طور سے لکھدیے گئے ہیں مثلاً رتے آل اور ریال، آکسفورڈ اور آکسفرڈ، گوتی اَین اور گوتی یَین ——— اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ کچھ ترجمہ مولف نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا اور کچھ ایک صاف نویس کو کہہ کر املا کرایا گیا تھا۔

بعض کتابوں کے ناموں میں خود اصل مولف نے یکسانی نہیں برتی ہے۔ کہیں کچھ اور کہیں کچھ ہے۔ بعض وقت کسی لاطینی کتاب کے نام کا ترجمہ کرنے کے کئی ہفتوں بعد مکرر وہی نام کسی دوسری جگہ آیا اور سابق میں آنا ذہن سے اتر جانے کے باعث مکرر ترجمے میں مفہوم تو وہی رہا لیکن کبھی کبھی الفاظ کسی قدر بدل گئے۔

تنبیہ: ۔ یورپی زبانوں میں تلفظ کی کچھ اتنی بے قاعدگی اور تفاوت ہے کہ ایک ہی طرح لکھا جانے والا نام اگر اطالوی کا ہے تو الگ طرح پڑھنا پڑتا ہے اور

فرانسیسی کا ہو تو الگ اور انگریزی کا ہو تو الگ ـــــ مثلاً شارل اور چارلس، لوئیوس اور جوئیس، رچرڈ اور ریشار، ہنری اور آن ری، آلسیا اور آلجیات وغیرہ۔ مزید برآں فرانسیسی مولفوں میں ناموں کے ترجمے کی بری عادت ہے چنانچہ وہ جرمن کارل کو شارل، لودوش کو لوئی لکھیں گے ولہلم نیز ولیم کو گیوم، مائکل نیز میخل کو میشل، جوئیس کو ژول، یوحان اور جان کو ژاں۔ بعض وقت کسی نام پر بڑی تلاش کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہاں کس ملک والے سے مراد ہے۔ ہر جگہ فرانسیسی تلفظ دینا مثلاً لندن کو لوندر، اسکاٹ لینڈ کو ایکوس کسی طرح اردو دانوں کے لیے موزوں نہیں ہوگا۔

اس صورت حال کے باعث مترجم سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، وہ آیندہ دور ہوسکتی ہیں اگر ناظرین ان کی جانب از راہ عنایت تنبیہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۲۴	احکام زرین مولفۂ گرانتیان	۱۲ نیز "مجموعۂ قوانین متضادہ"
۲۵	احکام مذہبی کی پانچ کتابوں میں شرح مولفۂ ابو اش	۱۰۰-۱۰۱ ح
۲۶	اختلاف مابین اقتدار صدر کلیسا و سلاطین ارضی جسے ایک پادری اور سپاہی کے مکالمے کے طور پر مرتب کیا گیا ہے" مولفۂ اوکام	۵۱-۵۲
۲۷	اخلاقی اور سیاسی فلسفے کی تاریخ مولفۂ ژلنے	۵۹ ح
۲۸	اڈنبرا ریفیو" رسالہ	۶۷۱ ح
۲۹	"اس امر کے متعلق مقالہ کہ جنگوں اور اختلافوں کی اجازت خدا نے اس لیے دی ہے کہ حکمرانوں اور بڑے لوگوں کو سزا دلائے" کتاب مولفۂ کوبین	۵۶۳
۳۰	استاد و شاگرد کے مکالمے مولفۂ لوپس	۱۴۹
۳۱	اسپین، افریقہ میں" مولفۂ تودکاں یو	۴۹۲ ح
۳۲	اسپین سے جنگ ہونے کے متعلق ملحوظات" مولفۂ بیکن	۲۸۴
۳۳	"اسپین کے بادشاہ اور شہنشاہ کی حیثیت اور رومی مجلس میں اس کے سفیروں کے مقام کے اعزاز کے لیے حقوق کیا ہونے چاہییں" مولفۂ فال دیشس	۵۵۳

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۳۴	"اسپین کی تاریخ" مولفہ ای لیر	۱۵۳ ح
۳۵	اسپین کے قانونِ تعزیرات کی تاریخ مولفہ دوبوا	۱۳۴ ح
۳۶	"اسپین کی گاتھک حکومت کے قدیم عدالتی قانون" (سابقہ نام کتاب "قوانین" اور قسطیلی ترجمے میں "عدالتی قانون" نام ہے)	۸۰۴ ح تا ۸۱ ح
۳۷	اِستاجریت مولفہ ارسطو	۵۸
۳۸	"اسکاٹ لینڈ والے فرانس میں" مولفہ میشل	۲۰۸ ح
۳۹	اسی دور کے مصنوعی احکام پاپائی اور انجیلی رامنی کا خط مرتبہ ہن شیوس	۶۱۷ ح
۴۰	"اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" مولفہ سسموندی	۳۴۱
۴۱	"اطالوی نشاۃ ثانیہ اور فلسفہ تاریخ" مولفہ گے بار	۴ ح
۴۲	افتتاحیہ لکچر، متعلقہ جنتی لیس مولفہ ہالینڈ	۲۱۷
۴۳	اقوام جدید کے قانون تعزیرات کی تاریخ مولفہ دوبوا	۱۲۷ ح نیز جدید قوموں..."
۴۴	"الحاد اور کشوری ہاتھ قرون متوسطہ میں" مولفہ ہیتے	۲۷۴
۴۵	"امارت بحریہ کی کالی کتاب"	۳۴۶ ح - ۳۹۱ ح - ۳۹۴ ح
۴۶	"امن اور تجارت کے لیے معاہدے اور	

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
	دیگر مختلف دستاویزیں جو قرون متوسطہ میں شمالی افریقہ میں عیسائیوں اور عربوں کے تعلقات سے متعلق ہیں" مولفہ ماس لاٹ ری	٢٦٨ ح
٤٧	"امور جنگ کے متعلق" مولفہ پوت سو	١٨٩
٤٨	امور فوجی مولفہ ثے ژیس	١٧٩ ح
٤٩	"ان مخطوطات کی تفصیل و اقتباسات جو بلجیم کی تاریخ سے متعلق ہیں" مولفہ گاشار	٥٤٠
٥٠	"ان ہدایات کا مجموعہ جو فرانس کے سفیروں اور منتظمین سفارت کو صلح نامہ ہائے ویسٹ فالیا سے انقلاب فرانس تک دیے جاتے رہے" مولفہ راں بو	٢٨٥ ح
٥١	انتقامات مولفہ ثسائت ہوف	١١٠ ح
٥٢	انتقامات، مولفہ مارتن	١١٠ ح
٥٣	انتقامات کے حقوق کی مدافعت پر رسالہ مولفہ کوباخ	١١٠ ح
٥٤	انتقاموں پر مقالہ، مولفہ ال ریش اول رک ہونیوس	١١٠ ح
٥٥	انتقاموں پر مقالہ، مولفہ ڈومی نیک فان آروم	١١٠
٥٦	انتقاموں پر مقالہ مولفہ آندرے وشر	١١٠ ح

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۸۳	بائیسویں جان کی غلطیوں کا مجموعہ کتاب	۶۲
۸۴	"بحری جنگ، قانون بین الممالک کے نقطۂ نظر سے تبصرہ" مولفہ نیس	۱۲۰ح - ۳۷۷ح
۸۵	"بحری جنگ کے مال غنیمت کی تاریخ" مولفہ کال تن بورن	۳۵۹ح
۸۶	"بحری غنیمت کا قانون، خاص کر حربیوں اور ناطرفداروں کے فرائض و واجبات کے حوالے سے" مولفہ کاچے نوقس کی	۳۹۰ح
۸۷	"بحری قانون بین الممالک پر تاریخی وتنقیدی تحقیقات" مولفہ رتی	۳۹۲ح - ۳۹۵ح
۸۸	"بحری قواعد" (کتاب کونسلاتو دیل مارے)	۳۸۷ - ۳۹۰ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ح - ۳۹۶
۸۹	برطانوی سمندروں کا اقتدار اعلیٰ جس کا ثبوت دستاویزوں، تاریخ اور اس بادشاہت کے قوانین ملکی سے ملتا ہے، مولفہ باروز	۴۴۲
۹۰	"برطانیۂ عظمیٰ اور آئرستان کی تاریخیں اور یادداشتیں" سلسلۂ نشریات	۳۴۷ح
۹۱	"بروگیس میں منعقدہ شدہ ۱۴۶۹ء کی بین الممالک رسمی کانفرنس" مولفہ ونے	۴۸۵
۹۲	بطرائینہ مولفہ بوشے	۱۴۳
۹۳	"بٹروں کی طرف سے مقبوضہ اشیا کی واپسی کے متعلق رسالہ" مولفہ ژولی	۲۹۲ح

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
	انسائکلوپیڈیا مولفہ ہیرٹ سوگ	۶۳ ح - ۷۰ ح - ۶۰۴ ح -
۱۰۸	"پرانا قانون" کتاب	۴۸۰
۱۰۹	"پرانی ڈائجسٹ کے حصۂ اول پر" مولفہ روزاتے	۴۳۱ ح
۱۱۰	"پرانی ڈائجسٹ کے حصّہ اول کی شرح" مولفہ بالدے	۳۹۸ ح
۱۱۱	"پرانی ڈائجسٹ کی شرح ایک حصے میں"	۲۴۳ ح
۱۱۲	"پرتگالیوں کی ایشیائی شہنشاہی کی حقیت اور گروتیوس کی تالیف موسوم بہ "سمندروں کی آزادی" کی تردید" مولفہ فرائی تاس	۶۴۰
۱۱۳	"پستویا (پستوا) کے چینو کی سوانح عمری اور قانونی تالیفیں" مولفہ کیاپلی	۱۴ ح
۱۱۴	پوپ اور شہنشاہ کے حقوق پر تبصرہ مولفہ خیرے ای رو	۱۵۱ ح
۱۱۵	"پوپ اور قانون بین الممالک" مولفہ بوں پار	۶۰۴ ح
۱۱۶	"پوپ کے سفیر"، مولفہ سی لے نیوس	۶۰۶
۱۱۷	"پوپوں کے احکام" کتاب	۳۶۶
۱۱۸	"پوپوں کے احکام کا مجموعہ" مولفہ گرتیاں	۱۲ - ۳۲۳ (نیز احکام مجموعۂ تو ازین متضادہ)
۱۱۹	"پوپوں کے مذہبی احکام" کتاب	۳۶۱
۱۲۰	"پولی کراٹیک" مولفہ جان	۵۸۸
۱۲۱	"پیدل فوج کا حکمنامہ" کتاب	۳۵۵

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۲۹۰	سفیر، مولفہ پاس کال	۵۹۴
۲۹۱	"سفیر" مولفہ مارس لیبر	۵۹۷
۲۹۲	"سفیر" شہرادہ فی نخے رو اور کرنتی خا کی مشترکہ تالیف	۵۹۸
۲۹۳	"سفیر" سفیر کا فریضہ اور رتبہ" طبع اول و ثانی مولفہ ہاٹ من	۵۹۵
۲۹۴	"سفیر، اس کے حقوق، رتبے اور فرائض کی دو کتابوں میں توضیح" مولفہ کرشنر	۵۹۶
۲۹۵	"سفیر اور سفارت" مولفہ سے بیرپولانس	۵۹۷
۲۹۶	"سفیر اور سفارت" مولفہ ثار شٹے فس کی	۵۹۴
۲۹۷	"سفیر اور مملکت کی سلامتی کے خلاف سازش کے اصول" کتاب	۵۹۳
۲۹۸	"سفیر پر مقالہ" مولفہ شوکئے	۵۹۸
۲۹۹	"سفیر کا فریضہ اور رتبہ" مولفہ ہاٹ من	۵۸۷
۳۰۰	"سفیر سے متعلق مقالہ کہ اصولاً کس صورت میں سازش پر اسے سزا دی جا سکتی ہے" مولفہ آرومر	۵۹۷
۳۰۱	"سفیر یا حقوق و امتیازات سفارت وسفراء اور ان کے فرائض منصبی کی انجام دہی پر ایک چھوٹی سی کتاب جو لائبجسٹ اور کوڈ پر مبنی ہے"، اس کو	

فلپ ادر التوء و ایکونٹ شیبٹ ری لو؟ فرانس کے نائب قنصل کے نام معنون کیا گیا ہے

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
	اس کا مولف لقائیے ہے جو عدالت اعلیٰ میں وکیل بھی ہے" کتاب مولفہ لقائیے	۵۸۱
۳۰۲	....	
۳۰۳	"سفیروں اور سفارتوں پر قانونی اور سیاسی مباحث" کتاب	۵۹۸
۳۰۴	"سفیروں کی عدالتیں" مولفہ مارتینس	۵۹۳ح
۳۰۵	"سفیروں کا عہدہ" مولفہ زنتہ سر	۵۹۵
۳۰۶	"سفیروں کے فرائض، حقوق اور طریقہائے تصرف" مولفہ ژوناس	۵۹۷ تا ۵۹۸
۳۰۷	"سفیروں کے لیے حاکم مجاز پر رسالہ" مولفہ بنکرشوک	۵۶۴ح - ۵۹۴ح
۳۰۸	"سفیروں کے متعلق"، مولفہ ماجی	۵۷۸
۳۰۹	"سفیروں سے متعلق رسالہ، اصول سفارت کے متعلق، ان کا اعتماد، اور ان کا فریضہ" مولفہ فیرقی	۵۷۷
۳۱۰	"سفیروں کے متعلق کتاب" مولفہ براؤن	۲۹۶ح
۳۱۱	"سفیروں کے متعلق یادداشتیں"، مولفہ وکفور	۵۸۷ح - ۵۹۲ح
۳۱۲	سکسنی کا آئینہ، کتاب	۲۵
۳۱۳	سل قستری خلاصہ، کتاب	۱۹۳ - ۱۹۸
۳۱۴	"سمندروں کی آزادی" مولفہ گروتیوس	۶۴۰
۳۱۵	"سمندروں کی آزادی کا اثبات جو مشہور شخص ...سلڈن کی تردید میں لکھی گئی ہے"	

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۳۶۱	"فرانس کا تاریخی گلستان" کتاب	۱۹۱
۳۶۲	"فرانس کی بڑی تاریخیں" کتاب	۱۹۲
۳۶۳	"فرانس کی تحقیقات" مولفہ پاسکلے	۴۱۲ ح
۳۶۴	فرانس کی تعزیرات کی تاریخ مولفہ دوبلوا	۱۳۹ ح
۳۶۵	"فرانس کی جو ارضی اور سیاسی تنظیم گیارھویں صدی کے اختتام سے پندرھویں صدی کے اختتام تک تھی" اس کے متعلق مقالہ" مولفہ میں بے	۳۴۱ ح
۳۶۶	"فرانس کے حکومتی اور عدالتی حالات اور عہدوں پر مقالہ جس میں مختصر طور پر اس سے بحث کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو کیا اقتدار حاصل ہوتا ہے کن پر اختیار سماعت چلتا ہے اور ان کے مخصوص فرائض کی کیا نوعیت ہے" کتاب مولفہ ڈی گوں	۵۸۲
۳۶۷	"فرانس کے دربارہائے شاہی کے عمدہ فیصلوں کا مجموعہ" مولفہ پاپوں (فرانس کی مقتدر عدالتوں)	۸۶ ح - ۳۳۰ ح
۳۶۸	"فرانس کی سفارت کاری سولھویں صدی کے وسط میں گیوم پی لی سیے کی خط و کتابت کی روشنی میں" مولفہ زلر	۱۰۱ تا ۳ ح - ۳۸ ح

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
	سوائے بھی ہیں" مولفہ اے فریڈرڈی	۶۳۵
۴۲۴	"قدیم ترین قوانین موضوعہ پر تبصرے" مولفہ بارنگٹن	۴۰۷ ح
۴۲۵	قرون متوسطہ اور زمانۂ جدید کی تاریخ اور مماثل موضوعوں پر سترہ تقریریں مولفہ اِسٹبس	۱۵۵ ح
۴۲۶	قرون متوسطہ کے اطالوی آثار مولفہ موراتوری	۱۰۴ ح
۴۲۷	"قرون متوسطہ کی تاریخی اور فلسفیانہ سیر" مولفہ ژوردین	۱۷۴ ح - ۲۰۵ - ۲۰۶ - ۴۷۱ ح
۴۲۸	قرون متوسطہ کی جرمن دولت عامہ کے قانونِ انتقام کے اصول، مولفہ بروک	۱۳۹ ح
۴۲۹	"قرون متوسطہ کی سفارت کاری کی مذہبی نوعیت" مولفہ برنتانو	۵۳۷ ح
۴۳۰	قرون متوسطہ کے مولفوں کی استعمال کی ہوئی لاطینی اصطلاحیں، مولفہ دوکانژ	۹۹ ح
۴۳۱	"قرون متوسطہ میں اطالوی جمہوریتوں کی تاریخ" مولفہ سِسمونڈی	۳۴۲ ح
۴۳۲	"قرون متوسطہ میں انگریزی صنعت اور تجارت کی ترقی" مولفہ کننگ ہام	۳۲۷ ح
۴۳۳	قرون متوسطہ میں شمالی افریقہ کے	

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۵۱۸	مقدس رومی شہنشاہت اور موجودہ جرمن شہنشاہت مولفہ برائیس	۲۳-۹۳ ح- ۱۴ ح- ۶۵۰ ح
۵۱۹	"مقدس رومی شہنشاہت کی بادشاہی" مولفہ گولداست	۵۳ ح
۵۲۰	مقدمہ مولفہ ابن خلدون	۱۷۴
۵۲۱	مکالمہ جس کے تین ممتاز حصے ہیں: پہلا ملحدوں کے متعلق، دوسرا بائیسویں جان کی غلطیوں کے متعلق تیسرا پوپ اور مجالس شورائے کلیسا اور شہنشاہ کے اقتدارات کے متعلق	۶۲
۵۲۲	"ملحدوں کے قانون کا اعادہ" مولفہ آلبرتی نو	۲۵۲
۵۲۳	"ممتاز انگریز ماہرین قانون روما کے سوانح اور کردار کے خاکے نیز ایک تاریخی تمہید متعلق بہ کالج وکلاء" مولفہ کوٹ	۴۰ ح
۵۲۴	"مملکت اور کلیسا کے حدود اور ان کی تعدی کے خلاف ضمانتیں" مولفہ فریڈبرگ	۷۴ ح
۵۲۵	"مملکت کا بارہ یا مملکت کے متعلق مختلف مقالات کا مجموعہ" کتاب	۲۸۶
۵۲۶	"مملکت کے ضروری ہونے کی تاریخ" مولفہ فے راری	۵۷۷ ح
۵۲۷	"مملکتی لغت" مولفہ لوذنیک	۳۵۹ ح

شمار	نام کتاب یا مضمون	صفحہ
۵۸۱	"یورپی مملکتوں کے سفارت نامے جو سفیروں نے سینیٹ میں پڑھ کر سنائے اور جو سترھویں صدی میں آئے" مولفہ بارزوتناسی و برشے	۵۰۴ ت

حصۂ دوم

اعلام و مباحث

صحت نامہ

جدید قانون بین الممالک کا آغاز

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
و	۱۱	اثولوجیا	اثولوجیا
۲۹	آخری	گیزلر	گی زے لر
۳۷	۴	کے جان	جان
۶۳	۱ (حاشیہ)	42	×
؍؍	۲۳ (؍؍)	×	42
۶۵	۱۲	روھی	رومی
۸۲	۱۶	مونٹ فورڈ	مونٹ فورٹ
۸۳	۱		
۸۴	۱۰	علاقہ ثالوا کے حکمران فلپ۔	بادشاہ ثالوا کے فلپ۔
۸۴	آخری	کہ سپنے	کہ وہ اپنے
۸۶	۳	نے حکمراں	کے حکمراں
۹۵	۲۲	مونت روئی	مونست روئی
۹۹	۱۹	لڑیوں	لڑائیوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۰۴	۱۱	فیرار	فیرارسے
۱۱۰	۲۲	ہمایرش	ہل فریش
۱۱۲	۳	×	70
۱۲۱	۱۳	سنہ ۱۲۰۶ء	سنہ ۱۲۹۶ء
؍؍	۱۴	لیبوں	لبو
۱۲۴	آخری	لانڈزون	لانزڈاون
۱۲۹	۸	ذات	جات
۱۳۸	۱	تہدیدامین	تہدیدیں
۱۳۹	۱۶	تورم برگ	نورم برگ
۱۶۷	۲۲	بوسے	بوسیوسے
۱۸۰	۶	کے جائداد	کی جائداد
۱۸۱	۲۳	ڈِیل	ڈیل
۱۸۶	۹	یوت فیس	بوت فئیں
؍؍	۲۳	؍؍	؍؍

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۹۰	آخری	سلہ	۲ہ	۳۶۶	۱	یں پوپ	میں
۱۹۱	۱۲	طبیبیوں	طبیبوں	"	۲۱	قلبیلہ	قبیلہ
۱۹۳	۳۰	مرتب کیا؟	مرتب کیا۔	۳۷۰	۱(حاشیہ)	2	220
۱۹۵	۱۲	غنیمت پر یادداشت	غنیمت کی شرح	۳۸۲	۲۴(حاشیہ)	228	×
۲۰۳	۱۶	لاقہ	لوقہ	۳۸۳	۶	×	228
"	۱۷	تنز ثے لا	ثنز وے لا	۴۰۲	پیشانی	۳۰۲	۴۰۲
۲۱۹	آخری	دو پلے	دِو سبلے	۴۲۱	۲۲	سوات سارا	سوت سارا
۲۲۶	۲۲	تغریزی	تعزیری	۴۳۹	۴	آڈم	آدم
۲۴۹	۲۴	ٹامن برگ	ٹامسنے برگ	۴۴۸	۱۰	لاٹپزگ	لائپزگ
۲۵۷	۳	ثالا دولد	ثاآیا دولد	۴۴۹	۷	آرقیبی لیوں	آرقیں یوں
۲۶۸	۱۹	خلیفہ مامون	سلطان مامون	۴۵۵	۹	بارتٹ	بارنٹ
۲۷۱	۱۱(حاشیہ)	101	162	۴۵۷	۸(حاشیہ)	×	272
۲۷۸	۷	میگاپولس	میگالوپولس	۴۵۹	۲۰ حاشیہ	ژپر	ژیر
۲۸۴	۴	تسونک لے	تسونگ لے	۴۶۳	۱۸(حاشیہ)	×	276
۲۸۵	۵	مازارینی	مادزارینی	۴۷۳	۹	ڈن یوب	ڈان یوب
۲۸۶	۴	سنہ ۱۶۲۳ء	سنہ ۱۶۳۴ء	۴۷۴	۳ حاشیہ	×	283
"	۲۳	گھراللہ	گھرالہ	۴۷۶	۲۳ "	×	285
۲۹۴	آخری	زمانے	زمانے میں	۴۷۸	۱۴ "	×	286
۳۰۶	۲	آلاسوں	آلالسوں	۴۸۰	۶ "	×	287
۳۱۰	۹(حاشیہ)	×	185	۴۸۱	۲۱	ونے گر	وئے خر
۳۳۳	۲۴	ذرہ	زرہ	۴۹۸	۲۴	لبرمولی	ریلرمول
۳۴۰	۱۰	ویں سیں	قین سین	۴۹۹	۱۹		

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۴۹۹	۲۴	مبدی	میدی	۶۰۹	۲۰	دیانا	دیاتا
۵۰۸	۲۲	۸۷۸۹۷	۸۷۸۷۹	۶۱۳	۲۰	کالیوتو	کاپوتو
۵۳۸	۱۶	گرلی	گرتی	۶۱۸	۶	یوژرادور	بوژرادور
۵۴۰	۱۷	دلبورگو	دلبورگو	۶۳۲	۱۱		
۵۴۴	۴	برادے	پرادیے	۶۳۳	۲	آں سوں	آں کوں
۵۴۸	۵	آڈولف	روڈولف	〃	۱۷		
〃	۲۳	یلاگ	بیرگ	〃	۲۰	تیریتان	تیرے تیان
〃	〃	حلیفاں	حلیقیاں	۶۳۶	۱۵	گریس کرک	گریس کرسکے
۵۵۱	۹	پول لتسا	پوگ لیتسا	〃	۲۱	پاساپا	پاسیا
۵۵۳	۲۲	نہیں ان کی	نہیں کہ ان کی	۶۴۰	۲	ایشائی	ایشیائی
۵۵۹	۱	سنہ ۱۹۱۹ء	سنہ ۱۶۱۹ء	〃	حاشیہ ۱۲	×	384
〃	۵	ملگ	ملک	۶۴۸	۶	ثقاں سیں	ثقانس
۵۶۴	۵	آل بیر	آل بیرے	۶۴۹	۱۰	شارت	شارتر
۵۷۲	۵	رائن	مائن	۶۶۰	۹	وزیر	مشیر
۵۸۹	۲۳	صفحہ ( )	صفحہ (135)	〃	۲۱	ہوز	ہوس
۵۹۳	۸ حاشیہ	×	356	۶۶۳	۱۴	کالابرے	سکالابر
۵۹۷	۴	کے ایا زیادہ	کے زیادہ	۶۶۵	۱۰	حلہ	جلہ
۵۹۸	۳	اے ثی	اے ٹی	۶۷۲	۱۹	کامیت سے	کامیٹس